قال تعالیٰ لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ (الآیۃ)

فکیف ووُدّی ماحییت ونصرتی لآل رسول اللّٰہ زین المحافل

(حسان ابن ثابتؓ فی مدح ام المؤمنین عائشۃ صدیقہؓ)

زین المحافل شرح الشمائل للترمذی

جلد اول

افادات

شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

استاذ الحدیث ومہتمم جامعہ دار العلوم حقانیہ

ضبط وترتیب

مولانا اصلاح الدین حقانی

نظر ثانی وحاشیہ

مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

ناشر: مؤتمر المصنفین جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

نام کتاب	:	زین المحافل شرح الشمائل للامام الترمذی
افادات	:	شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ استاد الحدیث و مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
ضبط وترتیب	:	مولانا اصلاح الدین حقانی استاد الحدیث جامعہ اسلامیہ لکی مروت
نظر ثانی وحاشیہ	:	مولانا مفتی مختار اللہ حقانی مفتی واستاد شعبہ تخصص فی الفقہ والافتاء جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
کمپوزنگ	:	محمد اکمل، بابر حنیف جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
صفحات	:	جلد اول:532 جلد دوم:526
طبع اول	:	اپریل ۲۰۰۷ء
ناشر	:	مؤتمر المصنفین جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
طابع	:	المطبعۃ العربیہ، لیک روڈ پرانی انارکلی لاہور

مطبوعات مؤتمرالمصنفین جامعه حقانیه

نمبر شمار	نام کتاب	تصنیف	افادات	صفحات
۱	حقائق السنن شرح جامع السنن	حضرت مولانا سمیع الحق	شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ	۵۳۶
۲	دعوات حق (مکمل دو جلد)	" " "	" " " "	۱۱۹۲
۳	قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ	" " "	" " " "	۴۰۰
۴	عبادات و عبدیت	" " "	" " " "	۸۸
۵	مسئلہ خلافت و شہادت	" " "	" " " "	۱۰۴
۶	صحبتے با اہل حق (مجلد)	مولانا عبدالقیوم حقانی	" " " "	۴۰۸
۷	اسلام اور عصر حاضر (مجلد)	حضرت مولانا سمیع الحق	حضرت مولانا سمیع الحق	۴۶۰
۸	قرآن حکیم اور تعمیر اخلاق	" " "	" " " "	۹۶
۹	کاروان آخرت (مجلد)	" " "	" " " "	۴۴۶
۱۰	شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ خصوصی نمبر	مولانا عبدالقیوم حقانی	" " " "	۱۲۰۰
۱۱	قادیانیت اور ملت اسلامیہ کا موقف	حضرت مولانا سمیع الحق	" " " "	۲۰۸
۱۲	قادیان سے اسرائیل تک	" " "	" " " "	۲۲۴
۱۳	قومی اور ملی مسائل پر جمعیت کا موقف	" " "	" " " "	
۱۴	میری علمی اور مطالعاتی زندگی (مجلد)	" " "	" " " "	۵۶۰
۱۵	روسی الحاد	" " "	" " " "	۲۲۰
۱۶	فتاوی حقانیہ (چھ جلد)	مولانا مفتی مختار اللہ	حضرات شیخ الحدیث و مفتیان حقانیہ	۳۶۰۰
۱۷	خطبات حق	" " "	حضرت مولانا سمیع الحق	۴۵۰
۱۸	اسلام کا نظام اکل و شرب و فلسفہ حلال و حرام	" " "	" " " "	۴۵۰
۱۹	صلیبی دہشت گردی اور عالم اسلام	مولانا عبدالقیوم حقانی	" " " "	۵۰۰
۲۰	زین المحافل (شرح شمائل ترمذی) (۲ جلد)	مولانا اصلاح الدین حقانی	" " " "	زیر طبع
۲۱	مروجہ کرنسی کیلئے معیار نصاب سونا یا چاندی	مولانا مفتی مختار اللہ	مولانا مفتی مختار اللہ	۱۰۰

نمبرشمار	نام کتاب	تصنیف	افادات	صفحات
	انوارِحق (جلداول)	حافظ سلمان الحق حقانی	حضرت مولانا انوارالحق حقانی	۲۶۰
	شریعت بل کا معرکہ	حضرت مولانا سمیع الحق		
	مکتوبات مشاہیر بنام شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ	" " "		زیرطبع
	مکتوبات مشاہیر بنام مولانا سمیع الحق مدظلہ	" " "		زیرطبع
	اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتیں	حضرت مولانا سمیع الحق		
	ماہنامہ الحق کا مولانا عبدالحقؒ نمبر	مولانا عبدالقیوم حقانی		
	حیات صدرالمدرسین	مولانا محمد ابراہیم فانی		
	افادات حلیم	" " "	شیخ الحدیث مولانا عبدالحلیمؒ زروبوی	
	حیات شیخ القرآن	" " "		
	دروس الکافیہ	مولوی محمد سلیم سواتی حقانی	مولانا محمد ابراہیم فانی	
	العیون الصافیہ	مولوی مولاداد ہمدرد حقانی	" " "	
	داغہائے فراق	مولانا محمد ابراہیم فانی	" " "	
	جماعۃ النساء کی شرعی حیثیت	مولانا مفتی مختاراللہ حقانی	مولانا مفتی مختاراللہ حقانی	
	سادات اور بنوہاشم کیلئے زکوٰۃ دینے کی شرعی حیثیت	" " "	" " "	
	صفۃ الاقوال فی استحباب صوم ستۃ من شوال	" " "	" " "	زیرطبع
	دارالعلوم سے جامعہ ازہر تک	مولانا مفتی غلام الرحمٰن		
	تبلیغ مستورات سے ازالہ شبہات	مولانا حافظ شوکت علی		
	اعمالِ روحانی	" " "	شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ	
	تنویر الجامع شرح ملا جامی (پشتو)	" " "	مولانا حافظ شوکت علی	
	مسئلہ رویت ہلال اور اختلاف مطالع	مولانا مفتی مختاراللہ حقانی	مولانا مفتی مختاراللہ حقانی	زیرطبع
	سفر کے مسائل	مولانا مفتی غلام قادر نعمانی		

مؤتمر المصنفین "جامعہ دارالعلوم حقانیہ" اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

قال تعالیٰ لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ (الآیۃ)

فکیف ووڈی ماحییت ونصرتی لآل رسول اللّٰہ زین المحافل

(حسان ابن ثابتؓ فی مدح ام المؤمنین عائشۃ صدیقۃؓ)

زین المحافل شرح الشمائل للترمذی

جلد دوم

افادات

شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

استاذ الحدیث ومہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ

ضبط وترتیب

مولانا اصلاح الدین حقانی

نظر ثانی وحاشیہ

مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

ناشر: مؤتمر المصنفین جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

مقدمہ

(ازمولانا اصلاح الدین حقانی مرتب کتاب)

کسی بھی علم میں ابتداء علی وجہ البصیرت کرنے کیلئے کچھ امور کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ ان امور کے مجموعے کو مقدمۃ العلم کہتے ہیں۔ کتاب کی شرح شروع کرنے سے پہلے ہم علم حدیث کے متعلق ایسے چند امور کا بیان کریں گے۔

امر اول: علم حدیث کیا ہے؟ ''علم الحدیث'' ایک مرکب لفظ ہے جس کے دو جزؤ ہیں۔ مضاف یعنی علم اور مضاف الیہ یعنی ''الحدیث'' علم چار معانی میں مستعمل ہے۔

(۱) علم کا لغوی معنی دانستن یعنی جاننا ہے۔ یہ ایک مصدری مفہوم ہے جو اختیاری اور کبھی غیر اختیاری ہوتا ہے۔

(۲) علم کا عرفی معنی ہے مابہ الانکشاف یعنی وہ چیز جس کے ذریعے کسی مفہوم کا ادراک اور انکشاف ہوتا ہے۔ اس معنیٰ میں علم کا مصداق عقلاء کے نزدیک ہر زمانہ میں متنازع فیہ رہا ہے۔ چنانچہ بعض لوگ اسے کیفیت قلبی بتاتے ہیں۔ بعض حصول الصورۃ کے بعد حال سے تعبیر کرتے ہیں کچھ لوگ اسے صورۃ حاصلہ اور بعض دیگر افراد حصول الصورۃ کو اس کا مصداق گردانتے ہیں۔ اور کچھ لوگ اس کو عین عالم بھی سمجھتے ہیں۔ بہرحال اس کے مصداق میں قول فیصل ناپید ہے۔

(۳) علم کا تیسرا معنی شرعی ہے۔ وہ ہے''نور فی المؤمن مقتبس من مشکوٰۃ مصابیح النبوۃ'' یعنی وحی اور نبوۃ کی وہ روشنی جو کسی مومن کے قلب کو منور کرے۔ شرعی معنی میں علم کہلاتا ہے۔

(۴) علم کا چوتھا استعمال ''علم مدوّن'' کے معنی میں ہے یعنی واضعین ومدوّنین کا ترتیب دیا ہوا فن۔ جیسے ''علم فقہ''''علم بلاغت'' وغیرہ۔

اجمالی طور پر اس کے بھی تین مصداق علماء کے نزدیک مذکور ہیں۔

(۱) نفس مسائل (۲) تصدیقات بالمسائل (۳) تصدیقات سے حاصل شدہ ملکہ

دوسرا اجزء ''الحدیث'' ہے یہ تین معانی میں مستعمل ہے

(۱) لغوی لحاظ سے یہ فعیل کا وزن ہے جو فاعل کے معنی میں ہے۔یعنی حدیث حادث (نوپیدا) کے معنی میں ہے۔جو قدیم کا متضاد ہے۔

(۲) عرفاً حدیث خبر (جو انشاء کی ضد ہے) کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔اردو میں اس کا معنی ''نئی بات'' سے کرنا مناسب ہے۔لغوی معنی اور عرفی معنیٰ میں مناسبت واضح ہے۔حضرت علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں ''**وأمّا الحدیث فاصله ضدالقدیم وقداستعمل فی قلیل الخبر و کثیره**'' **لأنّه یحدث شیئاً فشیئاً**(۱)۔

(۳) حدیث کا شرعی معنی ہے ''**مایضاف إلیٰ النبیﷺ فی قولٍ اوفعلٍ او تقریرٍ**(۲)'' چونکہ آئندہ اسی معنیٰ میں حدیث زیر بحث رہے گا۔اس لئے اس تعریف کی کچھ تشریح کرنا مناسب ہے۔یہاں تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔قول نبیﷺ، فعل نبیﷺ اور تقریر نبیﷺ۔

قول نبیﷺ: وہ الفاظ اور ارشادات لسانیہ ہیں جو وقتاً فوقتاً نبی کریمﷺ سے صادر ہو چکے ہیں۔مثلاً نبی کریمﷺ کا ارشاد مبارک ہے **انّماالاعمال بالنّیات**۔

فعل نبیﷺ: اس سے مراد وہ کام اور اعمال ہیں جو نبی کریمﷺ سے صادر ہو چکے ہیں۔مثلاً **مسح النبیّﷺ علی الخفّین** یعنی نبی کریمﷺ نے موزوں پر مسح کیا۔

تقریر نبیﷺ: تقریر یہاں تثبیت کے معنی میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریمﷺ کسی صحابی کو کوئی قول یا فعل کرتا ہوا دیکھیں اور آپﷺ اس پر سکوت فرمائیں اور انکار نہ فرمائیں۔یہ کم از کم اس فعل کے جائز ہونے کی دلیل بن جاتی ہے۔مثلاً صحابہ کرامؓ صرف اِزار (لنگی) باندھ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔اور نبی کریمﷺ خاموشی سے ان کو دیکھتے تھے۔یہ نبی کریمﷺ کی طرف سے صحابہ کرامؓ کے اس فعل کی تقریر ہے۔

(۱) تدریب الراوی جلد نمبر ا ص ۴۲

امر دوم: حدیث کی وجہ تسمیہ: حدیث کی وجہ تسمیہ کے بارے میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی رائے پہلے ذکر ہو چکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "لأنّہ یحدث شیئافشیئا "یعنی چونکہ نبی اکرم ﷺ کے اقوال وافعال اور تقریرات حادث ہیں۔ اس لئے اسے حدیث کہتے ہیں۔

علامہ ابن حجرؒ نے اس کی کچھ مزید وضاحت کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شریعت کے دو مدار ہیں۔ کتاب اللہ اور رسول اللہ۔ حدیث مؤخر الذکر کے ساتھ مختص ہوتا ہے اور چونکہ کتاب اللہ قدیم ہے اور مؤخر الذکر حادث ہے لہٰذا کتاب اللہ کے تقابل کی وجہ سے اسے حدیث کہا گیا ہے "وکأنّہ أرید بہ مقابلة القرآن لأنّہ قدیم"(۱)۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مقدمہ فتح الملہم میں ایک اور وجہ تسمیہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ کہتے ہیں کہ حدیث کا لفظ "قرآنی آیت" "وامّا بنعمة ربّک فحدّث" (۲) سے مقتبس یعنی ماخوذ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سورۃ الضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر تین انعامات کا ذکر کیا ہے۔ (۱) ایواء (ٹھکانہ دینا) (۲) ہدایت (۳) اغناء۔ پھر ہر نعمت کے مقابلہ میں ایک مطالبہ کیا گیا ہے۔ دوسری نعمت یعنی ہدایت دینے کے مقابلہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس نعمت کا اظہار و بیان کردو۔ اس حکم کو آیت مذکورہ میں "فحدّث" سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ کے بیان کو تحدیث اور بیان شدہ امور کو "حدیث" کہا گیا۔

امر سوم: علم الحدیث کی تعریف: مضاف اور مضاف الیہ کی تشریح کے بعد مرکب لفظ "علم الحدیث" کی تشریح کا مرتبہ آتا ہے۔ واضح رہے کہ علم کے معنی میں سب سے آخری معنیٰ اور حدیث کے معانی میں بھی سب سے آخری معنیٰ لے کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ "علم الحدیث" وہ علم مدوّن ہے جس میں نبی کریم ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات سے بحث کی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ علم الحدیث کی تعریف میں متقدمین اور متاخرین کا اختلاف نقل کیا جاتا ہے۔

---

(۱) تدریب الراوی جلد ۱ ص ۴۲

(۲) سورۃ والضحیٰ

متقدمین کہتے ہیں ”هو علم يعرف به أقوال النبيّ ﷺ وأفعاله وأحواله“ (۱) اس تعریف کی رو سے علم الحدیث روایۃ الحدیث کے ساتھ مختص ہوگا۔یعنی سندحدیث سے صرف نظر کر کے متن الحدیث میں جو کچھ مقصود بالروایۃ ہوتا ہے اسی کی معرفت علم الحدیث کہلائے گا۔

انکے نزدیک علم الحدیث کا موضوع ذات النبیّ ﷺ من حيث أنّه نبيّ ومبلّغ ہے۔اوراس کا غایۃ قریبہ معرفة متون الاحاديث ہے۔یعنی راویوں نے جومضامین روایت کی ہیں ان کو جاننا مقصود ہوتا ہے۔

متأخرین نے علم الحدیث کی تعریف یوں کی ہے”هو علم يعرف بهااحوال السند والمتن“،یعنی علم حدیث وہ علم ہے جس میں روایۃ الحدیث کی حقیقت،شروط،انواع واحکام کے ساتھ ساتھ احوال رواۃ،اصناف مرویات اور دیگر متعلقات روایت بیک وقت زیر بحث ہوتے ہیں۔اس کو درایۃ الحدیث بھی کہتے ہیں۔اس فن کا موضوع متن وسند دونوں اور غایہ مقبول ومردود احادیث میں تمیز کرنا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں ؎

علم الحديث ذوقوانين تحدّ يدرىٰ بها احوال متن وسند

فذالک الموضوع والمقصود ان يعرف المقبول والمردود (۲)

متاخرین میں سے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اول الذکر مطلق علم الحدیث کی تعریف ہےاور مؤخر الذکر علم اصول حدیث کی تعریف ہے لیکن سلف میں سے بعض نے مؤخرالذکر کو بھی مطلق علم الحدیث کی تعریف قرار دیا ہے۔

<u>امر چہارم:حدیث،اثر،خبر اور سنت:</u> بعض حضرات کے نزدیک یہ چاروں الفاظ مترادف ہیں۔جب کہ بعض لوگوں نے ان میں فرق کیا ہے۔چنانچہ حدیث”مانسب إلى النبيّ ﷺ من قولٍ او فعلٍ او تقريرٍ“ کو کہاجاتا ہے۔اوراثر”مانسب إلى الصحابيّ“ کو کہاجاتا ہے۔یعنی وہ قول وفعل جو کسی صحابی

(۱)الکرمانی ج۱ص۱۲،عینی جلدنمبر۱۰ص۱۱

(۲)اوجز المسالک جلد۱ص۵

کی طرف منسوب ہو۔ جبکہ خبر کا لفظ عام ہے۔اُحوال نبی ﷺ اوراُحوال سلاطین ماضیہ دونوں کو کہا جاتا ہے۔

البتہ سنت کا لفظ اصطلاحاً عام ہے۔ نبی کریم ﷺ ،صحابہؓ اور تابعین کے ہاں پسندیدہ طور طریقوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

تنبیہ: واضح رہے کہ سند طریق حدیث یعنی رجال کے اس مجموعہ کا نام ہے جنہوں نے حدیث کی روایت کی ہے اور کبھی اسناد بھی اسی معنیٰ میں مستعمل ہوتا ہے۔ جبکہ متن ان کلمات اور احکام کا نام ہے جو مقصود بالبیان ہو یا بالفاظ دیگر ''مایساق له السند'' یعنی وہ حکم جس کیلئے سند بیان کی گئی ہو۔

امر پنجم: موضوع علم حدیث اور غرض وغایہ: ان دونوں امور کا ذکر علم الحدیث کی تعریف کے ضمن میں ہو گیا ہے۔

امر ششم: مرتبۂ علم حدیث: فضیلت کے اعتبار سے تفسیر کے بعد دوسرا مرتبہ علم حدیث کا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید اور اس کی تفسیر کو مطلقاً شرف حاصل ہے۔ جبکہ تعلّم کے اعتبار سے علم حدیث کا مرتبہ سب سے آخر میں ہوتا ہے کیونکہ تمام علوم آلیہ تو حدیث کے فہم میں معاون بلکہ اس کیلئے موقوف علیہ کے درجہ میں ہیں۔ کیونکہ بغیر دیگر علوم کے غلطی اور حدیث بیان کرتے ہوئے کذب علی النبی ﷺ کا خوف ہوتا ہے جو بہت خطرناک بات ہے۔ اس لئے تعلّم کے وقت دیگر فنون کو اس پر مقدم کرنا ضروری ہے۔ تاکہ روایت میں خطا سے بچا جاسکے۔

امر ہفتم: تدوین حدیث: احادیث کی نسبت تو آنحضرت ﷺ کی طرف ہوتی ہے۔ اور اس کی کتابت کا سلسلہ بھی نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ زمانہ نبوت میں احادیث کی کتابت کرتے تھے۔ اس طرح حضرت ابو ہریرۃؓ کے شاگرد اُن سے سنی ہوئی احادیث کی کتابت کیا کرتے تھے۔ جن میں حسن بن عمروؒ، بشر بن نھیکؒ، ہمام بن منبہؒ اور وھب بن منبہؒ کے امالی اور صحیفے قابل ذکر ہیں (۱)۔ لیکن اس کو فن کا درجہ اور مستقل علم کی حیثیت کس نے دی ہے۔ اس سلسلے میں دو نام قابل ذکر ہیں۔

---

(۱) سنن دارمی جلد نمبر ۱ ص ۱۳۸ اور مسند احمد جلد ۲ ص ۳۱۲ تا ۳۱۸

اول: امام محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبداللہ بن شہاب الزہریؒ (م ۱۲۵ھ) ہیں۔ جد امجد شہاب کی طرف ان کی نسبت ہوتی ہے۔ علامہ ابن حجرؒ نے ان کو ''اوّل مــن دوّن الــحــدیــث'' کا مصداق ٹھہرایا ہے(۱)۔

اسی طرح امام مالکؒ نے بھی انہی کو مدوّن اوّل قرار(۲) دیا ہے۔

دوم: ابوبکر بن حزمؒ (م ۱۲۰ھ) ہیں جو عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں مدینہ کے گورنر تھے۔ انہوں نے بھی اپنے زمانہ میں احادیث کو جمع کیا تھا۔

دراصل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے خلافت کے زمانہ میں علماء اور امراءِ جنود (جرنیلوں) کو حکم دیا تھا کہ وہ احادیث کو جمع کر کے محفوظ کر لیں کیونکہ ان کے ضائع ہونے کا خدشہ تھا۔ اس سلسلے میں امام زہریؒ، ابوبکر بن حزمؒ اور سعد بن ابراہیمؒ کو خصوصی طور پر جمع حدیث کا حکم ملا تھا۔ چنانچہ امام زہریؒ نے تعمیل حکم میں احادیث کا مجموعہ تیار کر کے عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس بھیجا تھا۔ انہوں نے اس کی نقلیں کروا کر اطراف مملکت میں بھیج دیں۔ جب کہ ابن حزمؒ کا مجموعہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس نہیں پہنچ سکا۔ اسی وجہ سے امام مالکؒ وغیرہ نے امام زہریؒ کو مدوّن اوّل کا درجہ دیا۔ اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ امام زہریؒ تدوین حدیث کے طبقہ اولیٰ کے سرخیل ہیں۔ اس کے بعد دوسرے طبقہ میں ربیع ابن صبیحؒ (م ۱۶۰ھ) اور سعید بن ابی عروبہؒ (م ۱۵۶ھ) وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ جنہوں نے تصنیف کے ساتھ تبویب اور ترتیب کا لحاظ بھی رکھا۔

تیسرا دور ۱۵۰ھ سے ۲۲۰ھ تک کا ہے جس میں ابن جریجؒ (م ۱۵۰ھ)، معمر بن راشدؒ (م ۱۵۴ھ) امام اوزاعیؒ (م ۱۵۷ھ) امام ثوریؒ (م ۱۶۱ھ) امام مالکؒ اور عبداللہ ابن المبارکؒ کے نام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے بھی احادیث اور آثار صحابہ کو جمع کر کے متعدد ابواب کے مجموعے تیار کیے اور مستقل کتب تالیف کیں۔

---

(۱) فتح الباری ج ۱ ص ۲۰۸

(۲) حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۳۶۳

چوتھا دور ۲۰۰ھ سے ۲۲۵ھ تک کا ہے جس میں عبیداللہ بن موسیٰؒ (م ۲۱۳ھ) نعیم ابن حمادؒ (م ۲۲۸)، عثمان بن ابی شیبۃؒ (م ۲۳۹) اور امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱) وغیرہ شامل ہیں ان حضرات نے مرفوع احادیث کے مجموعے لکھے۔ جن میں آثار صحابہ کو کم ذکر کیا گیا لیکن ان مجموعوں میں حسن اور ضعیف احادیث بھی موجود تھیں۔

پانچواں طبقہ کتب صحاح وحسان کے مصنفین کا ہے۔ جن کا دور ۲۲۵ھ سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے سرخیل امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ ہیں۔ جن کی تقلید میں امام نسائیؒ، امام ابوداؤدؒ، امام ترمذیؒ، امام ابن ماجہؒ نے بھی تالیفات کیں۔ انہوں نے صحاح کی تجرید کی یعنی غیر صحیح احادیث سے ان کو الگ کر دیا۔

امر ہشتم: کتب حدیث: کتب حدیث کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن ان میں سات بڑی قسموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) جوامع: جامع کی جمع ہے۔ جامع اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں ان آٹھ فنون کی احادیث کو جمع کیا گیا ہو جن کو اس شعر میں ذکر کیا گیا ہے۔

سیر وآداب وتفسیر وعقائد فتن، احکام واشراط ومناقب

صحیح بخاری اور سنن ترمذی بالاتفاق جوامع میں سے ہیں۔ جبکہ صحیح مسلم شریف میں تفسیر کی قلت کی وجہ سے اختلاف ہے کہ جامع ہے یا نہیں۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مسلم میں بھی تفسیر کے بارے میں اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اگرچہ وہ متفرق ہے اس لئے صاحب کشف الظنون اور صاحب قاموس نے اسے بھی جوامع میں سے شمار کیا ہے۔

(۲) سنن: فقہی ترتیب کے موافق ترتیب دی ہوئی حدیث کی کتاب کو سنن کہا جاتا ہے جیسے سنن ترمذی اور سنن ابی داؤد وغیرہ۔

(۳) مسانید: مسند حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں صحابہ کرامؓ کی مروی احادیث کو صحابہ کرام کی ترتیب کے مطابق لایا جائے۔ یہ ترتیب یا تو اسماء صحابہ کے حروف تہجی کو ملحوظ رکھتے ہوئے دی جاتی ہے یا پھر ان کے مراتب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ جیسے مسند امام احمدؒ

(۴) معاجم: معجم اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں مصنفؒ نے اپنے مشائخ کی ترتیب کا لحاظ

کیا ہو۔ پھر مشائخ کی ترتیب میں کبھی ان کی وفیات کو اور کبھی ان کے علم و فضل کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر یہاں بھی ان کے اسماء کے حروف تہجی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ جیسے امام طبرانیؒ کی معجم کبیر، معجم اوسط اور معجم صغیر وغیرہ۔

(۵) مستدرکات: مستدرک احادیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی مؤلف کتاب کے شروط کے مطابق اس سے متروک احادیث کو جمع کیا جائے جیسے ''مستدرک حاکم'' یہ کتاب ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم (م ۴۰۵ھ) نے لکھی ہے۔ اور بخاری و مسلم کے شروط کے مطابق ان سے چھوٹی ہوئی احادیث کو جمع کیا۔

(۶) مستخرجات: مستخرجات مستخرج کی جمع ہے۔ مستخرج اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں مصنف کسی دوسرے مصنف کی روایات کو اپنی سند کے ساتھ روایت کرے۔ یوں کہ مصنف سابق کا واسطہ درمیان میں نہ آئے۔ جیسے محمد بن عبدالمالک کی ''مستخرج علی سنن ابی داؤد'' وغیرہ۔

(۷) اجزاء ورسائل: جزء احادیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی ایک مسئلہ کے متعلق احادیث کو جمع کیا جاتا ہے۔ مثلاً جزء القراءۃ خلف الامام للبخاریؒ۔ اسے متاخرین کی اصطلاح میں رسالہ بھی کہا جاتا ہے۔ امام ترمذیؒ کی کتاب شمائل ترمذی کو بھی اسی صنف کے تحت شمار کیا جانا چاہیئے۔

مذکورہ مشہور اقسام کے علاوہ کچھ دیگر اصناف بھی ہیں۔ مثلاً کتاب الافراد والغرائب، کتاب العلل، اطراف، مسلسلات اور اربعینات وغیرہ

امر نہم: حکم شرعی: علم حدیث کا حصول فرض کفایہ ہے حتی کہ جہاں پر مسلمان موجود ہوں اور کوئی بھی اس علم کا عالم نہ ہو تو تمام مسلمان ترک فریضہ کے گنہگار ہونگے۔

امر دہم: تقسیمات حدیث: حدیث میں مختلف جہات سے متعدد تقسیمات ہیں۔

تقسیم اول باعتبار انتہائے حدیث: اس اعتبار سے حدیث تین قسم پر ہے۔

(۱) مرفوع (۲) موقوف (۳) مقطوع

مرفوع: مرفوع وہ حدیث ہے جس میں کسی قول، فعل یا تقریر کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی ہو۔

موقوف: وہ حدیث ہے جس میں نسبت صحابی کی طرف کی گئی ہو۔

مقطوع: مقطوع وہ حدیث ہے جس میں نسبت کسی تابعی کی طرف ہو۔

تقسیم دوم باعتبار تعداد رواۃ: اس لحاظ سے حدیث کی چار بڑی قسمیں ہیں۔

(۱) متواتر: اگر کسی روایت کو ہر زمانے میں راویوں کی اتنی تعداد روایت کرے کہ کثرت کی بناء پر ان کے جھوٹ پر اتفاق کو عقل سلیم عادتاً محال سمجھے تو حدیث متواتر کہلاتی ہے۔ بعض لوگوں نے یہاں مخصوص عدد کا اعتبار کیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ تواتر میں راویوں کی کسی خاص عدد کا اعتبار نہیں ہوتا۔ بلکہ جب بھی کوئی تعداد یقین اور جزم کا مفید ہو تو وہ تواتر کا فائدہ دے گا۔

(۲) غریب: اگر کسی زمانہ میں کسی روایت کو روایت کرنے والا ایک ہو تو اسے غریب کہتے ہیں۔

(۳) عزیز: اگر سند کے کسی طبقہ میں رواۃ کی تعداد دو سے کم نہ ہو مگر تمام طبقات میں تین تک نہ پہنچتی ہو تو اسے عزیز کہتے ہیں۔

(۴) مشہور (۱): جب تمام مراتب سند میں رواۃ کی تعداد دو سے زیادہ ہو اور حدیث متواتر کے درجہ کو بھی نہ پہنچی ہو تو وہ حدیث مشہور یا مستفیض کہلاتی ہے۔

تنبیہ: علامہ عثمانیؒ فتح الملہم کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ حدیث مشہور اور حدیث عزیز میں طبقہ اولیٰ یعنی صحابہ کے زمانے میں تعداد شرط نہیں ہے گویا ایک صحابی کی روایت بھی عزیز یا مشہور ہو سکتی ہے۔

تقسیم سوم باعتبار سقوط رواۃ اور عدم سقوط: اس اعتبار سے حدیث کی دو بڑی قسمیں ہیں۔

(۱) متصل: اگر حدیث کی سند میں کہیں بھی کوئی راوی گرا ہوا نہ ہو تو اس کو حدیث متصل کہتے ہیں۔ متصل مرفوع بھی ہو سکتا ہے اور موقوف یا مقطوع بھی۔ البتہ مسند کا اطلاق کبھی تو صرف مرفوع متصل روایت پر ہوتا ہے اور کبھی یہ صرف متصل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

(۲) منقطع: اگر رواۃ میں کسی جگہ کوئی ایک یا زیادہ راوی ساقط ہو چکے ہوں تو اس کو حدیث منقطع (بالمعنی الاعم) کہتے ہیں۔ پھر منقطع بالمعنی الاعم کی کئی قسمیں ہیں۔

---

(۱) فقہاء احناف کے ہاں حدیث کی بنیادی تین قسمیں ہیں (۱) متواتر (۲) مشہور (۳) آحاد جبکہ جمہور کے ہاں حدیث کی بنیادی دو قسمیں (۱) متواتر (۲) احاد۔ فقہاء احناف میں بھی بعض فقہاء جیسے امام جصاص وہ اس تقسیم میں جمہور کا ساتھ دیتے ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ بعض فقہاء احناف مشہور کو متواتر کا قسم اور جمہور مشہور کو خبر واحد میں داخل کرتے ہیں۔

(۱)مرسل: وہ حدیث جس کی سند کے آخر میں صحابی ساقط ہو چکا ہو۔

(۲)معلق: وہ حدیث جس کی سند کی ابتداء میں ایک یا متعدد راوی ساقط ہوں۔

(۳)منقطع بالمعنی الاخص: وہ حدیث جس کی سند کے وسط میں ایک یا متعدد لیکن غیر متتالی (یعنی بغیر لگاتار کے) راوی ساقط ہوں۔

(۴)معضل: وہ حدیث جس کی سند کے درمیان میں متعدد راوی متتالی یعنی لگا تار ساقط ہو۔

(۵)مدلّس: وہ حدیث ہے جس میں راوی اپنا شیخ ترک کر کے شیخ الشیخ سے اس طرح روایت کرے کہ وہ شیخ الشیخ سے موہم سماع ہو۔ یعنی مخاطب یہ سمجھے کہ جس شیخ الشیخ کا وہ نام لے رہا ہے۔ اس سے وہ بلا واسطہ روایت سن چکا ہے۔

تقسیم رابع: باعتبار احوال رواۃ: راویوں کی صفات اور احوال کے لحاظ سے حدیث کی ابتدائی پانچ قسمیں ہیں۔ جن کی تفصیل سے قبل راویوں میں طعون اور عیوب کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ راویوں میں دو قسم کے عیوب کا احتمال ہے۔ ایک وہ جو راوی کی عدالت کو مجروح کرتے ہیں۔ اور وہ پانچ ہیں۔ کذب، تہمت کذب، فسق، بدعت اور جہالت یعنی مجہول ہونا۔ دوم وہ جو راوی کے ضبط کو مجروح کرتے ہیں۔ وہ بھی پانچ ہیں۔ کثرت غفلت، کثرت غلط، کثرت وہم، سوء حفظ، اور دوسرے ثقہ راویوں کی مخالفت۔

اس تفصیل کے بعد راویوں کی صفات کے اعتبار سے پانچ قسموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اول: صحیح لذاتہ: وہ متصل حدیث جس کو کامل العدل اور کامل الضبط راوی روایت کریں۔ اور وہ علت وشذوذ وغیرہ صفات سے محفوظ ہو۔ صحیح لذاتہ کہلاتا ہے۔ گویا صحیح لذاتہ میں تین وجودی صفات (کمال عدالت، کمال ضبط اور اتصال) نیز وہ سلبی صفات یعنی علت سے خالی ہونا۔ اور شذوذ سے خالی ہونا معتبر ہے(۱)۔

---

(۱) محدثین نے صحیح کی ایک اور تعریف بھی کی ہے اذا تلقاہ الناس بالقبول وإن لم یکن له إسناد صحیح قال ابن عبدالبر فی الاذکار لمّا حکی عن الترمذیّ أنّ البخاریّ صحّح حدیث البحر ھو الطھور ماء ہ واھل الحدیث لا یصحّحون مثل اسنادہ لکنّ الحدیث عندی صحیح لأنّ العلماء تلقوہ بالقبول (مقدمۃ اعلاء السنن قواعدالحدیث ۱۹/ ۲۰)(مختار)

دوم: صحیح لغیرہ: وہ متصل حدیث جس کی راویوں میں کمال عدل یا کمال ضبط نہ ہو لیکن یہ روایت متعدد طرق (طریقہ کی جمع) سے مروی ہو اور علت وشذوذ سے سالم ہو صحیح لغیرہ کہلاتا ہے۔ گویا اس کی سند میں نقصان کا جبیرہ تعدد اسانید کی وجہ سے ہوتا ہے۔

سوم: حسن لذاتہ: وہ متصل حدیث جس کو کامل العدل لیکن غیر کامل الضبط راوی روایت کرے اور طرق متعدد نہ ہوں لیکن علت وشذوذ سے سالم ہو۔

چہارم: حسن لغیرہ: وہ متصل حدیث جس کے راویوں میں کمال عدل نہ ہو یا کمال عدل اور کمال ضبط دونوں مفقود ہوں۔ لیکن وہ طرق متعددہ سے مروی ہو۔ اور علت وشذوذ سے بھی خالی ہو۔ حسن لغیرہ کہلاتا ہے۔

پنجم: ضعیف: وہ حدیث جسے ناقص العدل اور ناقص الضبط راوی روایت کریں۔ اور اس کے طرق بھی متعدد نہ ہوں یا اس میں علت شذوذ وغیرہ میں عیوب پائے جائیں ضعیف کہلاتا ہے۔

حدیث ضعیف کی اقسام: حدیث ضعیف کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں مشہور اقسام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) موضوع: وہ حدیث جس کا راوی روایت حدیث میں کذب سے متہم ہو۔ یہ کذب خود اس کے اقرار یا دیگر قرائن سے ثابت ہو چکا ہو۔ موضوع کہلاتا ہے۔ ایسی حدیث قطعی طور پر غیر مقبول ہوتی ہے۔

(۲) متروک: وہ حدیث جس کا راوی غیر باب الروایۃ میں جھوٹ سے مطعون ہو یا یہ روایت دین کے معلوم ومعروف قواعد کے خلاف مروی ہو۔

(۳) شاذ: وہ روایت جس کو ثقہ راوی روایت کرے لیکن وہ اپنے سے اوثق راوی یا ثقہ راویوں کی جماعت سے مخالف ہو شاذ کی مخالف روایت محفوظ کہلاتی ہے۔

(۴) منکر: وہ روایت جس کا راوی ضعیف ہونے کے باوجود ثقہ راویوں کی مخالفت کرے اس کی مخالف روایت معروف کہلاتی ہے۔

(۵) معلل: وہ حدیث جس میں کوئی علۃ خفیہ موجود ہو، جس کی وجہ سے حدیث میں ضعف ہو۔ اس

علۃ خفیہ کو صرف ماہرین فن معلوم کر سکتے ہیں۔

(۶)مضطرب: وہ حدیث جس کی سند یا متن میں کمی بیشی یا تقدیم وتاخیر وغیرہ کے لحاظ سے اختلاف ہو۔اور اس اختلاف کو رفع کرنے کیلئے تطبیق یا ترجیح بھی ممکن نہ ہو مضطرب کہلاتی ہے۔

(۷)مصحف: وہ حدیث ہے جس میں نقطوں یا حرکت وسکون کے تغیّر کی وجہ سے غلطی واقع ہوئی جب کہ عبارت کی صورت خطی باقی رہے۔مثلاً اُبَی کی جگہ ابی پڑھا جائے۔جیسے کہ عوام ابن المراجم کی جگہ عوام بن المزاحم پڑھا گیا ہے۔اس طرح ''**من صام رمضان واتبع ستاً من شوال فکانّما صام الدهر کله**'' کی جگہ ''**واتبع شیئاً من شوال**'' پڑھا گیا ہے۔کبھی کبھی اس کو محرّف بھی کہتے ہیں۔

(۸)مقلوب: وہ حدیث جس کی سند یا متن میں تقدیم وتاخیر کی گئی ہو مقدم کی جگہ مؤخر اور مؤخر کی جگہ مقدم ذکر کیا گیا ہو۔یا کسی راوی کی جگہ دوسرا راوی ذکر کیا جائے۔یا کسی متن کی سند کو دوسرے متن کی سند سے بدل دیا جائے۔

(۹)مدرج: وہ حدیث جس میں راوی اپنا کلام حدیث میں بغرض تفسیر داخل کر دے لیکن ادوات تفسیر ذکر نہ کرے۔

(۱۰)منقلب: وہ حدیث جس میں راوی تفسیر کی غرض سے نہیں بلکہ صرف مناسبت کی وجہ سے اپنا کلام داخل کر دے جیسے ''**لاتحاسدوا و لاتباغضوا و لاتدابروا..**'' کے ساتھ ''**و لاتنافسوا**'' کا اضافہ بھی روایت کیا جائے۔

(۱۱)مدلّس: وہ روایت جس میں راوی شیخ کو ترک کر کے شیخ الشیخ سے روایت کرے یوں کہ شیخ الشیخ سے حدیث سننے کا ایہام بھی ہو۔یہ بھی ضعیف کی ایک قسم ہے۔

(۱۲)غریب: غریب اور فرد حدیث بھی کبھی کبھی غرابت کی وجہ سے ضعیف ٹھہرائی جاتی ہے۔ضعیف کی دیگر قسموں میں وہ روایات ہیں جس کا راوی مجہول، مبتدع اور سیئ الحفظ ہو۔

تقسیم خامس باعتبار صیغ ادا: ادائے حدیث کے صیغوں کے اعتبار سے حدیث کی دو قسمیں ہیں۔

(۱)حدیث مسلسل: وہ حدیث جس میں روایت مقبول صیغوں سے ادا کی جائے۔جیسے **حدّثنا فلان**،

أخبرنافلان، انبأنافلان، قال لنا، رویٰ لنا، سمعته يقول، ذکرنی فلان وغیرہ

(۲)حدیث معنعن: وہ حدیث ہے جسے عــن انَّ یااُن صیغوں سے روایت کیاجائے جوراوی کے سماع پر دلالت نہ کریں۔جیسے **عـن فـلان، انّ فلاناً قال، رویٰ فلاناً، قال فلان، ذکرفلان، کتب فلان** وغیرہ۔اس کوحدیث مؤنّن بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ اَنّ اوراِنّ سے بھی روایت ہوتا ہے۔

تنبیہ: حدیث معنعن کی قبولیت اورقبولیت کی شرائط میں وسیع اختلاف ہے۔ جسے اختصاراً ترک کیاجاتا ہے۔

تقسیم سادس حدیث مقبول میں: عمل کے اعتبار سے حدیث مقبول دوقسم پر ہے۔

(۱)محکم سالم عن المعارضة (۲)مختلف الحدیث

محکم حدیث جس کا کوئی معارض موجود نہ ہو۔مطلقاً معمول بہ ہوتا ہے۔جبکہ مختلف الحدیث یعنی وہ حدیث جس کا دوسرے حدیث سے تعارض ہوتفصیل طلب ہے۔چنانچہ اگردو حدیث متعارض ملیں تو سب سے پہلے ان میں تطبیق تلاش کی جائے گی۔اگردونوں کے الگ الگ محمل مل جائیں تو دونوں حدیثوں پرعمل کیاجائے گا۔تطبیق ممکن نہ ہوتو دونوں حدیثوں کی تاریخ کودیکھاجائے گا۔اگران میں سے کوئی حدیث مؤخر ہوتو وہ معمول بہ ہوگا اورمقدم منسوخ ہوگا۔اگرتاریخ معلوم نہ ہوسکے تو پھراسباب الترجیح کی طرف رجوع کیاجائے گا۔اگرایک کوراجح ثابت کرلیا گیاتو وہی معمول بہ اوردوسرامتروک ہوگا۔اوراگر یہ بھی ممکن نہ ہوسکا تو پھر دونوں پرعمل نہیں ہوگا اورتوقف اختیار کیاجائے گا۔

امریازدہم:مراتب رواۃ اورصحاح کی درجہ بندی: قوت وضعف کے لحاظ سے راویوں کے پانچ مرتبے ہیں۔

(۱)قوی الضبط کثیر الملازمه: یہ وہ راوی ہے جوحدیث کے اخذ کے وقت غفلت اور ادا کے وقت کثرت خطا سے محفوظ ہونیز اپنے استاد سے استفادہ کا التزام رکھے۔

(۲)قوی الضبط قلیل الملازمه: وہ راوی جوغفلت اورخطا کی کثرت سے تومحفوظ ہولیکن شیخ سے اس کا استفادہ قلیل ہو۔

(۳)**قلیل الضبط کثیر الملازمہ:** وہ راوی جو دوسری قسم کا عکس ہو۔

(۴)**قلیل الضبط قلیل الملازمہ سالم من العیوب:** وہ راوی جس کا ضبط اور شیخ کے ساتھ ملازمہ تو ناقص ہو لیکن اس کی عدالت میں نقص نہ ہو اور کذب فسق اور بدعت یا جہالت سے متصف نہ ہو۔

(۵)**قلیل الضبط قلیل الملازمہ مطعون:** جو راوی ضبط وملازمہ میں ناقص ہونے کے ساتھ ساتھ مذکورہ عیوب میں سے کچھ عیوب سے مطعون بھی ہو۔ان کو ضعفاء اور مجہولین بھی کہا جاتا ہے۔

ان مراتب کوملحوظ رکھ کر صحاح ستہ کی درجہ بندی یوں کی جاتی ہے کہ امام بخاریؒ طبقہ اولیٰ سے بالاستیعاب روایت کرتے ہیں۔اوردوسرے طبقہ کے راویوں سے انتخاب فرماتے ہیں۔اس لئے ان کی کتاب صحت کے اعلیٰ مقام پر ہے۔

امام مسلمؒ کی کتاب دوسرے نمبر پر ہے۔اس لئے کہ وہ اول دوطبقوں سے بالاستیعاب روایت کرتے ہیں۔جب کہ تیسرے طبقہ کے مشاہیر سے روایت کرتے ہیں۔

امام ابوداؤد اور امام نسائی اول الذکر تین طبقوں سے بالاستیعاب روایت کرتے ہیں۔جب کہ چوتھے طبقہ کے راویوں سے انتخاب فرماتے ہیں۔لیکن امام نسائی کی کتاب کو امام ابوداؤد کی سنن پر سبقت درجہ ذیل وجوہ سے حاصل ہے۔

(۱) امام نسائی کمزور احادیث کی کمزوری بیان کر لیتے ہیں۔جبکہ امام ابوداؤد ایسا کم کرتے ہیں۔

(۲) طبقہ رابعہ سے امام نسائی کی روایت کم ہوتی ہے۔جب کہ امام ابوداؤد نسبتاً زیادہ روایت کرتے ہیں

(۳) امام نسائی شخصی لحاظ سے امام ابوداؤد کی نسبت احفظ ہیں۔بلکہ علامہ سبکیؒ اور علامہ ذہبیؒ نے تو ان کو مسلمؒ سے بھی زیادہ احفظ کہا ہے۔

امام ترمذیؒ پہلے چار طبقوں سے روایت کرتے ہیں اور پانچویں طبقہ کے مشاہیر سے بھی۔لیکن انہوں نے بھی اکثر مقامات پر تنقید کا اہتمام کیا ہے۔لہٰذا وہ پانچویں نمبر پر ہے۔

اور آخر میں ابن ماجہؒ کی سنن کا درجہ آتا ہے۔جو مذکورہ تمام طبقات سے روایت کرتے ہیں۔

امر دوازدہم: مشتغلین فی الحدیث کی اقسام:

(۱)طالب: وہ شخص جو طلب حدیث اوراخذ روایت کی ابتداء کرتا ہے۔

(۲)محدّث یا شیخ الحدیث: وہ شخص جو روایات کے حصول کے بعد اس کو نقل کرتا ہو علم حدیث کے ساتھ ایسا تعلق ہو کہ ناسخ ومنسوخ، احوال رواۃ، علل احادیث کے اصول سے واقف ہو۔اور علم حدیث میں مشغول رہے۔بعض لوگوں نے ایک ہزار روایات یاد ہونے کی بھی شرط لگائی ہے۔لیکن مولانا اعزاز علیؒ نے یہ تعریف لکھی ہے کہ "من یُعتنیٰ بروایته ویکتفیٰ بدرایته"یعنی اس کی روایت معتبر اور شرح احادیث قابل اعتماد ہو۔

(۳)حافظ : وہ محدّث جسے ایک لاکھ احادیث اسماء الرجال اور ناسخ ومنسوح کی معرفت کے ساتھ یاد ہوں۔

(۴)حجۃ: وہ شخص جس کو تین لاکھ احادیث مذکورہ حیثیت کے ساتھ یاد ہوں۔

(۵)حاکم: وہ شخص جس کو تمام روایات اور بعض حضرات کے بقول دس لاکھ احادیث متناً وسنداً جرحاً وتعدیلاً یاد ہوں۔

حافظ، حجۃ اور حاکم کی مذکورہ تعریفیں ملاعلی قاریؒ نے فرمائی ہیں۔لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ متقدمین کی کتابوں میں مذکورہ القاب کی مبیّنہ تعریفات نہیں ملتیں۔

امر سیزدہم: حجیت حدیث: دیگر فتنوں کی طرح دور حاضر میں انکار حدیث کا فتنہ بھی زوروں پر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دور کے علماء کو جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے مستقل کتابیں لکھ کر اس فتنے کا سدباب کیا۔ اس لئے ہم اس بحث کو زیادہ تو نہیں چھیڑنا چاہتے۔بطور خلاصہ صرف اتنا کہیں گے کہ قرآن مجید خود حدیث کی حجیت پر ناطق ہے۔اور احادیث سے انکار قرآن سے انکار کے مترادف ہے۔

قرآن خود کہتا ہے۔

(۱) اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول(الآیۃ)

اگر صرف قرآن ہی دلیل وحجت ہے تو اطیعوا الرسول کیلئے کیا رہ جاتا ہے۔

(۲) **قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ.(الآیة)**

اتباع رسول کا امر حدیث پر عمل کی صورت ہی میں ممکن ہے۔

(۳) **من یطع الرسول فقداطاع اللّٰہ(الآیة)**

شرط اور جواب شرط میں مغائرت کے اصول کے مطابق اطاعت رسول، قرآن پر عمل کرنے کے بعد ایک اور مامور بہ ہے۔

(۴) **ولکم فی رسول اللّٰہ أسوة حسنة.(الآیة)**

اس اسوہ حسنہ کو احادیث کے سوا ہم کہاں ڈھونڈ کے لائیں۔

(۵) **وماآتاکم الرسول فخذوہ ومانھٰکم عنہ فانتھوہ.(الآیة)**

کلمہ **ما** کا عموم اس کا متقاضی ہے کہ قرآن کی طرح حدیث بھی واجب العمل ہے۔کیونکہ وہ بھی "**ماآتاکم اورمانھٰکم**"کا مصداق ہے۔

<u>امر چہاردہم:شرف علم حدیث:</u> قرآن مجید کے علم کے بعد بالاجماع علم حدیث کا مقام آتا ہے۔ بلکہ امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے۔**لولا السنة لمافھم القرآن**۔ظاہر ہے کہ قرآن فہمی کے لئے احادیث کا علم ضروری اور موقوف علیہ ہے۔کیونکہ قرآنی احکام کے اجمال کی تفصیل نبی اکرم ﷺ کے قول وفعل ہی میں موجود ہے۔

علاوہ ازیں علم حدیث کا موضوع **ذات النبی من حیث ھو نبی** ہے۔اور **ذات النبی** تمام مخلوقات سے افضل ہے۔اس لئے اس سے بحث کرنے والا علم بھی افضل العلوم ہوگا۔

دوسری طرف علم حدیث کی اشاعت کرنے والوں کے لئے نبی اکرم ﷺ کی خصوصی دعائیں، اس علم کی افضلیت کی کافی دلیل ہیں۔بہرحال علم حدیث کا علوم میں ایک بڑا عظیم مرتبہ ہے۔اس وجہ سے علماء کا فیصلہ ہے کہ "علم حدیث کا حصول فرض کفایہ ہے"

شمائل ترمذی

علم حدیث سے متعلق ضروری مباحث ذکر کرنے کے بعد کتاب کے بارے میں چند ضروری مباحث کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امر اول: مؤلف کتاب: امام ترمذی رحمہ اللہ

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن الضحاک السلمی الضریر البوغی الترمذیؒ کا شمار چوٹی کے ان محدثین میں ہوتا ہے جن کی خدمت حدیث کا اعتراف پورے عالم میں اور ہر زمانہ میں یکساں کیا جاتا ہے۔

آپؒ کی کنیت ابوعیسیٰ تھی۔ مصنف ابن ابی شیبہؒ کی ایک حدیث میں ابوعیسیٰ کنیت رکھنے سے منع بھی مروی ہے۔ اس کے باوجود آپ کی کنیت ابوعیسیٰ مشہور ہے۔ اور خود کتاب میں اپنے آپ کیلئے یہی کنیت استعمال کرتے ہیں۔

آپؒ کی اس روش کے لئے شرّاح حدیث متعدد توجیہات کرتے ہیں مثلاً

(۱) مصنف بن ابی شیبہ کی حدیث منسوخ ہے۔

(۲) اس حدیث میں نہی تنزیہی ہے کیونکہ حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ نے جب نبی کریم ﷺ سے ابوعیسیٰ کنیت رکھنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ یعنی یہ دلیل ہے کہ یہ نہی تحریمی نہیں تھی۔

(۳) مصنف ابن ابی شیبہؒ کی حدیث امام ترمذیؒ تک نہیں پہنچی۔

(۴) مصنف ابن ابی شیبہؒ کی حدیث میں نہی صرف اس صورۃ پر محمول ہے۔ جس میں حضرت عیسیٰؑ کے لئے والد ثابت ہونے کا ابہام ہو۔ مطلقاً یہ کنیت استعمال کرنا ممنوع نہیں ہے۔ اس پر قرینہ یہ ہے کہ خود مصنفؒ کی روایت میں نہی مرفوع نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یوں ہے کہ ایک صحابی نے کنیت ابوعیسیٰ رکھ لی تھی۔ جب نبی کریم ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو فرمایا انّ عیسیٰ لااب له۔

(۵) بعض حضرات نے نبی کریم ﷺ کے کلام کو ملاطفت اور مزاح پر بھی محمول کیا ہے۔ کہ مقصود نہی نہیں بلکہ تو ہم فاسدہ کی طرف صرف اشارہ ہے۔ البتہ حضرت عمرؓ سے اس پر واضح نکیر مروی ہے۔ کہ انہوں

نے اپنے ایک بیٹے کو اس پر سزا بھی دی تھی جس کی کنیت ابوعیسیٰ تھی۔ اور مغیرۃ بن شعبہؓ کی کنیت تبدیل کر کے ابوعبداللہ رکھ دی تھی۔

بہر حال روایات پر نظر غائر کرنے کے بعد اس کنیت کے استعمال کی ممانعت کی دلیل غیر مضبوط نظر آتی ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے امام ترمذیؒ نے اس کنیت کو استعمال فرمایا ہے۔

<u>آپؒ کی نسبتیں:</u> بنی سلم قبیلہ کی طرف نسبت کی وجہ سے آپ کو سُلمی کہا جاتا ہے۔ ضریر آپ کو اس لئے کہتے ہیں کہ بعض مؤرخین کے نزدیک آپ مادرزاد اندھے تھے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

صحیح یہ ہے کہ غلبۂ خوف الٰہی کی وجہ سے آپ اکثر رویا کرتے تھے جس کی وجہ سے آپؒ کی بینائی جاتی رہی۔ جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ بستان المحدثین میں لکھتے ہیں کہ "بخوف الٰہی بسیار گریہ وزاری کردو نابینا شد" یہی بات علامہ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں بھی لکھی ہے اور امام حاکمؒ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔

<u>بوغی:</u> بوغ کی طرف نسبت ہے۔ جو ترمذ سے ۱۸ میل کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے۔ جب کہ ترمذ دریائے آمو کے کنارے ایک شہر اور بوغ کیلئے مرکز ہے۔ اس لئے ترمذ کی طرف بھی آپؒ کی نسبت کی جاتی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ ترمذی کے حوالے سے تین محدثین مشہور ہیں۔

(۱) ابوالحسن احمد بن الحسن الترمذیؒ جو ترمذی کبیر کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ابوعیسیٰ ترمذی اور امام بخاری کے شیوخ میں سے ہیں اور امام محمدؒ اور امام احمدؒ کے شاگرد ہیں۔ فقہ علل اور رجال کے بہت ماہر ہیں۔ ۲۴۰ھ کے بعد وفات پائی ہے۔

(۲) ابوعبداللہ محمد بن علی بن الحسین الترمذیؒ الزاہد یہ حکیم الترمذی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ اپنی کتاب نوادر الاصول سے مشہور ہوئے ہیں۔ یہ سلوک اور طریقت میں زیادہ محو تھے۔ حتیٰ کہ بعض تفردات کی وجہ سے ترمذ سے جلاوطن کئے گئے تھے۔ ۲۸۵ھ تک زندہ تھے۔

(۳) محمد بن عیسیٰ ابوعیسیٰ الترمذیؒ یعنی ہمارے امام ترمذی یہ عمر میں سب سے چھوٹے ہیں۔ ۲۰۹ھ

میں بوغ میں ان کی ولادت ہوئی۔اور سوموار ۳ر رجب ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔

علامہ کاشمیریؒ فرماتے ہیں ؎

الترمذی محمد ذوزین عطر وفات عمرہ فی عین

<u>تحصیل علم:</u> آپؒ نے تحصیل علم میں بہت سے علاقوں کے سفر کئے۔خراساں،عراق اور حجاز کے متعدد شہروں میں سینکڑوں شیوخ سے استفادہ کیا۔ بخاری کے شاگرد ہیں۔ جامع ترمذی میں اسماء رجال اور نقد حدیث میں ان سے اپنے استفادے کو بار بار بیان کرنے کے علاوہ ان سے دو روایتیں بھی نقل کی ہیں۔امام مسلمؒ سے بھی ایک روایت جامع ترمذی میں روایت کی ہے۔ نیز بہت سے اساتذہ میں وہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے شریک بھی ہیں۔

<u>مسلک:</u> علامہ شاہ انور شاہ کاشمیریؒ نے فیض الباری ج۱ص۵۸ میں امام ترمذی کو شافعی المسلک قرار دیا ہے۔اسی طرح عرف شذی میں بھی آپ کا یہ قول منقول ہے۔حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ان کو مجتہد منتسب الیٰ احمد و اسحٰق بتایا ہے۔لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ امام ترمذی کسی بھی امام کے مقلد محض نہیں ہیں۔اگر چہ اکثر و بیشتر وہ امام شافعی کے مسلک کے موافق ہوئے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے ان کو اہل حدیث میں سے شمار کیا ہے۔یعنی نہ تو وہ مجتہد مطلق ہیں نہ مقلد محض (۱)۔

<u>مناقب:</u> امام ترمذیؒ حدیث کے بڑے امام ہیں۔لیکن ابن حزم اندلسیؒ نے ایک عجیب بات لکھی ہے۔ وہ یہ کہ ''محمد بن عیسیٰ ترمذی مجہول ہیں''ابن حزمؒ کے اس قول کے بارے میں بعض لوگوں نے توجیہات کی ہیں۔ چنانچہ علامہ ذھبیؒ میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں۔ کہ ابن حزمؒ نے اپنی کتاب میں ترمذی کو اس لئے مجہول کہا ہے کہ ان کو ترمذی کی جامع اور کتاب العلل نہیں پہنچی (۲)۔

اسی طرح سیر النبلاء میں ابن حزم کچھ مناقب اور کچھ عیوب بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

---

(۱)راجع توجیہ النظر الی اصول الاثر ص۱۸۵

(۲)میزان ج۲ص۲۸۹

(۳)سیر النبلآء جلد۱۸ ص۲۰۱

"ماذکر سنن ابن ماجة ولا جامع ابی عیسیٰ الترمذی فأنّه مارء اھماو لاادخلاالی الاندلس الابعدموته(۳)"

لیکن ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یہ بات کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ ابن حزمؒ نے شاید امام ترمذی کو نہیں پہچانا تھا۔اوران کے حافظہ اور تصانیف کاان کو علم نہیں تھا۔یہ اس لئے کہ ابن حزم نے یہ عبارۃ دوسرے مشہور ثقہ حفاظ کے بارے میں بھی لکھی ہے۔مثلاً ابی القاسم بغویؒ،اسماعیل ابن محمد صفارؒ اور ابوالعباس الاصمؒ وغیرہ کو بھی مجہول کہا ہے۔خصوصاً جب حافظ فرضی نے ترمذیؒ کا ذکر اپنی کتاب المؤتلف والمختلف میں قدرومنزلت کے ساتھ کیا ہے تو کیسے ابن حزمؒ امام ترمذیؒ کو نہ پہچان سکا(۱)۔

حق یہ ہے کہ ابن حزمؒ رجال کے سلسلے میں انتہائی متشدد ہیں۔مشہور ہے کہ **قلم ابن حزم کسیف حجاج** یعنی حجاج کی تلوار کی طرح ان کے قلم سے بھی کوئی نہ بچ سکا۔

بہرحال امام ترمذیؒ جلیل القدر امام ہیں۔عمر بن علک کا بیان ہے کہ بخاری نے مرتے مرتے سارے خراسان میں ترمذی جیسا شخص علم وورع اور زہد میں نہیں چھوڑا۔

حافظہ: ان کا حافظہ ضرب المثل تھا۔احمد بن عبداللہ بن داؤدؒ خود امام ترمذیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ایک شیخ کی حدیثوں کے دوجزء(رسالے) لکھے تھے۔ایک دفعہ مکہ جاتے ہوئے اس شیخ سے ملاقات کا موقع ملا۔میں نے ان کے بارے میں لوگوں سے پوچھا۔بتایا گیا کہ وہی شیخ ہیں۔ میں وہی دوجزء سننے کے لئے ان کے پاس حاضر ہوا۔میرا خیال تھا کہ لکھے ہوئے جزء میں اپنے ساتھ اٹھالایا ہوں۔لیکن غلطی سے میں ان جزوؤں کے مشابہ دوسرے سفید جزء کو ساتھ لایا تھا۔ملنے کے بعد میں نے وہ دوجزء سنانے کی درخواست کی۔تو وہ اپنے حافظہ سے وہی احادیث سنانے لگے۔اور میں خالی صفحے سامنے رکھ کر سنتا رہا۔تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا تو سفید کاغذ پر نظر پڑھتے ہی غصہ ہوکر بولا کہ تمہیں مجھ سے شرم نہیں آتی؟۔۔۔ میں نے سارا واقعہ سنادیا۔اور کہا کہ آپ کی ساری احادیث میں یاد کر چکا ہوں۔وہ بولے کہ پڑھو اور میں نے احادیث سنادیں۔اس نے کہا کہ میرے پاس آنے سے پہلے تو یہ احادیث تجھ کو یاد نہ تھیں۔میں نے کہا

---

(۱) تہذیب التہذیب ج۹ص۳۸۸

نہیں۔ پھر اس نے کہا کہ چلو تم کو اور احادیث سنا دوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نادر وغریب احادیث میں سے چالیس احادیث سنا دیں۔ جب بعد میں میں نے اسی طرح دھرا دیں۔ تو وہ بولے مارأیت مثلک(۱)۔

امام ترمذیؒ خود نقل کرتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے مجھ سے کہا ''میں نے تجھ سے جتنا نفع حاصل کیا اتنا تم نے مجھ سے حاصل نہیں کیا''

علامہ کاشمیریؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک کامل استاذ کو ایک کامل شاگرد کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ وہ اس کے علوم وفیوض کی اشاعت کرے۔ یہی امام بخاریؒ کا اس مقام پر مقصد تھا۔

<u>کتب:</u> آپؒ کی عظمت کا اندازہ آپؒ کی تصنیفات سے بخوبی ہوتا ہے۔ جو آپؒ کے کثرت علم، تاریخ دانی، اسماء رجال اور علل الاحادیث کی معرفت، فقہی مہارت اور طلب حدیث میں جہاں نوردی کی واضح دلیل ہیں۔ سب سے زیادہ جامع اور مفید ترین کتاب ''جامع ترمذی'' ہے۔ اس طرح کتاب ''العلل الکبیر'' اور ''کتاب العلل الصغیر'' کی افادیت بیان سے مستغنی ہے۔ شمائل ترمذی میں آپ نے جس نہج سے سیرت وصورت نبوی ﷺ کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اصحاب صحاح ستہ میں علو سند کے لحاظ سے امام ترمذیؒ کا بڑا مقام ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے کل بائیس ثلاثی احادیث ذکر کی ہیں۔ جبکہ امام ترمذیؒ نے جامع کی کتاب الفتن میں ایک ثلاثی حدیث روایت کی ہے۔ البتہ ابن ماجہؒ کی کتاب میں صحیح بخاری سے بھی زیادہ ثلاثی احادیث موجود ہیں۔

لیکن صحت کے لحاظ سے امام ابن ماجہؒ کی کتاب آخری مرتبہ میں ہے۔ جبکہ صحیح مسلم، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی ثلاثیات سے خالی ہیں۔

<u>امر دوم: کتاب شمائل ترمذیؒ:</u> امام ترمذیؒ نے کتاب شمائل ترمذی لکھی ہے۔ جو اپنے طرز پر مضمون کے لحاظ سے بے مثال کتاب ہے۔ اگرچہ آپ کی تقلید میں دیگر محدثین نے بھی اس موضوع کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت دیکر تالیفات کیں۔ لیکن ''الفضل للمتقدم'' کے تحت اس موضوع پر پہلی تالیف آپ کی ہے یہ ایک واضح اور مسلّمہ حقیقت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ سراپا نور وہدایت ہے۔

---

(۱) تھذیب التھذیب ج۹ ص۳۸۸

دوست، دشمن، مؤمن، کافر آپ کے کردار کی عظمت اور لاثانی دیانت وامانت کے قائل رہے۔نبوت سے پہلے کی زندگی اتنی بے داغ رہی کہ رب ذوالجلال نے اسے نبوت کی دلیل کےطور پر پیش کیا۔فرمایا

لقدلبثت فیکم عمراً من قبله أفلاتعقلون(سورۃ یونس)

یعنی دعویٰ نبوت سے پہلےتمہارے درمیان میں نے چالیس برس گزارے۔تم ہی لوگوں نے مجھے صادق وامین مانا۔تم ہی نے مجھے دیانت، عبادت، اخلاق عالیہ، عصمت کاملہ کا مرقع گردانا۔انسانیت کے سب سے بلند مقام پر ہوتے ہوئے کیا یہ ممکن ہے کہ اچانک چالیس سال بعد خداوندکریم پر جھوٹ بولنے کا عظیم ترین جرم سرزد ہوجائے۔کردار کی یہ بلندی آج بھی اطاعت کی متقاضی ہے۔

ایک غیر مسلم بادشاہ ہرقل نے بھی ابوسفیانؓ سے انٹرویو کے دوران یہی سوال کیا تھا کہ **فهل کنتم تتهمونه بالکذب قبل ان یقول ماقال**،نبوت کے دعویٰ سے قبل کیا تم لوگ اس نبی پر کبھی جھوٹ بولنے کی تہمت لگانے کے روادار ہوئے؟

ابوسفیان نے جواب دیا نہیں۔ہرقل رومی نے بالآخر فیصلہ سناتے ہوئے یہی کہا۔کہ **فقداعرف انّه لم یکن لیذرالکذب علی الناس ویکذب علی اللّٰه** ۔مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ شخص لوگوں میں تو جھوٹ بولنے سے بچتا رہےاور جا کر خدا پر جھوٹ باندھنے لگے(۱)۔

اخلاق ودیانت کی عظمت کے ساتھ ساتھ نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس حسن وجمال اور مادی وصوری کمالات کا بھی مرقع تھی۔جس کا مکمل تذکرہ کتاب میں آئیگا۔

حسن صورت بھی مقبولیت اور تقلید واطاعت کا فطری سبب ہے۔اسی وجہ سے عقل وخرد اور علم ودانش کے ساتھ ساتھ سفارت کیلئے ایسے لوگوں کا عادتاً انتخاب کیا جاتا ہے جو ظاہری تقدس، وقار اور محاسن کا حامل ہو۔جس کا مشاہدہ روزمرہ کی زندگی میں کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ کے ظاہری وباطنی محاسن کو اجاگر کرنا اشاعت دین اور ہدایت عالم کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔اور گویا امام ترمذیؒ نے اس موضوع پر مستقل کتاب لکھنے میں سبقت حاصل

(۱)بخاری ج۱ص۴ کتاب الایمان

کرتے ہوئے مضمون اور طرز کے لحاظ سے بے نظیر کتاب شمائل ترمذی تالیف فرمائی ہے۔ پھر اگر امام ترمذیؒ نے اپنی جامع ترمذی کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ **من کان فی بیتہٖ ھذا الکتاب فکانّما فی بیتہٖ نبی یتکلم**

جس کے گھر میں جامع ترمذی ہو تو گویا اس کے گھر میں بولتا ہوا نبی موجود ہے۔ تو یہ کہنا بھی بالکل بے جا نہ ہوگا۔ کہ جس کے پاس شمائل ترمذی موجود ہو تو گویا اس کے سامنے نور افشاں پیغمبر موجود ہے۔

ـ **اهل الحديث هم اهل النبی وان لم يصحبو انفسه انفاسه صحبوا**

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

ومن احسن ماصنّف فی شمائلہٖ وأخلاقہٖ ﷺ کتاب الترمذی المختصر الجامع فی سیرہ علی الوجه الاتم بحيث انّ مطالعة هذاالكتاب كأنّه يطالع طلعة ذالک الجناب ويری محاسنه الشريفة فی کل باب(۱).

نبی کریم ﷺ کے اخلاق و شمائل میں امام ترمذیؒ کی مختصر مگر سیرت طیبہ میں جامع و کامل کتاب سب سے اچھی کتاب ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والا گویا جناب عالی کا خود مطالعہ کرتا ہے اور ہر باب میں محاسن شریفہ خود دیکھ رہا ہے۔

صاحب تحفۃ الاحوذی لکھتے ہیں:

ومنهاشمائل النبیّ ﷺ وهوأحسن الكتب المؤلفة فی هذاالباب كثير اليمن والبركات وقال الشيخ عبدالحقؒ فی اشعّة اللمعات ''وخواندن آں برائے مہمات مجرب اکابر است(۲)۔

امام ترمذیؒ کی تصانیف میں سے شمائل النبی ﷺ ہے۔ جو اس باب میں سب سے اچھی کتاب ہے۔ اور بہت سے برکات کا حامل ہے۔ شیخ عبدالحقؒ اشعۃ اللمعات میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا پڑھنا اکابر کے ہاں اہم حوائج میں مجرب ہے۔

---

(۱) جمع الوسائل (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی

عشاق ایسی کتاب پا کر بقول کسے یہ کہہ کر بھی تسکین خاطر کر لیتے ہیں ؎

یاعین ان بُعد الحبیب و دار ہ | ونأت مرابعہ وشط مزارہ
فلقدظفرت من الحبیب بطائل | ان لم تریہ فھذہٖ آثارہٖ

یعنی اے میری آنکھ! اگر محبوب دور ہے، اس کا گھر دور ہے، مسکن دور ہے، ملاقات متعذر ہے۔ پھر بھی محبوب سے استفادے تک تجھے رسائی حاصل ہے۔ اگر تو اس کو نہیں دیکھ سکتا تو یہ اس کے نشانات ہیں (اس سے تسکین حاصل کر لے)

انہی جذبات کے تحت بندہ کو بھی یہ خیال آیا کہ حسن دو عالم کا ذکر بھی تو ایک لذت ہے۔ کم از کم میرے ان نقوش کو بھی اس حسن کی وجہ سے استحسان کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ ؎

ماان مدحت محمداً بمقالتی | ولکن مدحتُ مقالتی بمحمدٖ

اس مقصد کیلئے شیخنا حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم کے درس کا انتخاب کیا۔ اور اس کو حتی الوسع اپنی تعبیر کا رنگ دے کر قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ میں اس خدمت میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑ رہا ہوں۔ میں اپنی جہالت اور وفور معاصی پر نظر کر کے کبھی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے علاوہ کوئی بھی اس کام کو مجھ سے بہتر نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر میرے احباب میری کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے مجھے تنبیہ کر لیں۔ تو منت شناسی اور امتنان وتشکر میں بندہ کو کسی سے کم نہیں پائیں گے۔

<u>امر سوم: شرح کیلئے نام کا انتخاب:</u> صحیح بخاری کے درس کے لئے فتح الباری کا مطالعہ کر رہا تھا کہ حبیبۃ حبیب اللہ سیدۃ عائشہؓ کے بارے میں حضرت حسان بن ثابتؓ کی زبان سے نکلا ہوا الہامی قصیدہ سامنے آیا۔ جس میں انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے۔

عقیلۃُ حیٍّ من لؤیّ بن غالب | کرام المساعی مجدھم غیرزائل
مھذبۃ قدطیب اللّٰہ خیمھا | وطھّرھامن کل سوء وباطل
فان کنت قدقلت الذی زعموالکم | فلارفعت سوطی الیّ اناملٖ

فکیف وودّی ماحییت ونصرتی لآل رسول اللّٰہ زین المحافل(۱)

اچانک اس وقت یہ سوچ آئی کہ اصل "**زین المحافل**" تو نبی کریم ﷺ ہیں۔ انہی کی وجہ سے آل رسول ﷺ کی مجلسیں حسین ہونے لگی تھیں۔ اور ساتھ ہی زیر ترتیب شرح کا بھی دھیان آیا۔ نام پسند آ گیا۔ بعد میں حضرت الشیخ مدظلہم نے فون پر نام کے بارے میں دریافت فرمایا تو بندہ نے تجویز سامنے رکھ دی۔ اور ان کو بھی پسند آ گئی۔

<u>امر چہارم: التزامات:</u> اس شرح کی تکمیل میں بندہ نے جن امور کو بالخصوص مدنظر رکھا وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اس شرح کی اساس چونکہ حضرت شیخ مدظلہ کی درس تھی۔ لہٰذا اصل مضمون میں تغیر بہت ہی کم کرنا پڑا۔

(۲) شرح کی زبان کو عامیانہ رکھنے کی بجائے تعلیمی زبان اور تدریسی اصطلاحات کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس لئے کہ یہ صورۃ علماء اور طلباء کے لئے خصوصی افادیت کی حامل ہے۔ پھر بھی اہم مقامات پر مناسب تفصیل کے ذریعے عوامی استفادے کو ممکن بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۳) لغوی اور فنی تشریحات میں مبتدئین کی بجائے منتہی طلبہ کی رعایت کی گئی ہے۔ اس لئے طول سے بچنے کی خاطر عام، صرفی، نحوی اور لغوی تحقیقات کو محدود کر دیا گیا ہے۔

(۴) شرح میں بیان کی گئی بعض احادیث اور آیات کی حتی الوسع تخریج کر دی گئی ہے۔

(۵) متداول شروح اور اکابر کی تحقیقات سے مراجعت کے بعد بعض مقامات میں مفید اضافے کرنے پڑے جو اگرچہ کم ہیں لیکن انتہائی ضروری تھے۔ اہل علم کو پتہ ہے کہ کوئی بھی شرح اس عمل سے مستغنی نہیں ہے۔

(۶) تقریباً ہر باب کے خاتمے پر خلاصۂ باب کے عنوان سے ایک خلاصہ تحریر کیا گیا ہے۔ تاکہ باب کا اندازہ لگ سکے۔ میرا خیال ہے کہ کسی باب کو پڑھنے سے پہلے خلاصۂ باب کو پڑھا جائے تو سارے باب کے سمجھنے میں بہت معاون ہوگا۔

---

(۱) فتح الباری ج ۸ ص ۶۲۳

(۷) ہر حدیث کے راوی کے حالات کو بقدر ضرورت تحریر کیا گیا ہے۔لیکن تکرار سے بچنے کی خاطر صرف اس حدیث کے ضمن یہ حالات تحریر کئے گئے ہیں جو شمائل ترمذی میں اس کی پہلی حدیث ہو۔سہولت کے لئے مذکورہ راویوں کے ناموں کی فہرست حروف تہجی کے لحاظ سے آخر میں شامل کی گئی ہے تا کہ جس راوی کے حالات معلوم کرنے ہوں ان سے مروی پہلی حدیث کی نشاندہی ہو جائے۔

(۸) ابتداء میں علم حدیث اور کتاب کے تعارف کے طور پر ایک مفید مقدمہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

(۹) کسی حدیث میں اشکال کی توجیہ میں مختلف آراء کو بسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔توجیہات میں ترجیح بھی بعض مقامات پر ظاہر کی گئی ہے۔

(۱۰) نسخوں میں اختلاف کے وقت جامع ترمذی شریف کے ساتھ مطبوعہ نسخے کا خیال رکھا گیا ہے۔ کیونکہ طلبہ کو عموماً یہی نسخہ میسر ہوتا ہے۔البتہ بعض مقامات پر دوسرے نسخوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

<u>وجہ ضبط و ترتیب:</u> یہ شوال ۱۴۰۰ھ مطابق اگست 1980ء کی بات ہے۔ جب راقم الحروف پہلے پہلے دارالعلوم حقانیہ میں ایک متعلم کی حیثیت سے داخل ہوا۔تمام اساتذہ محاسن و کمالات کے خزانے تھے۔ بندہ حسب عادت اساتذہ کے قرب کو درس پر بھی مقدم سمجھتا تھا۔البتہ حضرت الشیخ مولانا سمیع الحق صاحب سے ذرا بعد تھا۔خیال تھا کہ عام صاحبزادوں کی طرح ان میں بھی نزاکت یا تعلّی قسم کی کوئی خوبی ہوگی اور ایسے شخص کے ساتھ تادیر نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر ان کے ساتھ پہلے سال تعلّم کا رشتہ بھی نہیں تھا۔

جلد ہی مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کے ساتھ تعلقات استوار ہو گئے۔ جو خود مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ان دنوں موصوف حضرت مولانا سمیع الحق کے قائم کردہ ادارہ مؤتمر المصنفین میں ان کے زیر نگرانی مراحل تحریر و تصنیف طے کرنے میں منہمک تھے۔ان کی شہہ پر راقم الحروف نے بھی کچھ مضامین لکھے۔جن میں سے ایک کو ''الحق'' میں بھی جگہ دی گئی۔اور وہیں سے حضرت الاستاذ کی نظر التفات کو راہ ملی۔ چنانچہ ان کے حکم کے مطابق ان کے دفتر میں گاہے گاہے حاضری ہوتی تھی۔دل موہ لینے والی شفقت و محبت ملتی۔اور جلد ہی حضرت کے بارے میں سوء الظن کافور ہو گیا۔ بلکہ اپنی طرف سے خود ساختہ تکلف کو بے تکلفی میں بدلنا پڑا۔اور پھر ان کے تلمذ کا انتظار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ دورۂ حدیث کے سال یہ

تمنا پوری ہوگئی۔حضرت کے پاس شمائل ترمذی کے علاوہ بخاری ج ۲ اور ترمذی ج ۲ کے بعض اجزاء تھے۔

راقم الحروف کی ایک عادت تھی کہ مشکل کتابوں میں ہر استاد کے درس کے دوران ان کے فرمودات تحریری طور پر ضبط کرتا تھا۔اس عمل سے اساتذہ کے ارشادات کی حفاظت کے علاوہ میں نے ایک بڑا فائدہ یہ بھی پایا تھا۔کہ دھیان درس پر مرکوز رہتا تھا۔اور دوران درس ادھر ادھر التفات سے محفوظ رہتا تھا۔ نیز بعد میں دوران تکرار طلبہ کے استفسارات کے لئے بھی راقم الحروف کے پاس مرجع موجود ہوتا تھا۔ چنانچہ تعلّم کے آخری چھ سالوں میں بندہ نے اس کا التزام کیا۔ دورۂ حدیث میں بھی بندہ اساتذہ کے افادات تحریر کرتا رہا۔

مولانا نے جب میرے شغف کو دیکھا تو حکم دیا کہ لکھنے کی بجائے میرے درس کو ٹیپ کے ذریعے محفوظ کرنا اور پھر کمرے میں جا کر آرام سے لکھنا چونکہ پہلے سے حضرت اقدس شیخ الحدیثؒ کے درس کو ریکارڈ کرنے کی ذمہ داری بھی مولانا نے بندہ پر ڈال دی تھی۔اس لئے مولانا نے حکم دیا کہ درس میں لکھنے کے بجائے ریکارڈنگ کرتے رہنا۔ مجھے فکر ہوئی کہ اتنے کیسٹ کہاں سے لاؤں۔لیکن دوسرے روز حضرت نے نئے کیسٹوں کا پورا پیکٹ بھجوادیا۔درس کی ریکارڈنگ تو ہوگئی مگر اسے کاغذ پر منتقل کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔

فراغت کے بعد تدریسی مشاغل کی وجہ سے اس کام پر توجہ نہ دے سکا۔تا آنکہ فراغت کے پانچ سال بعد احباب نے فرمائش کی کہ شمائل ترمذی کو نقل کردوں۔چنانچہ عاریتاً ٹیپ ریکارڈر حاصل کرکے اسے کاغذ پر منتقل کردیا۔اور جب مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔تو انہوں نے مولانا عبدالقیوم حقانی کو تبییض کی ذمہ داری سپرد کی۔مگران کے دیگر مصروفیات کی وجہ سے کام میں تاخیر ہوئی۔اور حضرت نے کچھ عرصہ بعد مسودہ بھیج کر بندہ کو ہی تبییض کا حکم دیا۔

راقم میں ان دنوں اتنی خوداعتمادی نہ تھی۔لہٰذا دو ڈھائی باب کرنے کے بعد ہمت جواب دے گئی۔اور آٹھ سال تک یہ سلسلہ ٹھپ ہوکر رہا گیا۔غالباً ۱۴۱۸ھ یعنی 1998ء کی بات ہے۔ایک ملاقات میں مولانا نے اس کام کے بارہ میں دریافت کیا۔چونکہ ان دنوں خود بندہ پر شمائل ترمذی، مسلم شریف اور ترمذی ج ۲ پڑھانے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی۔لہٰذا پھر ایک داعیہ پیدا ہوگیا۔اور تقریباً تین چوتھائی مسودہ

صاف کردیا۔ دیگر شروح سے تطبیق، اجمال کی ضروری تفصیل اور غیر ضروری تفصیل کی قدرے اجمال کے بعد حضرت کی خدمت میں پیش کردیا۔ تاکہ وہ نظر ثانی فرمائیں۔ تب تک میں باقی حصہ کی تبییض کرلوں۔

شومیٔ قسمت سے ملکی اور جماعتی، سیاست اور سینٹ میں ان کے پیش کردہ شریعت بل کا معرکہ اتنا گرم ہوا کہ مولانا کی مصروفیات ان دنوں اتنی بڑھیں کہ مسودہ ویسے کا ویسے پڑا رہا۔ ادھر مجھے خیال آیا کہ حضرت کو میرا کیا ہوا کام پسند نہیں آیا۔ اس لئے مزید کا تقاضا نہیں کررہے۔ چنانچہ جذبہ ماند پڑ گیا۔ مگر ۱۴۲۵ھ کے اوائل میں حضرت نے حکم دیا کہ بقیہ حصہ بھی مکمل کرلوں۔ اور معاون خاص جناب مولانا مفتی مختار اللہ حقانی کو حکم دیا کہ اصلاح الدین سے یہ کام مکمل کروانا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ انہوں نے بار بار یاددہانی کروائی اور اس ہیچمدان نے اپنے شکستہ الفاظ میں حضرت کی خواہش کی تکمیل کی۔

اہل فن جانتے ہیں کہ کسی دوسرے شخص کی ترجمانی کا حق ادا کرنا مشکل کام ہے۔ اور پھر ایسے شخص کی ترجمانی جو خود جوامع الکلم کی ترجمانی کررہا ہو، مشکل تر ہوجاتا ہے۔ اور اگرچہ ایک استاد اور شاگرد کے درمیان جو نسبت ہوتی ہے وہ شاگرد کیلئے کافی حد تک استاد کے مافی الضمیر تک رسائی میں معاون ہوتی ہے۔ اور مطالب کے ادراک کو آسان بنادیتی ہے۔ مگر اس میں شاگرد کے استعداد کو کلیدی مقام حاصل ہے۔ اور راقم الحروف کو اعتراف ہے کہ اساتذہ کے حسن ظن اور ان کی بے انتہاء شفقت کے باوصف ان سے علمی اکتساب کے بجائے ان کے ساتھ عقیدت و محبت کے تعلق کیلئے زیادہ کوشاں رہتا تھا۔ اس لئے کام کی عظمت اور اپنی بے مائیگی کو دیکھ کر یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ حضرت الشیخ کے مطالب کی ترجمانی میں قصور ضرور ہوگا۔ بلکہ بندہ کی تحریر شمائل ترمذی اور پھر حضرت الشیخ کی تشریحات کی اشاعت کے عظیم کام کو داغدار بنانے کے مترادف ہے۔ لیکن حضرت کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا بھی قرین قیاس نہیں تھا۔

لہٰذا ان کے حکم کے بعد یہ جرأت کرنی پڑی۔ اگر میری اس کوشش کو اللہ رب العزت، حضرت الاستاد مدظلہم اور دیگر علماء وطلباء کے ہاں قبولیت ملی۔ تو یہ میرے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ اور اللہ تعالیٰ کا خصوصی احسان ہوگا۔ اور اگر اسے قابل التفات نہ سمجھا گیا تو اس کی ساری ذمہ داری بندہ پر ہوگی۔ اور اس عظیم کام کو ضائع کرنے پر اللہ تعالیٰ سے، حضرت الشیخ سے اور پھر علماء وطلباء سے معافی کا خواستگار ہوں۔

اگر حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کی خصوصی دعاؤں اور حضرت الاستاذ مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہم کی بھرپور توجہات کے طفیل اللہ تعالیٰ نے اس کاوش کو قبولیت عطا فرمائی۔تب بھی اہل قلم کے تجربات کے مطابق اس کام میں کوتاہیاں اور غلطیاں دیکھنے کو ملیں گی۔ایسے میں اہل علم سے التماس ہے کہ دوران مطالعہ میری جس بھول چوک پر مطلع ہوں تو حتی الوسع بندہ کو اطلاع دینے کی سعی فرمائیں تاکہ آئندہ اس کی اصلاح کی جاسکے۔شاید آپ کی ادنیٰ توجہ ایک تباہ حال عاصی کو تباہی سے بچا سکے۔

خادم الطلباء والعلماء

اصلاح الدین حقانی

۱۲رشوال المکرّم ۱۴۲۷ھ خادم الحدیث دارالعلوم اسلامیہ لکی مروت

از مولانا مفتی مختار اللہ حقانی
مفتی واستاذ شعبہ تخصص فی الفقہ والافتاء

پیش لفظ

الحمدللّٰہ و کفیٰ و الصلوٰۃ و السلام علی خیر الخلائق و الانبیاء، أمّابعد

جب سے بنی نوع انسان کا سلسلہ شروع ہوا ہے اسی روز سے اللہ تعالیٰ نے بے راہ انسانوں کی ہدایت اوران کوراہ راست پر لانے کیلئے انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ شروع کیا۔اوراس کی آخری کڑی نبی آخرالزمان سرداردوعالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی امتیازی شان: اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کوایک امتیازی شان کیساتھ مبعوث فرمایا اورآپ ﷺ کی ذات اقدس میں تمام انبیاء کرام کے مکارم اخلاق ودیعت رکھا گیا۔اورعملی نمونہ آنحضرت ﷺ نے امت کے سامنے پیش کیا۔

کسی نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ آپ ﷺ کے اخلاق کیا تھےتو آپؓ نے فرمایا کہ کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟ تو سائل نے عرض کیاہاں پڑھا ہے۔تو آپؓ نے فرمایا **کان خلقہ القرآن** یعنی آپ ﷺ کے اخلاق قرآن پاک کی عملی تصویر تھے۔اس لئے قرآن کریم نے آپ ﷺ کے اس عملی نمونہ اورحسن کرداراورعمدہ اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے **وإنّک لعلیٰ خلق عظیم(القلم)** بیشک آپ عظیم اخلاق کے حامل ہیں۔اوراسی کوتمام انسانیت کے لئے بلاامتیاز رنگ ونسل اسوۂ حسنہ قراردیا۔ **لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ ﷺ اسوۃ حسنۃ(الاحزاب)** یقیناً تمہارے لئے آپ ﷺ کی ذات اقدس میں عمدہ نمونہ موجود ہے۔اوریہی رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہے **إنّما بعثت لاتمّم مکارم الاخلاق(مشکوٰۃ)** کہ بیشک میں اسلئے بھیجا گیاہوں تا کہ دنیامیں عمدہ اخلاق کی تکمیل کروں۔پھرساری عمراسی صفت کے ساتھ دنیامیں رہےاوراسی سیرت طیبہ کیساتھ اپنی ذمہ داری پوری فرماتے رہے۔آنحضرت ﷺ کے اس حسن کرداراوراعلیٰ اخلاق وعادات کی تعریف نہ صرف قرآن کریم اوراپنوں نے کی بلکہ غیروں کی زبانی بھی ستائش وتحسین کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری رہا ہے۔

آنحضرت ﷺ غیر مسلموں کی نظر میں: چنانچہ جنیوا یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر ایڈورڈ موئٹ لکھتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کو اصلاح اخلاق اور سوسائٹی کے متعلق جو کامیابی ہوئی اس کے اعتبار سے آپ ﷺ کو انسانیت کا محسن اعظم یقین کرنا پڑتا ہے۔ (مقدمات تاریخ ہند ۲/۳۴۰)

پیشوائے اعظم بدھ مذہب: مانگ نونگ نے کہا ہے کہ: حضرت محمد ﷺ کا ظہور بنی نوع انسان پر خدا کی ایک رحمت تھی لوگ کتنا ہی انکار کریں مگر آپ ﷺ کی اصلاحات عظیمہ سے چشم پوشی ممکن نہیں۔ ہم بدھی لوگ حضرت محمد ﷺ سے محبت کرتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔

(معجزات اسلام ٦٦ بحوالہ نقوش نمبر ۴/۴٦۲)

ماسٹر تارا سنگھ پریذیڈنٹ سکھ لیگ: جب کوئی مجھ سے یہ کہتا ہے کہ محمد ﷺ نے تلوار کے زور سے اپنا مذہب پھیلایا تھا تو مجھے اس شخص کی کم فہمی پر ہنسی آتی ہے۔

(اخبار، الامان، دھلی ۱۷ر جولائی ۱۹۳۲ء بحوالہ نقوش نمبر ۴/۴٦۲)

لالہ رام لال ورما ایڈیٹر اخبار تیج: جمہوریت، اخوت، مساوات یہ عطیات ہیں جو حضرت محمد ﷺ نے بنی نوع انسان کو عطاء کئے۔ (نقوش نمبر ۴/۴٦۱)

ڈاکٹر جے کارام برھما: حضرت محمد ﷺ نے اخلاق عالیہ کی تلقین ہی نہیں کی بلکہ ان اصولوں پر عمل بھی فرمایا ان کی زندگی ایثار وقربانی کی زندگی تھی۔ (نقوش نمبر ۴/۴۵۹)

گاندھی جی: وہ (رسول اللہ ﷺ) روحانی پیشوا تھے بلکہ ان کی تعلیمات کو سب سے بہترین سمجھتا ہوں کسی روحانی پیشوا نے خدا کی بادشاہت کا پیغام ایسا جامع اور مانع نہیں سنایا جیسا کہ پیغمبر اسلام نے۔

(رسالہ ایمان پٹی ضلع لاہور اگست ۱۹۳٦ء بحوالہ نقوش نمبر ۴/۴۵۷)

ڈاکٹر لین بول: اگر محمد ﷺ نبی نہ تھے تو کوئی نبی دنیا میں برحق آیا ہی نہیں۔ (بحوالہ نقوش نمبر ۴/۴۴۹)

ڈاکٹر اینڈ برنگھم: مجھ کو کسی وقت یہ خیال بھی نہ ہوا کہ اسلام کی ترقی تلوار کی مرہون منت ہے بلکہ اسلام کی کامیابی رسول اللہ ﷺ کی سادہ، بے لوث، ایفائے وعدہ، اصحاب وپیروں کی غیر معمولی حمایت، توکل بخدا اور ذاتی جرأت واستقلال سے وابستہ ہے الخ۔ (بحوالہ نقوش نمبر ۴/۴۴۹)

ڈاکٹر ڈی رائٹ: محمدﷺ اپنی ذات اور قوم کیلئے نہیں بلکہ دنیائے ارضی کیلئے ابر رحمت تھے۔ تاریخ میں کسی ایسے شخص کی مثال موجود نہیں جس نے احکام خداوندی کو اس مستحسن طریقہ سے انجام دیا ہو۔

(اسلامک رویو اینڈ مسلم انڈیا فروری ۱۹۲۰ء بحوالہ نقوش نمبر۴ر۴۴۷)

مسٹر ایڈورڈ موئیٹے: آپﷺ نے سوسائٹی کے تزکیہ اور اعمال کی تطہیر کیلئے جو اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے وہ آپﷺ کو محسن انسانیت کا محسن اول قرار دیتا ہے۔ (نقوش نمبر۴ر۴۴۷) اور اسی طرح بے شمار غیر مسلموں نے آنحضرتﷺ کی حسن سیرت کا اعتراف کیا ہے۔ ادارۂ فروغ اردو لاہور نے نقوش رسول نمبر میں کئی غیر مسلم اہل علم اور سکالروں، سیاسی و غیر سیاسی شخصیات کے تعریفی اقوال کا ذکر کیا ہے یہ کتاب کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ کئی غیر مسلموں نے رسول اللہﷺ کے حسن کردار پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس اسوۂ حسنہ کو اصطلاح میں سنت کہا جاتا ہے۔

سنت کی تعریف: اس لئے کہ علماء امت نے سنت کی جو تعریف کی ہے وہ اس پر صادق ہے۔ علامہ عبدالحئ فرنگی محلیؒ سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں **إنّ السنة تطلق علی قول الرسول وفعله وسكوته وطريقة الصحابة**(ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی) بیشک سنت کا اطلاق آنحضرتﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات پر ہوتا ہے حتی کہ صحابہ کرام کے طریقے کو بھی سنت کہا جاتا ہے۔

سنت کی اقسام: البتہ سنت کی دو قسمیں ہیں (۱) سنت مؤکدہ جسے سنت ھدیٰ بھی کہا جاتا ہے۔ (۲) سنت زوائد جسے سنت غیر مؤکدہ بھی کہا جاتا ہے۔

صاحب شرح الوقایۃ علامہ صدر الشریعۃ عبیداللہ بن مسعودؒ ان دونوں اقسام سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں **قلتُ السنة ما واظب النبیﷺ عليه مع الترک احياناً فان كانت المواظبة المذكورة علی سبيل العبادة فسنن الهدیٰ وان كانت علی سبيل العادة فسنن الزوائد. كلبس الثياب والاكل باليمين وتقديم الرجل اليمنیٰ فی الدخول ونحو ذلک**(شرح الوقایة علی صدر السعایة ۱ / ۱۷۱ تا ۱۷۵) میں کہتا ہوں سنت وہ ہے جس

پر آنحضرت ﷺ نے مواظبت فرمائی ہو لیکن کبھی ترک بھی کیا ہو۔اب اگر یہ مواظبت عبادت کے طریق پر ہو تو سنن الھدیٰ (سنت مؤکدہ) اور اگر مواظبت علی سبیل العادۃ ہو تو سنت زوائد جیسے کپڑے پہننا، دائیں ہاتھ سے کھانا، دایاں پاؤں جوتے میں داخل کرنا وغیرہ۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: مگر سنت زوائد ہونے کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے کہ سنت کے مطابق کھانے، پینے ، اٹھنے، بیٹھنے، گفتگو کرنے وغیرہ کو اگرچہ فی ذات عبادت نہیں کہا جائے گا لیکن ان امور پر عمل کرنا عبادت ضرور ہے۔قاضی عیاض مالکیؒ نے شفاء میں لکھا ہے **اصول مذہبنا ثلاثۃ الاقتداء بالنبی ﷺ فی الاخلاق والافعال والاکل من الحلال واخلاص النیۃ فی جمیع الاعمال** ہمارے مذہب کی تین بنیادیں ہیں (۱) اخلاق واعمال میں نبی پاک ﷺ کی اقتداء کرنا (۲) حلال کھانا (۳) اور تمام اعمال میں اخلاص نیت۔اس عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں ہیں **ای فی جمیع اقوالہ وافعالہ وأحوالہ (بحوالہ شمائل کبریٰ ۱/۳۷)** یعنی آنحضرت ﷺ کے جمیع اقوال، افعال اور احوال میں اقتداء کرنا۔

اور علامہ بدر عالم میرٹھیؒ لکھتے ہیں حالانکہ آپ ﷺ کا ہر قول اور آپ ﷺ کا ہر عمل سب حدیث کا جزو ہے اسی طرح اسوۂ حسنہ صرف عمل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ آپ ﷺ کا قول و فعل جو کچھ بھی ہے وہ سب امت کیلئے نمونہ ہے۔نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی پر موقوف نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات جس طرح اس بارے میں اسوۂ ہے اسی طرح فصل خصومات، امت کے نظم و نسق اور دیگر ضروریات میں بھی اسوۂ ہے حتیٰ کہ خوش طبعی، ہنسی اور مسکراہٹ کے طور و انداز میں بھی، قرآن کریم نے کسی ادنیٰ تفصیل کے بغیر تمام امور میں آپ ﷺ کی ذات کو اسوۂ کہا ہے اور کوئی معمولی سا معمولی اشارہ بھی اس طرح نہیں کیا کہ نماز وروزہ یا عبادات کی تشریح کے سواء بقیہ امور میں آپ کی ذات اسوۂ نہیں ہے (ترجمان السنۃ ۱/۱۶۴)

آپ ﷺ کی اتباع مطلوب ہے: یہی وجہ ہے کہ سنت کی یہ دونوں قسمیں شرعاً مطلوب ہیں۔اور سنت پر عمل ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔**من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ (النساء)** جو شخص آپ ﷺ کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اس نے اللہ کی فرمانبرداری کی ۔اور دوسرے مقام پر

آپ ﷺ کی پیروی کو اللہ کی طرف سے محبت اور بخشش کی نوید قرار دیا گیا۔ قل ان کنتم تحبُّون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ ویغفرلکم ذنوبکم (آل عمران) اے پیغمبر ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تم سے محبت رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کردے گا۔ حدیث پاک میں سنت سے محبت کو جنت میں رسول اللہ ﷺ کی معیت کا سبب کہا گیا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا من احبّ بسنتی فقدأحبّنی ومن احبنی کان معی فی الجنة (مشکوٰة المصابیح ۳۰) جس نے میری سنت سے محبت کی (اس پر عمل کیا) تو اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا من تمسک بسنتی عند فسادأمّتی فله اجر مائة شهيد (مشکوٰة ۳۰) جس نے میری سنت کو فساد امت کے وقت زندہ کیا تو اسے ۱۰۰ شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

گویا دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی و کامرانی کا راز رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کی اتباع میں مضمر ہے۔ اسلئے امام مالکؒ نے فرمایا ہے إنّ السنة مثل سفينة نوح من ركبهانجیٰ ومن تخلف عنها غرق الخ سنت کی مثال حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی ہے جو اس میں سوار ہوا تو کامیاب ہوا اور جو اس سے پیچھے رہا وہ غرق ہوا۔

اور ولی کامل عارف باللہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا ہے اساس الخير متابعة النبی ﷺ فی قوله وفعله کہ تمام خیر اور خوبیوں کی جڑ رسول اللہ ﷺ کے قول و عمل کی اتباع میں ہے۔

اور امام غزالیؒ نے فرمایا ہے اعلم ان مفتاح السعادة اتباع السنة والاقتداء برسول اللّٰہ ﷺ فی جميع مصادره وموارده وحركاته وسكناته حتى فی هيئة اكله وقيامه ونومه وكلامه لست اقول ذلک فی آدابه فی العبادات فقط لاوجه لاهماله السنن الواردة فيها بل ذلک فی جميع امور العادات فبذلک يحصل الاتباع المطلق (اربعین ۵۸) جان لو کہ تمام امور میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع سعادت ہے۔ آنحضرت ﷺ سے صادر

ہونے والے تمام حرکات، سکنات یہاں تک کہ کھانے، پینے، اٹھنے، سونے، باتیں کرنے میں بھی آنحضرت ﷺ کے عادات طیبہ کے چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں اسی لئے میں اسوۂ حسنہ کو صرف عبادت میں منحصر نہیں کرتا بلکہ تمام عادات، احوال میں بھی کمال اتباع اسی سے حاصل ہوگی۔ اور مزید لکھتے ہیں **فعلیک ان تلبس السراویل قاعداً وتتعمّم قائماً وتبدأ بالیمین فی تنعلک وتاکل بیمینک(اربعین ۵۸)** پس تم پر لازم ہے کہ شلوار بیٹھ کر پہنے، عمامہ کھڑے ہو کر باندھے، جوتا اولاً دائیں پاؤں میں پہنیں اور دائیں ہاتھ سے کھائیں۔

<u>رسول اللہ ﷺ نعمت عظمیٰ:</u> اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت اس امت مرحومہ بلکہ تمام عالم پر اللہ تعالیٰ کا ایک بہت ہی بڑا احسان ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کو ایک نعمت عظمیٰ کے طور پر ذکر فرمایا ہے **لقدمنّ اللّٰہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکّیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلٰلٍ مبین(الآیۃ)** ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر احسان عظیم فرمایا ہے کہ اس نے انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات تلاوت کرتا ہے ان کے نفس کی اصلاح کرتا ہے اور انہیں قرآن کریم اور حکمت ودانائی کی تعلیم دیتا ہے جبکہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔

اسلئے رسول اللہ ﷺ کی سنتوں، عادات واطوار اور بودوباش کے طریقوں کو ہلکا نہ سمجھا جائے کیونکہ آپ ﷺ کی سنتوں کو ہلکا سمجھنا فرائض سے محرومی کا ذریعہ ہے۔

علامہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے تفسیر فتح العزیز میں لکھا ہے **من تھاون بالسنۃ عوقب بحرمان الفرائض** جسنے سنت کے ادا کرنے میں سستی کی تو اس کو فرائض سے محرومی کی سزا ملے گی۔

اس لئے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ دونوں قسم کی سنتوں کی اتباع کرنی چاہئے سنت مؤکدہ کا ترک کرنا گمراہی اور ضلالت کا سبب ہے اور سنت زوائد کے ترک کرنے سے کمال ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

علامہ عبدالحیٔ لکھنویؒ نے لکھا ہے **والآیات فی ھذاالباب کثیرۃ والاخبار النبویۃ شھیرۃ کلّھا تدل صراحۃً او اشارۃ علی انّ الأخذ بما التزمہ رسول اللّٰہ ﷺ موجب للھدایۃ**

وخلافه موجب للضلالة واماسنن الزوائدفلمالم یکن ترکھا موجباً للضلالة ولامخلافی اصل الهداية وان لم يحصل كمال الهداية سميت بذلك(السعاية ۱/ ۱۷۳)

اس بابت آیات قرآنی بہت ساری ہیں اوراحادیث نبویہ صلوات اللہ علیہ وسلامہ مشہور ہیں جو تمام کی تمام صراحۃً یا اشارۃً اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جن امور پر رسول اللہ ﷺ نے مواظبۃ فرمائی ہو وہ موجب ہدایت ہیں اوراس کی مخالفت موجب ضلالت ہےاور سنن زوائد اگر چہ ان کا ترک کرنا موجب ضلالت نہیں اور نہ اصل ہدایت میں مخل ہے لیکن اس کے باوجود(ان کے ترک کرنے سے) کمال ہدایت حاصل نہیں ہوگی اسی وجہ سے ان کو سنن زوائد نام رکھا گیا ہے۔اور مزید لکھتے ہیں

والتحقيق انّ الترك ليس بمعتبر لافى السنن الهدىٰ ولافى السنن الزوائد انّما الفرق بينهما بالعبادة والعادة (السعاية ۱/ ۱۷۳) اور تحقیق یہ ہے کہ بیشک سنتیں چاہئے سنن ھدیٰ ہوں یا سنن زوائدان کا ترک کرنا معتبر نہیں ان میں فرق صرف عادت اورعبادت کی وجہ سے ہے۔

<u>بعض سنتیں ترک کرنا موجب ملامت نہیں:</u> مگر یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ جو سنتیں عادیہ ہوں اوران پر آنحضرت ﷺ سے دوام بھی منقول نہ ہوں مثلاً ثرید کھانا، عجوہ کھجور کھانا، جبہ پہننا وغیرہ ان امور میں اتباع موجب اجروثواب ضرور ہےاوران پر عمل کرنے والا عامل بالسنۃ ہوگا لیکن اگر کوئی ان کو بجانہ لائے تو ترک کرنے والے کوتارک السنۃ نہیں کہا جائے گا اور نہ اس پر اس ترک کی کوئی ملامت ہوگی۔اسی طرح جن سنتوں پر آنحضرت ﷺ سے دوام مروی ہو مگر ان میں دوام مطلوب اور مراد نہ ہو بلکہ ماحول ومعاشرہ کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ نے دوام فرمایا ہو جیسے جو کی روٹی کھانا، کھجور کھانا، تہبند باندھنا، خفین استعمال کرنا وغیرہ تو ان سنتوں کے ترک کرنے والوں پر ملامتی یا ارتکاب ترک سنت کا الزام نہ ہوگا۔اگر چہ عمل کرنے میں کمال اتباع اور محبت رسول اللہ ﷺ کی علامت ہے اورآخرت میں رسول خدا ﷺ کی رفاقت،معیت اور شفاعت کا ذریعہ ہے۔

<u>ضعیف حدیث اور رسول اللہ ﷺ:</u> آج کل بعض لوگوں کے دل ودماغ میں یہ بات ہے اوروہ سنت کو سلسلہ رجال کے کسوٹی پر پرکھتے ہیں اگر سلسلہ رجال درست اور محدثین کے پیمانے پر صحیح اترتا ہو تو ٹھیک

ورنہ اس حدیث کوضعیف کہتے ہوئے ترک کرتے ہیں۔اھ

مگر یہ وہم اتباع سنت کے موافق نہیں اس لئے کہ سنت پرعمل کرنے کیلئے یہ ہرگز نہ سوچا جائے کہ یہ روایت ضعیف ہے اور یہ صحیح اس لئے کہ اس ضعف کا تعلق سلسلہ رجال کے ساتھ ہے متن حدیث کے ساتھ نہیں۔اور سلسلہ رجال کا ضعف متن پرمؤثر نہیں ہوتا۔

علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے **اذارأیت حدیثاً باسنادٍ ضعیف فلک ان تقول هو ضعیف بهذاالاسناد ولاتقل ضعیف المتن(قواعدعلوم الحدیث ۵۸، تدریب الراوی)** کہ جب تم کسی حدیث کوسند کے اعتبار سے ضعیف دیکھ لوتو تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ حدیث اس سند کے ساتھ ضعیف ہے لیکن اس کوضعیف المتن نہیں کہہ سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ فضائل اور مندوبات میں فقہاء کرام اور محدثین نے ضعیف احادیث پرعمل کرنے اور اس کوقابل قبول ماننے کی اجازت دی ہے۔

علامہ نوویؒ نے لکھا ہے **قال العلماء من المحدثین والفقهاء وغیرهم یجوزویستحب العمل فی الفضائل والترغیب والترهیب بالحدیث الضعیف مالم یکن موضوعاً(الاذکار ص ۵)** محدثین اور فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ حدیث ضعیف پرعمل کرنا فضائل وترغیب وترھیب میں جائز اور مستحب ہے تاوقتیکہ موضوع نہ ہواور علامہ شبیراحمدعثمانیؒ نے مقدمہ فتح الملہم میں لکھا ہے کہ ارباب حدیث اس امر پرمتفق ہیں کہ فضائل وغیرہ میں حدیث ضعیف پرعمل کرنا درست ہے(فتح الملہم ۵۸/۱)

اور علامہ جلال سیوطیؒ کے ہاں تو ضعیف حدیث بھی احکام میں معمول بہ ہے۔فرماتے ہیں کہ **ویعمل بالضعیف ایضا فی الاحکام اذا کان فیه احتیاط (تدریب الراوی ۱۰۸)** اور ضعیف حدیث پراحکام میں بھی عمل کیا جائے گا جب اس روایت پرعمل کرنے میں احتیاط ہو۔

<u>حدیث ضعیف سے استدلال:</u> علماء احناف کے ہاں تو ضعیف روایت کسی امر کے استحباب کے لئے مفید ہے۔ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں **الا ستحباب یثبت بالضعیف غیر الموضوع(اعلاء السنن ۱۱۰/۱۹)** کہ ضعیف حدیث سے استحباب کا ثبوت ہوسکتا ہے جب وہ روایت موضوع نہ ہواور

یہی بات علامہ عبدالحیؒ نے تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔فالحق فی هذا المقام:أنّه اذا لم يثبت ندب شئی او جوازه بخصوصه بحديث صحيح وورد بذلک حديث ضعيف ليس شديد الضعف يثبت استحبابه وجوازه به بشرط ان يكون مندرجاًتحت اصل شرعی ولا يكون منا قضا للاصول الشرعية والا دلّة الصحيحة(الاجوبة الفاضلة ص ۵۵) کہ جب کسی امر کا استحباب یا جواز کسی صحیح حدیث سے ثابت نہ ہواور اس بارے میں ضعیف روایت وارد ہوتو اگر اسکی ضعف شدید نہ ہوتو اس روایت سے اس امر کا استحباب اور جواز ثابت ہوگا بشرطیکہ وہ کسی اصل شرعی کے تحت واقع ہواور اصول شرعیہ اور ادلۂ صحیحہ سے متصادم نہ ہو۔

<u>ضعیف حدیث سے استحباب کی مثالیں:</u> اسلئے حنفیہ کثر اللہ سوادھم نے بہت سارے مسائل کے استحباب کے لئے ضعیف حدیث کو مستدل بنایا ہے وضاحت کے لئے چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

۱) احناف کے ہاں اذان میں ارسال اور اقامۃ میں حدر مستحب ہے اور اس کے لئے احناف ترمذی کی روایت پیش کرتے ہیں عن عبدالمنعم بن نعيم عن يحيى بن مسلم عن الحسن وعطاء عن جابر أنّ رسول اللّٰه ﷺ قال لبلال يا بلال اذا اذنت فترسل فی اذانک واذا اقمت فاحدر واجعل بين اذانک واقامتک قدر ما يتفرغ الأكل من اكله والشارب من شربه الخ(جامع ترمذی ۱/ ۱ ۱ ۳) حضرت جابرؓ سے روایت ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا اے بلال جب تو اذان دے تو اپنے اذان میں ارسال کر اور جب تو اقامۃ کرے تو اس میں حدر کر اور اذان اور اقامۃ میں اتنا فاصلہ رکھ کہ کھانے والا کھانے سے اور پینے والا پینے سے فارغ ہوجائے۔حالانکہ اس روایت کے بارے میں امام ترمذیؒ خود فرماتے ہیں هذا الحديث لانعرفه إلاّمن هذا الوجه من حديث عبدالمنعم وهو اسناد مجهول ،اس روایت کو ہم نہیں جانتے مگر عبدالمنعم کے طریق سے اور یہ اسناد مجہول ہے۔امام دارقطنیؒ اور دوسرے علماء جرح وتعدیل نے عبدالمنعم کی تضعیف کی ہے اسکے علاوہ اگرچہ روایت امام حاکمؒ نے بھی روایت کی ہے مگر اس میں عمرو بن فائد الاسواری عن يحيى بن مسلم الخ ہے اور عمرو بن فائد مطعون ہے۔

۲) احناف کثر اللہ سوادہم کے ہاں گردن کی مسح مستحب ہے اور اس کے لئے وہ ابوداؤد اور

مسند احمد کی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ طلحہ بن مصرف عن أبیه عن جده قال رأیت رسول اللّٰہ یمسح راسه مرة واحدة حتیٰ بلغ القذال طلحہ بن مصرف کے دادا فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے سر مبارک پر ایک بار مسح فرماتے، یہاں تک کہ آپ ﷺ گردن تک پہنچاتے۔ حالانکہ یہ روایت ضعیف ہے شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ لکھتے ہیں وھذه الاحادیث ضعفه لا جل طلحة بن مصرف فقال ابن القطان طلحة و ابوه وجده لا یعرفان وقال النووی طلحة بن مصرف احد الائمة الاعلام من التابعین احتج به الائمة الستة وابوه وجده لا یعرفان (حاشیه الا جوبة الفاضلة ۴۵۰) گردن کے مسح کے متعلق تمام تر احادیث طلحہ بن مصرف کی وجہ سے ضعیف ہیں۔ امام ابن قطان فرماتے ہیں کہ طلحہ کے باپ اور دادا کا پتہ نہیں کہ وہ کون ہیں امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ طلحہ بن مصرف تابعین کے بلند پایہ ائمہ میں سے ہیں ائمہ ستہ نے ان سے حجت پکڑی ہے۔ لیکن اس کے باپ اور دادا غیر معروف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود علماء احناف کے ہاں گردن کا مسح کرنا مستحب ہے۔

(۳) ائمہ مجتہدین نے بسا اوقات احتیاط کی بناء پر ضعیف حدیث کی وجہ سے کسی امر کی کراہت کا فتویٰ بھی دیا ہے (۱) جیسے ماء مشمس کے استعمال کی کراہت کا فتوی کتب فقہ میں وضاحت کے ساتھ مذکور ہے کہ ماء مُشَمَّس سے وضو کرنا مکروہ ہے اور اس کراہت کے لئے بطور استدلال حضرت عائشہ کی روایت پیش کی جاتی ہے قالت اسخنت ماء لرسول اللّٰہ ﷺ فی الشمس لیغتسل به فقال لی یا حمیراء لا تفعلی فإنّه یورث البرص (نصب الرایة ۱/۱۰۲) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے لئے سورج کی تپش پر پانی کو گرم کیا تا کہ آپ ﷺ اس سے غسل کر لیں تو آپ ﷺ نے فرمایا اے حمیرا ایسا نہ کرو کیونکہ اس سے برص کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ روایت ضعیف ہے مگر چونکہ اسی میں احتیاط ہے اس لئے فقہائے کرام نے ماء مشمس کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ لہٰذا حدیث مبارک اگر ضعیف بھی ہو لیکن اس کا تعلق آنحضرت ﷺ کی زندگی، اخلاق، اعمال اور اسوۂ حسنہ سے ہو تو اس کو معمول بہ مانا جائے گا۔ اور اس پر عمل باعث اجر و ثواب اور دنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے۔

شمائل ترمذی: چونکہ آنحضرت ﷺ کی زندگی مختلف پہلوؤں پر محیط تھی۔ اس لئے اصحاب علم و کمال

نے ہر پہلو کو مستقل موضوع بنا کر اس پر تصانیف لکھی ہیں مگر ان پہلوؤں میں ایک اہم پہلو رسول اللہ ﷺ کے شمائل اور خصائل ہیں۔ اس پہلو کو بھی ایک مستقل حیثیت حاصل ہے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ کی ظاہری، باطنی سیرت وصورت کے متعلق بحث ہوتی ہے اور اس میں آنحضرت ﷺ کے چال ڈھال، آپ ؐ کی نشست و برخاست، کھانے پینے کے طریقوں کو بیان کیا جاتا ہے اور آپ ﷺ کے لباس، آپ ﷺ کا مزاج و مذاق، حسن معاشرت، عسر و تنگدستی، عمر مبارک میں پیش آمدہ واقعات وغیرہ پر اس موضوع میں سیر حاصل بحث کی جاتی ہے۔ علماء امت نے اس موضوع پر تقریباً ہر زبان میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مگر امام ترمذیؒ کی تصنیف شمائل ترمذی کو خدا تعالیٰ نے ایک فائق اور بلند مقام عطاء فرمایا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح امام ترمذیؒ کی جامع ترمذی درس نظامی میں شامل نصاب ہے تو اسی طرح شمائل ترمذی بھی درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے۔ اور دورۂ حدیث کے طلباء کو سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا ہے۔

<u>شمائل ترمذی اکابرین امت کی نظر میں:</u> ملا علی قاریؒ نے امام ترمذیؒ کی اس تصنیف کے بارے میں فرمایا ہے کہ **ومن احسن ما صنّف فی شمائله واخلاقه** ﷺ **کتاب الترمذی المختصر الجامع فی سیره علی الوجه الاتم بحیث إنّ مطالع هذاالکتاب کانّه یطالع طلعة ذلک الجناب ویریٰ محاسنه الشریفة فی کل باب ولذاقیل والاذن تعشق قبل العین احیاناً(جمع الوسائل ۱ / ۲)** رسول اللہ ﷺ کے اخلاق، عادات پر امام ترمذیؒ نے ایک اچھی اور عمدہ مختصر، جامع اور مکمل کتاب لکھی ہے۔ اس کے مطالعہ سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آنحضرت ﷺ کی سیرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کا ہر گوشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے حالانکہ وہ آنکھوں سے پوشیدہ ہیں اس لئے کہا گیا ہے کہ کان کبھی کبھی آنکھوں سے پہلے عاشق ہو جاتا ہے۔

اور علامہ بیجوریؒ نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا ہے کہ **إنّ کتاب الشمائل للامام الترمذی کتاب وحید فی بابه فرید فی ترتیبه واستیعابه حتّیٰ عدّذلک الکتاب من المواهب وطار فی المشارق والمغارب (المواهب اللدنیة ص ۲)** کہ امام ترمذیؒ کی کتاب شمائل ترمذی آنحضرت ﷺ کے شمائل وخصائل کے باب میں ایک منفرد کتاب ہے۔ ترتیب واستیعاب میں ایک یکتا کتاب ہے یہاں تک اس کتاب کو مواہب میں سے شمار کیا گیا ہے اور مشارق ومغارب پر چھا چکی ہے۔

شمائل ترمذی کے شروح: امام ترمذیؒ کی اس تصنیف کی اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ ارباب علم نے ہر دور میں اس کی مختلف زبانوں میں شروحات اور تراجم لکھی ہیں۔جن میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱)جمع الوسائل(عربی): یہ کتاب مشہور و معروف محدث وفقیہ علامہ علی بن سلطان محمد القاری الشہیر بالملاعلی قاریؒ التوفی ۱۰۱۴ھ کی تصنیف ہے اور ایک جامع شرح ہے۔

(۲)المناوی شرح الشمائل: یہ حضرت الامام المحدث الشیخ عبدالرؤف المناوی المصریؒ التوفی ۱۰۰۳ھ کی تصنیف ہے۔اور اس وقت جمع الوسائل کے حاشیہ پر شائع ہوچکی ہے۔

(۳)المواہب اللدنیۃ علی الشمائل المحمدیۃ: یہ علامہ الامام الشیخ ابراہیم البیجوریؒ کی تصنیف ہے۔

(۴)زہرالخمائل علی الشمائل: یہ علامہ جلال الدین السیوطیؒ کی عمدہ کتاب ہے۔

(۵)الاتحافات الربانیۃ بشرح الشمائل المحمدیۃ: یہ علامہ احمد عبدالجواد احمد الرومیؒ کی تصنیف ہے۔

(۶)اشرف الوسائل شرح علی الشمائل: یہ علامہ ابن حجر المکی الھیتمیؒ کی کتاب ہے۔

(۷)الفوائد الجلیلۃ البھیۃ علی الشمائل المحمدیۃ: یہ علامہ احمد بن قاسم بن اسد المغربیؒ کی تصنیف ہے۔

(۸)اسنیٰ الوسائل بشرح الشمائل: یہ علامہ اسماعیل بن محمد العجلونیؒ التوفی ۱۱۶۲ھ کی تصنیف ہے۔

(۹)المواہب المحمدیۃ بشرح الشمائل الترمذیۃ: یہ علامہ سلیمان بن عمر المعروف بالجمل التوفی ۱۲۰۴ھ کی عمدہ تصنیف ہے۔

(۱۰)شرح شمائل للترمذی: للعلامہ ابراہیم بن محمد بن عرب شاہؒ التوفی ۹۴۳ھ

(۱۱)شرح الشمائل للترمذیؒ: للعلامہ سلطان بن احمد المصری المزاجیؒ التوفی ۱۰۷۵ھ

(۱۲)شرح الشمائل: للشیخ عبداللہ نجیب العینتابی شارح الشفاء التوفی ۱۲۱۹ھ

(۱۳)شمائل النبی ﷺ: للعلامہ مصلح الدین اللاری محمد بن صلاح الدین جلال التوفی ۹۷۹ھ

(۱۴)خصائل النبوی شرح شمائل ترمذی: یہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ کی اردو زبان میں عمدہ شرح ہے۔جو اختصار کے ساتھ جامع بھی ہے۔

(۱۵)ترجمہ شمائل ترمذی: حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ کا اردو زبان میں ترجمہ ہے۔

(۱۶) شمائل ترمذی مع اردو ترجمہ وتشریح: مفسر قرآن علامہ مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کے درسی افادات کا مجموعہ ہے۔

(۱۷) آفتاب نبوت کی کرنیں شمائل اور خصائل کی روشنی میں: یہ مولانا محمد حسین صدیقی مدظلہ کی شمائل ترمذی کی اردو زبان میں شرح ہے۔

(۱۸) شرح شمائل ترمذی: یہ مولانا عبدالقیوم حقانی مدظلہ بانی ومہتمم جامعہ ابوہریرۃ خالق آباد نوشہرہ کی شمائل ترمذی کا عمدہ شرح ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سارے شروح ہیں۔

کچھ شرح ھذا کے بارے میں: قائد جمعیت حضرت مولانا سمیع الحق صاحب زید مجدہم سیاسی میدان میں شہرت رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک کہنہ مشق اور ماہر ترین مدرس بھی ہیں۔ آپ مدظلہ نے ایام تدریس میں جو بھی کتاب پڑھائی، اس کتاب کی لفظی اور عبارتی تشریح کا نہ صرف حق ادا کیا بلکہ حالات حاضرہ اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل اور اس موضوع کے مالھا و ماعلیھا سے طلباء علوم دینیۃ کے اذہان کو منور اور معطر فرمایا۔ اور خصوصاً احادیث کی کتابوں کو پڑھاتے وقت جس جامعیت اور سہل انداز سے طلباء کو درس حدیث دیتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قارئین ماہنامہ الحق کی اصرار پر آپکے جامع ترمذی کے درسی افادات کو الحق میں بالاقساط شائع کیا جاتا ہے۔ جامع ترمذی کے درسی افادات کو مزید افادہ واستفادہ کے لئے بندہ ناچیز (مختار اللہ حقانی) نے جامع ترمذی کے کتاب الاطعمۃ والاشربۃ کو یکجا کر کے "اسلام کا نظام اکل وشرب" کے نام سے ایک ضخیم جلد میں مرتب کر کے شائع کیا۔ جس کو مجالس علم میں کافی پزیرائی حاصل ہوئی۔ اور یہ مقبولیت اس لئے ہے کہ مولانا سمیع الحق صاحب کے جامع ترمذی کے درسی افادات ہر خاص وعام کیلئے مفید ہیں۔ اسی طرح زیر نظر کتاب زین المحافل شرح الشمائل بھی مذکورہ صفات کی حامل کتاب ہے۔ مولانا اصلاح الدین حقانی مدظلہ استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ لکی مروت چونکہ خود شمائل ترمذی حضرت اقدس مدظلہ سے پڑھ چکے ہیں اور ساتھ ساتھ آپ مدظلہ کا درس آڈیو کیسٹ میں بھی محفوظ ہے اسلئے انہوں نے انتہائی عرق ریزی سے آپ کے انداز بیان اور طرز افہام وتفہیم کو مدنظر رکھتے

ہوئے زینتِ قرطاس کیا۔ جواب آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے۔

بندہ اپنے لئے سعادت سمجھتا ہے کہ مجھ ناچیز کو حضرت اقدس مدظلہ کے ان جواہر پاروں کی نظرثانی، کمپوز کروانے اوران کو کتابی شکل میں ترتیب دینے کی خدمت کا موقع ملا۔ بندہ ناچیز نے مناسب مقام پر کچھ حواش بھی لکھے اور ساتھ شمائل ترمذی میں جو روایات امام ترمذیؒ نے نقل کی ہیں ان کی تخریج بھی دیگر کتب حدیث سے کی۔ تاکہ کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوجائے۔ اس کے علاوہ بعض معرکۃ الآراء فقہی مسائل کی قدرے وضاحت کی کوشش کی ہے۔ تخریج احادیث میں متعلقہ کتاب کا جلد اور صفحہ نمبر کتاب اور باب کو ذکر کیا ہے تاکہ اصل مراجع تک رسائی آسان ہو۔ اس کے علاوہ ترتیب، پروف ریڈنگ اور تصحیح اغلاط کی کافی حد تک اپنی بساط کے مطابق کوشش کی ہے مگر یابیٰ اللہ عصمۃ کتاب غیر کتابہ کی وجہ سے کتاب میں لفظی، معنوی اور ترتیبی غلطیوں کا امکان کوئی ناگزیر نہیں۔ اس لئے اہل علم اور قارئین حضرات سے التجاء ہے کہ دوران مطالعہ اگر کوئی لفظی، معنوی یا کتابتی غلطی نظر آئے تو ازراہ کرام ان اغلاط پر مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں ان کا ازالہ ہوسکے۔ آخر میں ان سب حضرات کا مشکور ہوں خصوصاً برادر مکرم مولانا عرفان الحق اظہار حقانی مدرس دارالعلوم حقانیہ کا جنہوں نے اس کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ وغیرہ میں تعاون کیا اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو حضرت اقدس مدظلہ، مولانا اصلاح الدین حقانی اور مجھ ناچیز کے لئے دنیاوآخرت میں ذخیرۂ خیر بنائے۔ آمین

احقر العباد مختار اللہ حقانی

خادم دارالافتاء، شعبہ تخصص فی الفقہ والافتاء

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۱۱رمئی ۲۰۰۷ء بروز جمعہ المبارک

مختصر سوانحی خاکہ شیخ الحدیث

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

نام ونسب: حضرت مولانا سمیع الحق دامت برکاتہم العالیہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۷ء کو حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ کے گھر اکوڑہ خٹک میں پیدا ہوئے۔ آپکے آباؤاجداد سلطان محمود غزنویؒ کے ہمرا جہاد کیلئے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اور پھر اکوڑہ خٹک میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ آپ کا تعلق ایک علمی گھرانے سے ہے۔ کئی پشتوں سے یہ خاندان دینی اور مذہبی خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے۔

ابتدائی تعلیم: آپ نے پرائمری تک عصری تعلیم گاؤں ہی میں اپنے والد محترم حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کے قائم کردہ انجمن تعلیم القرآن اسلامیہ پرائمری سکول میں حاصل کی۔ دینی تعلیم ابتدائی درجات سے لے کر درجات عالیہ تک جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں حاصل کی۔ اور ۱۹۵۷ء کو دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد الامام الکبیر شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے ۱۳۷۸ھ کو دورۂ تفسیر کیا۔

اعزازی اسناد: جامعہ دارالعلوم حقانیہ سے سندِ فراغت کے علاوہ بعض دوسرے اکابرین علماء کرام مثلاً قطب العالم شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیرالدین غورغشتویؒ، حضرت مولانا بدرعالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ، حضرت مولانا فخرالدین صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، اور مکہ مکرمہ کے مسند وقت شیخ علوی مالکیؒ نے آپ کو اعزازی اسناد اور اجازاتِ حدیث سے نوازا۔

اساتذہ: ولی کامل حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالغفور سواتیؒ، مولانا عبدالحلیم زروبویؒ، قطب العالم شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ وغیرہ اکابرین سے شرف تلمذ آپ کو حاصل ہے۔

تدریس: تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۵۸ء کو جامعہ دارالعلوم حقانیہ ہی میں درس وتدریس کا آغاز کیا۔ اور جلد ہی خداداد صلاحیتوں کی بدولت ابتدائی کتب سے کتب حدیث کی تدریس تک پہنچ گئے جو

کہ آج تک جاری وساری ہے۔

انداز تدریس: آپ کا انداز ایسا عام فہم اور سلیس ہے کہ ادنیٰ سمجھ رکھنے والا طالبعلم بھی کتاب کے مطلب کو تقریباً کما حقہ سمجھ جاتا ہے۔ عموماً مدرسین حضرات کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ وہ سال کے آغاز میں خوب تحقیق وتدقیق سے اسباق پڑھاتے ہیں۔ لمبی چوڑی تقاریر کرتے ہیں۔ بسا اوقات وہ محققانہ باتیں طلباء کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔ لیکن چند مہینے بعد اور خصوصاً سال کے آخر میں کتاب کو ختم کرنے کی غرض سے عبارت کا ترجمہ تک نہیں کرتے۔ ہاں کہیں ضروری بات ہو تو وہ کر جاتے ہیں۔ مگر مولانا صاحب کا انداز درس سال کے آغاز سے لیکر اختتام تک یکساں ہوتا ہے۔ آپ کی تقریر میں تکرار نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک بہتے دریا کی طرح رواں دواں ہوتی ہے۔ آپ درس میں محققانہ روایتی ابحاث کے ساتھ ساتھ جدید دور کے جدید تقاضوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست، یہود وہنود اور اسلام دشمن عناصر کے عزائم سے بھی طلباء کو آگاہ کرتے ہیں۔ اگرچہ مولانا صاحب نے تقریباً ہر فن میں کوئی نہ کوئی کتاب پڑھائی ہے اور ہر ایک کتاب کی تدریس کا ایک الگ انداز ہے۔ مگر علم حدیث کی کتابوں کی تدریس اور پڑھانے میں آپ کا دیگر محدثین حضرات سے الگ تھلگ اپنا ایک منفرد اور انوکھا انداز ہے۔ حدیث کی لفظی تشریح کے ساتھ اس حدیث کے اسرار ولطائف بھی بیان کرتے ہیں، فقہی مسائل، مذاہب وجوہ اختلاف دلائل اور پھر ترجیح الراجح بیان کرتے ہیں۔ ترقی سائنس سے پیدا شدہ مسائل، جدید سیاسی صورت حال کا جائزہ، جدید معاشی نظام کا نشیب وفراز، نئے فتنوں کے عزائم، یہود وہنود کے منصوبے، عالم اسلام کو درپیش مسائل اور پھر قرآن وسنت کی روشنی میں ان کا حل خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ جس کا اندازہ زیر نظر درسی افادات سے لگایا جا سکتا ہے۔

صحافت: درس وتدریس کے ساتھ ساتھ ۱۹۶۵ء میں آپ نے ماہنامہ الحق کے نام سے ایک دینی وعلمی جریدے کا آغاز کیا۔ جسے بہت جلد ملک اور بیرون ملک مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ اور تادمِ تحریر نہایت آب وتاب سے جاری ہے۔

مشہور تلامذہ: ویسے تو اس طویل دور تدریس میں آپ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے جو

ملک وبیرون ملک مختلف خدمات دینیہ میں مشغول ہیں۔ مگران میں چند مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن (مہتمم جامعہ عثمانیہ پشاور)، حضرت مولانا اصلاح الدین (مرتب تقریر شمائل ترمذی کتاب ھذا اوانا)، حضرت مولانا محمد محسن شاہ (مہتمم جامعہ حلیمیہ درہ پیزو)، حضرت مولانا نصیب علی شاہؒ (سابق ایم این اے، مہتمم المرکز الاسلامی بنوں)، مولانا حبیب اللہ حقانی (ناظم دارالعلوم اسلامیہ لکی مروت)، حضرت مولانا حافظ ابن امین (مہتمم دارالعلوم تخت نصرتی)، استادالمعقول والمنقول حضرت مولانا تاج محمد حقانی (مدرس دارالعلوم کاہی)، حضرت مولانا عبیداللہ چترالیؒ (سابق مہتمم دارالعلوم تعلیم الاسلام باڑہ گیٹ پشاور)، حضرت مولانا گوہر شاہ (ایم این اے، مہتمم جامعہ اسلامیہ چارسدہ)، حضرت مولانا غلام محمد صادق (ایم این اے، ناظم جامعہ اسلامیہ)، شیخ الحدیث حضرت مولانا ادریس حقانی (ایم پی اے، اتمان زئی)، حضرت مولانا بدر منیر صاحب (مہتمم دارالعلوم تعلیم القرآن بٹ خیلہ) حضرت مولانا صبغۃ اللہ حقانی (مہتمم مدرسہ ہاشمیہ کوئٹہ)، حضرت مولانا خیر محمد (جامعہ خیر المدارس کوئٹہ)، حضرت مولانا سید عبدالباری آغا (سابق صوبائی وزیر مذہبی امور بلوچستان)، حضرت مولانا عصمت اللہ (سابق وزیر خزانہ بلوچستان)، حضرت مولانا نصیب خان صاحب استاد حدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک)، حضرت مولانا سیف اللہ حقانی (رئیس دارالافتاء دارالعلوم حقانیہ)، حضرت مولانا الطاف الرحمٰن بنوی (استاد حدیث جامعہ امدادالعلوم پشاور)، حضرت مولانا نثار اللہ حقانی (مہتمم دارالعلوم اضاخیل)، حضرت مولانا قاضی فضل اللہ صاحب (سابق ایم این اے چھوٹا لاہور حال مقیم امریکہ)، حضرت مولانا محمد ابراہیم فانی (مدرس دارالعلوم حقانیہ)، حضرت مولانا حافظ شوکت علی حقانی (مدرس دارالعلوم حقانیہ)، حضرت مولانا مفتی غلام قادر حقانی (مدرس دارالعلوم حقانیہ) مولانا عبدالکبیر حقانی (سابق گورنر جلال آباد و معاون سرپرست شوریٰ عالی افغانستان)، حضرت مولانا سعید الرحمٰن حقانی (پاکستان میں افغانستان کے سابق سفیر، معاون وزیر فوائد عامہ ''مواصلات وتعمیرات'')، مولانا احمد اللہ حقانی (سابق وفاقی وزیر فوائد عامہ ''مواصلات وتعمیرات'')، مولانا سید غیاث الدین حقانی (سابق وفاقی وزیر اوقاف)، مولانا مسلم حقانی (سابق معاون وزیر حج)، مولانا عبداللطیف

حقانی (سابق وفاقی وزیر زراعت)، مولانا عبدالرقیب حقانی (سابق وفاقی وزیر شہداء صالحین)، مولانا حفیظ اللہ حقانی (سابق سیکرٹری خارجہ وسابق وزیر منصوبہ بندی)، مولانا حاجی احمد جان حقانی (سابق وفاقی وزیر پانی وبجلی)، مولانا صدر اعظم حقانی (نائب گورنر جلال آباد)، مولانا نورمحمد ثاقب حقانی (سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف افغانستان)، اور دیگر بے شمار تحریک طالبان اور جہاد افغانستان کے قائدین بھی آپ کے تلامذہ کی فہرست میں شامل ہیں۔

__اولاد واحفاد:__ اللہ تعالیٰ نے اولاد واحفاد کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔جن میں مولانا حامد الحق فاضل مدرس حقانیہ ممبر قومی اسمبلی، مولانا راشد الحق فاضل مدرس حقانیہ ایڈیٹر "الحق"، اسامہ سمیع، خزیمہ سمیع، عبدالحق ثانی ابن مولانا حامد الحق، محمد احمد بن مولانا راشد الحق سمیع وغیرہ شامل ہیں۔

__تصنیف وتالیف:__ تدریسی، سیاسی اور دار العلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کے باوجود آپ نے تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔آپ کے تصانیف اور درسی افادات میں بعض اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

(۱) ملت اسلامیہ کا مؤقف (قومی اسمبلی میں مرزائیوں کو متفقہ طور پر غیر مسلم اقلیت اس کتاب کو پیش کرنے کے بعد قرار دیا گیا)

(۲) حقائق السنن شرح جامع الترمذی (افادات حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ)

(۳) اسلام کا نظام اکل وشرب وفلسفہ حلال وحرام (شرح جامع ترمذی کتاب الاطعمۃ والاشربہ)

(۴) میری علمی اور مطالعاتی زندگی (۵) اسلام اور عصر حاضر

(۶) قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ (۷) زین المحافل شرح شمائل ترمذی ۲ جلدوں میں

(۸) دعوات حق (خطبات شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ) دو جلدوں میں

(۹) خطبات حق (خطبات مولانا سمیع الحق)

(۱۰) مکتوبات مشاہیر اکابر امت بنام مولانا عبدالحقؒ

(۱۱) مکتوبات مشاہیر بنام مولانا سمیع الحق، کئی جلدوں میں

(۱۲) صلیبی دہشت گردی اور اسلام کا معرکہ (عالمی میڈیا سے بے لاگ مکالمہ اور انٹرویوز)
(۱۳) سینٹ میں شریعت بل کا معرکہ (۱۴) وفاقی مجلس شوریٰ (فوجی پارلیمنٹ میں اسلام کی جنگ)
(۱۵) روسی الحاد (۱۶) عبادات وعبدیت
(۱۷) مسئلہ خلافت وشہادت (۱۸) صحبتے با اہل حق
(۱۹) قرآن حکیم اور تعمیر اخلاق (۲۰) کاروان آخرت
(۲۱) قادیان سے اسرائیل تک (۲۲) قومی اور ملی مسائل پر جمعیت کا موقف

اوراسی تصنیف وتالیف اور ریسرچ کیلئے آپ مدظلہ نے جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں شعبۂ مؤتمر المصنفین کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ جو ان کی نگرانی میں شب وروز مصروف عمل ہے۔

تحریکات اور ملی خدمات: درس وتدریس کے ساتھ آپ نے مختلف تحریکات میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ صدر ایوب خان کے دورِ حکومت میں جب ماڈرن ازم کے داعی ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے فتنہ نے سر اٹھایا تو آپ نے اس کا بھرپور تعاقب کیا۔ جس پر ماہنامہ الحق میں شائع شدہ آپ کے اداریئے دال ہیں۔

۱۹۷۴ء میں جب تحریک ختم نبوت شروع ہوئی، تو آپ نے اس تحریک میں بھی اپنے والد محترم اور قائد جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور دوسرے اکابر علماء کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے قومی اسمبلی میں امت مسلمہ کی ترجمانی کرتے ہوئے قادیانیت کے بارے میں "ملت اسلامیہ کا موقف" جو سنایا تھا۔ اس کا کافی حصہ آپ نے لکھا تھا۔

۱۹۷۷ء میں جب تحریک نظام مصطفیٰ شروع ہوئی۔ تو اس میں بھی آپ نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ جس کی پاداش میں آپ نے ہری پور جیل میں قید وبند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔

سیاسی خدمات: درس وتدریس، تصنیف وتالیف، ماہنامہ الحق کی ادارت اور دارالعلوم کے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست میں بھی آپ نے اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں جب اکابرین جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور مجاہد ملت حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کو عام انتخابات میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ تو

آپ (مولانا سمیع الحق) کو مجبوراً حصہ لینا پڑا۔اور حضرت شیخ الحدیثؒ کی کامیابی کے بعد قومی اسمبلی میں ساری کارروائی پس پردہ آپ ہی چلاتے رہے۔تحاریک التواء کی قراردادیں، اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں ترامیم پیش کرنے میں بھی آپ پیش پیش رہے۔

جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دورِ مارشل لاء میں آپ کو وفاقی مجلس شوریٰ کا ممبر نامزد کیا گیا۔تو زکوٰۃ وعشر، حدود، قصاص ودیت اور امتناع قادیانیت آرڈیننس کا نفاذ اور آئین میں بے شمار اسلامی شقوں اور دفعات کا شمول آپ ہی کی شبانہ روز جدوجہد کی بدولت ممکن ہوسکا۔اور جب (۱۹۸۵ء میں) سینٹ آف پاکستان کے آپ ممبر بنے۔تو آٹھ سال کی طویل تاریخی جدوجہد کے بعد سینٹ سے شریعت بل منظور کروایا۔

اسلامی جمہوری اتحاد کا قیام: مملکت خداداد پاکستان پر جب سیکولرزم کے منحوس سائے دوبارہ پھیلنے لگے تو اس کے تدارک کیلئے آپ نے اس وقت اسلامی جمہوری اتحاد کی بنیاد رکھی۔جس میں نو سیاسی ومذہبی جماعتیں شامل ہوئیں۔اور متفقہ طور پر آپ کو اس اتحاد کا سنیئر نائب صدر منتخب کیا گیا۔

متحدہ علماء کونسل کا قیام: ۱۹۸۸ء میں جب بے نظیر کی حکومت قائم ہوئی۔تو آپ نے اس کے خاتمہ کے لئے متحدہ علماء کونسل کے پلیٹ فارم پر تمام مکاتب فکر کے علماء اور اکابرین کو جمع کیا۔جس کی بدولت نسوانی حکومت کا خاتمہ ممکن ہوسکا۔

متحدہ دینی محاذ کی تشکیل: بھارت میں جب بابری مسجد کے انہدام کا دلخراش حادثہ پیش آیا۔تو ملک میں دینی اقدار وآثار کو تباہی سے بچانے کیلئے ۱۵دسمبر ۱۹۹۲ء کو ایک بار پھر تمام دینی جماعتوں کے قائدین کو جمع کر کے ''متحدہ دینی محاذ'' کی تشکیل کی۔

تحریک تحفظ مدارس دینیہ: ۱۹۹۴ء میں جب بے نظیر حکومت نے مدارس دینیہ کے خلاف بے بنیاد الزامات لگانے، مدارس کی انکوائریاں اور تحقیقات کرانے کا سلسلہ شروع کیا، تو مولانا صاحب نے یکم جنوری ۱۹۹۵ء کو لاہور میں تمام مکاتب فکر کے علماء اور ارباب مدارس کو جمع کر کے ''تحریک تحفظ مدارسِ دینیہ'' قائم کی اور حکومت کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔

اب جبکہ جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت اور اس کے ناعاقبت اندیش وزراء نے امریکہ کی

خوشنودی حاصل کرنے کیلئے مدارس دینیہ کے خلاف مہم شروع کی۔تو اسی مردمجاہد نے ۳۰/اپریل ۲۰۰۰ء کو دارالعلوم حقانیہ میں تمام مدارس کے مہتممین کو جمع کر کے مذکورہ منصوبہ کے سامنے بند باندھا۔

ملی یکجہتی کونسل کا قیام: ۱۹۹۶ء میں ملک عزیز میں فرقہ واریت کی آگ بھڑک اٹھی۔اور حکومتی سطح پر امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کی تکمیل کی سازشیں شروع ہوئیں۔تو اس نازک وقت میں آپ ہی نے تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ''ملی یکجہتی کونسل'' قائم کی۔

سی ٹی بی ٹی: ۱۹۹۸ء میں جب نواز حکومت سی ٹی بی ٹی پر دستخط کیلئے آمادہ ہوئی تو مولانا صاحب نے نہ صرف اپنے ادارہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ سے اس کی مخالفت میں مدلل شرعی فتویٰ شائع کر کے راتوں رات سینٹ اور قومی وصوبائی اسمبلیوں کے ممبران میں تقسیم کروایا، بلکہ ۵/مئی ۱۹۹۸ء کو تمام دینی جماعتوں کی آل پارٹیز کانفرنس طلب کر کے اس ناپاک سازش کو ناکام بنایا۔

دفاع افغانستان و پاکستان کونسل کا قیام: جہادِ افغانستان اور تحریک طالبان میں حضرت مولانا سمیع الحق صاحب کا کلیدی کردار کسی پر مخفی نہیں کہ انہوں نے اس جہاد میں قائدانہ کردار ادا کیا۔اور کر رہے ہیں۔اس لئے کہ تحریک طالبان میں شامل طلباء اور ان کے قائدین کے آپ نہ صرف مربی ہیں۔بلکہ دارالعلوم حقانیہ کے مہتمم کی حیثیت سے ہزاروں کی تعداد میں علماء اور طالبان لیڈر آپ کے براہ راست شاگرد ہیں۔جنوری ۲۰۰۱ء میں جب امریکہ نے افغانستان پر پابندیاں لگانے کا فیصلہ کیا تو مولانا صاحب نے ملک کی تمام دینی اور سیاسی جماعتوں کے مرکزی قائدین کو دارالعلوم حقانیہ میں جمع کیا۔اس کانفرنس میں امریکی استعمار اور سامراج کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے ''دفاع افغانستان و پاکستان کونسل'' کے قیام کا باضابطہ اعلان کیا گیا۔اور اتفاق رائے سے مولانا صاحب کو اس کونسل کا چیئر مین نامزد کیا گیا۔

سود کے خلاف آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد: پاکستان کے اعلیٰ عدالتی ادارے سپریم کورٹ نے حکومت کو ۳۰/جون ۲۰۰۱ء تک سودی نظام ختم کرنے کا حکم دیا۔اور حکومت نے حسب سابق اس سلسلہ میں لیت ولعل کی پالیسی اختیار کرنی شروع کی۔تو مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے ۱۹/مئی ۲۰۰۱ء کو کراچی میں تمام دینی اور سیاسی جماعتوں کا مشترکہ سربراہی اجلاس طلب کیا۔اور حکومت کو سپریم کورٹ کے فیصلہ پر عمل کرنے کا نوٹس دیا۔اور بصورت دیگر حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا۔

مختصر تذکرہ مرتبِ کتاب

مولانا اصلاح الدین حقانی بن مولانا سراج الدینؒ

ولادت: ۱۸ستمبر ۱۹۵۸ءمطابق ۴ربیع الاول ۱۳۷۸ھ بروز جمعرات بمقام ملازئی ضلع ٹانک

گھرانہ: آپ کے دادا اپنے علاقہ کے مشہور عالم تھے۔ والد صاحب مولانا سراج الدین مرحوم تقسیم سے قبل سہارنپور میں پڑھتے تھے۔ تقسیم ہند کی وجہ سے ۱۹۴۷ء میں جامعہ خیر المدارس ملتان آگئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ جید عالم دین اور اپنے علاقہ میں افتاء کے مرجع تھے۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ملازئی میں حاصل کی۔ دینی کتب دادا مولانا شیخ امیر صاحب، والد صاحب مولانا سراج الدین صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب رحمہم اللہ سے پڑھیں۔ یہیں سے ۱۹۷۵ء میں سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ سکول کے اساتذہ اور دیگر احباب کی رائے تھی کہ کالج میں داخلہ لیں۔ مگر اپنے شوق اور والدین جبکہ بالخصوص دادا جان کی خواہش نے دینی علوم کی طرف کھینچا۔ میٹرک کے نتیجہ کے بعد چونکہ مدارس کے تعلیمی سال کا کچھ حصہ گزر چکا تھا۔ اس لئے بڑے مدارس میں داخلہ کی توقع نہیں تھی۔ تو والد صاحب نے اپنے تعارف پر بنوں کے دارالعلوم الاسلامیہ میں ۲۶ر جنوری ۱۹۷۶ء مطابق ۱۳۹۶ھ کو داخلہ دلوایا۔ جون ۱۹۸۰ء تک یہیں پڑھتے رہے۔ اور ابتدائی فنون یہیں پڑھے۔

۲۴ر اگست ۱۹۸۰ء مطابق ۱۲ر شوال ۱۴۰۰ھ کو مشہور عالم درسگاہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں داخلہ لیا۔ پانچ سال تک یہی پڑھتے رہے۔ شعبان ۱۴۰۵ھ میں وفاق المدارس کے عالمیہ کے امتحان سے فارغ ہو کر ۳ر مئی ۱۹۸۵ء دارالعلوم حقانیہ سے سند الفراغت حاصل کی اور وفاق المدارس کے امتحان میں پاکستان بھر میں اول آنے کا اعزاز ملا۔

فراغت کے بعد دارالعلوم الاسلامیہ لکی مروت دارالعلوم وزیرستان وانا (جنوبی وزیرستان ایجنسی) اور جامعہ اسلامیہ زرگری ضلع ہنگو میں مختلف فنون اور حدیث پاک کی کتابوں کی تدریس کا موقع ملا جو الحمدللہ تاحال جاری ہے۔

عصری علوم: جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ میٹرک کا امتحان ریگولر طالب علم کی حیثیت سے اپنے گاؤں سے پاس کیا۔ پھر دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کا پرائیویٹ مطالعہ جاری رہا۔ ۱۹۸۰ء میں ایف اے کا امتحان پشاور بورڈ سے پاس کیا۔ ۱۹۸۳ء میں گومل یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان دیا تو یونیورسٹی میں اول آئے۔ اور گولڈ میڈل کا مستحق قرار دیئے گئے۔ اور ۱۹۸۶ء میں ایم اے عربی کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔ اور دوبارہ گولڈ میڈل کا مستحق قرار دیئے گئے۔

اور ۱۹۸۹ء میں ایم اے اسلامیات کے امتحان میں یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن لی۔

تحریر وتحقیق: ابتداء ہی سے ادبی ذوق ملا تھا۔ سکول کے زمانہ میں بھی اساتذہ کے حکم سے مضامین لکھتے رہے۔ اشعار کا ملکہ بھی ملا تھا۔ طالبعلمی کے زمانے کے بہت سے اشعار تو ضائع ہو چکے ہیں۔ اور فراغت کے بعد شعر گوئی کی طرف توجہ کم کرنی پڑی۔ البتہ اساتذہ کے دروس کے امالی محفوظ ہیں۔ بلکہ مطوّل اور مسلم شریف کے دروس کے امالی ایک افغانی شخص اپنے نام سے چھپوا چکا ہے۔ الحمدللہ اس کو کوئی کوفت نہیں ہوئی۔ ان امالی میں مشکوٰۃ شریف کی تقریر سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ جس سے ہزاروں فوٹوسٹیٹ کاپیاں نکل چکی ہیں۔

حضرت مولانا شیخ الحدیث مغفور اللہ صاحب مدظلہم کے درس کی اس تقریر سے ایک عالم استفادہ کر رہا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ کی حقائق السنن کے احادیث کی تخریج بھی کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں دیگر مضامین لکھنے کا شغف بھی تھا۔ جن میں الحق اکوڑہ خٹک، اقرأ کراچی اور النصیحۃ چارسدہ وغیرہ جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مکمل شرح کی حیثیت سے زیر نظر کتاب نقش اول ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور سعادت دارین کا وسیلہ بنائے۔ آمین

بسم اللّٰہ الرحمان الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے

الحمد للّٰہ وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفیٰ قال الشیخ الحافظ ابوعیسٰی محمد بن عیسی بن سورۃ الترمذی.

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اور سلامتی ہو اس کے ان بندوں پر جن کو انہوں نے منتخب کیا۔ شیخ حافظ ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذیؒ فرماتے ہیں

کتاب کی ابتداء میں **بسم اللّٰہ** اور **حمد** لانے کی متعدد وجوہ بیان کی گئی ہیں جن میں اہم وجوہ درج ذیل ہیں۔

۱) قرآن مجید کی اقتداء

۲) تیمّن یعنی برکت کا حصول

۳) ان احادیث کا اتباع جن میں بسم اللہ اور حمد کے بغیر کسی کام کے شروع کو ابتر اور اجذم یعنی ناقص اور بے برکت کہا گیا ہے۔

۴) سلف صالحین کی دیگر کتابوں کی تقلید

<u>اجزاء کی تشریح اور ظرف کا متعلق:</u> باء کو استعانت کے لیے لایا گیا ہے جو تیمّن اور تبرک کو متضمن ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کی اعانت سے برکت حاصل کر رہا ہوں، بعض حضرات نے باء کو تعدیۃ کے لیے قرار دیا ہے جیسا کہ علامہ بیجوریؒ نے صفویؒ اور جوینیؒ کی طرف منسوب کیا ہے۔

لفظ اللہ اس ذات حق کے لیے علم کے مرتبہ میں ہے جو تمام صفات کمال سے متصف اور صفات نقصان سے پاک ہے جبکہ رحمٰن اور رحیم دونوں رحمت سے مبالغہ کے صیغے ہیں جو کہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر دال ہیں اور (دنیا و آخرت) کے لیے تسکین و تسلی کا سامان ہیں۔

بسم اللّٰہ کی باء جارہ بظاہر فعل مقدّر کے ساتھ متعلق ہے جو کہ ابتدأیا اُؤلفُ ہے یا پھر ابتدائی یا

تالیفی جیسے مصادر کے ساتھ اس کا تعلق ہے یہ مقدم بھی مقدر کہا جاتا ہے اور مؤخر بھی لیکن محققین شرّاح ومفسرین نے مؤخر مقدر کرنے کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ اس طرح قصر حصر کے علاوہ تقدیم اسم الٰہی کی وجہ سے تعظیم بھی مستفاد ہوتا ہے نیز اسم الٰہی کو مقدم ماننے سے تبرک کا حصول بھی زیادہ قریب تر ہے اور یہی اصل مقصود بھی ہے۔

حمد کا مطلب: اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے تمام محامد کا مستحق ہے اور اختیاری محاسن کے مقابلے میں واقع تمام تعریفیں صرف اسی کے لائق ومناسب ہیں کیونکہ وہی ذات تمام محاسن کے لیے مبدأ ہے جبکہ مخلوق اسی ذات کی جمالی اور جلالی صفات کے مظاہر ہیں۔

لفظ سلام کی تشریح: سلام سے یا تو تسلیم مراد ہے یعنی سلام بھیجنا یا یہ سلامتی کے معنی میں ہے اور اس کی تنکیر میں بھی دو احتمال ہیں یا تو تعظیم کیلئے ہے یعنی ہماری طرف سے عظیم سلام ہو۔ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے لامحدود سلامتی ہو منتخب بندوں پر یا پھر تکثیر وتعمیم کیلئے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر قسم کی سلامتی ہو ان لوگوں پر جو عبدیت کا اعلیٰ ترین مقام پانے کیساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے منتخب شدہ بھی ہیں یہ دونوں وصف انبیاء کرام، علماء واولیاء، فرشتوں اور جنات صالحین میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ اہل بیت اور حضرات صحابہ سب کا حق ادا ہو گیا۔ اس مقام پر بعض شرّاح نے کہا ہے کہ الحمد کے مقابلے میں سلام کے لفظ کو نکرہ لانے میں نکتہ یہ ہے کہ حمد میں تعظیم اور سلام میں (تحقیر یعنی حمد سے کم درجہ گویا تقلیل وتصغیر مقصود ہے) اگر چہ اس قول کی ایک تاویل بھی علامہ بیجوریؒ وغیرہ نے کی ہے۔ لیکن ملا علی قاریؒ اور قسطلانیؒ نے اس کو مردود قرار دیا ہے۔ اگر یہ تحقیر کے لیے نہیں تو پھر اس میں کیا نکتہ ہے۔ تو بعض شراح نے یہ کہا ہے کہ اس میں تنکیر تعظیم کے لیے ہے یا تکثیر وتعمیم کے لیے۔ جیسے پہلے بیان ہو چکا ہے۔

کیا صلوٰۃ وسلام بیک وقت لازمی ہیں: یہاں پر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ امام نوویؒ نے صلوٰۃ وسلام کو ایک دوسرے کے بغیر لانے کو مکروہ قرار دیا ہے بلکہ خود جب امام مسلمؒ نے صرف صلوٰۃ کا ذکر کیا ہے تو اس کے اس فعل کو منکر کہہ دیا ہے اس کا استدلال ہے کہ **یایھا الذین آمنو صلّوا علیه وسلموا تسلیما**(الآیۃ) میں **صلوٰۃ و سلام** کا یکجا امر ہوا ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ کا افراد نا جائز ہے اسی طرح سلام کا

افراد بھی ناجائز ہوگا۔

اس سوال کے جواب میں بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ صلوٰۃ کا افراد اوراسی طرح سلام کا افراد ابتدائے اسلام میں مکروہ تھا مگر یہ کراہت بعد میں منسوخ ہوگئی لیکن ملا علی قاریؒ نے تاریخی ثبوت نہ ہونے کی بناء پر اس قول کو مردود کہا ہے۔ بعض حضرات نے جواب دیا ہے کہ مصنفؒ اوراسی طرح امام مسلمؒ پر افراد کا اعتراض اس وقت صحیح ہوتا جبکہ اسی مجلس میں اور اس پوری کتاب میں وہ ایسا کرنے کے مرتکب ہوتے یعنی اس مجلس میں سلام کے ساتھ صلوٰۃ ذکر نہ کرتے یا کتاب میں صلوٰۃ نہ لاتے۔ تو ان کو تارک صلوٰۃ کہا جا سکتا تھا جبکہ یہاں پر سلام صلوٰۃ کو متضمن ہے۔ نیز مصنف کی کتاب تو صلوٰۃ و سلام سے بھری پڑی ہے لیکن اصل اور صحیح جواب یہ ہے کہ امام نوویؒ نے کراہت کا جو دعویٰ کیا ہے وہ درست نہیں بلکہ خود شوافع میں ان کے سوا کوئی اس کا قائل نظر نہیں آتا۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں **لم اقف علٰی دلیل یقتضی الکراھۃ.** علامہ جزریؒ نے امام نوویؒ پر رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگرچہ صلوٰۃ و سلام میں جمع اولیٰ ہے لیکن **لا اعلم احداً نصّ علی ذالک (قول الکراھۃ) من علماء نا و لا غیرھم.**

بایں ہمہ امام ترمذیؒ تو ویسے بھی اس الزام سے بری نظر آتے ہیں کیونکہ انہوں نے سلام کا یہ انداز **سورۃ النمل** کی آیت ۵۹ سے بطور اقتباس اختیار کیا ہے لہٰذا اس کی ذمہ داری ان پر نہیں ڈالی جائیگی۔ بلکہ خود رب ذوالجلال کی طرف سے یہ انوکھا اور بہترین اندازِ تسلیم ہے۔ اب یہاں یہ استفسار ہوسکتا ہے کہ مصنف خود اپنے الفاظ میں حمد کیوں نہیں لائے اور اقتباس کا انداز اختیار کرنے کا کیا سبب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس انداز میں ایک طرف تو اس امر کا امتثال ملحوظ نظر ہے جو رب تبارک وتعالیٰ کی طرف سے صادر ہوا ہے کہ **وقل الحمدللّٰہ و سلام علٰی عبادہ الذین اصطفیٰ.(سورۃ النمل ۵۹)**

دوسری طرف ادائے حمد کے عمل عظیم میں اپنی عجز کو بھی اشارہ ہے اور یہ وضاحت کرنا مطلوب ہے کہ میں خود اپنی طرف سے حمد وصلوٰۃ کا حق ادا نہیں کرسکتا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

خدا درا انتظارِ حمدِ ما نیست — محمد چشم بر راہ ثنا نیست

محمد حامد حمدِ خدا بس — خدا خود مدح آفرین مصطفیٰ بس

بلکہ حق یہ ہے کہ دنیا میں حضور اقدس ﷺ خود بھی حمد کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شفاعت کبریٰ کے موقع پر حالت سجدہ میں مجھ پر کچھ ایسے انداز سے حمد کا القاء فرمائے گا جو اس وقت سے پہلے میرے علم میں نہیں ہوگا۔ نیز ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں کہ **سبحانک لا نحصی ثناء ًعلیک أنت کما أثنیت علی نفسک.**

اے اللہ تو پاک ہے ہم تیری تعریف کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں تو ویسا ہے جیسا کہ تو نے اپنے آپ کی تعریف کی ہے۔

رہی یہ بات کہ **وعلٰی عبادہ الذین اصطفیٰ**۔ میں سلامتی اللہ کے منتخب بندوں پر بتائی گئی ہے اور اللہ کے منتخب بندے انبیاء کرام ہیں۔ مگر سوال اٹھتا ہے کہ کفار کی جانب سے انبیاء اور ان کے صحابہ پر تو بہت زیادہ مظالم ہوئے ان کو زیادہ تکالیف پہنچائی گئیں۔ قتل کیے گئے، مارے گئے، گالیاں دی گئیں۔ **اوذیت فی اللّٰہ مالم یؤذ احداً** ارشاد نبوی ﷺ ہے تو سلامتی کا کیا مطلب؟ جواب یہ ہے کہ دراصل یہ انشاء ہے اور سلامتی کی دعا ہے اخبار نہیں ہے۔ لہٰذا اشکال نہیں رہا۔ اور اگر اخبار کے معنی میں لے لیں تو توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ انبیاء کرام تمام تکالیف کے باوجود منصب نبوت کی ادائیگی کو ملحوظ رکھنے میں سلامت رہے اور تھوڑی سی لغزش اور کوتاہی بھی ان سے اپنے منصب میں صادر نہیں ہوئی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ عباد سے مراد یہاں انبیاء کرام ہیں جن کو خداوند کریم نے نبوت کے لیے منتخب فرمایا۔ لیکن عبدیت کے لقب سے ذکر کیا اور بندگی ہی کسی بندہ کے لیے عظیم ترین صفت ہے۔ حتیٰ کہ نبی کی عبدیت کو نبوت اور رسالت سے افضل سمجھا جاتا ہے کیونکہ عبدیت کا تعلق اللہ کی نسبت ہے اور رسالت دوسرے لوگوں کی نسبت سے ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کے لیے قرآن مجید میں ''عبـــدہ'' کا لفظ لایا گیا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ اضافت خود اپنی طرف کروا کر بندہ کی تشریف وتعظیم کرتے ہیں تو یہاں بھی اضافت تشریفی اور تعظیم کے لیے ہے۔ واضح رہے کہ ہر جگہ اضافت تعظیم کے لیے نہیں ہوتی۔ یہاں قرائن خارجہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ تشریفی ہے ورنہ **ثـم بعثنا علیهم عبادا لنا اولی بأس شدید** (الایة) میں عباد سے مراد بخت نصر اور اس کے ساتھی ہیں جنہوں نے بیت المقدس کو ڈھایا تھا تو وہاں پر اضافت تعظیم کے لیے نہیں ہے۔

__خطبہ میں تشہد:__ بعض حضرات نے امام ترمذیؒ کے اس خطبہ پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ اس میں تشہد موجود نہیں ہے۔اور خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ **کل خطبة ليست فيها تشهد فهي كاليد الجذمى** ۔لہٰذا یہ خطبہ ناقص ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں خطبہ سے مراد ہر خطبہ نہیں بلکہ خطبہ نکاح مراد ہے اوراس کی دلیل یہ ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے یہ حدیث کتاب النکاح میں ذکر کیا ہے۔تو گویا ان کے نزدیک بھی یہاں خطبہ نکاح مراد ہے۔علاوہ ازیں ممکن ہے مصنفؒ نے زبانی طور پر تشہد ادا کیا ہو یا دل میں پڑھا ہو لہٰذا اشکال باقی نہیں رہے گا۔

__شیخ وحافظ کی اصطلاحات:__ **قال الشيخ الحافظ**(۱): شیخ لغت میں عمر رسیدہ شخص کو کہتے ہیں لیکن علماء کی اصطلاح میں اس شخص پر بھی بولا جاتا ہے جو کسی فن میں ماہر، کامل اور قابل تقلید ہو۔ اگرچہ عمر کے لحاظ سے نوجوان ہو۔بعض لوگوں نے حدیث کی تدریس کے لیے معمر ہونے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن خود محدثین عظام کے عمل سے اس کی تردید ہوتی ہے،اور حافظ سے بھی ہمارے ہاں کی مروجہ اصطلاح کے مطابق حافظ قرآن مراد نہیں بلکہ حافظ الحدیث مراد ہے جو کہ علم اصولِ حدیث کی اصطلاح میں علم حدیث اور روایت حدیث سے شغف رکھنے والے حضرات کے ایک خاص مرتبہ پر بولا جاتا ہے۔چنانچہ محدثین کے ہاں حافظ الحدیث وہ شخص ہے جسے ایک لاکھ احادیث کی متون اور اسانید وعلل ازبر ہوں اسے امام بھی کہا جاتا ہے اور یہاں یہ مراد ہے(۲)۔

__ابوعیسیٰ محمد بن سورۃ الترمذیؒ:__ اس مقام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ امام ترمذیؒ نے خود شیخ اور حافظ کہہ کر خودستائی اور فخر وتکبر کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ بلکہ درحقیقت تلامذہ کے اعتماد کو حاصل کرنے کے لیے اور **تحديث بالنعمة** کے طور پر حقیقتِ حال کا اظہار فرمایا ہے جو کہ بوقتِ ضرورت واجب بھی ہوتا ہے۔

---

(۱) قال کے فاعل کے بارے میں بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ مصنفؒ خود اس کا فاعل ہے۔اور بعض کا کہنا ہے کہ اس کا فاعل آپؒ کا ایک شاگرد ابوالعباس محمد بن محبوب المروزی المتوفی ۳۴۶ھ ہیں۔(مختار)

(۲) حضرت تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ آج کل حافظ وہ شخص ہے جس کا احادیث کے ساتھ اتنا لگاؤ اور شغف ہو کہ جب بھی وہ کسی حدیث کو سنے تو اس حدیث کے بارے میں اسے صحیح اور ضعیف ہونے کا پہچان ہو سکے اور اس کو ایک ہزار سے زائد احادیث یاد ہوں۔(مختار)

جس طرح کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر بننے سے قبل مصر کے بادشاہ ریان کے سامنے اپنی صلاحیتیں اور کمالات گن گن کر پیش کی تھیں۔ یا پھر امام ترمذیؒ نے تفاؤ لا یہ لقب اختیار کئے۔ تاکہ یہ کمالات حاصل ہوجائیں۔ آج کل بھی اپنے ساتھ ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، پی ایچ ڈی یا فاضل تعارف کے لئے لکھا جاتا ہے نہ کہ تعریف اور خودستائی کیلئے۔

جبکہ بعض شراح (۱) کے خیال میں اس بات کا احتمال ہے کہ امام ترمذیؒ کے بعض شاگردوں نے جو ان کی کتابوں کے راوی اور ناقل ہیں ان القاب کا اضافہ کردیا ہے اور خود امام ترمذیؒ نے کوئی خودستائی نہیں کی۔ واللہ اعلم۔

ابوعیسیٰ کنیت کا حکم: ابوعیسیٰ اس کنیت کو اختیار کرنے سے حدیث میں بھی ممانعت آئی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف باپ کے منسوب ہونے کی وجہ سے یہ کنیت رکھنا مکروہ بتایا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے فرمان میں اس علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا انّ عیسیٰ علیہ السلام لااب لہ (۲)۔ لیکن ملا علی قاریؒ نے کہا ہے کہ ابتداءً ابوعیسیٰ کنیت رکھنا اگرچہ مکروہ ہے لیکن کسی شخص کو اگر اس کنیت سے شہرت حاصل ہوجائے تو جائز ہوگی۔ اس پر علماء کا اجماع ہے بلکہ خود نبی کریم ﷺ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو اس کنیت سے پکارا ہے۔ لہٰذا کراہت کا قول درست نہیں البتہ ابتداءً کنیت رکھنے میں چونکہ اس لفظ سے ایک فاسد معنی کا توہم ہوتا ہے لہٰذا خلاف اولیٰ ہوگا۔

---

(۱) جمع الوسائل ج ۱ ص ۸

(۲) المواہب الدنیہ ص ۵

۱. باب ماجاء فی خلق رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارک کے بارے میں

لفظ باب کا اعراب: لفظ باب مشہور ترکیب کے مطابق مرفوع ہے اور عموماً اسے ماجاء الخ کی طرف مضاف کر کے پڑھا جاتا ہے۔اس طرح یہ خبر ہو کر اس کی مبتداء محذوف ہوگی یعنی "ھذا باب ماجاء الخ" یا پھر مبتدا بن کر اس کیلئے خبر مقدر مانا جائیگا اور تقدیر عبارت یوں ہوگی "با ب ما جاء الخ ھذا الکلام الآتی"

دوسرا احتمال یہ ہے کہ باب یعنی تنوین کے ساتھ مرفوع پڑھا جائے اس طرح یہ لفظ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی۔یعنی "ھذا باب" اور مابعد کا کلام یعنی ماجاء مستأنف کلام ہوگا۔

تیسرا احتمال وقف کا ہے یعنی باب موقوف پڑھا جائے اس تقدیر پر محل من الاعراب میں واقع نہیں ہوگا۔علامہ کرمانیؒ نے اس احتمال کو بھی جائز کہا ہے۔

خَلق اور خُلُق کا فرق: خَلق بفتح الخاء اور خُلُق بضم الخاء و اللام میں معنی کے لحاظ سے فرق ہے۔اوّل الذکر دراصل ایجاد، ابداع اور پیدا کرنے کے معنی میں مستعمل ہے نیز ظاہری صورت وضع قطع اور طبعی ھیت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔جن کا ادراک بصارت کے ذریعے ہوتا ہے۔

جبکہ مؤخر الذکر کا اطلاق عموماً باطنی سیرت یعنی عادات و اخلاق اور ان صفات و معانی پر ہوتا ہے جو آنکھوں اور بصارت کے ذریعے معلوم نہ ہوں بلکہ بصیرت سے معلوم ہو رہی ہوں۔یہاں پر لفظ خَلق خاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔کیونکہ اس باب میں جو چودہ احادیث مذکور ہیں وہ اصالۃً آپ ﷺ کی ظاہری صورت اور شکل وہیئت سے متعلق ہیں۔

آپ ﷺ کے کمالات باطنی اور محاسن ظاہری: نبی کریم ﷺ باطنی کمالات کے ساتھ ساتھ ظاہری محاسن کے بھی جامع تھے۔اگر چہ ان محاسن کا کما حقہ ادراک عام لوگوں کو نہیں ہوتا تھا۔لیکن کائنات میں آپ ﷺ سے زیادہ حسن کا مالک کوئی بھی نہیں تھا۔امام قرطبیؒ کا قول ہے کہ اگر آپ ﷺ کے تمام محاسن ظاہر ہو جاتے تو صحابہؓ آپ ﷺ کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکتے۔لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان احادیث میں جو کچھ بیان ہے یہ صرف وہ ہیں جو صحابہ کو نظر آیا۔جبکہ آپ ﷺ کا حقیقی حسن اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔حتیٰ

کہ یہاں پر ہر مبالغہ حقیقت سے کم تر ہے۔ کیونکہ ان کے اوصاف جمیلہ سے الفاظ عاجز ہیں خود صحابہؓ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں جیسا کہ شمائل ترمذی میں آگے آرہے ہیں۔

یہی وہ بات ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

لواحی زلیخا لورأین جبینه لاثرن بالقطع القلوب علی الید

ترجمہ: اگر حضرت یوسفؑ کی محبت کی وجہ سے زلیخا کوملامت کرنے والی عورتیں میرے محبوب کی جبین حسین کودیکھ لیتھیں توہاتھوں کی بجائے دل کوکاٹ دینے کوترجیح دیتھیں۔

اور کیوں نہ ہو جب حضرت عائشہؓ سے سوئی گم ہو جاتی ہے تو رخ انور کی روشنی میں وہ مل جاتی ہے۔

مصنف شمائل ترمذی میں نبی کریمﷺ کے اخلاق، سیرت اور صفات کے مختلف پہلوؤں کو روایات کی روشنی میں اجاگر کرتے ہیں۔ لیکن ظاہری اور صوری محاسن کو باطنی محاسن پر اس لیے مقدم کیا کہ ایک تو ادنیٰ سے اعلیٰ کو ترقی ہو، دوسری بات یہ کہ اس میں ترتیب وجود کے طرف بھی اشارہ ہے۔ چنانچہ جسمانی وجود صورت و ہیئت کے بعد ہی اخلاق اور سیرت کا نمبر آتا ہے۔ علاوہ ازیں ظاہری صورت باطن کی ترجمان ہوتی ہے، اسلئے کہتے ہیں کہ الظاهر عنوان الباطن. چنانچہ آپ نے خَلق کو مقدم ذکر کیا۔

(۱)أخبرنا ابو رجاء قتيبة بن سعيد عن مالک بن أنسؓ عن ربيعة بن أبی عبدالرحمٰن عن أنس بن مالک أنّه سمعه يقول كان رسول اللّٰهﷺ ليس بالطويل البائن و لا بالقصير و لا بالا بيض الامهق و لا بالآدم و لا بالجعد القطط و لا بالسبط بعثه اللّٰه تعالىٰ على رأس اربعين سنة فاقام بمكّة عشر سنين وبالمدينة عشر سنين فتوفاه اللّٰه تعالىٰ على رأس ستين سنة و ليس فی رأسه ولحيته عشرون شعرة بيضاء(۱)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نہ بہت لمبے قد کے تھے نہ

---

(۱)صحيح البخاری ۱/۵۰۲ کتاب المناقب باب صفة النبیﷺ،صحيح مسلم ۲/۵۸ کتاب الفضائل باب فی صفة شعر النبیﷺوصفاته الخ(مختار)

پستہ قد کے نہ خالص (چونہ کی طرح) سفید تھے اور نہ بالکل گندم گوں (سانولے)
تھے۔ آپ ﷺ کے بال مبارک نہ زیادہ گھنگریالے تھے نہ بالکل سیدھے تھے۔
چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نبوت بخشی۔
پھر دس برس مکہ میں رہے اور مدینہ میں بھی دس برس قیام فرمایا۔ پھر ساٹھ سال کی عمر
میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وفات دی۔ اس وقت آپ ﷺ کے سر مبارک اور
داڑھی مبارک میں بیس بال بھی سفید نہ تھے۔

حدّثنا اور أخبرنا میں فرق: ادائے حدیث کے متعدد صیغے مثلاً حدّثنا، أخبرنا، اور أنبانا وغیرہ ہیں۔ یہاں پر أخبرنا ذکر ہے جبکہ بعض نسخوں میں حدّثنا کا لفظ آتا ہے۔ یہ دونوں لفظ لغت میں ہم معنی ہیں اور اصطلاح میں بھی متقدمین محدثین مثلاً امام مالکؒ اور امام بخاریؒ کے نزدیک ایک ہیں۔ جبکہ امام ابن جریجؒ، امام شافعیؒ اور بعض دیگر حضرات نے ان دونوں لفظوں میں فرق بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ استاد حدیث کی قراءت کرے اور شاگرد سنے تو حدّثنا کا لفظ مستعمل ہوتا ہے اور اگر شاگرد استاد کے سامنے حدیث پڑھ کر سنائے تو أخبرنا کے لفظ سے روایت کی جاتی ہے۔ تیسرا لفظ أنبانا کا ہے جو عموماً اس موقع پر بولا جاتا ہے جہاں قرأت نہ ہو بلکہ شیخ نے صرف اجازت دی ہو۔

پھر فرق کی صورت میں تحدیث یعنی شیخ کی قرأت بہتر ہے یا اخبار یعنی شاگرد کی قرأت۔ اس میں اختلاف ہے امام ابوحنیفہؒ اور بعض آئمہ نے مؤخر الذکر کو ترجیح دی ہے۔ جبکہ دیگر اہل عراق سماع من الشیخ یعنی تحدیث کو اولیٰ کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ اس اختلاف کو اختلاف زمانہ وحالات پر محمول کیا جائے۔ متقدمین کے زمانہ میں طلبہ کے حضور اور کمال توجہ کی وجہ سے شیخ کی قرأت کو ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ نبی کریم ﷺ اور صحابہؓ کا بھی ادائے حدیث کا طریقہ یہی تھا جبکہ بعد میں طلبہ میں کمال توجہ کے فقدان کے سبب ان سے حدیث پڑھوا کر شیخ تصحیح کیا کرتا تھا۔ حضور ﷺ کی مجلس میں تو طلبہ کے حضور کی حالت اور تھی۔ حضرت عروہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ ﷺ بات کرتے تو صحابہ ایسے ساکن اور متوجہ ہوتے تھے کأنّ علی رؤوسهم الطير گویا سر پر پرندے بیٹھے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ: اس حدیث کے راوی ابوحمزہ انس بن مالک بن نضر انصاری خزرجیؓ ہیں۔ آپ ہجرت سے دس سال قبل مدینہ میں پیدا ہوئے۔ والدہ ام سلیمؓ عطر بیچا کرتی تھیں۔ جب اس میں نبی کریم ﷺ کا پسینہ ملایا تو اس کی خوشبو میں ایک خوشگوار اضافہ ہوا۔ ہجرت کے بعد حضرت انسؓ کی والدہ ان کو لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ یہ تیرا خادم ہے۔ اس کیلئے دعا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے دعا فرمائی اللھم بارک له فی ماله وولده واطل عمره واغفرله.

اے اللہ اس کے مال واولاد میں برکت دے۔ اس کی عمر دراز فرما اور اس کی بخشش فرما۔

حضرت انسؓ اخیر عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ تین دعائیں تو میری زندگی ہی میں قبول ہو چکی ہیں۔

چنانچہ اپنے صلبی اولاد میں سے اٹھانوے کو تو دفن کر چکا ہوں۔

اور مال ایسا ملا کہ میرے باغ میں پھل سال میں دو مرتبہ لگتے ہیں۔ اور زندگی ایسی ملی کہ اس سے تنگ آ چکا ہوں، جبکہ چوتھی دعا یعنی مغفرت کی قبولیت کی توقع ہے۔ آپؓ کی اولاد کی تعداد سو سے متجاوز تھی۔ صرف طاعون جارف میں آپ کی اولاد میں اسی ۸۰ افراد کا انتقال ہوا تھا۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ سو بچے پیدا ہوئے جن میں نرینہ اولاد کی تعداد اٹھتر ۷۸ تھی عمر بھی سو سال سے متجاوز تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فقہ کی تعلیم دینے کیلئے بصرہ تشریف لے گئے۔ چنانچہ بہت سے ائمہ نے آپؓ سے استفادہ کیا۔ اور وہیں ۹۳ھ میں وفات پائی (۱)۔ بصرہ میں وفات ہونے والے صحابہ میں آپ آخری صحابی تھے۔

نبی کریم ﷺ کی قد وقامت: حلیہ کی تفصیل میں سب سے پہلے حضور اقدس ﷺ کے قد مبارک کا بیان ہے۔ راوی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ زیادہ لمبے قد والے نہیں تھے۔ بائن کے معنی الگ اور ممتاز کے بھی ہوتے ہیں۔ اور بعید کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ لہٰذا طویل بائن کے معنی ہیں۔ اتنا لمبا جو دوسروں سے الگ اور ممتاز نظر آئے۔ یا وہ جس کے اعضاء ایک دوسرے سے دور دور ہوں۔

---

(۱) جمع الوسائل میں تاریخ وفات ۷۱ھ لکھی ہے جو درست معلوم نہیں ہوتی۔ شاید ناسخ نے احدیٰ و تسعین کی جگہ غلطی سے احدیٰ و سبعین لکھ دیا ہو۔ ورنہ آپ کی تاریخ وفات میں ۹۰ء، ۹۱، ۹۲، ۹۳ اور ۹۵ ہجری کے مختلف اقوال تو پائے گئے ہیں ۷۱ھ کا قول جمع الوسائل کے سوا کہیں بھی نہیں ملتا۔ بلکہ خود ملا علی قاریؒ نے مرقات میں آپ کی تاریخ وفات ۹۳ھ لکھی ہے اور یہی قول راجح بھی ہے۔ دیکھیں مرقات شرح مشکوٰۃ ج۱ ص۱۴۴ (اصلاح الدین)

ولا بالقصیر "لا" سابقہ نفی کی تاکید کے لیے ہے۔اور قصیر پستہ قد کو کہتے ہیں۔گویا آپ ﷺ پستہ قد بھی نہیں تھے۔لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ آپ میانہ قد شخص تھے۔جس طرح کہ آگے دوسری احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔لیکن بعض دیگر احادیث میں یہ بھی مروی ہے۔آپ ﷺ طول کی طرف مائل اور قریب تھے یعنی میانہ قد سے قدرے اونچے تھے۔اسلئے جہاں روایات میں مربوع (میانہ قد) کا لفظ آتا ہے اس سے مراد میانہ قد کے قریب ہے بالکل میانہ قد مراد نہیں۔حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث میں اس کی تصریح ہے۔اور حضرت انسؓ کی اس حدیث میں بھی اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کیونکہ اس میں قصیر کی تو مطلقاً نفی کی گئی ہے۔لیکن طویل کی نفی مطلقاً نہیں بلکہ طویل بائن کی نفی کی گئی ہے(۱)۔

چہرہ مبارک کا رنگ: **ولا بالابیض الا مهق ولا بالآدم: امهق مهق** سے صفت مشبہ ہے۔جو خالص سفیدی کو کہتے ہیں جسمیں نورانیت اور ملاحت نہ ہو جیسا کہ بعض گوروں یا برص کے مریضوں کا مکروہ رنگ ہوتا ہے۔اور اُدمۃ سخت گندمی رنگ کو کہتے ہیں۔جو سیاہی کی طرف مائل ہو۔خلاصہ یہ ہوا کہ آپ ﷺ کا رنگ بالکل سفید اور تیز گندمی نہیں تھا۔بلکہ ہلکا گندمی سفید رنگ تھا۔بیہقی کی روایت میں "**کان ابیض بیاضہ الی السمرۃ**" کے الفاظ آئے ہیں۔ اس حدیث سے اگلی حدیث میں آپ کو **اسمر اللون** کہا گیا ہے۔وہاں بھی دراصل سخت سفید کی نفی مقصود ہے ورنہ آپ گندمی رنگ کے نہیں تھے بلکہ پندرہ صحابہؓ نے آپ ﷺ کے رنگ کو سفید بتایا ہے(۲)۔لیکن وہ سفید مراد ہے جس میں سرخی کے خلط کیوجہ سے ملاحت ہو۔بعض روایات میں "**ازھر اللّون**" کے الفاظ آئے ہیں یعنی رُخِ انور میں تجلی اور نورانیت ہوا کرتی تھی۔اور جس روایت میں "**کان أبیض کانّما صیغ من فضّۃ**" کے الفاظ آئے

(۱) مگراس کے باوجود آپ ﷺ کا معجزہ تھا کہ مجمع میں کوئی بھی جتنا لمبا آدمی ہوتا تھا آنحضرت ﷺ اس سے کچھ لمبے معلوم ہوتے تھے۔کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

پستہ قد نہ لامبے کوئی مفہوم ہوتے ہیں　　میانہ قد سے کچھ نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں
مگر مجمع میں ہوتے تھے جب بھی حضرت والا　　نمایاں اور اونچا ہوتا تھا سر وقد بالا　(مختار)

(۲) جمع الوسائل ص۱۷،اور اسی کثرۃ روایت کی وجہ سے علامہ مناویؒ وغیرہ نے تطبیق کی بجائے سفید رنگ بیان کرنے والی احادیث کو راجح اور گندمی رنگ بیان کرنے والی احادیث کو مرجوح قرار دیا ہے۔(مختار)

ہیں اس سے بھی یہی مباحث مراد ہونی چاہیے۔

بال کھلے مگر قدرے گھنگریالے تھے: **ولا بالجعد القطط ولا بالسبط. جعودة** گھنگریالے پن کو کہتے ہیں اور **قطط** **جعد** کی صفت ہے۔اس سے مراد سخت گھنگریالے ہونا ہے۔جیسے افریقہ کے حبشی لوگوں کے بال ہوتے ہیں۔جبکہ **سبط** سین مفتوحہ اور باء ساکن یا مفتوح یا مکسور کے ساتھ کھلے ہموار بالوں کو کہتے ہیں۔جن میں سرے سے شکستگی اور موڑ نہ ہو۔لہٰذا آپ ﷺ کے بالوں کی کیفیت یہ ہوئی کہ کھلے ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے گھنگریالے بھی تھے نہ بالکل ہموار اور نہ زیادہ گھنگریالے۔حضرت انسؓ کی ایک اور روایت میں آیا ہے کہ **کان شعرہ بین شعرین لارجل سبط ولا جعد** (بیجوری)

علامہ زمخشریؒ کہتے ہیں کہ **وفی العرب جعودة وفی العجم سبوطة**۔تو گویا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عرب وعجم میں محبوب بنانے کیلئے دونوں خوبیوں سے نوازا۔

بعثت کے وقت عمر: **بعثه اللہ علی راس اربعین سنة:** چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رسالت عطا فرمائی۔محدثین کے نزدیک چالیس سال مکمل ہونے کے بعد آپ ﷺ کو نبوت عطا کی گئی۔اس لیے رأس اربعین سے مراد چالیسویں سال کا آخری سرا ہے۔نہ کہ ابتدائی سرا۔لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ ابتدائی وحی رمضان میں نازل ہوئی جبکہ آپ ﷺ کی ولادت ربیع الاول میں ہوئی تھی۔اسلئے بعثت کے وقت یقیناً آپ ﷺ کی عمر چالیس سال نہ تھی۔اس اشکال کی مختلف توجیہات ہیں بہترین توجیہہ یہ ہے کہ راوی نے کسر کا اعتبار نہیں کیا ہے ورنہ درحقیقت آپ ﷺ کی عمر ساڑھے چالیس یا ساڑھے انتالیس برس تھی۔علامہ قرطبیؒ نے اسے راجح کہا ہے۔لیکن علامہ ابن حجرؒ نے مسعودیؒ اور علامہ ابن عبدالبرؒ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت بھی ولادت کی طرح ربیع الاول ہی میں ہوئی تھی اور اس قول کو اصح الاقوال بھی کہا ہے۔اس تقدیر پر چالیس سال کی عمر میں بعثت کا قول حقیقت پر محمول ہوگا۔(۱)

---

(۱) احقر کے خیال میں یہ توجیہ بھی ممکن ہے کہ ٹھیک چالیس کی عمر میں یعنی ربیع الاول کے مہینے میں آپ ﷺ پر رؤیائے صادقہ کے نزول کا دور شروع ہوا ہو۔اور پھر چھ ماہ بعد رمضان المبارک میں پہلی وحی "اقرأ باسم ربک (الآیة) نازل ہوئی ہو اور رؤیائے صادقہ کو بھی بعثت کا زمانہ شمار کرلیا گیا ہو واللہ اعلم بالصواب (اصلاح الدین)

بعض روایات میں تریالیس (۴۳) سال کا بھی ذکر ہے۔ علامہ ملاعلی قاریؒ نے اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ نبوت چالیس سال بعد اور رسالت تریالیس سال بعد عطا کی گئی۔ اسی طرح رسالت نبوت کے تین سال بعد ملی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی وحی چالیس سال کی عمر میں آئی ہو اور پھر تقریباً تین سال فترۃ الوحی کے بعد تریالیس سال کی عمر میں تتابع سے وحی آئی ہو۔اور فترۃ وحی کے زمانہ کو بعثت میں شمار نہ کیا گیا ہو۔

<u>مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا قیام:</u> فاقام بمكة عشر سنين: جناب نبی کریم ﷺ نبوت کے بعد مکہ مکرمہ (زادھا اللّٰہ شرفاً) میں دس برس ٹھہرے مگر صحیح روایات کے مطابق آپ ﷺ نبوت کے بعد تیرہ برس تک مکہ میں رہے۔اس تعارض کو دفع کرنے کیلئے بعض شراّح نے زیرنظر حدیث کو مرجوح قرار دیکر تیرہ سال والی روایات کو متعدد وجوہ کی بناء پر راجح کہہ دیا ہے۔لیکن بعض حضرات نے تاویل کا سہارا لیکر دونوں روایتوں میں تطبیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں آپ ﷺ کو نبوت اور تین سال بعد رسالت ملی۔یوں رسول ہونے کی حیثیت سے آپ ﷺ مکہ میں دس سال رہے۔لیکن اس تاویل کو مدنظر رکھ کر بھی بعد کی عبارت یعنی ساٹھ سال کی عمر میں وفات کی بات پر اشکال باقی رہتا ہے۔اسلئے یہاں یہی کہنا بہتر ہوگا کہ راوی نے کسر کا اعتبار نہ کر کے دس سال کا ذکر کیا ہے۔اور ایک توجیہہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نبوت کے بعد قیام مکہ کے ابتدائی تین سال مخالفت اور تکالیف سے خالی ہونے کیوجہ سے باقی مکی زندگی کی طرح نہیں تھے لہٰذا انہیں عہد نبوت میں شمار نہیں کیا گیا۔

وبالمدينة عشر سنين: نبی کریم ﷺ بارہ ربیع الاول کو سوموار کے دن مدینہ منورہ پہنچے اسی سال آپ ﷺ نے ہجری سنِ تاریخ کے اجراء کا حکم دیا اور حضرت عمرؓ نے محرم کے مہینے کو پہلا مہینہ قرار دیکر تاریخ کا اجراء کیا۔اور مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے ٹھیک دس سال بعد ۱۲ ربیع الاول کو آپ ﷺ وفات پائے۔جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

<u>حضور ﷺ کی عمر مبارک:</u> على رأس ستين سنة جناب نبی کریم ﷺ کی عمر میں روایات مختلف ہیں۔اس مقام پر ساٹھ سال کا ذکر ہے۔بعض صحابہ نے پینسٹھ سال اور کچھ نے تریسٹھ سال عمر بتائی ہے۔

مؤخر الذکر قول کو صحیح ترین قول قرار دیا گیا ہے(۱)۔ جبکہ اس حدیث میں یہ تاویل کی جاتی ہے کہ یہاں راوی نے کسر کا الغاء کر کے اس کا اعتبار نہیں کیا ہے جبکہ پینسٹھ سال والے قول کے بارے میں شراح حدیث کہتے ہیں کہ راوی نے ولادت اور وفات کے دو سال مستقل گن کر اصل عمر میں دو سال کا اضافہ کر دیا ہے۔ جبکہ یہ دونوں سال پورے سال نہیں تھے۔

تاحیات حسنِ زلف کی بقاء: ولیس فی راسه ولحیته عشرون شعرة بیضاء وفات کے وقت حضور اکرم ﷺ کے سر اور داڑھی میں بیس بال سفید نہیں تھے۔ حضرت انسؓ کی دیگر روایات میں ان سفید بالوں کی تعداد گیارہ، چودہ، سترہ یا اٹھارہ مذکور ہے۔ ابن عمرؓ کی حدیث میں بیس کے قریب بتائے گئے ہیں۔

اس کی تحقیق اور مزید تفصیل تو ریش مبارک کے باب میں آجائے گی۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ سفید بال نور اور وقار ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے احادیث میں ان کی مدح فرمائی ہے پھر نبی کریم ﷺ اس منقبت سے محروم کیوں رہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ سفید بال واقعۃً وقار اور قابل لحاظ حیثیت پر دلالت کرتے ہیں لیکن جوان جذبات کے حامل افراد اور بالخصوص عورتوں کی نظر میں بالکل سفید بال ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ اور شاید اسی حکمت کو مدنظر رکھ کر نبی کریم ﷺ نے تغییرِ شیب یعنی سفید بالوں کو رنگنے کا حکم دیا ہے تاکہ حسن اور نفاست برقرار رہے۔ ولم یشنهُ اللّٰه بالشیب (۲)۔ اور چونکہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر قسم کے قابل نفرت احوال و کیفیات سے برأت اور ہر قسم کی محبوبیت عطا فرمائی تھی اس لیے آپ ﷺ کو بالوں میں سفیدی بھی محض علامتی طور پر ظاہر کر دی تاکہ ہدایت میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے اور کوئی شخص بھی طبعی نفرت کا بہانہ نہ کر سکے۔ نہ ازواج مطہرات کی طبیعت میں ناپسندیدگی آسکے۔

---

(۱) امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے أنّ النبیّ ﷺ توفی وهو ابن ثلاث ستین (صحیح بخاری ۱/۱ ۵۰) اور اسی پر علماء کا اتفاق ہے (مختار)

(۲) مگر بالوں یا داڑھی کا سفید ہونا کوئی عیب نہیں بلکہ وقار کی علامت ہے ایک روایت میں آتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے بال سفید ہوئے تھے آپؑ نے جب دیکھا تو حیران ہو کر اللہ تعالیٰ سے استفسار کیا تو اللہ جل شانہ نے فرمایا یہ تو مؤمن کی وقار ہے تو اسپر آپؑ نے یہ دعا کی اللّٰھمّ زدنی وقارا کہ اے اللہ میرے اس وقار میں اضافہ فرما۔ (مختار)

پھر نبی کریم ﷺ سے نفرت یا ناپسندیدگی میں کفر کا خطرہ بھی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سفید بالوں کی طرح دیگر عیوب سے بھی محفوظ رکھا۔ حتیٰ کہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ نبی کریم ﷺ کالے تھے تو کافر ہو جائے گا۔

(۲) حدثنا حمید بن مسعدة البصریّ ثنا عبدالوهاب الثقفیّ عن حمید عن أنس بن مالک قال کان رسول الله ﷺ ربعة و لیس بالطویل و لا بالقصیر حسن الجسم و کان شعره لیس بجعدو لا سبط اسمر اللون اذا مشیٰ یتکفّأ (۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ میانہ قد تھے نہ زیادہ لمبے اور نہ پستہ قد۔ خوبصورت معتدل بدن والے تھے آپ ﷺ کے بال نہ بالکل گھنگریالے تھے نہ بالکل سیدھے۔ نیز آپ ﷺ گندمی رنگ کے تھے جب راستہ پر چلتے تو آگے کی طرف جھکے ہوئے چلتے تھے۔

<u>حمید الطّویل کون تھے؟</u> **عن حمید عن انسؓ** حضرت انسؓ سے روایت کرنے والے تابعی کا نام حمید ہے۔ لیکن حمید الطّویل کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ علامہ مناویؒ نے اس کے نام کے بارے میں آٹھ دیگر اقوال بھی ذکر کئے ہیں (۲)۔ **الطویل** کے نام سے شہرت کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اگر چہ یہ شخص خود لمبے نہیں تھے لیکن اس کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ کسی مردے کے ساتھ کھڑے ہو کر ہاتھ پھیلاتے تو ایک ہاتھ میت کے سر اور دوسرا اس کے پاؤں سے جا لگتا تھا۔ اور بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ اس کا ایک دوسرا پڑوسی بھی اس کا ہم نام تھا اور وہ اس کی نسبت زیادہ پستہ قد تھا لہٰذا حضرت انسؓ کے اس شاگرد کو **حمید الطویل** اور اس دوسرے شخص کو **حمید القصیر** کہا جانے لگا۔ حمیدؒ کی وفات بھی نماز میں کھڑے کھڑے ہوئی تھی۔ <u>۱۴۲ھ یا ۱۴۳ھ</u> میں وفات پائی۔

---

(۱) جامع ترمذی ۱/۳۰۳ کتاب اللباس باب ماجاء فی الجمة واتخاذالشعر، شرح السنة للبغوی ۱۳/۲۲۰ باب صفة النبی ﷺ رقم حدیث ۳۶۴۰ (مختار)

(۲) تیرویہ، دارویہ، طرحان، مہران، عبداللہ، عبدالرحمٰن، مخلد وغیرہ (مختار)

قد کابیان: کان رسول اللہ ﷺ ربعۃً(۱)،ربعۃ راءمفتوحہ کےساتھ مربوع کےمعنی میں ہے۔جس کامعنی میانہ قد کے ہوتے ہیں راوی خوداس لفظ کی تشریح لیس بالطویل و لا بالقصیر سے کر رہے ہیں۔لیکن یہ بات،ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ میانہ قدی سے قدرے طول کی طرف مائل تھے۔

حسن الجسم قد کاحسن بیان کرنے کے بعد تعمیم کرتے ہیں کہ ہرلحاظ سے آپ حسین تھے۔حسی اور عقلی اعتبار سے آپ ﷺ کا جسم حسین اور جاذب نظر تھا۔اور رنگ،بدن کی نرمی اور ساخت کے لحاظ سے تمام بدن میں حسن واعتدال تھا۔گویا نہ زیادہ موٹے تھے نہ بالکل کمزور بلکہ سڈول جسم،متوازن اور متناسب اعضاء کے مالک تھے۔اور اگرچہ حسن میں ہر علاقہ کے لوگوں کا معیار مختلف ہوتا ہے لیکن تناسب اعضاء سب کے ہاں قدر مشترک ہے۔جبکہ حسن صورت تناسب اعضاء کا نام ہے۔

لون أسمر کی توجیہ: أسمر اللون آپ ﷺ کے رنگ کے بارے میں پچھلی حدیث میں تفصیل گذر چکی ہے یہاں اسمر کہا گیا ہے جسکے معنی ہیں سانولا یعنی سیاہی مائل سرخ۔اب صحیح روایات کے مطابق یہ روایت حقیقت سے بعید لگتی ہے اس لئے بعض لوگوں نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہاں بدن کے ان حصوں کے رنگ کا بیان ہے جو دھوپ میں کھلے رہنے کی وجہ سے سیاہی مائل ہو چکے تھے جبکہ آپ ﷺ کے بدن کا اصل رنگ سفید تھا اور بعض لوگوں کے خیال میں یہاں لفظ میں تصحیف ہوگئی ہے اصل میں أزھر اللون یعنی پھول جیسا چمکدار رنگ والے تھے جبکہ علامہ ابن جوزیؒ نے اس روایت ہی کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔

باوقار چال کی کیفیت: اذا مشیٰ یتکفّا یعنی چلتے ہوئے آگے کی طرف جھکے ہوئے ہوتے تھے(۲)۔ جیسا کہ دوسری روایات میں آتا ہے کانّما ینحطّ من صبب یعنی گویا آپ اترائی میں اتر رہے ہوں۔ یہ شجاعت،ہیبت اور وقار کی رفتار ہوتی ہے۔بعض لوگوں نے اس جملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ آپ ﷺ جب

---

(۱)ربعۃ کی جمع رَبَعَات،رَبْعَات اور مربوعات آتی ہے جس کامعنی ہے المتوسط بین الطویل و القصیر (مناوی ص۱۶)
یہاں آنحضرت ﷺ کیلئے مؤنث کا صیغہ باعتبار نفس استعمال کیا گیا ہے کہا جاتا ہے رجل ربعۃ وامراۃ ربعۃ (مختار)
(۲)جدید حکماءاطباء نے اس کے کئی فوائد بھی بیان کئے ہیں (۱)جوڑوں میں درد نہیں ہوگا(۲)سفر میں تھکاوٹ محسوس نہیں ہوگی(۳)نگاہ تیز ہوگی(۴)یہ بات یورپین سیاحوں کی کتابوں میں ملتی ہے کہ لمبے سفر میں پاؤں کے پنجوں پر وزن ڈالو اور قدرے جھک کر چلو اس طرح سفر جلدی طے ہو جائے گا(مختار)

چلتے تو سرعت کیساتھ چلتے تھے۔ اور بعض شرّاح کے نزدیک معنی یہ ہے کہ چلتے ہوئے قوت کیساتھ قدم اُٹھاتے تھے تینوں تشریحات اپنی جگہ صحیح ہیں آپ ؐ کی رفتار کے بارے میں مستقل باب میں تفصیل آجائے گی

(۳) حدّثنا محمّد بن بشّار یعنی العبدیّ ثنا محمّد بن جعفر ثنا شعبة عن أبی اسحٰق قال سمعت البراء بن عازب یقول کان رسول اللّٰہ ﷺ رجلاً مربوعاً بعید ما بین المنکبین عظیم الجمّة إلی شحمة اذنیه علیه حلّة حمراء مارأیت شیئاً قط أحسن منه(۱).

ترجمہ: حضرت براء بن عازب ؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک میانہ قد آدمی تھے آپ ﷺ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان قدرے زیادہ فاصلہ تھا۔ لمبے بالوں والے تھے جو کان کی لو تک آئے تھے آپ ﷺ پر ایک سرخ (دھاری دار) جوڑا تھا۔ میں نے آپ ﷺ سے زیادہ حسین کبھی کوئی چیز نہیں دیکھی۔

راوی حضرت براء بن عازب ؓ: عن براء بن عازب ؓ ابوعمارہ براء بن عازب ؓ انصاری حارثی اوسی صحابی ہیں ان کے والد بھی صحابی ہیں حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کے ہم عمر ہیں۔ کوفہ میں رہا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کے ہمراہ سب سے پہلے غزوہ خندق میں شرکت کی۔ نیز حضرت علی ؓ کے ہمراہ جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں شریک رہے ۷۲ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔

کان رسول اللّٰہ ﷺ رجلاً مربوعاً: یعنی نبی کریم ﷺ میانہ قد آدمی تھے اس جگہ اگرچہ کان کا خبر بظاہر رجُلاً ہے لیکن مقصود مربوعیة کا اثبات ہے نہ کہ رجلیة کا۔ اور مربوعیة کی بات بھی تقریبی ہے کیونکہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ میانہ قد سے اونچے تھے بعض شرّاح کہتے ہیں کہ یہ لفظ رجلاً بکسر الجیم ہے۔ جس میں بالوں کی صفت بیان کرنا مقصود ہے یعنی آپ ﷺ کے بال کھلے ہوئے تھے زیادہ

(۱) صحیح بخاری ۵۰۲/۱ کتاب المناقب باب صفة النبی ﷺ، صحیح مسلم ۲۵۸/۲ کتاب الفضائل باب فی صفة شعر النبی ﷺ وصفاته، الخ، ابو داؤد ۲۰۷/۲ کتاب اللباس باب فی الرخصة فی ذلک.(مختار)

گھنگریالے نہ تھے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ مردانگی بیان کرنا بے معنی ہے اور کسی بھی صحابی سے مروی نہیں ہے۔لیکن پہلی تاویل بھی صحیح ہے۔کیونکہ رجلاً دراصل توطۂ ہے مربوعاً کیلئے جو بالذات مقصود ہے۔اب بھی کہتے ہیں فلاں ایسے آدمی تھے۔

<u>سینہ اور کولھوں کی چوڑائی:</u> **بعید ما بین المنکبین،** بعید باء کے فتح کے ساتھ فعیل کے وزن پر ہے جبکہ بعض روایات میں باء کے ضمہ کے ساتھ تصغیر کے صیغہ پر آیا ہے۔ منکب کندھے کو کہتے ہیں اس طرح اس حدیث میں اس بات کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کے کولہوں کے درمیان فاصلہ تھا جو پیٹھ کے بالائی حصہ کی چوڑائی پر دلالت کرتا ہے نیز اس کے ساتھ سینہ کی چوڑائی بھی لازم ہے۔اور یہی درحقیقت مقصود بھی ہے کیونکہ سینہ کی فراخی سخاوت، وقار اور نجابت کی علامت ہے۔

<u>زلف مبارک:</u> **عظیم الجمّة جمّة** جیم کے ضمہ کیساتھ **جموم** سے ہے جس کے معنی اجتماع کے ہوتے ہیں۔**وتحبون المال حبّاً جمّا** اس لفظ کے مفہوم کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے بعض کے ہاں یہ وفرہ سے بڑھے ہوئے بالوں کو کہتے ہیں۔بعض کے ہاں پیشانی کے بالوں کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے لیکن علامہ ابن اثیرؒ نے لکھا ہے کہ سر کے وہ بال جو کانوں کے لوتک پہنچے وفرہ کہلاتے ہیں۔اور اگر اس سے قدرے لمبے ہوں تو لمہ کہلاتے ہیں۔اور اس سے بڑھ جائیں اور کندھوں پر پڑے رہیں تو جُمہ کہا جائیگا۔ ترتیب کو لفظ ولج میں اشارہ ہے یعنی واو وفرہ لام لمہ اور جیم جُمّة۔اور اسی تحقیق کو علامہ بیجوریؒ اور بعض دیگر شرّاح نے ترجیح دی ہے۔لہٰذا اس تحقیق کے مطابق اس مقام پر جمہ سے مراد وفرہ ہوگا کیونکہ یہاں "**إلىٰ شحمة الاذن**" کی قید لگادی گئی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ **شحمة الخ** کا قید عظیم کے لفظ کیلئے ہے نہ کہ جمہ کیلئے۔تو مطلب یہ ہوا کہ جمہ کا بڑا حصہ کانوں کی لووں تک تھا لیکن کچھ بال بڑھ کر کندھے پر بھی پڑے رہتے تھے۔نبی کریم ﷺ کے بالوں کی لمبائی کے بارے میں روایات مختلف ہیں جو کہ مختلف اوقات اور ازمنہ پر محمول ہیں۔ان کی تفصیل اپنے باب میں آجائے گی۔

<u>سرخ جوڑے کا استعمال:</u> **علیہ حلّة حمراء** ایک جیسے دو کپڑوں کو جو ایک ساتھ مستعمل ہوں حُلّة ہے۔اردو میں جوڑا کہتے ہیں۔یہ عموماً ازار یعنی لنگوٹی اور رداء یعنی اوڑھنے کے چادر پر مشتمل ہوتا تھا جو دو یمنی

لکیر دار چادروں کا مجموعہ تھا اور اسی وحدت کی بناء پر اس کی صفت مفرد دلائی گئی ہے۔مگر یہاں سرخ رنگ کے جوڑے کا ذکر ہے جس سے امام شافعیؒ اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ سرخ لباس کا پہننا جائز ہے۔جبکہ احناف کے نزدیک خالص سرخ لباس مردوں کیلئے جائز نہیں (۱)۔تو حدیث مذکور سے جواب یوں دیا جاتا ہے کہ یہ جوڑا یا تو ان دو چادروں سے مرکب تھا جن میں سرخ لکیریں تھیں۔خالص سرخ جوڑا نہیں تھا (۲)۔

جسطرح کہ یمنی چادروں کے بارے میں معروف بات ہے کہ خالص سرخ نہیں ہوتے تھے۔اور اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ جوڑا جو آپ ﷺ زیب تن کئے ہوئے تھے خالص سرخ تھا تو ہم کہتے ہیں کہ یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیات میں سے تھا۔دوسرے لوگوں کیلئے جائز نہیں اور یا یہ کہ آپ ﷺ نے یہ جوڑا منع کئے جانے سے قبل پہنا ہوگا۔اور سرخ لباس سے نہی بعد میں وارد ہوئی۔جس طرح کہ احادیث نہی اس پر ناطق ہیں۔

<u>حسن بے مثال:</u> ما رأیت شیئاً أحسن منه ۔میں نے ان سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں دیکھی۔یعنی نہ کوئی انسان نہ سورج نہ چاند۔نہ اور کوئی چیز ان سے زیادہ حسین نظر آئی۔اس تعمیم سے صحابی کی محبت ظاہر ہوتی ہے۔نیز حقیقت میں اہل علم کا اس پر اتفاق بھی ہے کہ آپ ﷺ کو جس قدر ظاہری محاسن سے نوازا گیا تھا۔کائنات کی کوئی چیز بھی ان محاسن تک نہیں پہنچ سکتی۔اس لیے یہ حقیقت ہے کہ آپ ﷺ سے زیادہ حسین

---

(۱) علماء احناف میں علامہ سرخسیؒ امام شافعیؒ کی طرح سرخ لباس کو جائز سمجھتے ہیں۔لکھتے ہیں وفیہ دلیل أنّه لابأس بلبس الثوب الأحمر (شرح السیر الکبیر ۱/۱۱۵) مگر ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے والحاصل أنّ عندنا یؤوّل الحمراء بالتی لها خطوط حمراء ویعدّ من خصائصه ﷺ بعد تسلیم صحة الحدیث اویحمل لبسه علی ماقبل نهیه (جمع الوسائل ۱/۲۱) گویا علماء احناف کے ہاں بھی یہ مسئلہ مختلف فیہا ہے بقول علامہ شامیؒ کے کہ علامہ شرنبلالیؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس میں انہوں نے سرخ لباس پہننے کے بارے میں آٹھ اقوال ذکر کیے ہیں اور ترجیح کراہت کو دی ہے۔أقول ولکنّ جل الکتب علی الکراهة کالسراج والمحیط والاختیار والمنتقیٰ والذخیرة وغیرها وبه افتی العلامة قاسم اه (ردالمحتار ۶/۳۵۸ کتاب الکراهیة فصل فی لبس (مختار)

(۲) اور اس کی تائید حضرت قدامہ کلابیؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو عرفہ کی رات دیکھا کہ آپ ﷺ کے جسم مبارک پر سرخ دھاری دار منقش حلّہ تھا (مختار)

کوئی بھی نہیں۔غالباً حضرت حسان بن ثابتؓ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

واحسن منک لم ترقط عینی واجمل منک لم تلدالنساء

خلقت مبرأً من کل عیبٍ کانّک قدخلقت کماتشاء

اورام المؤمنین سیدنا عائشہؓ نے آپ ﷺ کے حسن کے بارے میں فرمایا ہے

لواحی زلیخالورأین جبینه لاثرنّ بالقطع القلوب علی الید

اسی طرح شاعر نے کہا حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضاء داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(۴) حدّثنا محمود بن غیلان ثنا وکیع ثنا سفیان عن أبی اسحاق عن البراء بن عازب قال ما رأیت من ذی لمّة فی حلّة حمراء أحسن من رسول اللّٰه ﷺ له شعر یضرب منکبیه بعید مابین المنکبین لم یکن بالقصیر ولا بالطویل(۱).

ترجمہ: حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ میں نے کانوں سے لمبے بال رکھنے والے کسی شخص کو سرخ جوڑا پہنے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا۔ نبی کریم ﷺ کے بال مونڈھوں تک آرہے تھے۔آپ ﷺ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان کا حصہ ذرا زیادہ چوڑا تھا۔آپ ﷺ نہ پستہ قد تھے نہ زیادہ لمبے تھے۔

سفیان ثوری یا ابن عینیہ: حدّثنا سفیان، اس میں اختلاف ہے کہ یہ کونسے سفیان ہیں۔بعض شرّاح کہتے ہیں کہ ابواسحٰق ہمدانیؒ کے مشہور تلامذہ میں سفیان بن عیینہؒ ہی ہے۔اس لئے وہی مراد ہیں۔لیکن علامہ قسطلانیؒ کا خیال ہے کہ یہ سفیان ثوریؒ ہیں کیونکہ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں یہی حدیث اسی سند کے ساتھ ذکر کی ہے۔جس میں انہوں نے ثوری کی تعیین کی ہے۔ملاعلی قاریؒ نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

---

(۱)صحیح بخاری ۱/۵۰۲ کتاب المناقب باب فی صفة النبی ﷺ،شرح السنة للبغوی ۱۳/۲۲۴ باب صفة النبی ﷺ(مختار)

کیفیات لمّہ، جمّۃ، وفرۃ میں تطبیق: ما رأیت من ذی لـمّۃٍ فی حلّۃ حمراء الخ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی جسم مبارک کی کچھ تفصیل کے ساتھ ساتھ بالوں کا بھی ذکر ہے یہاں لمّہ کا ذکر ہے جبکہ جمّہ کا ذکر پچھلی حدیث میں کیا گیا ہے آپ ﷺ کی بالوں کی کیفیت بدلتی رہتی تھی۔کبھی وفرہ کبھی اس سے بڑھ کر لمّہ اور کبھی اس سے بھی بڑھ کر جمّہ تک پہنچ جاتے تھے۔اس لئے صحابہ میں سے جس نے جس حالت میں آپ ﷺ کو دیکھا بیان فرمایا۔چنانچہ بالوں کے بارے میں روایات میں تعارض نہیں ہے۔''من ذی لمّۃ''میں من تاکید عموم کی غرض سے زائد لایا گیا ہے۔ذی کبھی اشارہ کیلئے آتا ہے اور کبھی صاحب کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔یہاں مؤخر الذکر معنی مراد ہے۔لمّہ وہ بال ہیں جو کان کے لو سے نیچے بڑھ جائیں۔ المام کا معنی نزول ہے اسی سے لمّہ مستعمل ہے۔اور لـمّ یلـمّ کا ایک معنی جمع کرنا بھی ہے۔کہا جاتا ہے۔لـمّ اللّٰـہ شعث فلانٍ۔یعنی اللہ تعالیٰ اس کے پراگندہ امور کو مجتمع کردے۔گویا کانوں کے نیچے بالوں کو جمع کردیا جاتا ہے۔ فـی حـلّۃ حمـراء یہ حال ہے ترکیب میں۔یعنی اس حال میں کہ وہ صاحب لمّہ سرخ جوڑا پہنے ہوئے ہو۔پہلے بتایا جاچکا ہے کہ حمراء سے مراد خالص سرخ رنگ کا جوڑا نہیں۔بلکہ یہ دراصل سرخ مخطّط کپڑا ہوتا تھا جس میں دوسرے رنگ کی دھاریں ہوتی تھیں۔ہاں بظاہر سرخ اس لیے نظر آتا تھا کہ دوسرا رنگ مغلوب ہوجاتا تھا۔اس سلسلے میں تفصیل باب لباس رسول اللہ ﷺ میں آرہی ہے۔مـا رأیت یہاں رؤیۃ سے رویۃ بصری مراد ہے اس لئے یہ فعل ایک مفعول چاہتا ہے۔اس صورت میں "احسن" ذی لمّہ سے حال ہوگا۔اور اگر رویۃ قلبی مراد ہو تو فعل دو مفعولوں کا مقتضی ہوگا۔

لہٗ شَعَرٌ شعر بالوں کو کہتے ہیں۔اور اس میں چار لغات ہیں شَعْرٌ سکون عین کے ساتھ۔شَعَرٌ عین کے فتحہ کے ساتھ۔شَعْرۃٌ عین کے سکون اور تاء کے ساتھ۔اور شَعَرَۃٌ عین کے فتح اور تاء کے ساتھ۔ یہاں پہلے دونوں لغتوں کے مطابق مروی اور مستعمل ہے۔

یضرب منکبیہ، یضرب یصل کے معنی میں ہے۔اور لمّہ کی صفت ہے۔پہلے بھی گزر چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بال مونڈھوں کو چھوتے تھے لیکن یہاں یہ اشکال ہے کہ مونڈھوں کو جو بال چھوتے ہیں۔ان کو جمّہ کہتے ہیں جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اور یہاں تو لمّہ کا ذکر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان

الفاظ کا ایک دوسرے کی جگہ استعمال شائع ہے۔اس لیے یہاں لمّہ کا ذکر ہے۔لیکن مراد جمّہ ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ لمّہ ہی مراد ہو اگر چہ براہ راست مونڈھوں تک نہیں پہنچتا۔لیکن اگر بال کان کی لو سے بڑے ہوئے اور گھنے ہوں۔تو سر کو حرکت دینے سے بال کندھوں تک آ جاتے ہیں بہر حال اس صورت میں بال ہر وقت مونڈھوں سے لگے ہوئے نہ تھے بلکہ حرکت کے وقت مونڈھوں کو چھوتے تھے۔

<u>مونڈھوں کے درمیان وسعت:</u> **بعید مابین المنکبین،** منکب نکب سے ماخوذ ہے۔ پھیرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔کہا جاتا ہے نکبت و جھه. میں نے اس کا منہ پھیرا۔چونکہ کسی طرف مڑنے اور پھرنے میں مونڈھوں کو پھیرنا پڑتا ہے۔اس لیے مونڈھے کو منکب کہا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ کے مونڈھے کے درمیان وسعت تھی لیکن تھوڑی۔ بعید کو تصغیر کے صیغہ سے اس لیے لایا کہ زیادہ چوڑائی کبھی جسمانی طور پر بدصورتی کا باعث بنتی ہے۔ جبکہ کچھ نہ کچھ فاصلہ ضروری بھی ہے اور مونڈھوں کے درمیان فاصلے کی وجہ سے سینہ بھی چوڑا پڑتا ہے۔جو کہ مردانہ حسن کا حصہ ہے اور نہایت درجہ کی بردباری اور تحمل پر بھی دلالت کرتا ہے۔

(۵) عن محمّد بن إسماعيل ثنا أبو نعيم ثنا المسعوديّ عن عثمان بن مسلم بن هرمز عن نافع بن جبير بن مطعم عن عليّ بن أبي طالبؓ قال لم يكن النبيّ ﷺ بالطويل و لا بالقصير شثن الكفين والقدمين ضخم الرأس ضخم الكراديس طويل المسربة اذا مشٰى تكفّأً كانّما ينحط من صبب لم ارقبله و لا بعده مثله ﷺ.

حدّثنا سفيان بن وكيع ثنا أبي عن المسعوديّ بهذا الاسناد نحوه بمعناه(۱) .

ترجمہ: حضرت علی بن ابی طالب سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نہ زیادہ لمبے تھے نہ پستہ قد، ہتھیلیاں اور دونوں پاؤں پُر گوشت تھے (یا سخت تھے) بڑے سر

---

(۱)المستدرک للحاکم ۶۰۶/۲، جامع ترمذی ۱۸۳/۲ کتاب المناقب باب ماجاء فی صفة النبی ﷺ (مختار)

والے تھے اور ہڈیوں کے جوڑ بھی بڑے بڑے تھے۔ سینہ سے ناف تک بالوں کی ایک باریک دھاری تھی۔ جب چلتے تھے تو قوت سے چلتے تھے جیسے کسی اونچی جگہ سے نیچے کو اتر رہے ہوں۔ میں نے نبی کریم ﷺ جیسا نہ آپ سے پہلا دیکھا اور نہ بعد میں دیکھا۔

<u>سند کو خلاف عادت عن سے شروع کرنے کی وجہ:</u> عن محمد بن إسمٰعیل. امام ترمذی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سند کو حدثنا سے شروع کرتے ہیں لیکن یہاں پر انہوں نے سند کو حدثنا سے شروع کرنے کی بجائے عن سے شروع کیا ہے۔ شراح کہتے ہیں کہ یہ یا تو شاگردوں کی ترمیم ہے یا پھر یہ جدت امام ترمذی نے قصداً کی ہے۔ اور حدثنا سے ذکر کرنے کا التزام انہوں نے جامع ترمذی میں کیا ہے جبکہ شمائل ترمذی مستقل کتاب ہے لیکن بعض نسخوں میں حدثنا محمّد بن اسماعیل کے الفاظ بھی ہیں۔

یہ حدیث امام ترمذی نے امام بخاریؒ سے روایت کی ہے۔ جو ترمذی کے شیوخ میں سے ہیں۔ امام ترمذی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ خود امام بخاریؒ نے بھی ان سے روایت کی ہے جس کو روایة الأکابر عن الأصاغر کہا جاتا ہے۔

ھرمز: یہ نام بعض کے نزدیک منصرف اور بعض کے نزدیک عجمہ اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے لیکن دوسرا قول راجح ہے۔

<u>علی بن ابی طالبؓ:</u> حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلفائے راشدین میں سے چوتھے خلیفہ ہیں۔ باپ کا نام عبد مناف اور کنیت ابوطالب تھی۔ ماں کا نام فاطمہ بنت اسدؓ تھا جو ایمان اور ہجرت دونوں سے مشرف ہو چکی تھیں۔ خود آپ کی کنیت ابوتراب اور ابوالحسن ہے۔ بچوں میں آپ بالاتفاق سب سے پہلے ایمان لائے اور بعض اقوال کے مطابق آپ مردوں میں بھی سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر مختلف اقوال کے مطابق پندرہ، چودہ، تیرہ، آٹھ یا دس سال تھی۔

<u>حضرت علیؓ کا اعزاز:</u> جنگ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ شریک رہے اس جنگ میں بھی خود نبی کریم ﷺ نے آپ کو مدینہ طیبہ میں یہ کہہ کر ٹھہرایا کہ ''أما ترضٰی ان تکون منّی بمنزلة هارون من موسٰی الّا أنّه لا نبّی بعدی'' کیا تجھے یہ پسند نہیں کہ تیری نسبت مجھ سے ایسی ہو

جیسے ہارونؑ کوموسیٰؑ سے تھی۔ہاں مگرمیرے بعدکوئی نبی آنیوالانہیں۔

آپؓ کا رنگ گہرا سانولا تھا، بڑی بڑی آنکھیں تھیں، قد سے پستہ قد تھے، بڑی داڑھی اور سر مبارک میں گنجاپن تھا۔حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد اٹھارہ ذی الحجہ ۳۵ھ کو مسند خلافت پر بٹھادیئے گئے۔ چار سال نو ماہ اور چند دن خلافت کا فریضہ انجام دیا۔سترہ رمضان ۴۰ھ کو بروز جمعہ صبح کی نماز کے وقت عبدالرحمن بن ملجم مرادی نے کوفہ میں خنجر مارااور تین دن بعدوفات پائے۔آپ کے دونوں بیٹوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور بھتیجے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے آپ کو غسل دیا۔حضرت حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی،اوروہیں دفن ہوئے آپ کی عمر تریسٹھ برس تھی۔اہلسنت کا اس پر اجماع ہے کہ مرتے وقت روئے زمین پر آپ سے افضل شخص نہ تھا۔

تشریح حدیث: لـم يـكـن الـنبی ﷺ بالطویل نبی کریم ﷺ کے قدوقامت کا بیان ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نہ زیادہ لمبے تھے نہ زیادہ کوتاقد، بلکہ میانہ قدوالے تھے۔لیکن یہاں مراد أقـرب إلـیٰ الطول ہے۔یعنی میانہ قد سے کچھ اونچے تھے۔جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

ہتھیلیوں کی سختی اورنرمی: شثن الكفين، شثـن سمِعَ اور کَرم دونوں بابوں سے آتا ہے جس کے معنی ہیں غَـلُظَ و خَشُن یعنی سخت اور کھردراہونا۔یہ نعومت اور لین کے مقابل ہے کام اور محنت کی وجہ سے ہاتھ کی سختی کو شثن کہتے ہیں۔امام اصمعی لغت کے امام ہیں انہوں نے شثـــن کی تشریح میں کہا ہے کہ الغليظ الاصابع من الكفين و القدمين (۱)۔یعنی شثن اس آدمی کو کہا جاتا ہے جس کے ہاتھ پاؤں کی انگلیاں سخت اور کھردری ہوں۔لیکن علامہ ابن حجرؒ نے شثـن الـكـفيـن و القدمين کی تـفسیر غَـلـيظُ الاصـــابـع و الـــراحة سے کی ہے۔یعنی صرف انگلیوں کی خشونت نہیں بلکہ ساتھ ساتھ ہتھیلیوں کی سختی

(۱)شثن الکفین الخ مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اور منصوب بھی،مرفوع کی صورت میں یہ خبر ہے اور مبتداء محذوف ہوگئی اور منصوب کی صورت میں کان مقدر کے لئے خبر ہے۔ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے قـال میرک الروایة فيه بالرفع فيكون خبـراً هوالمحذوف قيل ويجوزالنصب ليكون خبراً لكان المقدر(جمع الوسائل ۱/۲۵) اورنصب کی صورت اس میں حال ہونے کا بھی احتمال ہے(مناوی)(مختار)

بھی مراد ہےاوراس کی تائید ضخم الکفین و القدمین سے بھی ہوتی ہے(۱)۔

<u>اشکال وازالہ:</u> لیکن یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ دوسرے مقام پر حضرت انسؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ "ما مسستُ خزاً ولا حریرا الین من کف رسول اللہ ﷺ"یعنی میں نے ریشمی کپڑے کوبھی نبی کریم ﷺ کے ہاتھ سے نرم نہیں پایا۔

اس حدیث کا بظاہر حضرت علیؓ کی حدیث سے تعارض معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں سختی کا ذکر ہے۔
بعض حضرات نے دونوں حدیثوں میں تطبیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کام کاج اور محنت و مشقت کیا کرتے تھے اور صحابہؓ کے ساتھ خدمت میں شرکت فرماتے جیسا کہ غزوہ خندق کے موقع پر خندق کی کھدائی اور دوسرے مواقع پر لکڑیاں کاٹنے اور جمع کرنے کے کام میں آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ برابر کے شریک رہے۔تو ایسی حالت میں آپ ﷺ کے ہاتھ سخت ہوجاتے جبکہ عام حالات میں آپ ﷺ کے ہاتھ نرم ہوتے تھے۔ابن بطالؒ نے شثن الکفین و القدمین (۲) کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ مملوءۃ لحماً۔

---

(۱) بخاریؒ۔کہاجاتا ہے کہ امام اصمعیؒ نے شثن کا ترجمہ غلیط الاصابع و القدمین سے کیا۔تو کسی نے ان پر یہ اعتراض کیا۔کہ یہ لفظ تو نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں کے بارے میں آیا ہے۔اس پر انہوں نے قسم کھائی کہ آئندہ کے لیے وہ کبھی بھی حدیث میں وارد الفاظ کی تشریح نہیں کریگا۔(مناوی۔۔جمع الوسائل ص۲۵)(اصلاح الدین)

شثن کی لغت میں دومعانی ہیں (۱) کھردراہونا (۲) پرگوشت ہونا، یہاں دوسرا معنی مراد ہے اسلئے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ مبارک ریشم سے زیادہ نرم تھے۔اوراس کی تائید حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی ہتھیلی گوشت سے پُرتھی۔اور حضرت ھند بن ابی ہالہ سے روایت ہے کہ آنخضرت ﷺ کی ہتھیلی ذرا پھیلی ہوئی تھی۔ملاعلی قاریؒ نے جمع الوسائل میں لکھا ہے کہ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ آنخضرت ﷺ کی ہتھیلی مبارک کا کشادہ ہونا سخاوت سے کنایہ ہے۔اورعلامہ مناویؒ نے فرمایا ہے کہ یہ وسعت قوت کی طرف اشارہ ہے(جمع الوسائل ۱/۲۵) یادرہے کہ ہتھیلی کا کشادہ اور پُرگوشت ہونا مردوں میں ممدوح اور خواتین میں مذموم ہے(مختار)

(۲) حضرت ھند بن ابی ہالہؓ کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک پُرگوشت تھے۔ملاعلی قاریؒ نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کے پاؤں کی انگلیاں موٹی تھیں۔

(جمع الوسائل ۱/۲۰)(مختار)

یعنی آپ ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں گوشت سے بھرے ہوئے تھے گویا شثن سے سختی مراد نہیں۔ اس صورت میں دونوں حدیثوں میں تعارض ہی نہیں۔

سرمبارک: ضخم الرّاس، ضخم اور ضخامت دونوں مصدر آتے ہیں جسم میں بڑے ہونے کو کہتے ہیں جیسے بڑی کتاب "کتاب ضخیم" کہتے ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کا سر بڑا تھا۔ حکماء، اطباء اور علم الابدان کے ماہرین کہتے ہیں کہ سر کا بڑا ہونا، دماغی قوتوں کے کمال پر دلالت کرتا ہے۔ یہ وصف موجود ہو، تو فکری، نظری اور دماغی قوتیں صحیح اور درست ہونگی۔ لہٰذا سر کا بڑا ہونا خوبی ہے۔

ضخم الکرا دیس۔ کرادیس کردوس کی جمع ہے بعض شرّاح کا خیال ہے کہ کردوس عظم الرأس یعنی ہڈی کے سرے کو کہتے ہیں۔ جو دوسری ہڈی سے ملکر جوڑ بنتا ہے اور بعض کے خیال میں کردوس "مجتمع العظمین التقیا" یعنی دو ہڈیوں کے آپس میں ملنے کی جگہ اور جوڑ کو کہتے ہے۔ احادیث میں ایک اور لفظ "جلیل المشاش" آتا ہے وہ بھی ضخم الکرادیس کا ہم معنی ہے۔ بہر حال معنی یہ ہوئے کہ نبی کریم ﷺ کی ہڈیاں اور جوڑ مضبوط تھے جو کہ جسمانی قوت، صحتمندی، شجاعت، اور نجابت کی علامت ہے۔

سینہ کے بال: طویل المسرّبۃ، مسرّبۃ میں راء کا ضم اور فتح دونوں منقول ہیں۔ سرَبَ یسرُب سے ہے۔ جس کے معنی ہیں پانی کا برتن یا مشک سے نیچے کی طرف جاری ہونا۔ آنسو اور پانی کے بہنے کے راستے کو نیز مرعی یعنی چراگاہ کو بھی مسرّب کہتے ہیں۔ کیونکہ لوگ چراہ گاہ میں اپنے حیوانات کھلے چھوڑ دیتے ہیں۔ بہر حال اونچائی سے اترائی کی طرف بہکر اور دھار کی طرح چلے جانے کو مسروب کہتے ہیں۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سینہ پر زیادہ بال نہ تھے صرف اوپر کے ابھرے ہوئے حصہ پر تھوڑے تھوڑے بال تھے لیکن سینہ مبارک سے ناف تک بالوں کی ایک باریک لمبی دھاری تھی جس طرح کہ آگے امام اصمعیؒ کی تشریح سے واضح ہوتا ہے نیز بیہقی وغیرہ میں تصریح ہے کہ "لہ شعرات فی سرّتہ کالقصیب" یعنی حلق سے لے کر ناف تک ایک باریک دھاری تھی جیسے ٹہنی ہو۔

انداز رفتار: اذا مشیٰ تکفّأ تکفوأً، کفئت الا ناء کے معنی برتن کے الٹ جانے کے ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کی چال ایسی تھی جس میں آگے کی طرف میلان اور جھکاؤ ہوتا تھا۔ اور رفتار کی یہ ہیئت عاجزی اور فروتنی کی علامت ہے۔ تو معنیٰ یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ جاتے ہوئے تواضع سے آگے کی طرف جھک کر

جاتے تھے۔ دوسرا معنیٰ یہ کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ جاتے ہوئے سرعت سے جاتے تھے قدم چھوٹے نہیں ہوتے تھے۔ تیسرا معنیٰ جو کہ آگے ایک اور حدیث کے لفظ اذا مشیٰ تقلع سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ آپ ﷺ قوت اور طاقت سے جاتے تھے۔ کانّما ینحط من صبب ِ گویا آپ بلندی سے پستی کی جانب اُتر رہے ہیں۔ یہاں مِن فِی کے معنی میں ہے عموما اترائی کی طرف جاتے ہوئے انسان تیزی اور احتیاط کے ساتھ قدم جما جما کر رکھتا ہے اور کچھ کچھ آگے کی طرف جھکا بھی ہوتا ہے۔ نیز ایسی حالت میں چلنا تکبر اور نخوت سے بھی خالی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس تشبیہ سے تمام مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ صبب حدور اور المنحدر من الارض یعنی زمین کی گہرائی اور پستی کے حصے کو کہتے ہیں۔ صبّ ادغام کے ساتھ بھی اسی معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن اس کے ایک اور معنی عشقِ شدید کے بھی آتے ہیں اس لیے رفع التباس کے لیے ادغام کو چھوڑ دیا۔ لم أر قبله ولا بعده مثله : حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ جیسا نہ ان سے پہلے دیکھا نہ ان کے بعد دیکھا ہے۔

<u>اشکال وازالہ:</u> یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت علیؓ سے عمر میں بڑے تھے اور ایک ہی گھر کے آدمی تھے۔ تو نبی کریم ﷺ سے پہلے کا ذکر عبث ہے کیونکہ آپ سے پہلے کسی غیر کا دیکھنا ممکن نہ تھا۔ بلکہ بدو شعور سے آپ ﷺ کو دیکھ لیا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ لم أر قبله کا معنیٰ "لم أسمع قبله" یا "لم أفهم قبله" ہے یعنی میں نے نبی کریم ﷺ سے پہلے گزرنے والوں کے بارے میں نہ یہ سنا نہ جانا کہ آپ ﷺ سے پہلے بھی کوئی آپ جیسا حسین گزرا ہے۔ لہٰذا رؤیت سے صرف بصری رؤیت مراد نہیں ہے۔ اس طرح نبی کریم ﷺ کی تمام لوگوں پر فضیلت ظاہر ہوگئی۔ نیز یہاں پر اگر چہ نبی کریم ﷺ سے حسین تر کی نفی ہے لیکن نبی کریم ﷺ کے مثل کی نفی بھی مقصود ہے گویا آپ جیسا حسین کوئی نہیں تھا حدثنا الخ امام ترمذیؒ سابقہ حدیث کی تائید کے لیے دوسری سند لا رہے ہیں۔

<u>مثلہ اور نحوہ:</u> پہلی سند میں امام بخاریؒ ابونعیم کے واسطے سے عبدالرحمٰن مسعودیؒ سے روایت کرتے تھے اس سند میں سفیان بن وکیعؒ اپنے والد وکیعؒ کے واسطے سے مسعودی سے روایت کرتے ہیں۔ لہٰذا مصنف مسعودیؒ سے دو واسطوں کے ذریعے روایت کرتے ہیں۔ نحو بمعناه ضابطہ یہ ہے کہ اگر کوئی حدیث دو

سندوں کے ساتھ مروی ہوتو اگر دونوں لفظاً اور معناً موافق ہوں تو ایسی صورت میں مثلہ کے الفاظ لائے جاتے ہیں۔لیکن اگر روایتیں لفظاً مغائر اور معناً متحد ہوں تو دوسری سند کے ساتھ نحوہ لاتے ہیں۔اور کبھی دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ مجازاً استعمال ہوتے ہیں۔اب یہاں یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید نحوہ سے مثلہ مراد ہو یعنی روایتوں میں لفظی اور معنوی اتحاد ہوگا۔تو اس وہم کو دفع کرنے کے لیے مصنف نے بمعناہ کا لفظ تاکید اًبڑھادیا۔تاکہ صرف معنوی اتحاد پر تنبیہ ہو اور یہ وہم دفع ہو کہ نحوہ مثلہ کی جگہ مستعمل ہے۔

(۲) حدّثنا احمد بن عبدة الضبّی البصری و علّی بن حجر و ابو جعفر محمّد بن الحسین وهو ابن ابی حلیمة و المعنی واحد قالوا ثنا عیسیٰ بن یونس عن عمر بن عبداللّٰه مولیٰ غفرة قال حدّثنی إبراهیم بن محمّد من ولد علیّ بن أبی طالب قال کان علیؓ اذا وصف رسول اللّٰهﷺ قال لم یکن رسول اللّٰه ﷺ بالطویل المُمَغّط و بالقصیر المتردد و کان ربعة من القوم لم یکن بالجعد القَطِطُ و لا بالسبط کان جعداً رجلا و لم یکن بالمطهّم و لا بالمُکَلْثَم و کان فی وجهه تدویر ابیض مشرب أدعج العینین أهدب الأشفار جلیل المشاش و الکتد اجرد ذو مسربة شثن الکفین و القدمین اذا مشیٰ تقلّع کا نّما ینحّط فی صبب و اذا التفت التفت معاً بین کتفیه خاتم النبوّة وهو خاتم النبییّن أجود الناس صدراً و أصدق الناس لهجة و ألینهم عریکة و أکرمهم عشیرة من راه بداهة هابه و من خالطه معرفة أحبّه یقول ناعته لم ارقبله و لا بعده مثله ﷺ(۱).

ترجمہ: ابراہیم بن محمدؒ جو حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ نبی کریم ﷺ کا حلیہ بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ حضور اقدس ﷺ نہ زیادہ لمبے

(۱) جامع ترمذی ۲۰۵/۲ کتاب المناقب باب ماجاء فی صفة النبیّ ﷺ، المستدرک للحاکم ۶۰۶/۲،مسنداحمد ۱۲۷/۱ شرح السنة للبغوی ۲۸۲/۱۳ باب صفة النبی ﷺ (مختار)

تھے نہ زیادہ پستہ قد بلکہ میانہ قد لوگوں میں سے تھے۔حضورﷺ کے بال نہ زیادہ گھنگریالے نہ بالکل سیدھے تھے بلکہ قدرے خم دار بالوں والے تھے۔نہ آپﷺ موٹے بدن کے تھے نہ گول چہرے والے تھے البتہ تھوڑی سی گولائی آپﷺ کے چہرہ انور میں تھی۔سفید سرخی مائل رنگ کے حامل تھے آپﷺ کی آنکھیں نہایت سیاہ اور پلکیں دراز تھیں۔ہڈیوں کے سرے(جوڑوں پر)موٹے تھے،نیز دونوں مونڈھوں کے درمیان کا حصہ بھی موٹا تھا(سوائے بعض حصوں کے)بدن کا اکثر حصہ بالوں سے خالی تھا۔سینہ مبارک سے لیکر ناف تک بالوں کی ایک لکیر سی تھی۔ہاتھ اور قدم مبارک پُر گوشت تھے۔جب چلتے تو قدموں کو قوت سے اٹھاتے گویا پستی کی طرف اتر رہے ہیں اور جب کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن مبارک کے ساتھ توجہ فرماتے۔دونوں کندھوں کے درمیاں مہر نبوت تھی اور آپ نبیوں کو ختم کرنے والے تھے۔سب سے زیادہ سخی دل کے مالک تھے اور سب سے زیادہ سچی زبان نرم طبیعت والے تھے نیز سب سے زیادہ شریف خاندان والے تھے جو شخص آپﷺ کو اچانک دیکھتا وہ آپﷺ سے مرعوب ہو جاتا تھا۔البتہ جو شخص آپﷺ کو پہچان کر آپ سے گھل مل جاتا وہ آپﷺ کی محبت میں گرفتار ہو جاتا تھا۔آپﷺ کا حلیہ بیان کرنے والا(خواہ وہ کوئی بھی ہو)صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے نبی کریمﷺ جیسا(جمال وکمال کا حامل)شخص نہ آپﷺ سے پہلے دیکھا نہ آپﷺ کے بعد دیکھا۔

حضرت علیؓ کی روایت اور امام اصمعی کی لغوی تشریحات:

قال ابوعیسیٰؒ سمعت أبا جعفر محمّد بن الحسین یقول سمعت الاصمعیّ یقول فی تفسیر صفة النبیﷺ الممغّط الذاھب طولا قال وسمعت أعرابیاً یقول فی کلامه تمغّط فی نشّابته ای مدّھا مدًّا شدّیداً والمتردّد الداخل بعضه فی بعض قصرا واما القطط فالشدید الجعودة

والرجل الذی فی شعره حجونة ای تثنٍّ قلیلا واما المطهّم فالبادن الکثیر اللحم والمکلثم المدور الوجه والمشرّب الذی فی بیاضه حمرةٌ والادعج الشدید سواد العین والأ هدب الطویل الأشفار والکتد مجتمعة الکتفین وهو الکاهل والمسرّبة هو الشعر الدقیق الذی کانّه قضیب من الصدر إلیٰ السرة والشثن الغلیظ الأصابع من الکفین والقدمین والتقلّع ان یمشی بقوّة والصبب الحدور تقول انحدرنا فی صبوب و صبب و قوله جلیل المشاش یرید رؤس المناکب و العشرة الصحبة والعشیر الصحاب و البداهة المفأجة یقال بدهته بامر ای فجئته.

ترجمہ: امام ابوعیسیٰ الترمذیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوجعفر محمد بن حسینؒ سے سنا ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے امام اصمعیؒ سے سنا جو رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارک کی تشریح فرماتے تھے کہ الممغط اس شخص کو کہا جاتا ہے جو درازی کی طرف جارہا ہو، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دیہاتی کو یہ کہتے سنا کہ اس نے اپنے تیر کو چلے پر چڑھا کر خوب کھینچا۔اور المتردد کا مطلب یہ ہے جو انسانی اعضاء جو پستی کی وجہ سے بعض بعض کے ساتھ ملے ہوئے ہوں۔اور قطط سے بالوں کا شدت کے ساتھ گھنگریالے ہونا مراد ہے۔اور رجل کا معنی معمولی گھنگریالے ہونا ہے۔مطھم بھاری جسم والے شخص کو کہا جاتا ہے اور مکلثم گول چہرے والے آدمی کو کہا جاتا ہے۔ مشرب اس رنگ کو کہا جاتا ہے کہ سفیدی میں سرخی کی ملاوٹ ہو اور ادعج بالکل سیاہ آنکھوں والے شخص کو کہا جاتا ہے اور اھدب لمبی پلکوں والے شخص کو کہتے ہیں اور کَتَدُ دونوں کندھوں کے اکٹھے ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ گویا ایک باریک لکیر جو سینے سے ناف تک چلی گئی ہو اور شثن سے مراد ہاتھوں اور پاؤں کا پُر گوشت ہونا ہے اور تقلع

کا مطلب ہے کہ آدمی قوت کے ساتھ چلے اور صبب سے مراد پستی یا ڈھلوان ہے
جیسا کہ تو کہتا ہے کہ ہم نچلی جگہ میں اتر گئے اور راوی نے جو کہا ہے کہ آپ ﷺ جلیل
المشاش تھے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کندھوں کے کنارے بڑے تھے اور عشرہ کا
معنی رفاقت اور عشیر سے مراد ساتھی ہے اور بداھۃ سے مراد اچانک ملاقات ہے
جیسے کہا جاتا ہے کہ میں اس کے پاس کوئی معاملہ لے کر اچانک آیا۔

<u>حدیث کی سندی بحث:</u> والمعنیٰ واحد یعنی احمد بن عبدہ علی بن حجر اور محمد بن الحسین تینوں کی روایات میں معنوی موافقت ہے اگر چہ لفظاً ان میں مغائیرت ہے۔قالوا حدّثنا عیسیٰ الخ یعنی تینوں حضرات میں سے ہر ایک نے فرمایا کہ "حدّثنا عیسیٰ" لہٰذا یہ حدّثنا پہلے حدّثنا کا بیان اور اس کی تفصیل ہو جائے گی۔ ابراھیم بن محمد ،ابراہیم کے والد محمد سے ابوالقاسم محمد بن الحنفیہؒ مراد ہیں۔جو علم وشجاعت میں بہت مشہور تھے۔ان کی والدہ خولہ بنت جعفر بنو حنفیہ کی قیدیوں میں سے تھیں اور حضرت علیؓ کے حصے میں آئیں۔بعض غالی شیعہ محمد بن الحنفیہ کے بارے میں الوھیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ فلعنھم اللّٰہ

<u>وُلد کی بحث:</u> شرّاح کہتے ہیں کہ ابراہیم کی ملاقات حضرت علی سے ثابت نہیں خود امام ترمذی بھی ایک جگہ اس کی تصریح کر چکے ہیں اس لیے یہ حدیث منقطع ہوگی۔ من ولد علی ولد،واو،اور لام دونوں کے فتح کے ساتھ مروی ہیں اور واو کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ بھی درست ہے۔امام قسطلانیؒ فرماتے ہیں کہ اول صورت میں یہ اسم جنس اور دوسری صورت میں اسمِ جمع ہے بہر حال حضرت ابراہیمؒ،حضرت علیؓ کے پوتے ہیں۔

<u>تناسب قدوقامت:</u> المغّط یہ باب انفعال یعنی انمغاط سے اسم فاعل کا صیغہ ہے جسکے معنی ہوتے ہیں زیادہ لمبا ہونا۔تمغط البعیر کا معنی ہوتا ہے " مدّبدنہ فی السیر شدیداً" یعنی اونٹ نے سفر میں لمبے لمبے قدم لئے۔یہاں مراد حد سے زیادہ اور نمایاں طول ہے۔ولا بالقصیر المتردّد، متردد کا معنی بعد میں خود نقل کرتا ہے۔یہاں تناہی فی القصر کے معنی میں مستعمل ہے۔مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کے اعضاء ایک دوسرے میں مضموم یعنی گھسے ہوئے نہ تھے۔آپ پستہ قد نہ تھے بہر حال نبی کریم ﷺ کی میانہ قدی اس

حدیث میں اوراس قسم کی دوسری احادیث میں مذکور ہے لیکن صحیح احادیث کے مطابق آپ میانہ قدی سے کچھ بڑھ کرطول کی طرف مائل تھے۔چنانچہ ھند بن ابی ہالہؓ کی روایت میں اس کی تصریح فرماتے ہیں کان اطول من المربوع ۔یعنی میانہ قدی سے قدرے اونچے تھے۔ایک اورحدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی جماعت اور مجمع میں کھڑے ہوتے تو سب سے اونچے نظر آتے تھے۔لیکن اس کا حدیثِ باب سے کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ کا سب سے بلند نظر آنا درازی قد کی وجہ سے نہ تھا بلکہ یہ آپ ﷺ کا معجزہ تھا کہ ہر مجلس میں آپ ﷺ نمایاں نظر آتے تھے۔ وکان ربعة من القوم مردوں میں میانہ قد تھے۔قوم اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں عورت نہ ہو کیونکہ قوامیت کی خصوصیت مردوں میں ہے۔ولم یکن بالجعد القطط یہاں آپ ﷺ کے بال مبارک جو جسم کا حصہ ہیں کا بیان ہے جعد کے معنی انطویٰ و انقبض ۔یعنی مڑنے اور گھنگریالے ہونے کے ہیں۔جبکہ قطط سے مراد شدۃ جعودۃ ہے۔یعنی سخت گھنگریالا پن۔ولا بالسبط سبط عدم تکسُّر شَعر یعنی بالوں کے بالکل ہموار اورغیر پیچیدہ ہونے کو کہتے ہیں۔ بلکہ کان جعداً رجلاً یعنی سیدھےاورقدرے گھنگریالے بال تھے۔

<u>چہرے کی ساخت:</u> ولم یکن بالمطھّم چہرے کا بیان ہے۔مطھّم کے متعدد معانی ہیں یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ سمین البدن یعنی فربہ اورنحیف البدن یعنی کمزوردونوں پراس کا اطلاق ہوتا ہے۔امام اصمعیؒ تو بادن کثیر اللحم کا ترجمہ کرتے ہیں یعنی موٹا پُر گوشت ۔جبکہ بعض لوگوں نے منتفخ الوجہ سے تفسیر کی ہے جس کا معنی گوشت سے بھرے چہرے والا ہوتا ہے۔اور چہرے میں حد سے زیادہ گوشت کا ہونا بھی حسن کو ختم کردیتا ہے کیونکہ اس طرح چہرہ گویا سوجا ہوا اور متورم نظر آتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ مطھم یہاں رنگ کی صفت ہے سرخ مائل بسیاہ کو اسمر کہا جاتا ہے لیکن سفیدی اورسرخی کے مقابلے میں زیادہ سیاہی آجائے تو طھمه کہتے ہیں۔مقصد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سیاہی مائل نہ تھے لیکن یہ معنی کچھ بعید معلوم ہوتا ہے۔

ولا بالمکلثم مکلثم مدوّرالوجه اورخالص گول چہرے والے کو کہتے ہیں اس سے چہرے کا حسن ختم ہو جاتا ہے اسی طرح چہرے میں زیادہ لمبائی بھی بدصورتی پیدا کرتی ہے۔اوراگر کچھ

تدویر اور کچھ طول ہوتو اسے کتابی چہرہ کہتے ہیں۔اور اس سے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ایسے چہرے والے کو عربی میں اسیل الوجہ کہتے ہیں۔تو نبی کریم ﷺ کے چہرہ انور میں اگر چہ تدویر تھی اور کامل استطالۃ نہ تھی۔جیسے کہ خود راوی کہتے ''وکان فی وجھہ تدویر ''لیکن بالکل گول چہرہ بھی نہ تھا جس طرح کہ روسیوں اور چینیوں کا ہوتا ہے۔

<u>رنگ کا بیان:</u> أبیض مشرب: ابیض، کان کا خبر ہو تو منصوب ہوگا۔لیکن راجح یہ ہے کہ یہ مرفوع ہو اور مبتداء محذوف کی خبر ہو یعنی ھوا بیض کیونکہ مشرّب بھی مرفوع ہے۔اور مشوب راء کی تخفیف کے ساتھ اشراب کا اور اس کی تشدید کے ساتھ باب تفصیل کا اسم مفعول ہے دونوں صحیح ہیں۔ اشراب اصل میں خلط لونٍ بلونٍ یعنی ایک رنگ کا دوسرے میں مخلوط ہونے کو کہتے ہیں۔تو یہاں مقصود یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا رنگ سفید تھا لیکن اس میں سرخی تھی۔سفیدی میں سرخی آمیزش ہو تو یہ حسن میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔نبی کریم ﷺ کے رنگ کے بارے میں صرف ایک حدیث میں اسمر یعنی گندم گون کا لفظ مستعمل ہے۔اس کے علاوہ جہاں بھی آپ ﷺ کے رنگ ذکر کیا گیا ہے وہ أبیض یا أبیض مشرب بالحمرۃ ہے یعنی سرخی مائل سفید رنگ تھا۔

<u>چشم مبارک کی ساخت:</u> أدعج العینین دعج یدعج کے معنی ہیں سیاہی کا سخت سیاہ ہونا۔ چونکہ رنگوں میں افعل کا صیغہ تفصیلی معنی سے خالی ہوتا ہے اس لیے مراد یہاں یہ ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھوں کی سیاہی زیادہ سیاہ تھی۔آنکھیں نیلی یا بھورے رنگ کی نہ تھیں۔شراح نے تصریح کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے آنکھوں کی سفیدی زیادہ سفید تھی اور بعض روایات کے مطابق اس میں سُرخ ڈورے بھی تھے یہ دونوں چیزیں آنکھوں کے لیے انتہائی درجہ کا حسن ہیں۔کیونکہ آنکھوں کی سفیدی میں زردی آجائے یا میلی نظر آئیں تو اس سے آنکھوں کا حسن ختم ہو جاتا ہے۔أھدب الأشفار أھدب ھدبٌ سے ہے لٹکنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ھدبۃ جھالر اور پھندنے کو کہتے ہیں ایک حدیث میں آتا ہے ''کھدبۃ ثوبی ھذا ''میرے اس کپڑے کے پھندنے کی طرح۔کپڑے کا وہ حصہ جو لٹک رہا ہو کپڑے کی لمبائی اور طول کی علامت ہے۔ چنانچہ اھدب سے بھی مراد اس مقام پر یہی ہے کہ پلکیں لمبی اور لٹکی ہوتی تھیں۔اور اشفار شفرہ کی جمع ہے

جس کے معنی ہیں پلکوں کا منبت یعنی آنکھ کا وہ حصہ جس پر پلکیں ہوتی ہیں لیکن یہاں منبت ذکر ہے اور نابت یعنی بال مراد ہیں۔ کیونکہ خمیدگی پلکوں میں ہوتی ہے ان کے منبت میں نہیں ہوتی اور منبت اور نابت میں ملابست کے سبب یہ مجاز صحیح ہے۔ یا پھر یہاں مضاف محذوف ہے۔ اور أھدب الأشفار سے مراد أھدب شعر الأشفار ہے۔ یعنی پلکیں لمبی اور دراز تھیں۔

<u>جلیل المشاش:</u> مُشاشة کی جمع مُشاش آتی ہے یہاں اس سے مراد ہڈیوں کے سرے ہیں جو بڑے بڑے اور مضبوط تھے۔ ضخم الکرادیس اور جلیل المشاش کا ایک ہی معنی بنتا ہے والکِتد، کتد سے مراد مونڈھوں کے درمیان کی جگہ ہے جہاں مونڈھوں کی ہڈیاں ملتی ہیں۔ اور اس کا بڑا اور مضبوط ہونا جسمانی قوت کی علامت ہے۔ اجرد، اجرد کے معنی ہیں بالوں سے خالی۔ نبی کریم ﷺ کے عام بدن پر بال نہ تھے۔ پاؤں، ہاتھ، پیٹھ وغیرہ بدن کے اکثر حصے بالوں سے خالی تھے۔ بعض لوگ اجرد کے معنی میں یہ کہتے ہیں کہ بدن پر چھوٹے چھوٹے بال تھے کیونکہ اجرد دراصل اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کے بدن پر بال چھوٹے چھوٹے ہوں لیکن یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اجرد کا یہ معنی حیوانات کی نسبت سے ہے جس طرح کہ قاموس میں اس کی تصریح ہے۔ اور انسان کے اوصاف محمودہ میں سے یہ ہے۔ کہ چند مخصوص اعضاء کے سوا جسم کے دوسرے حصے بالوں سے بالکل خالی ہوں جس طرح کہ بعض حصوں پر بالوں کا زیادہ ہونا پسندیدہ وصف ہے۔ ذو مسربة عوبة یعنی سینہ کے وسط میں ناف تک بالوں کی پتلی لکیر تھی۔ عوبة کی تفصیل پچھلی حدیث میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح شثن الکفین و القدمین کا ترجمہ گزر چکا ہے۔ اذا مشیٰ تقلّع چلنے کی کیفیت کا بیان ہے۔ قلع کے معنی گڑی ہوئی چیز کو بیخ سے نکالنے کے ہیں۔ نبی کریم ﷺ جب چلتے تو گویا پاؤں زمین میں دھنسے ہوئے ہیں۔ اور آپ ﷺ انہیں نکال نکال کر جا رہے ہیں۔ یعنی پوری قوت سے زمین سے اٹھاتے ہیں۔ اس میں اس قوت اور مضبوطی کی طرف اشارہ ہے جو نبی کریم ﷺ کی رفتار سے معلوم ہوتی تھی۔ کانّما ینحط من صبب الخ گویا آپ ﷺ اونچائی سے اترائی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

<u>التفات تام:</u> واذا التفت التفت معاً۔ نبی کریم ﷺ کے اخلاق عالیہ کا ایک عظیم پہلو ذکر کر رہے

ہیں۔ کہ جب آپ ﷺ کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پوری ہمہ تنی سے توجہ فرماتے۔ شراح کہتے ہیں کہ ''لایسارق النظر کما ھو عادۃ المتکبّرین ''یعنی متکبرین کی طرح آپ ﷺ کن انکھیوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ آپ ﷺ تو خلقِ عظیم کی دولت سے مالا مال تھے۔ اگر معمولی درجہ کا کوئی آدمی بھی آپ ﷺ سے بات کرتا تو سینہ مبارک اس کی طرف پھیر کر خوب توجہ سے بات سنتے اور پیٹھ پھیر کر کسی سے بات کرنے سے احتراز کرتے۔

ایک تشریح یہ بھی کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ ہر کام کو ہمہ تن اور توجہ سے کرتے تھے۔ خواہ وہ کوئی دنیوی کام ہو یا اخروی کام، التفاتِ تام کے بغیر نہیں کرتے۔ بنی نوع انسان کی اصلاح نبوت کے مشن اور جہاد و دعوت میں آپ ﷺ تمام وسائل اور صلاحیتوں کو مستعمل فرماتے۔ لیکن دوسری جانب ازواج مطہرات، اقارب اور دوستوں کے حقوق کا بھی پورا پورا خیال فرماتے۔ اور ضابطہ بھی ہے کہ مکمل التفات اور کامل توجہ کے بغیر کوئی کام بھی درست نہیں ہوتا۔ **بین کتفیه خاتم النبوۃ.** ایک بڑی جسمانی علامت اور آپ ﷺ کی صداقت کی نشانی کا ذکر ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان بدن پر نبوت کی مہر تھی جو کہ آپ ﷺ کی صداقت اور نبوت کی بڑی علامت تھی۔ مہر نبوت کے بارے میں مستقل اور مفصل بحث اپنے باب میں آئے گی اور اس کی کیفیت، کمیت اور رنگ وغیرہ حالات کا ذکر ہوگا۔

وھو خاتم النبییّن یہ جملہ معترضہ ہے۔ گویا راوی کے خیال میں یہ مہر ختم نبوت کی دلیل تھی۔

<u>فراخ دلی:</u> **أجود الناس صدراً** آپ تمام مخلوق سے سینہ کے اعتبار سے زیادہ سخی تھے۔ یہاں صدر سے مراد قلب ہے کیونکہ صدر محل اور قلب حال ہے۔ محل کو ذکر کر کے مجازاً حال مراد ہے۔ مطلب یہ کہ آپ دریا دل اور سخی تھے۔ نیز کشادہ دل اور تحمل کی یہ حالت تھی کہ مخالفین کا ہر ستم ہر مخالفت برداشت کرتے رہے مظالم سہتے رہے لیکن اپنے مشن سے دستبردار نہ ہوئے۔ بلکہ تمام تر عداوتوں کے باوجود دشمن سے ملاقات کے وقت پیشانی مبارک پر بل نہ آنے دیا۔ رہی مال کے سلسلے میں سخاوت تو وہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ہاں اس میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ آپ ﷺ کی سخاوت دل سے تھی۔ تکلف، ریاکاری اور تصنع سے سخاوت نہیں کرتے تھے۔

آپ ﷺ کی صدق گفتاری اورنرم مزاجی: **وأصدق الناس لهجةً**، زبان اورکلام کے لحاظ سے سارے عالم میں سچے تھے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اللہ تعالیٰ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں **ومن أصدق من الله حديثاً** ۔ پھر دوسرے نمبر پر نبی کریم ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے۔ **والذی جاء بالصدق** ۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **ما ينطق عن الهوى ان هوإلاّ وحی يوحیٰ**۔ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے اس کی بات تو صرف وحی ہے جو اس پر اتاری گئی ہے۔ یہاں **لهجة** سے مراد زبان اور کلام ہے۔ یعنی آپ ﷺ ہمیشہ سچ بولا کرتے تھے۔

وألينهم عريكة: عريكة فطرت اور طبیعت کو کہتے ہیں اور **الين لان يلين** سے اسم تفضیل ہے۔ یعنی آپ ﷺ تمام عالم میں نرم طبیعت کے مالک تھے۔ مزاج میں فطری نرمی تھی اور نرم خوئی میں ہزار ہا حکمتیں ہوتی تھیں۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ **فبما رحمةٍ من الله لنت لهم ولو كنت فضّا غليظ القلبِ لا نفضّوا من حولك** (الآیة) اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ سے تم ان کے لیے نرم ہو گئے ہو اور اگر تم بے رحم اور سنگ دل ہوتے تو لوگ تم سے بکھر جاتے۔

سخت گیر، سنگ دل اور تیز زبان شخص کے قریب لوگ نہیں جاتے۔ اور جس شخص میں محبت، الفت اور عفو ودرگزر کی خوبیاں ہوں تو لوگ اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔ جس سے آپ ﷺ کے لیے منصب نبوت کے فرائض ادا کرنے میں سہولت ہوتی تھی۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ **ألين** کے معنی **منقاد** کے ہیں۔ اور آپ ﷺ کی طبیعت حق کے لیے مسخر اور منقاد تھی۔

خاندانی شرافت اور معاشرتی کرامت: **وأكرمهم عشيرة** . عشیرة صحبت کو بھی کہتے ہیں۔ اور چونکہ ابتدائی صحبت اور مجالست اپنے ہم قوم افراد اور قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے اس لیے عشیرة قبیلہ کو بھی کہتے ہیں۔ بہرحال ایک معنی یہ ہوا کہ قبیلہ کے لحاظ سے آپ ﷺ تمام لوگوں میں معزز اور اشرف ترین ہیں۔ کیونکہ قریش کا خاندان سارے عالم میں شریف ترین خاندان ہے ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مجھے بنو ہاشم سے زیادہ اشرف خاندان نظر نہیں آیا۔ تو آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خاندانی نجابت وشرافت سے نوازا تھا۔ لیکن ایک دوسرے نسخہ کے مطابق یہ لفظ

عِشرۃ ہے جس سے مراد مصاحبت ومعاشرت ہی ہے پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ بود وباش اور رفاقت میں تمام لوگوں سے اکرم تھے۔حقوق دینے اور دلوانے میں، نیز دوسروں کے آرام وراحت کا خیال رکھنے میں آپ ﷺ اپنی نظیر آپ تھے۔معاملات میں نرمی برتتے،لیکن اس نرمی اور معاملات کی بھی ایک خاص حد تھی وہ یہ کہ حدود شریعت کے اندر رہ کر آپ ﷺ سب کچھ برداشت کرتے تھے لیکن اگر حدود شریعت کو پامال کیا جاتا اللہ تعالیٰ کے حقوق پر دست اندازی ہوتی تو آپ ﷺ کے غصہ کی انتہا نہیں ہوتی تھی۔ایسی ہی حالت کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ لم یقم لغضبہِ شئی(۱)۔تو پھر آپ ﷺ کے غصہ کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی تھی۔

(۷) حدّثنا سفیان بن وکیع قال ثنا جمیع بن عمیر بن عبدالرحمٰن العجلیّ أملاء علینا من کتابه قال أخبرنی رجل من بنی تمیم من ولد أبی هالة زوج خدیجة یکنیّ أبا عبدالله عن إبن لأبی هالة. عن الحسن بن علیّ قال سألت خالی هندابن أبی هالة و کان وصّافًا عن حلیة رسول اللّٰه ﷺ وأنا اشتهی ان یصف إلیّ شیئاً اتعلّق به فقال کان رسول اللّٰه ﷺ فخمًا مفخّماً یتلا لؤوجهه تلالؤ القمر لیلة البدر أطول من المربوع وأقصر من المشذّب عظیم الهامة رجل الشعرإن انفرقت عقیقتُه فرّق والا فلا یجاوز شعره شحمة اذنیه إذا هووفرة أزهرا للون واسع الجبین أزجّ الحواجب سوابغ من غیر قرن بینهما عرق یدرّه الغضب أقنیٰ العرنین له نور یعلوه یحسبه من لم یتامّله اشمّ کثّ اللحیة سهل الخدّین ضلیع الفم مفلّج الاسنان دقیق المسربة کانّ عنقه جید دمیة فی صفآء الفضّة معتدل الخلق بادن متماسک سواء البطن والصدرعریض الصدر بعید مابین المنکبین ضخم

(۱) شمائل ترمذی

الکرادیس أنور المتجرد موصول ما بین اللبّة والسّرّة بشعر یجری کالخط عاری الثدیین والبطن ممّا سویٰ ذلک أشعر الذراعین والمنکبین و اعالی الصدر طویل الذندین رحب الراحة شثن الکفین والقدمین سائل الأطراف أوقال شائل الأطراف خمصان الاخمصین مسیح القدمین ینبو عنهما الماء اذاازال زال قلعاً یخطوتکفّیًا و یمشی هوناًذریع المشیة إذا مشیٰ کا نّما ینحط من صبب وإذا التفت التفت جمیعًاخافض الطرف نظره الی الارض اکثرمن نظره إلی السماء جلّ نظره الملاحظة یسوق أصحابه یبدء من لقی بالسلام(۱).

ترجمہ: ہمیں سفیان بن وکیع نے بیان کیا کہ ہمیں جمیع بن عمیر بن عبدالرحمٰن العجلی نے اپنی کتاب سے سنایا کہ ہمیں بنوتمیم کے ایک آدمی نے جو أبی ھالہ کی اولاد سے تھااور وہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا پہلا خاوند تھا اس کی کنیت ابوعبداللہ تھی وہ ابوھالہ کے ایک فرزند سے روایت کرتا ہےاورانہوں نے حضرت حسن بن علیؓ سے یہ روایت سنی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں ھند بن ابی ھالہ سے حضوراقدس ﷺ کے حلیہ مبارک کے بارے میں دریافت کیا جبکہ وہ آنحضرت ﷺ کے حلیہ مبارک کو بہت ہی وضاحت سے بیان فرماتے تھے۔ مجھے یہ خواہش ہوئی کہ وہ ان اوصاف جمیلہ میں سے کچھ میرے سامنے بھی ذکر کریں تا کہ میں ان کے بیان کواپنے لئے حجت اورسند بناؤں یعنی میں اس کے ساتھ تعلق قائم کرلوں۔تو انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ اپنی ذات میں عظیم تھے اوردوسروں کےنزدیک بھی عظیم تھے۔آپ ﷺ کا چہرہ مبارک چودھویں رات کے چاند کیطرح چمکتا تھا۔آپ ﷺ درمیانہ قد سے قدرے لمبے تھے اوردراز قد سے قدرے پست تھے۔آپ ﷺ کا سر مبارک معتدل بڑا تھا۔آپ ﷺ کے بال مبارک کسی قدر بل کھائے ہوئے تھے۔اکثرسر کے بالوں میں خود مانگ نکل

(۱)جامع ترمذی ۸۳/۲ ا باب ماجاء فی صفة النبی ﷺ شرح السنة للبغوی ۲۷۰/۱۳ (مختار)

آتی تھی تو آپ ﷺ مانگ رہنے دیتے ورنہ آپ ﷺ خود مانگ نکالنے کا اہتمام نہ فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کے بال مبارک کانوں کی لو سے تجاوز کر جاتے تھے جب کہ آپ ﷺ بڑھا لیتے۔ آپ ﷺ کا رنگ مبارک سرخ وسفید تھا اور پیشانی مبارک کشادہ تھی۔ آپ ﷺ کے آبرو مبارک باریک اور خم دار اور گنجان تھے اور دونوں آبرو جدا جدا تھے۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں تھے دونوں آبروں کے درمیان ایک باریک رگ تھی جو غصہ کے وقت ابھر آتی تھی آپ ﷺ کی ناک مبارک اونچی بلندی مائل تھی اور اس پر ایک چمک اور نور تھا ابتداءً (بغور کرکے) دیکھنے والا گمان کرتا کہ آپ ﷺ کی ناک اونچی ہے آپ ﷺ کی داڑھی مبارک گھنی تھی۔ آپ ﷺ کے رخسار مبارک ہموار تھے۔ آپ ﷺ کا دہن مبارک کشادہ تھا، سامنے کے دانتوں میں قدرے کشادگی تھی سینے سے ناف تک باریک بالوں کی لکیر تھی آپ ﷺ کی گردن مبارک مورتی کی گردن جیسی تھی جو صفائی میں چاندی جیسی تھی۔ آپ ﷺ کے تمام اعضاء معتدل اور پُر گوشت تھے اور بدن مبارک گٹھا ہوا تھا، پیٹ اور سینہ مبارک برابر تھے۔ سینہ مبارک کشادہ تھا۔ آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان قدرے فاصلہ تھا۔ آپ ﷺ کے اعضاء کی جوڑوں کی ہڈیاں بھی بڑی اور مضبوط تھیں۔ جسم مبارک کا لباس سے خالی حصہ بڑا روشن اور چمکدار تھا۔ سینہ اور ناف کو بالوں کی ایک باریک لکیر ملاتی تھی اور سینہ کے اوپر حصہ میں بال تھے۔ آپ ﷺ کی دونوں کلائیاں دراز تھیں، دونوں پاؤں کے تلوے گہرے تھے، دونوں قدم مبارک ہموار تھے، پانی ان کی وجہ سے بہہ جاتا تھا۔ جب آپ ﷺ چلتے تو قوت سے قدم اٹھاتے اور جب قدم رکھتے تو جھک کر چلتے۔ قدم زمین پر آہستہ سے رکھتے۔ آپ ﷺ کی چال مبارک تیز تھی۔ آپ ﷺ چلتے تو کشادہ قدم رکھتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ ﷺ ڈھلان سے اتر رہے ہیں۔ جب آپ ﷺ کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو پورے بدن کے ساتھ توجہ فرماتے۔ آپ ﷺ کی نگاہ مبارک نیچے رہتی تھی اور بنسبت آسمان کے زمین کی

طرف زیادہ رہتی تھی۔ آپ ﷺ عموماً گوشہ چشم سے دیکھتے تھے اور چلنے میں صحابہ کرامؓ کو آگے رکھتے تھے جس سے ملتے تھے تو سلام کرنے میں خود ہی پہل فرماتے تھے۔

حدیث کے بعض راویان کا تذکرہ: باب کی اس حدیث میں جمع بن عمیر العجلی کا ذکر ہے۔ بعض نسخوں میں جمیع بن عمر کا ذکر ہے۔ اس راوی کے بارے میں اہل علم نے لکھا ہے کہ یہ ایک غالی رافضی ہے اسلئے اس نے اپنے باپ کا نام عمر کی جگہ عمیر رکھا اس لئے کہ رافضیوں کا حضرت عمرؓ سے تعصب ہے تو اس تعصب کی وجہ سے جمیع نے بھی اپنے باپ کا نام عمیر بتایا ہے۔

املاء علینا من کتابه، کہ اس نے ہمیں اپنی کتاب سے املاء کروائی، محدثین کرام کا ایک تو روایت حدیث یہ تھا کہ صرف نفس روایت کو بیان فرماتے تھے۔ اس کے الفاظ کی تشریح، معانی اور مطالب نہیں ہوتے تھے۔ اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ الفاظ حدیث کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کے معانی مطالب اور تشریح بھی بیان کرتے تھے۔ اور اسی کو املاء کہا جاتا تھا۔ مگر یہاں املاء سے یہ اصطلاحی معنی مراد نہیں بلکہ یہاں لغوی معنی یعنی لکھوانا مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جمیع نے یہ روایت اپنی کتاب (۱) سے لکھوادی۔

صاحب مواہب نے لکھا ہے کہ **هو الاليق هنا** کہ یہی معنی مناسب ہے۔

رجل من بنی تمیم من ولد ابی هالة زوج خديجة يكنٰى أباعبدالله، اس آدمی کے نام میں اختلاف ہے بعض نے یزید بن عمرو بتایا ہے جبکہ بعض نے عمرو اور بعض نے عمیر (۲)۔ اس لئے یہ آدمی مجہول ہے اور اس کی اس جہالت کی وجہ سے روایت بھی معلول ہے۔

اُبو ہالۃ کون تھے: یہ ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰؓ کے شوہر اول تھے اس کا نام مالک، ہند، نباش بن زرارہ یا زرارہ بن نباش بتایا جاتا ہے۔

---

(۱) حفاظت حدیث کے تین طریقے ہیں (۱) حفظ (یاداشت) اس طریقے کا سارا مدار حافظہ پر ہوتا ہے (۲) تعامل یعنی سنی گئی روایات پر عمل کرنا اس کا مدار عمل پر ہوتا ہے (۳) کتابت (لکھائی) اس طریقے کا مدار کاتب پر ہوتا ہے کہ سنی گئی روایات کو کاغذ وغیرہ پر لکھوا کر محفوظ کر دیا جائے۔ یہ تینوں طریقے روز اول سے رائج تھے۔ (مختار)

(۲) اور علامہ نورالدین علی بن ابی بکر الھیثمیؒ نے لکھا ہے **قال ابوعبيد ابوهالة كان زوج خديجة قبل رسول الله ﷺ واسمه النباش وابنه هندبن النباش من بنی اُسیدبن عمرو بن تميم(مجمع الزوائد ۸/ ۱ ۴۹ کتاب علامات النبوۃ(مختار)**

یکنٰی أباعبداللّٰہ، یعنی ابوہالہ کا تعارف زوج خدیجہ سے جس شخص نے کیا ہے اس کی کنیت ابوعبداللہ ہے اور ترتیب کے لحاظ سے یہ جملہ رجل موصوف کے لئے صفت ثالثہ ہے۔ اس لئے کہ نحوی ترتیب کے لحاظ سے رجل موصوف من بنی تمیم صفت اول من ولدأبی ھالہ زوج خدیجۃ پورا جملہ صفت ثانیہ اور یکنٰی الخ صفت ثالثہ۔

ایک اشکال کا جواب: البتہ یہاں ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ یکنّٰی تو فعل مجہول کا صیغہ ہے۔ اباعبداللّٰہ اس کا نائب فاعل ہوا جبکہ قانون یہ ہے کہ جس طرح فاعل مرفوع ہوتا ہے۔ نائب فاعل بھی مرفوع ہوتا ہے تو یہاں ابوعبداللہ ہونا چاہئے تھا جبکہ یہاں أباعبداللّٰہ ہے تو یہ منصوب کیوں؟

الجواب: تو اس اعتراض کے اہل علم حضرات نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔

(۱) بعض کا تو کہنا ہے کہ یہاں اباعبداللہ نائب فاعل نہیں بلکہ مفعول ثانی ہے اور نائب فاعل ھو ضمیر مضمر ہے اور مفعول کا اعراب نصب ہے۔

(۲) بعض نے لکھا ہے کہ یہاں یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں أباعبداللّٰہ منصوب بالمدح ہو اور اعنی فعل مقدر ہو یعنی یکنی أعنی أباعبداللّٰہ ہوگا۔

(۳) اور یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ نصب نزع حافض ہے اصل عبارت یہ تھی یکنیٰ بأبی عبداللّٰہ یکنّیٰ أباعبداللّٰہ ہوا۔

عن إبن أبی ھالۃ، ابوہالہ کے بیٹے کا نام ہند ہے اور سند میں ابوعبداللہ کے نام سے ذکر ہوا۔ اس کا نام بھی ہند ہے مگر اس کو ابوعبداللہ کے نام سے ذکر کیا تا کہ تمیز آ جائے۔

سالتُ خالی ھند بن ابی ھالۃ، یہ حضرت حسنؓ کے ماموں تھے اس لئے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے ساتھ نکاح کیا تو اس کے ساتھ پہلے شوہر ابوھالۃ کا ایک بیٹا تھا جس کا نام ہند تھا۔ اور حضرت فاطمہؓ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی بیٹی تھی۔ اس لئے ہند بن ابی ہالہ(۱) حضرت

(۱) ھند بن ابی ہالہ حضور اقدس ﷺ کے ربیب تھے کیونکہ جب آپ ﷺ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے ساتھ شادی کر لی تو آپؓ بچپن میں آپ ﷺ کی پرورش میں آئے۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کے ربیب بنے۔ اس لئے وہ آپ ﷺ کے ساتھ بے تکلف تھے۔ اسلئے آپ ﷺ کے عادات، خصائل اور حلیہ مبارک کا آپ کو خوب علم تھا(مختار)

فاطمہؓ کا اخیافی بھائی بنا۔ اوراسی طرح وہ حضرت حسنؓ کا ماموں بھی ہوا۔ اس لئے آپؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے پوچھا چونکہ وہ آپ ﷺ کے ربیب تھے اور بچپن آپ ﷺ کی پرورش میں گزرا تھا۔ اور آپ ﷺ سے بے پناہ محبت تھی اس عشق و محبت کی وجہ سے وہ آپ ﷺ کی بہت زیادہ تعریف کیا کرتا تھا۔

سوال: یہاں پرایک سوال اٹھتا ہے حضرت حسنؓ گھر کا فرد تھا تو اس کو خود آنحضرت ﷺ کے بارے میں خود علم ہونا چاہئے تھا۔ اس نے اپنے ماموں سے کیوں پوچھا؟

الجواب: تو حضرات محدثین نے اس اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ جس وقت آنحضرت ﷺ کا وصال ہوا تو حضرت حسنؓ کی عمر سات سال(۱) تھی۔ اور ظاہر بات ہے کہ اس کا بچپنا تھا ابھی پختگی نہیں آئی تھی اور نہ اتنی عمر میں علم وفہم کا ذوق ہوتا ہے لیکن جب پختگی آئی اور علم و آنحضرت ﷺ کے سیرت و کردار، عادات واخلاق کے جاننے کا جذبہ پیدا ہوا تو آپؓ نے اپنے ماموں سے پوچھا جو آپ ﷺ کیساتھ زیادہ رہ چکے تھے اور اس کو رسول اللہ ﷺ کے عادات واخلاق کا بہت زیادہ علم تھا اور خود نہ جاننے اور اپنے نانا محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جاننے کے ذوق وخواہش پر آپؓ کا یہ جملہ کہ **وانا اشتھی ان یصف لی منھا شیئاً أتعلق به،** کہ میری خواہش ہے کہ وہ مجھے آنحضرت ﷺ کے کچھ اوصاف بیان کریں اور میں اس کے ساتھ اپنا تعلق قائم کروں(۲)۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں اس کی اقتداء کروں **لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوة حسنة(الآیة)** اے ایمان والوں تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ میں بہترین نمونہ ہے۔

(۱) حضرت حسنؓ رسول خدا ﷺ کے نواسے ہیں اور شیر خدا حضرت علیؓ اور خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہرٰیؓ کے فرزند ہیں آپ ﷺ ۳ھ میں پیدا ہوئے، ۲۲ روایات خود آنحضرت ﷺ سے سنی تھیں۔ آپؓ بڑے حسین وجمیل اور انتہائی بہادر تھے۔ کئی جہادوں میں شریک رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا **الحسن والحسین سیّدا شباب اھل الجنة** بعض لوگوں کی آپؓ سے دشمنی تھی جس کی وجہ سے آپؓ کو زہر دیا گیا۔ چنانچہ ۴۹ھ ۵۰ھ کو انتقال کر گئے۔ آپؓ سگے تین بھائی تھے۔ خود آپ، حسین، محسن اور ایک بہن ام کلثوم تھی۔ (مختار)

(۲) تمام صحابہ کرامؓ کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ ہر قول وفعل پر عمل کریں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ آپؓ اپنے قدم بھی وہاں رکھتے تھے جہاں رسول اللہ ﷺ قدم رکھ چکے تھے اور اس جگہ وضو فرماتے تھے جہاں آپ ﷺ وضو کر چکے تھے۔ (مختار)

کان وصّافاً، وصّافا فعّالٌ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے اوراس کے کئی معانی ہیں کثرت سے بیان کرنا، بار بار بیان کرنا، مزے لے لے کر بیان کرنا، اور یہاں سب معانی لئے جاسکتے ہیں۔

فقال کان رسول اللہ ﷺ فخماً مفخّماً، فخمّاً خاء کے کسرے کے ساتھ باب نصر اور کرم سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جو عظمت والا ہو اور جسامت کے اعتبار سے موزون ہو اور **مفخّماً** سے مراد جو لوگوں میں عظمت والا ہو تو مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود اپنی ذات میں بھی عظیم تھے اور دوسروں کی نظروں میں بھی عظیم تھے۔ بعض لوگوں میں عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذات میں کمتر ہوتے ہیں مگر دوسروں کے سامنے بڑا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصولاً ایسا کرنا بڑا سمجھا جاتا ہے۔ مگر رسول اللہ ﷺ کی بات الگ ہے آپ ﷺ حقیقت میں ایسے ہی تھے کہ **کان عظیماً فیاتی ومعظّماً عندالنّاس** کہ آپ ﷺ اپنی ذات میں بھی عظیم تھے اور لوگوں کی نظروں میں بھی عظیم تھے۔ آپ ﷺ اپنے لئے یہ دعا بھی فرمایا کرتے تھے **اللھمّ اجعلنی فی عینی صغیراً وفی أعین النّاس کبیراً** کہ اے اللہ مجھے اپنی نگاہ میں چھوٹا اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بنادے۔ اور شیخ عبدالرؤف مناویؒ دوسرا معنی فرماتے ہیں **فخم عظیم عنداللّٰہ معظّم عندالنّاس (مناوی)**

یتلألأ وجھہ تلألؤ القمر لیلۃ البدر رسول اللہ ﷺ کا چہرہ انور چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا تھا اور یہ کوئی تخیلاتی بات نہیں تھی بلکہ حقیقت میں ایسا ہی تھا۔ لؤلؤ (۱) موتی کو کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت چمکتا ہے اس لئے علامہ مناویؒ نے لکھا ہے **لؤلؤھو الاضاءۃ والاشراق یتلألؤ وجھہ ای یستنیر ویشرق ویضیءُ۔**

أطول من المربوع واقصر من المشذّب، کہ آپ ﷺ کا قد مبارک عام درمیانے قد سے ذرا لمبا تھا اور زیادہ لمبے قد سے قدرے آپ ﷺ کا قد کچھ کم تھا۔

---

(۱) موتی کی حقیقت یہ ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو سمندر میں موجود سیپی کا منہ قدرتی طور پر کھلا رہتا ہے۔ اور جب بارش ہوتی ہے اور بارش کا قطرہ اس سیپی میں داخل ہوجاتا ہے تو سیپی کا منہ قدرتی طور پر بند ہوکر سیپی سمندر کی تہہ میں چلی جاتی ہے اور پھر ایک خاص مدت کے اندر اس بارش کے قطرے سے موتی بن جاتا ہے مردوں کیلئے اس دنیا میں بھی موتیوں کا استعمال روا ہے اور جنت میں تو ایک خاص قسم کا لباس ہے۔ **یحلّون فیھا من اساور من ذھب ولؤلؤ (الایۃ)** کہ مؤمنوں کو وہاں سونے اور موتیوں کے ہار پہنائے جائینگے جبکہ دنیا میں مردوں کیلئے سونا چاندی کا استعمال حرام اور خواتین کیلئے جائز ہے (مختار)

المربوع درمیانی قد کو کہا جاتا ہے۔امام ذہلیؒ نے لکھا ہے کہ **المربوع هوإلى الطول اقرب** تو مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا قد مبارک زیادہ دراز نہیں تھا بلکہ طول کی طرف قدرے مائل تھا۔

أقصر من المشذّب(۱)، **مشذّب** باب تفعیل سے جس درخت کی شاخیں کاٹ دی گئی ہوں اس لئے شذب کانٹ چھانٹ کو کہا جاتا ہے۔ درخت کی جب شاخیں کاٹ دی جائیں تو وہ درخت لمبا نظر آتا ہے تو مشذب کا معنی طویل بائن ہے۔اسی سے **تشذیب** ہے یعنی کھجور یا کسی درخت کی زائد اور خشک شاخوں کو کاٹنا۔اہل علم نے تہذیب اخلاق کو بھی تشذیب کہا ہے۔مطلب یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا قد مبارک اس درخت کے مانند لمبا نہیں تھا جس کی شاخیں کاٹ دی گئی ہوں بلکہ اس سے کم تھا۔مگر اس کے باوجود اگر کوئی طویل سے طویل تر آدمی آپ ﷺ کے ساتھ چلتا تو آپ ﷺ بلند معلوم ہوتے تھے اور یہ آپ ﷺ کا معجزہ تھا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ہر حیثیت سے رفعت عطا فرمائی تھی۔ **ورفعنالک ذکرک(الآية)**

عظیم الهامة، هامة کھوپڑی کو کہا جاتا ہے۔اس کی جمع **هامات** آتی ہے۔ اصولی طور پر عرف عام میں بڑا سر محمود اور چھوٹا سر معیوب سمجھا جاتا ہے۔اور سر کا بڑا ہونا عقل مندی کی علامت ہے۔اس لئے جس کا سر بڑا ہو تو اس میں دماغ بھی زیادہ ہوگا اور اس شخص میں سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کی استعداد بھی زیادہ ہوگی۔اور جس کا سر چھوٹا ہو تو اس میں دماغ بھی کم ہوتا ہے اور دماغ کم ہونے کی وجہ سے اس میں سوچنے، سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت بھی کم ہوگی۔تو رسول اللہ ﷺ کا سر مبارک قدرتی طور پر بغیر عارضہ کے اعتدال کے ساتھ بڑا تھا اور ایسا بڑا ہونا کمال کی علامت ہے۔

رجل الشعر،آپ ﷺ کے بال قدرے گھنگریالے تھے **ان انفرقت عقيقته فرق والافلا** اگر آپ ﷺ کے سر مبارک پر مانگ نکل آتی تو نکال لیتے ورنہ چھوڑ دیتے یعنی مانگ نکالنے میں تکلف نہیں فرماتے تھے۔

عقیقته، کا لفظ بال اتارنے اور نافرمانی کرنے میں استعمال ہوتا ہے۔**عقیقة** کو **عقیقة** اس لئے

---

(۱)قال الهيثمي المشذب،المفرط في الطول وكذلك هوفي كل شئ قال جرير ألوى بهاشذب العروق مشذّب..فكانّماوكيب على طربال(مجمع الزوائد۸/۲۹۱) كتاب علامات النبوة(مختار)

کہاجاتا ہے کہ اس میں بچے کے بال کاٹے جاتے ہیں(۱)۔مگر اس روایت میں مطلق بال مراد ہیں اور اس لفظ کے استعمال کی وجہ شاید یہی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں پیدا ہونے کے بعد اس کے بال اتارے جاتے تھے اور کچھ اور رسومات ادا کی جاتی تھیں اور وہ تمام رسومات آنحضرت ﷺ کی نہیں کی گئیں تو یہ بال آنحضرت ﷺ کے عقیقہ والے بال تھے۔

مگر بعض اہل علم نے اس کو رد کیا ہے۔اس لئے کہ آپ ﷺ کا تعلق بنوہاشم سے تھا اور بنوہاشم عرب کا شریف خاندان اور ایک شریف خاندان سے کیسے ممکن ہے کہ ایسے کام میں غفلت کرے۔اس لئے ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے **فأنّه مستبعد جداً فی العادة فأنّ عادتهم حلق الشعر المولود فی السابع و کذا ذبح الغنم و اطعام الفقراء**(جمع ۱/۴۲)(۲)

<u>آنحضرت ﷺ کا قدرتی مانگ:</u> **فلایجاوز شعره شحمة اذنیه اذاهو وفّرة**،رسول اللّٰہ ﷺ نے تین طرح کے بال رکھے تھے۔

(۱) وفرة، جب بال کانوں کے لوتک پہنچ جائے تو اسے وفرہ کہا جاتا ہے۔

(۲) لمّۃ اور جب بال کانوں کے لو سے تجاوز کر جائے اور منکبین تک نہ پہنچے ہوں تو اسے جمہ کہا جاتا ہے

(۲) جــمّة، جو کانوں کی لو سے تجاوز کر کے منکبین تک پہنچ جائیں تو اسے جمہ کہا جاتا ہے گویا رسول اللّٰہ ﷺ کے بالوں کا حد اول وفرہ تھا درمیانی حد لمّۃ تھا اور آخری حد جمّۃ تھا۔مگر عموماً آپ ﷺ کے بال وفرہ ہوا کرتے تھے(۳)۔

---

(۱)علامہ مناویؒ نے لکھا ہے **والعقيقة كالحقيقة و اصل العق القطع و الشق و من ثم قیل للذبیحة التی تذبح عن المولود یوم سابعه عقیقة لانّها یشقّ حلقها وقیل للشعر الخارج علی رأس المولود من بطن أمه عقیقة لأنّه یحلق ثم قیل للشعر النابت بعدذلک عقیقة مجازاً لأنّه منها ونباته من اصول**(مناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/۴۲)(مختار)

(۲)بعض شارحین نے لکھا ہے کہ ممکن ہے رسول اللّٰہ ﷺ کے بال معجزانہ طور پر رہ چکے ہوں اس لئے کہ رسول اللّٰہ ﷺ کا والد محترم ان کی پیدائش سے تقریباً چھ ماہ قبل وفات پا چکے تھے اور آپ ﷺ کے بال باقی رکھے گئے تا کہ ان پر مشرکانہ رسوم ادا نہ کی جائیں۔(مختار)

(۳)مردوں کے لئے اس طرح کے بال رکھنا جائز بلکہ موافق السنۃ ہیں اور اس سے زیادہ لمبے کرنا جیسے کہ آج کل کے فیشن ایبل حضرات، خواتین کی طرح بال رکھتے ہیں خلاف سنت اور گناہ ہے(مختار)

ازھر اللون، رسول اللہ ﷺ کا رنگ مبارک سرخ وسفید تھا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے رنگ مبارک میں ایک خاص چمک تھی(۱)۔اور ویسے سے بھی عموماً سرخ وسفید رنگ زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔

واسع الجبین، رسول اللہ ﷺ کشادہ جبین والے تھے یعنی آپ ﷺ کی پیشانی طولاً وعرضاً کشادہ تھی۔انسان میں ایسی پیشانی حسن کی علامت ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیشانی مبارک ایسی چمکدار تھی کہ گویا سورج دوڑ رہا ہے۔علماء کرام فرماتے ہیں کہ جبین کا وسیع اور کشادہ ہونا خوش قسمتی کی علامت ہے۔ایسا آدمی عموماً سخی اور خوش اخلاق ہوتا ہے۔پیشانی اگر وسیع اور کشادہ ہو تو آدمی باوقار اور وجیہہ معلوم ہوتا ہے۔

ازجّ الحواجب الخ،رسول اللہ ﷺ کے آبرو باریک اور خمدار ہونے کے ساتھ ساتھ کامل تھے مگر ملے ہوئے نہ تھے اور ان دونوں ابروؤں کے درمیان ایک باریک رگ تھی جو غصہ کے وقت ابھرتی تھی۔

ازج زجّ سے مشتق ہے۔جس کا معنیٰ ہے دوڑنا، نیزہ مارنا زجاج شیشہ کو کہا جاتا ہے اور نیزے کے پھل کو بھی زج کہا جاتا ہے۔

حواجب ،حاجب کی جمع ہے اور حاجب دربان اور چوکیدار کو کہا جاتا ہے چونکہ یہ بھویں بھی آنکھوں کی حفاظت کرتی ہیں اور جب کوئی شے آنکھوں کی طرف آتی ہے تو یہ بھویں خود بخود بند ہو جاتی ہیں اور آنکھوں کو اس چیز کے نقصان سے بچاتی ہیں۔

حواجب کے تین صفات: بھوؤں اور آبروؤں میں تین صفات کا ہونا حسن وجمال کا باعث ہوتا ہے۔ (۱)طویل ہونا (۲)باریک ہونا (۳)دونوں ماجبین کے درمیان قدرے فاصلہ ہونا تو ازج میں اول دو صفات کا ذکر ہے اور سوابغ من غیر قرن میں تیسری صفت کا ذکر ہے۔

حواجب جمع ذکر کرنے کی وجہ: یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ حواجب جمع کا صیغہ ہے جب کہ ہر انسان کے دو حاجبین ہوتی ہیں تو حدیث پاک میں حاجبین کیوں مذکور نہیں حواجب کا ذکر کیوں ہے؟

الجواب: مگر اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ عربی لغت میں کبھی کبھی تثنیہ پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حمل مبالغۃً ہو اور یہ مبالغہ ان دونوں کے امتداد کی وجہ سے ہو۔

---

(۱)قال أبو حنیفۃ الزھرۃ اشراق فی الألوان (مناوی ص۴۳)(مختار)

عرق واعصاب میں فرق: یہاں یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ عرق جس کی جمع عروق ہے ان رگوں کو کہا جاتا ہے جو مجوف ہوں اور عصب جمع اعصاب ان رگوں کو کہا جاتا ہے جو مجوف نہ ہو۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **العرق بکسر العین ھو أجوف یکون فیه الدم و العصب غیر أجوف**(جمع ۴۴)

تو رسول اللہ ﷺ کا **بین الحاجبین** والی رگ غصہ کے وقت ابھرتی تھی جو رسول اللہ ﷺ کے انتہائی قوت غضب پر دلالت کرتی ہے۔

اقنی العرنین الخ، رسول اللہ ﷺ کی ناک باریک، بلند اور قدرے لمبی تھی۔ چہرے کے حسن میں ناک کے باریک اور بلند ہونے میں بڑا دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ذوق ناک میں تین صفات کا موجود ہونا حسن و جمال تصور کرتے ہیں (۱) قدرے لمبائی (۲) باریک ہونا (۳) قدرے بلند ہونا۔ اور ناک مبارک پر ایک نور اور چمک ہوتا تھا۔

کث اللحیة (۱)، اور آپ ﷺ کی داڑھی مبارک گھنی تھی۔ کث گنجان کو کہا جاتا ہے۔ باب نصر سے گھنا ہونا اور گنجان ہونا آتا ہے۔ اہل علم کا کہنا ہے کہ داڑھی کا گھنا اور وسیع ہونا خوشنمائی کی علامت ہے اور چوڑی و لمبی داڑھی سے چہرہ حسین و جمیل لگتا ہے۔

داڑھی کی مقدار: ائمہ اربعہ کے ہاں ایک مشت کے برابر داڑھی رکھنا لازمی ہے۔ اور ایک مشت سے زیادہ ہو تو اس کا کٹوانا جائز ہے۔ بعض مصری علماء کرام داڑھی کو سنت عادیہ سمجھتے ہیں اور سنت عادیہ کی مخالفت موجب گناہ یا ملامت نہیں۔ البتہ جمہور اہل علم داڑھی کو سنت مؤکدہ سمجھتے ہیں۔

سهل الخدين: اور آپ ﷺ کے رخسار ہموار تھے رخساروں کا نرم اور ہموار ہونا اور کیل چھائیوں، داغ دھبوں سے محفوظ ہونا حسن سمجھا جاتا ہے۔

سهل اس زمین کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے جو بلند و بالا ہو۔ تو سہل کا معنیٰ ہے غیر مرتفع۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے رخسار مبارک بالکل صاف، نرم، ہموار اور پُر گوشت تھے۔

کشادہ دہن: **ضليع الفم** ضلع دراصل پسلیوں کی صفت ہے۔ چوڑی اور لمبی پسلیوں والے کو

(۱) علامہ ہیثمیؒ نے لکھا ہے الکثونة ان تکون اللحية غير رقيقة و لا طويلة ولكن فيها كثانة من غير عظم و لا طول (مجمع الزوائد ۲۹۲/۳ کتاب علامات النبوۃ)(مختار)

ضلیع کہتے ہیں یہاں مطلق کشادگی کے معنی پر ہے بعض اقوام کے ہاں بہت چھوٹا منہ حسن سمجھا جاتا ہے اور بعض کشادہ دہنی کو حسن سمجھتے ہیں نبی کریم ﷺ کا منہ مبارک زیادہ چھوٹا نہ تھا بلکہ اپنے جسم کے دیگر اعضاء کے بالکل موافق ذرا کھلا ہوا اور کشادہ تھا۔ یہ صفت دراصل ما فی الضمیر کے بہتر اظہار کرنے میں مدد ہوتی ہے فصاحت کی علامت ہے اور خطابت اور دعوت کے کام میں معاون ہے۔

گردن اور دانتوں کی خوبصورتی: مفلّج الأسنان فلج دانتوں کی کشادگی کو کہتے ہیں اور دانتوں کے درمیان تھوڑی کشادگی فطری حسن کو جلا بخشتی ہے بالکل بند اور ملے ہوئے دانت خوبصورت بھی دکھائی نہیں دیتے اس کے مقابلے میں جو صفت آتی ہے وہ الصّ ہے جو کہ ملے ہوئے دانتوں والے شخص کو کہتے ہیں لیکن شرّاح کہتے ہیں کہ فلج آپ ﷺ کے ثنایا یعنی آگے کے دانتوں میں تھا جو کہ ممدوح صفت ہے بخلاف پچھلے دانتوں کے ان میں فلج نہیں تھا۔

کان عنقہ جید دمیّۃ آپ ﷺ کی گردن گڑیا کی گردن کی طرح ہموار تھی گویا کسی ماہر مصوّر نے انگلیوں سے بنائی ہو۔ الدمیّۃ المنحوت من العاج او الرخام یعنی ہاتھی دانت یا سنگ مرمر کو تراش کر بنائی ہو۔ گڑیا کو دمیّۃ کہتے ہیں۔ دمیٰ اس کی جمع ہے۔ متنبّی کا شعر ہے کہ

خرجت غداۃ النفر اعترض الدمیٰ فلم ار أحلیٰ منک فی العین و القلب

الغرض آپ ﷺ کی گردن مبارک بھی اعتدال واستواء اور حسنِ ساخت میں ایسی تھی جیسے کسی ماہر بت تراش نے ہاتھی دانت سے تراش کر بنائی ہو۔

معتدل الخلق یہ گزری ہوئی تفصیل کے لئے اجمال ہے یا پھر بعد کے لئے اجمال ہے یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ ساری جسمانی ساخت میں بہت زیادہ اعتدال تھا گویا آپ ﷺ سڈول جسم کے مالک تھے۔ ہر ہر چیز میں توازن اور اعتدال وتناسب تھا۔

جسم نہایت معتدل تھا: بادن متماسک ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اس سے قبل کے الفاظ کان کی خبریت کی بناء پر منصوب تھے لیکن آگے کے الفاظ مرفوع مروی ہیں۔ آپ ﷺ فربہ تھے لیکن اعضاء میں تماسک تھا یعنی اعتدال کے ساتھ اعضاء پر گوشت تھے۔ لیکن ان کا گوشت لٹکا ہوا نہیں تھا جس طرح کے

پہلے بھی مطھم ہونے کی نفی کی گئی ہے۔عموماً ورزش اور جفاکشی کی کمی اور تنعم و بسیار خوری کے باعث جسم کا گوشت جوانی ہی میں لٹکنے لگتا ہے لیکن نبی کریم ﷺ کی زندگی تو فوجی زندگی تھی جفاکشی کے کاموں اور سخت سے سخت تر مشقت کے کاموں میں آپ ﷺ پیش پیش رہتے تھے۔عبادات میں بھی ایسا انہاک تھا کہ پاؤں میں ورم آجاتا تھا اس وجہ سے بدن میں پکڑ پیدا ہوا تھا یعنی گوشت ہڈیوں کے ساتھ اور اعضاء ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے چمٹے ہوئے تھے۔یہ صفت صحت وتندرستی کی علامت بھی ہے۔اور بظاہر یہی لگتا ہے کہ آپ ﷺ کی یہ صفت بڑھاپے تک برقرار تھی۔

سواء البطن والصدر زیادہ خوراک اور کم ورزش کے باعث عموماً پیٹ بڑھ جاتا ہے وزن بڑھ جاتا ہے جو ایک طرح بدصورتی کے ساتھ ساتھ سستی اور تکاہل کا سبب بنتا ہے۔دوسری طرف کئی بیماریوں کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔اطباء کا اس پر اتفاق ہے کہ پیٹ بڑھنا ایک مستقل بیماری ہے لیکن آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ کو تو **قوت لا یموت** ملتی تھی پھر مشقتیں اور جفاکشی اس پر مستزاد ہوتی تھی۔نیز دین کا غم اور امت کی فکر الگ کھائے جارہی تھی اس لئے پیٹ بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔جس کی وجہ سے جسم بہت معتدل تھا۔ **عریض الصدر** بعض روایات میں **رحب الصدر** آیا ہے سینہ کا چوڑا ہونا مردانہ حسن کے علاوہ تحمل اور بردباری کی علامت بھی ہے۔

<u>جسم مبارک کی رنگت:</u> **انور المتجرّد** ،متجرد بدن کے اس حصے کو کہتے ہیں جس پر بال نہ ہوں یا اس حصے کو جس سے کپڑا ہٹایا جائے یعنی برہنہ حصے کو کہتے ہیں۔اس لفظ کی تفسیر میں دو احتمال ہیں یہ بھی صحیح ہے کہ جب آپ ﷺ کپڑا بدن سے ہٹادیتے تو چھپے ہوئے اعضاء ظاہر ہو کر دوسرے اعضاء کی نسبت زیادہ روشن دکھائی دیتے تھے کیونکہ کھلے ہوئے اعضاء کا رنگ گندم گون ہوتا ہے لیکن اس سے بہتر تفسیر یہ ہے کہ عام حالت میں جو اعضاء کپڑے سے خالی اور ظاہر ہوتے ہیں وہ منور اور روشن ہوتے تھے جبکہ کپڑے کے اندر چھپے ہوئے اعضاء تو اور بھی زیادہ منور ہوتے تھے۔اس توجیہ میں اس قول پر رد بھی ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کا رنگ گندم گون تھا۔

<u>سینہ کے بال:</u> **موصول مابین اللبة والسرة بشعر** سینے کے اوپر گڑھا سا دکھائی دیتا ہے لبہ

کہلاتا ہےاور سرۃ ناف کو کہتے ہیں۔ان دونوں کے درمیان بالوں کی ایک لکیر تھی جو باریکی میں خط جیسے تھی۔اسی مفہوم کو پہلے دقیق المسربۃ سے بیان کیا گیا ہے۔

عاری الثدیین والبطن مما سویٰ ذالک اس خط اور بالوں کی لکیر کے علاوہ سینہ اور پیٹ پر بال نہیں تھے۔بعض لوگوں نے اس روایت سے اور حضرت انسؓ کی روایت سے جس میں **بیاض الإبط** کا ذکر ہے۔بغلوں کے نیچے کے بالوں کی بھی نفی کی ہے مگر یہ درست نہیں کیونکہ روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ بغلوں کے بالوں کو نکالا کرتے تھے۔

أشعر الذراعین والمنکبین واعالی الصدر، اشعر اجرد کی ضد ہے یعنی مذکورہ حصوں پر بال زیادہ اور طویل تھے۔**طویل الزندین، زند** کلائی کو کہتے ہیں آپ ﷺ کی کلائیاں طویل اور لمبی تھیں۔

رحب الراحۃ آپ ﷺ کی ہتھیلیاں چوڑی اور کشادہ تھیں اس لحاظ سے بھی ان میں فراخی پائی جاتی تھی اور یہی حسن فراخی اس معنوی فراخی پر بھی دلالت کرتی ہے جو کہ نبی کریم ﷺ میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔چنانچہ آپ ﷺ کی سخاوت بے مثل تھی بعض لوگوں نے اس جملہ کا معنی ''**واسع القوۃ**'' سے بھی کیا ہے یعنی شدائد کے وقت آپ ﷺ بہت مضبوط اور جمے ہوئے رہتے تھے۔لیکن پہلا معنی راجح ہے کیونکہ یہاں بدن کی ظاہری ساخت کا بیان مقصود ہے۔

<u>ہاتھ پاؤں اور اطراف کا ذکر:</u> **سائل الأطراف او قال شائل الأطراف** راوی کو شک ہے کہ اس کے استاد نے سائل کا لفظ بولا تھا یا شائل کہا تھا بلکہ بعض روایات میں **سائن الأطراف** اور بعض روایات میں **سائر الاطرف** بھی آیا ہے جو سائل کے قریب المعنی ہیں **سائل سال یسیل** کا اسم فاعل ہے جس کے حقیقی معنی ''بہا ہوا'' ہوتے ہیں لیکن یہاں پر لمبا ہونے کے معنی میں مستعمل ہے کہا جاتا ہے ''**سالت غرۃ الفرس**'' بمعنی **استطالت و عرصت** اور **شائل شال یشول** کا اسم فاعل ہے جو رفع اور ارتفاع یعنی متعدی اور لازم دونوں معنوں میں مستعمل ہے کہتے ہیں **شال المیزان** ترازو کا ایک پلڑا دوسرے سے اونچا ہو گیا اور ''**شال الفرس ذنبہ**'' کا معنی ہے گھوڑا دم اٹھا کر بھاگا۔اطراف ہاتھ پاؤں اور سر یعنی دھڑ سے جدا ہونے والے اعضاء نیز انگلیوں پر بھی بولا جاتا ہے بہر حال یہاں پر نبی کریم ﷺ کے ہاتھ

پاؤں کا ذکر ہے کہ وہ لمبے اور سیدھے تھے۔ ٹیڑھے اور چھوٹے نہ تھے۔

قدم مبارک کی ساخت: خمصان الأخمصين ،خمصان فتح خاء کے ساتھ بھی درست ہے لیکن روایت ضم خاء کے ساتھ ہے یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور أخمص بھی خمص خموصا ومخمصة سے ہے جس کے اصل معنی خالی ہونے کے ہیں أخمص اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے پاؤں کا درمیانی حصہ گوشت سے خالی ہو اور چلتے وقت سارا پاؤں زمین پر نہ لگے اور اس کا دوسرا معنی ہے ''ما يتجا فیٰ عن الأرض عند وضع القدم'' یعنی پاؤں کا وہ حصہ جو چلتے وقت زمین پر نہ لگے یہاں پر بھی اس دوسرے معنی میں مستعمل ہے یہ وصف پاؤں کے حسن میں اضافہ کرتا ہے اس کے برعکس پاؤں پر گوشت زیادہ ہو اور سارے کا سارا زمین پر پڑے تو یہ متورم اور بدصورت دکھائی دیتا ہے۔ أخمص قدمین کو کہا جاتا ہے۔ متنبی کا شعر ہے کہ فبايّماقدم سعيت إلیٰ العُلیٰ ادم الهلال لاخمصيک خذاء

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے پاؤں میں یہ صفت ثابت کی گئی ہے لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ ''اذا وطئی بقدمه وطئی بكلّها ليس له أخمص'' جس میں اس صفت کی بصراحت نفی کی ہے سند کے لحاظ سے بھی محدثین کے ہاں بہ نسبت اس حدیث کے ابو ہریرہؓ کی حدیث قوی ہے کیونکہ ہند کی اس حدیث میں جمیع کے علاوہ مجہول راوی بھی ہیں۔ لہٰذا اس حدیث کی توجیہ میں یہی کہا جائے گا کہ چونکہ نبی کریم ﷺ کے قدم مبارک کا خمص نہایت اعتدال پر تھا نہ معدوم تھا۔ اور نہ اتنا زیادہ تھا کہ پاؤں ٹیڑھا نظر آئے۔ اس لئے ہند کی اس حدیث میں جس خمص کا اثبات ہے وہ معتدل خمص ہے اور ابوھریرہؓ کی حدیث میں جس خمص کی نفی ہے وہ اعتدال سے باہر کا خمص ہے اور اسی وجہ سے خمصان کا معنی بھی زیادہ أخمص نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کا خمص نہایت معتدل تھا۔ اس طرح دونوں حدیثوں کا تعارض ختم ہو جاتا ہے۔ مسيح القدمين مسیح چکنے اور ہموار کو کہتے ہیں اور یہ اس لئے کہ مسح اور مسلسل ملنا ہموار اور چکنے ہونے کا سبب بنتا ہے آپ ﷺ کے پاؤں مبارک نشیب وفراز سے خالی تھے ہڈیاں ادھر اُدھر کو نکلی ہوئی نہ تھیں۔

ينبو عنهما الماء چونکہ پاؤں میں دراڑیں وغیرہ نہ تھیں اس لئے پانی پڑتے ہی ان سے جدا ہو

جاتا تھانبا ینبو ،نبوۃ کے معنی اچٹنا کے ہیں کہتے ہیں ''لکل سیف نبوۃ ولکل جواد کبوۃ'' یعنی تلوار جو بھی ہو کبھی کبھی اچٹ جاتی ہے اور گھوڑا بہترین ہو تو بھی کبھی کبھی ٹھوکر کھا جاتا ہے۔

سبک رفتاری: ویمشی هونًا آرام سے جانے کا مقصد وقار وسکون کی رفتار ہے جس میں جلدی نہ ہو اگرچہ تیز ہو اور دراصل اس میں عجلت کی نفی مقصود ہے جس کا تو ہم زال قلعا سے ہوسکتا ہے۔عبادالرحمٰن کی صفت میں ہے الذین یمشون علی الأرض هونا جس میں تکبر اور تبختر کا شائبہ نہ ہو۔

ذریع المشیة ،مشیة ایک قدم اور دوسرے قدم کے درمیانی مساحۃ کو کہتے ہیں کچھ لوگ چلتے ہوئے چھوٹے قدم اٹھاتے ہیں یہ تکاہل وسستی یا تکبر کی علامت ہوتی ہے۔اس کے برعکس نبی کریم ﷺ بے تکلفی کے ساتھ لمبے ڈگ بھرتے تھے۔چستی کے ساتھ جمے ہوئے قدم اٹھاتے تھے نیز تکبر سے محفوظ تھے۔ چنانچہ فطری طور پر آپ ﷺ کی رفتار بھی تیز ہوتی تھی۔ایک صحابی فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ جاتے تو گویا زمین آپ ﷺ کے لئے سمٹتی جاتی تھی بعض لوگ طیّ الأرض کو آپ ﷺ کا معجزہ قرار دیتے ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔لیکن ہر جگہ اسے معجزہ پر بھی حمل نہیں کیا جائیگا۔مثلاً اسراء اور معراج میں تو اس معجزہ کا ظہور ہوا۔لیکن عمومی طور پر ویسے ہی آپ ﷺ کے قدم بھی لمبے تھے۔جس کی وجہ سے رفتار بھی تیز تھی۔واذا التفت التفت جمیعاً اس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

دنیا سے صرفِ نظر: خافض الطرف آپ ﷺ میں یہ کمال درجہ کی حیا موجود تھی کسی سے بات کرتے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ کرتے نظر اکثر نیچی ہوتی تھی دنیا اور جہانداری کی چیزوں کو کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھا۔دنیا سے آپ ﷺ کا تعلق ہی نہ تھا اللہ تعالیٰ ہی سے تعلق تھا۔نبوت کی ذمہ داریوں اور فرائض کے بوجھ نے آپ ﷺ کو اجازت ہی نہ دی کہ دنیا کی طرف میلان بھی پیدا ہو۔خود فرماتے ہیں کہ مالی وللدنیا ما أنا إلاّ کراکب استظلّ تحت الشجرۃ دنیا سے مجھے کیا کام میں تو ایک مسافر کی طرح ہوں جو تھوڑی دیر ستانے کے لئے درخت کے نیچے بیٹھ جائے۔

یعنی اصل منزل ہماری آخرت ہے دنیا اور اس کے کاموں میں دل لگانا اولیاء اور انبیاء کا کام نہیں غالباً المدخل میں نظر سے گزرا۔ایک بزرگ جن کا نام غالباً محمد بن اسلم تھا یا کوئی اور راستے میں جارہے

تھے ایک کوٹھی پر نظر پڑی تو کھڑے ہو کر پوچھا من هذه الدار یہ گھر کس کا ہے پھر خیال آیا کہ یہ کیا کیا۔ آخر تیرا اس سے کیا مطلب۔ اس پر نہ تیری دنیا موقوف ہے نہ آخرت، مجھے اس سوال سے کیا تعلق؟ چنانچہ ایک سال تک اس ایک نگاہ غلط انداز اور لایعنی سوال کا کفارہ ادا کرنے کے لئے روزے رکھے۔

بہرحال نبی کریم ﷺ نے بھی ہمیشہ دنیا سے صرف نظر کر کے آخرت اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ دی فکر آخرت اور مشاہدہ عالم الغیب میں مشغول رہے جس کی وجہ سے نظر عموماً نیچی رہتی تھی نیز اس عمل میں ایک گونہ تواضع اور انکسار بھی تھا جو کہ آپ ﷺ کی فطری خوبی تھی۔ **نظره إلى الأرض أطول من نظره إلىٰ السماء** یہ ماقبل کے لئے تاکید ہے۔ لیکن ابوداؤدؒ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کی حدیث نقل فرمائی ہے وہ کہتے ہیں کہ **كان ﷺ إذا جلس يتحدّث يكثر ان يرفع طرفة إلى السماء.** نبی کریم ﷺ جب بیٹھے ہوئے باتیں کیا کرتے تھے تو اکثر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے۔

<u>تطبیق بین الاحادیث:</u> ان دونوں حدیثوں میں تطبیق یوں کی گئی ہے جب آپ ﷺ خاموش بیٹھے ہوتے تھے تو نظر زمین پر ہوتی تھی اور باتیں کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ یا یوں کہ آپ ﷺ عام حالت میں نظر نیچی رکھتے تھے کیونکہ دنیا اور اس کے لوازم سے کوئی غرض نہ تھی لیکن وحی کا انتظار ہوتا تھا تو نظر آسمان کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ **جلّ نظره الملاحظة، ملاحظة** "نظر بالالحاظ" یعنی کن انکھیوں سے دیکھنے کو کہتے ہیں **لحاظ** آنکھ کے اس گوشہ کو کہتے ہیں جو کان کی طرف ہوتا ہے بعض متصوّفین دنیا کی ہر چیز کو یک قلم رد کر دیتے ہیں اور عیسائی راہبوں کے طریقہ پر چلتے ہوئے کبھی کبھار غلط نگاہ بھی دنیا پر ڈالنا گوارا نہیں کرتے جس کی وجہ سے اکثر ان کے متعلقین کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن نبی کریم ﷺ کا عمل اس کے برعکس تھا آپ ﷺ کسی شخص کو کسی چیز میں دلچسپی لیتے ہوئے دیکھتے تو اس کی دلجوئی اور خاطرداری کے لئے آپ ﷺ بھی اس کی دلچسپی میں تھوڑی سی شرکت فرماتے لیکن حریص اور لالچی لوگوں کی طرح انہماک سے احتراز ضرور کرتے بس ایک اوپری سی نظر سے دیکھتے۔ کیونکہ آپ ﷺ کو طمع وحرص کی نظر سے منع کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ **ولا تمدنّ عينيک إلىٰ ما متّعنا به (آلاية)**

يسوق أصحابه آپ ﷺ صحابہ کی جماعت کے ساتھ چلتے تو ان کے پیچھے پیچھے چلتے آگے نہ

جاتے لوگوں کے آگے جانے والے کو قائد اور پیچھے جانے والے کو سائق کہتے ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سفر میں پیشوا اور لیڈر کو قوم کے پیچھے چلنا چاہیے تاکہ آگے جانے والوں کی حالت معلوم ہو سکے۔ ویسے بھی نبی کریم ﷺ صحابہؓ کی انتہائی نگہداشت فرماتے تھے ہر وقت ان کی کامیابی وسرفروشی کے لئے فکرمند اور ان کے تزکیہ کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ اسی لئے آپ ﷺ صحابہ کے پیچھے چلتے جیسے چرواہے مویشی کو ہانک کر لے جا رہے ہوں نیز اس میں تواضع بھی ہے علاوہ ازیں چونکہ آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے فرشتے بھی چلتے تھے۔ لہذا ان کے لئے جگہ خالی کروانے کے لئے بھی آپ ﷺ صحابہ کو آگے کر لیتے تھے۔

یبدأ من لقی بالسلام آپ ﷺ تکبر اور خود پسندی سے نہایت دور رہتے تھے کبھی یہ خیال تک نہیں گزرا کہ لوگ سلوٹ، سلام، استقبال اور خوش آمدید کریں۔ انسانیت کے سب سے عظیم ترین مرتبہ پر فائز ہونے کے باوصف ہر چھوٹے بڑے پر سلام میں سبقت آپ ﷺ کا شیوہ تھا۔ اور یہی انسانیت کی معراج بھی اور گارڈ آف آنر ہے۔ آج کل تو بعض طالبعلم بھی ایسے ہیں کہ راستہ جاتے ہوئے اساتذہ سے ملتے ہیں تو اساتذہ کے سلام کا انتظار کرتے ہیں اور پھر اساتذہ کے سلام کا جواب بھی ٹھیک طرح سے نہیں دیتے۔ بہرحال سلام میں نبی کریم ﷺ کے اتباع کی کوشش کرنی چاہیے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ دو ملنے والوں میں جو شخص سلام میں ابتداء کرے وہی اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب تر ہے(۱)۔

فقہائے کرام کا فیصلہ ہے کہ اگر چہ ابتداء بالسلام سنت ہے اور اس کا جواب واجب ہے مگر اس باب میں واجب کی نسبت سنت کو فضیلت حاصل ہے اور ابتداء بالسلام کا ثواب زیادہ ہے اس لئے یہاں یہ توجیہ درست نہیں ہوگی کہ آپ ﷺ امت کو جوابِ سلام کا موقع دے کر ان سے واجب عمل کروانا چاہتے تھے تاکہ ان کو ثواب زیادہ حاصل ہو۔

(۸) حدّثنا أبو موسٰی محمّد بن المثنیٰ ثنا محمّد بن جعفر ثنا شعبة عن سماک بن حرب قال سمعت جابر بن سمرة یقول کان رسول اللّٰه ﷺ ضلیع الفم أشکل العین منهوس العقب قال شعبة قلت لسماک ما ضلیع الفم قال عظیم الفم قلت ما أشکل العین قال

(۱) ترمذی، ابوداؤد، شمائل

طويل شق العين قلت ما منهوس العقب قال قليل لحم العقب (۱).

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرةؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فراخ دہن تھے آپ ﷺ کی آنکھوں کی سفیدی میں سرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے ایڑی مبارک پر بہت کم گوشت تھا۔شعبہؒ نے کہا کہ میں نے حضرت سماکؒ سے پوچھا کہ ضليع الفم کا کیا معنی ہے۔تو آپؒ نے فرمایا عظيم الفم. (فراخ دہن) یعنی فصاحت۔ پھر میں نے پوچھا کہ اشكل العين کا کیا معنی ہے۔تو آپؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد فراخ چشم ہے۔میں نے پھر کہا کہ منهوس العقب کا کیا معنی ہے۔آپؒ نے کہا کہ کہا گیا ہے لحم العقب۔

عن جابر بن سمرةؓ، ابوعبداللہ جابر عامریؓ حضرت سعد بن ابی وقاص کے بھانجے ہیں کوفہ میں رہا کرتے تھے اور ۷۴ھ میں وفات پائی ان کے والد حضرت سمرة بن جندبؓ بھی صحابی ہیں۔اصل میں فرازی ہیں انصار کے حلیف رہے انہوں نے ۵۹ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔

أشكل العين اس کا ایک معنی یعنی طويل شق العين تو سماک سے روایت کر کے مصنف خود کرتا ہے لیکن اکثر علماء کے نزدیک اشکل کے معنی اور ہیں وہ کہتے ہیں کہ آنکھیں دو صفت رکھتی ہیں ایک شكلة جو کہ ممدوح ہے دوسری شهلة جو کہ مذموم ہے شكلة کے معنی یہ ہیں کہ آنکھوں کی سفیدی میں سرخ ڈورے ہوں اور آنکھوں میں خمار سا آجاتا ہے۔اور نشیلی آنکھیں خوبصورت دکھائی دیتی ہیں اور شهلة کا مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کی سیاہی میں سرخ ڈورے یا نیلا پن ہو یہ صفت آنکھوں کے لئے حسن نہیں بلکہ عیب ہے۔

خلاصہ یہ کہ راجح قول کے مطابق أشكل العينين اس شخص کو کہتے ہیں جس کی آنکھوں کی سفیدی میں سرخ ڈورے ہوں۔حافظ عراقیؒ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھوں میں شكلة آپ ﷺ کی نبوت کی علامات میں سے ایک علامت تھی۔

منهوس العقب اور ایک اور روایت میں منهوش العقب بھی آیا ہے نهس اور نهش

---

(۱) المستدرک للحاکم ۶۴۰/۳

دونوں گوشت کو ہڈی سے الگ کرنے کیلئے نوچنے کو کہتے ہیں۔یہاں قلیل اللحم کے معنی میں آیا ہے گویا کہ آپ ﷺ کے ایڑیوں کے گوشت کو نوچا گیا ہو۔یعنی ایڑیاں گوشت سے خالی تھیں۔قال شعبة شعبہؒ اپنے شیخ سے بعض مشکل الفاظ کے معانی پوچھتے ہیں طویل شق العین شراح کے قول کے مطابق یہ معنی سماکؒ کے وہم کا نتیجہ ہے اس سے قبل اس کے راجح معنی ہم بیان کر چکے ہیں۔

(۹) حدّثنا هنادبن السريّ ثناعثربن القاسم عن اشعث يعني ابن سوارعن أبي إسحاق عن جابربن سمرة قال رأيت رسول اللّٰه ﷺ في ليلة اضحيان وعليه حلّةُ حمراء فجعلت انظر اليه وإلىٰ القمر فهوعندي أحسن من القمر(۱)

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ چاند کی چودھویں رات کو نبی کریم ﷺ کو دیکھا آپ ﷺ اس وقت سرخ جوڑا زیب تن کئے ہوئے تھے میں کبھی چاند کو دیکھتا اور کبھی آپ ﷺ کو پس خدا کی قسم نبی کریم ﷺ میری نظر میں چاند سے زیادہ حسین دکھائی دے رہے تھے۔

ليلة اضحيان علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ اس وزن پر اوصاف بہت کم آتے ہیں یہ لفظ ضحو سے ہے جس کے معنی ہیں روشن ہونا۔ ضحی چاشت کے وقت کو بھی کہتے ہیں جب دن چڑھنے کی وجہ سے ہر چیز روشن ہو جائے قربانی کو بھی اضحیہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ باطن کو منور کرتا ہے۔ليلة اضحيان اس رات کو کہتے ہیں جو ابتداء سے آخر تک روشن ہو سر شام چاند نکل آئے اور صبح تک روشنی پھیلاتا رہے۔یہ دراصل قمری مہینہ کی تیرھویں اور چودھویں رات ہوتی ہے۔أحسن من القمر چاند کی روشنی بہت خوبصورت ہوتی ہے اس میں حرارت نہیں ہوتی بلکہ برودت اور سکون و راحت ہوتی ہے۔دیکھنے سے انسان کو تسکین ملتی ہے سرور حاصل ہوتا ہے وہ تمام صفات نبی کریم ﷺ کے چہرہ انور میں بھی تھیں آپ ﷺ کے چہرے کی نورانیت چاند سے بھی زیادہ تھی اور یہ محض عقیدت کی بناء پر نہیں کہتا بلکہ نفس الامر ہی ایسا تھا اور یہ

---

(۱)صحيح مسلم ۲/۲۵۷ كتاب الفضائل باب ماجاء في صفة شعر النبي ﷺ صفاته الخ، جامع ترمذی۲/۱۸۳ كتاب المناقب باب ماجاء في صفة النبيّ ﷺ ،مسنداحمد۶/۸۸(مختار)

عقیدہ رکھنا آج بھی جزو ایمان ہے۔حضور نبی کریم ﷺ کے چہرے کا نور بہت زیادتھا۔ابن مبارکؒ اور ابن جوزیؒ کی ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے۔ **عن ابن عباسؓ أنہ ﷺ لم یکن لہ ظلّ ولم یقم مع شمس قط الأغلب ضوء ہ علی ضوء الشمس لم یقم مع سراج الأغلب ضوء ہ علی ضوء السراج.**

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا سایہ نہیں ہوتا تھا اور وہ جب بھی سورج کے ساتھ کھڑے ہوتے تو سورج کی روشنی پر آپ ﷺ کی روشنی غالب آجاتی تھی اور جب بھی کسی چراغ کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے تو چراغ کی روشنی پر آپ ﷺ کی روشنی غالب آجاتی تھی۔

(۱۰) حدثنا سفیان بن وکیع ثنا حمید بن عبدالرحمٰن الرواسی عن زھیر عن أبی إسحاق قال سأل رجل البراء بن عازب أکان وجہ رسول اللّٰہ ﷺ مثل السیف قال لا بل مثل القمر(۱).

ترجمہ: ابو اسحٰقؒ فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے حضرت براءؓ سے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ کا چہرہ مبارک تلوار کی طرح تھا تو انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ بدر(چاند) کی طرح تھا۔

<u>تشبیہ میں بھی انتہائے ادب تھا:</u> **لا بل مثل القمر** تلوار اس زمانے میں بیش قیمت ہتھیار تھا اور جب یہ نئی اور صیقل شدہ ہوتی تو اس کی چمک قابل دید ہوتی تھی چونکہ تلوار اس وقت عام حالات میں بھی لوگوں کے پاس ہوتی تھی اس لئے لوگوں کے درمیان چمک دمک میں تشبیہ دینے کے لئے تلوار متعارف تھی لہٰذا سائل کا مقصد یہ تھا کہ کیا آپ ﷺ کا چہرہ انور چمک میں تلوار کی طرح تھا اور ممکن ہے کہ استطالۃ کا مفہوم بھی ملحوظ ہو اور یہ مقصد ہو کہ کیا نبی کریم ﷺ کا چہرہ تلوار کی طرح لمبا اور منور تھا۔حضرات صحابہ کرامؓ کے نزدیک چونکہ ادب کا زیادہ پاس ہوتا تھا نبی کریم ﷺ کا مرتبہ اور شان کو وہ **مشابھۃ** اور تشبیہ میں بھی ملحوظ رکھتے اس لئے حضرت براءؓ نے کہہ دیا کہ تلوار کی طرح نہیں بلکہ چاند کی طرح تھا۔

(۱) سنن دارمی ۳۰/۱،المستدرک للحاکم ۱۸۶/۴

سیف نہیں چاند سے تشبیہ کے وجوہات: اس تشبیہ کو بدلنے میں متعدد وجوہ ہیں ایک وجہ تو یہ ہے کہ مشبہ بہ یعنی تلوار میں تدویر نہیں جو کہ نبی کریم ﷺ کے چہرہ میں تھی بلکہ تلوار لمبی ہوتی ہے لہذا انہوں نے اس تشبیہ کی نفی کی۔

اور دوسری تشبیہ ذکر کی تا کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں حتی الامکان من کل الوجوہ قرب ہو تو بہتر ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ تلوار مصنوعی چیز ہے اس کا تنوّر بھی مصنوعی اور وقتی ہوتا ہے یہ ٹوٹتی ہے، استعمال سے کند ہو جاتی ہے اور اسے زنگ بھی لگتا ہے جس سے چمک ختم ہو جاتی ہے جبکہ چاند میں اس قسم کا کوئی عیب نہیں وہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا دائمی منور جرم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نور بخشا ہے۔ انسان کے عمل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے بھی نبی کریم ﷺ کو چراغ سے تشبیہ دی ہے۔ جو کم از کم تلوار سے زیادہ روشن اور چاند کے قریب ہے فرماتے ہیں کہ **یاایّھا النّبیّ إنّاأرسلنک شاھداً و مبشراً و نذیراًo و داعیاً إلیٰ اللّٰہ باذنہ و سراجاًمنیراo(الاحزاب ۴۵۔۴۶)**

اے پیغمبر ﷺ ہم نے تجھ کو گواہ اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ نیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی طرح دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر۔ اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ آپ کے مشکوٰۃ نبوت سے صحابہ کرام رشد و ہدایت اور روشنی کے چراغ اور ماہ و انجم بن کر نکلے اصحابی کاالنجوم (الحدیث) پھر چراغ اور شمع اندھیروں اور تاریکیوں سے لڑلڑ کر سپیدۂ سحر تک جلتی رہتی ہے۔

ع شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

تو سراجاً منیراً میں علوم و نکات کا ایک مسند پنہاں ہے۔ نیز دوسرے صحابہ بھی قمر ہی کے ساتھ آپ ﷺ کے چہرے کو تشبیہ دیا کرتے تھے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ تلوار کا محل استعمال جنگ، بدامنی، ہلاکت اور قتل و غارت ہے اگرچہ بعض اوقات تلوار کا استعمال جائز بلکہ موجب ثواب بھی ہوتا ہے لیکن فی نفسہ یہ ایک قبیح امر ہے۔ جبکہ نبی کریم ﷺ بنیادی طور پر رحمۃ للعالمین ہیں امن کا پروانہ لے کر دنیا میں تشریف لائے آپ ﷺ کا مقصد

بعثت اہلاک نہیں احیاء ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے کہ **یا ایّھا الذین آمنوا استجیبوا للّٰہ والرسول إذا دعاکم لما یحییکم (الآیة انفال ۲۴)** اے ایمان والو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے کہنے کو بجالایا کرو جبکہ رسول تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہوں۔

وہ زندگی کے ہر میدان میں امت کے لئے پیغام حیات ہیں یوں مشبہ اور مشبہ بہ میں کوئی جوڑ نہیں رہتا جبکہ چاند خالص ایک نعمت ہے خیر ہی خیر ہے شر کا کوئی شائبہ نہیں۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ قمر کے لغوی مفہوم میں غلبہ کا معنی پایا جاتا ہے۔مقامرۃ قمار ایک دوسرے پر غلبہ کیلئے ہوتا ہے۔اور نبی کریم کو بھی غلبہ دلانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا۔فرماتے ہیں **ھو الذی أرسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون**(توبة ۳۳)

وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب کردے گو مشرکین اس سے ناخوش ہوں۔

اور سیف کے مفہوم میں اہلاک اور فنا کے گھاٹ اتارنا ہے۔جبکہ اس قسم کی مناسبت تلوار اور نبی کریم ﷺ کی ذات مبارک میں نہیں ہے۔اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کلام میں آداب ہر صورت میں ملحوظ رکھنے چاہیں۔

<u>ہارون الرشید کے بیٹوں کا واقعہ:</u> ہارون الرشید کے دو بیٹے امین الرشید اور مامون الرشید تھے۔ دونوں کا تاریخ میں بڑا نام ہے۔اول الذکر ہارون الرشید کی چہیتی بیوی زبیدہ خاتون کے بیٹے تھے۔جبکہ دوسرے ایک کنیز کے بیٹے تھے۔مامون الرشید کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت وفطانت سے نوازا تھا اور بچپن ہی سے اساتذہ اور بڑوں کے آداب کا لحاظ رکھا کرتے تھے۔اسی لئے وہ ہارون الرشید کو زیادہ پیارے تھے۔ایک دن زبیدہ خاتون نے شکایت کی کہ ہارون میرے بیٹے پر ایک کنیز کے بیٹے کو ترجیح دیتا ہے جس کی وجہ سے ہارون نے دونوں کا امتحان لے کر زبیدہ پر ظاہر کر دیا کہ مامون الرشید واقعی زیادہ پیار کے مستحق ہیں۔وہ اس طرح کہ اس نے چند مسواک ہاتھ میں لے کر پہلے امین الرشید کو بلایا اور پوچھا کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے اس نے جواب دیا کہ "مساویک" جس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ یہ لفظ مسواک کی جمع ہے۔ اس لحاظ سے جواب درست تھا لیکن اس کا دوسرا معنی "تیرے گناہ" یا "تیرے عیوب" بھی بنتا ہے۔اس لحاظ سے

باپ کو یہ جواب دینا مناسب نہ تھا۔اس کے بعد ہارون الرشید نے مامون کو بلا کر پوچھا کہ بیٹے میرے ہاتھ میں کیا ہے اس نے قدرے سوچ کر جواب دیا کہ ''ضد محاسنک'' اور سوءادب کے محض احتمال کی وجہ سے براہ راست مساویک نہ کہا اگرچہ ضد محاسنک بھی مآلاً مساویک بنتا ہے کیونکہ مساوی محاسن کی ضد ہے۔

(۱۱) حدّثنا أبو داؤد المصاحفيّ سليمان بن سلم ثنا النظربن شميل عن صالح بن أبي الأخضر عن ابن شهاب عن أبي سلمة عن أبي هريرة قال كان رسول الله ﷺ أبيض كا نّما صيغ من فضة رجل الشعر(۱).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اس قدر سفید اور خوبصورت تھے گویا کہ چاندی سے آپ ﷺ کا بدن مبارک ڈھالا گیا ہو۔آپ ﷺ کے بال مبارک ہموار مگر قدرے خمدار تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ: ابو هريرةؓ، تمام صحابہؓ میں سے زیادہ احادیث روایت کرنے والے ہیں۔آپؓ کے نام ونسب میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔جاہلیت کے زمانہ میں آپ کا نام عبدشمس یا عبدعمرو تھا۔ اسلام لانے کے بعد نبی کریم ﷺ نے آپ کا نام تبدیل کردیا۔جس کے بارے میں بھی اختلاف ہے لیکن سب سے مشہور دونام عبداللہ اور عبدالرحمٰن بن صخر الدوسی۔اس کے علاوہ آپؓ کے نام میں چالیس تک کے اقوال پائے جاتے ہیں پھر آپ اپنی کنیت کی وجہ سے اتنے مشہور ہوئے کہ گویا آپؓ کا کوئی نام ہی نہ تھا(۲)۔ غزوہ خیبر سے کچھ قبل اسلام لائے اور غزوہ خیبر میں شریک ہوئے۔پھر نبی کریم ﷺ کی ایسی مصاحبت اختیار کی۔جہاں نبی کریم ﷺ جاتے آپؓ بھی ساتھ ہوتے اور ایک ایک لفظ اور ادا کو یاد رکھا کرتے تھے۔حصول علم کے شوق میں فاقے برداشت کئے۔آپ خود فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ سے سنی ہوئی باتیں یاد نہیں رہتیں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ چادر

---

(۱)جامع ترمذی ۲/۱۸۳ کتاب المناقب باب ماجاء فی صفة النبی ﷺ

(۲) آپؓ کے کنیت کی وجہ تسمیہ کے بارے میں الاتحافات میں ہے وسبب التكنية ان رسول اللّٰه ﷺ رأی هرة فی قمه فناداه بها(ص۴۵)(مختار)

پھیلاؤ۔ میں نے پھیلائی تو آپ ﷺ نے تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ اس چادر کو ابھی لپیٹ کر سینے سے لگاؤ تو میں نے چادر کو اپنے سینے سے لگایا تو اس کے بعد میں کوئی بھی روایت نہ بھولا۔

(البدایۃ والنھایۃ ۱۰۵/۸، بخاری ۲۲/۱)

صحابہ اور تابعین میں سے آٹھ سو سے زائد لوگ آپؓ سے روایت کرتے ہیں(۱)۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ آپؓ کے زمانہ میں رواۃ حدیث میں آپؓ سے زیادہ حافظہ والا کوئی نہیں تھا(۲)۔ بارہ ہزار تسبیحات روزانہ کا معمول تھا۔ مدینہ کے گورنر بھی رہے ۵۷ھ، ۵۸ھ، ۵۹ھ کو اٹھتر سال کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

كان رسول اللّٰه ﷺ ابيض كانّما صيغ من فضة

ایسے سفید اور صاف رنگ کے مالک تھے گویا چاندی کو قالب میں ڈھال کر بنایا گیا ہو۔

صيغ صاغ يصوغ سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے بنانے اور سانچہ میں ڈھال کر بنانے کو کہتے ہیں۔ اس حدیث میں آپ ﷺ کے رنگ کی سفیدی اور نورانیت کا ذکر ہے۔

(۱۲) حدّثنا قتيبة بن سعيد انا الليث بن سعد عن أبي الزبير عن جابر بن عبداللّٰه أنّ رسول اللّٰه ﷺ قال عرض عليّ الأنبياء فإذا موسىٰ عليه السلام ضرب من الرجال كانّه من رجال شنوءة ورأيت عيسىٰ بن مريم عليه السلام فاذا أقرب من رأيت به شبها عروة بن مسعود ورأيت إبراهيم عليه السلام فاذا أقرب من رأيت به شبها صاحبكم يعني نفسه الكريمة ورأيت جبرئيل عليه السلام فاذاأقرب من رأيت به شبها دحية(۳).

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر

(۱) حاکم نیشاپوریؒ نے ۲۸ صحابہ کے اسماء لکھے ہیں جنہوں نے آپؓ سے روایت کی ہے۔ (مختار)

(۲) بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ کان ذکیافقیھا صاحب لیل وصوم(مناوی ص ۵۸) وھکذا فی اعلام الموقعین. اور صحابہ کرام میں سے سب سے زیادہ روایت کرنے والے ہیں وھو اکثر الصحابة رواية باجماع. (مختار)

(۳) مسند احمد ۴۲۶/۳

تمام انبیاءؑ پیش کئے گئے پس میں نے موسیٰؑ کو دیکھا تو وہ ذرا دبلے پتلے بدن کے آدمی تھے۔ گویا کہ قبیلہ شنوءہ کے لوگوں میں سے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰؑ کو دیکھا تو ان سب لوگوں میں جو میری نظر میں ہیں عروۃ بن مسعودؓ ان سے زیادہ ملتے جلتے معلوم ہوئے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا تو میرے دیکھے ہوئے لوگوں میں سے تمہارا ساتھی یعنی خود میں ان سے زیادہ مشابہ ہوں۔ اور جبرئیلؑ کو دیکھا تو ان کے ساتھ مشابہ ان لوگوں میں سے جو میری نظر میں ہیں دحیہ کلبی ہیں۔

جابر بن عبداللہ: عن جابر بن عبداللّٰہ، ابوعبداللہ جابر بن عبداللہ انصاری سلمیؓ صحابی ہیں ان کے والد حضرت عبداللہؓ غزوہ احد میں شہید ہوئے جبکہ حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مختلف اقوال کے مطابق سترہ، اٹھارہ، یا اُنیس غزوات میں شریک ہوئے۔ آخری عمر میں بینائی جاتی رہی مدینہ میں ۷۴ھ کو ۹۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔

عرض انبیاء: عرض علّی الأنبیاء نبی کریم ﷺ پر انبیاء کا پیش ہونا یا تو لیلۃ الاسراء کے موقع پر بیت المقدس میں ہوا تھا یا معراج کی رات آسمانوں میں جو عرض ہوا تھا وہ مراد ہے۔ اور بعض روایات کے قرینہ سے یہ عرض منامی تھا یعنی خواب میں رسول پاک ﷺ سے ان کی ملاقات کرائی گئی تھی۔ بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ أرانی اللیلۃ عند الکعبۃ فی المنام فاذا رجل آدم کأحسن ما یریٰ من الرجال تضرب لمتہ بین منکبیہ (الحدیث) اور بخاری ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ لیلۃ أسریٰ بی رأیت موسیٰ (الحدیث) اس مقام پر تین انبیاء کا ذکر ہے جن میں سے دو تو بنی اسرائیل کے نبی تھے جن کو اہل کتاب خوب جانتے تھے۔ تیسرے حضرت ابراہیمؑ نبی کریم ﷺ کے آباء میں سے ہیں اور تمام مشرکین اور اہل کتاب کے ہاں مشہور و معروف تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کا حلیہ: ضرب من الرجال الخ بعض علماء کہتے ہیں کہ ضرب کے معنی ہیں معتدل خفیف اللحم لیس بنا حل ولا مطھّم یعنی وہ شخص جو نہ تو زیادہ کمزور ہو نہ زیادہ فربہ۔ اور بعض شراح کا خیال ہے کہ ضرب نوع اور قسم کے معنی میں مستعمل ہے۔ گویا کہ موسیٰؑ خاص قسم کے لوگوں میں

سے تھے۔ بعض اقوام امتیازی شکل وشباہت اور خاص جسمانی ہیئت کے مالک ہوتے ہیں کچھ ہٹے کٹے اور مضبوط قسم کے ہوتے ہیں بعض کمزور اور نحیف ہوتے ہیں تو ضرب من الرجال کا معنی یہ ہوگا کہ آپ اس طرح کی ایک خاص قوم کے فرد معلوم ہو رہے تھے۔ اور جب نبی کریم ﷺ کو صحابہ کرامؓ میں کوئی خاص تشبیہ دینے کیلئے دکھائی نہ دیا تو آپ نے پہلے ایک غیر معین قبیلہ سے اس کی تشبیہ دی پھر اس قبیلہ کا تعین ''کأنّه من رجال شنوءة'' سے کیا۔ شنوءہ یمن کا ایک قبیلہ ہے جس کو عرب جانتے تھے یا یہ قحطانیوں کی ایک شاخ ہے۔ یہ لوگ بھی جسمانی لحاظ سے متوسط اور معتدل تھے۔ نہ زیادہ فربہ اور نہ کمزور۔ چونکہ یہ لوگ ذاتی تعلّی کی بناء پر دوسرے لوگوں کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے۔ غیر قوم میں رشتوں سے پرہیز کرتے تھے چنانچہ ان کے انساب بالکل خالص اور رنگ دلکش تھے اور اسی وجہ سے ان کو شنوءۃ کہا گیا کیونکہ شناءۃ کا اصل معنی بُعد اور دوری ہے(۱)۔

فاذا اقرب من رأیت به شبهاً عروة، اقرب مبتدا ہے اور عروۃ بن مسعود خبر ہے۔

عروۃ بن مسعودؓ: حضرت عروۃ بن مسعود الثقفیؓ صحابی ہیں۔ آپ کے عجیب حالات کتب سوانح میں لکھے ہیں۔ صلح حدیبیہ میں کفار کی طرف سے شریک ہوئے بلکہ ان کی طرف سے سفارت کی۔ ۹ھ کو اسلام لائے اور اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے حضور ﷺ سے اجازت طلب کی۔ اجازت ملنے پر آپ نے جا کر قوم کو توحید کی دعوت دی تو کسی نے تیر مار کر شہید کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیوی اور اخروی وجاہت سے نوازا تھا۔ لیکن حضرت عروۃؓ کا حلیہ بہرحال ہمارے لئے ایک نامعلوم بات ہے۔ ہاں عیسائیوں نے اندازوں اور تخمینوں سے عیسیٰؑ کی جو تصاویر بنائی تھیں ان کے مطابق آپ بہت حسین تھے۔ اور ممکن ہے کہ واقعۃً ان تصاویر سے کوئی تصویر آپؑ سے ملتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''وجیه'' کہا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جو صاحب وجاہت اور پروقار شخصیت کے مالک تھے انگریز لوگ کہتے

---

(۱) ملاعلی قاریؒ اور علامہ عبدالرؤف مناویؒ نے اس احتمال کو ذکر کیا ہے اس صورت میں ''کأنّه من رجال شنوءة'' ماقبل کا بیان ہوگا۔ کیونکہ پہلے بھی حضرت موسیٰؑ کے بدن کا چھریرا ہونا مذکور ہے۔ اور اس قبیلہ کے ساتھ تشبیہ میں بھی مقصود یہی ہے۔ لیکن پھر دونوں نے نیز دیگر شراح نے یہ کہا ہے کہ راجح یہ ہے کہ یہ کلام تاکید نہ ہو بلکہ مستقل تشبیہ ہو اور حضرت موسیٰؑ کی شکل وصورت کی تشبیہ اس قوم سے دینا مقصود ہو جبکہ پہلے موسیٰؑ کے جسمانی اعتدال کا بیان تھا۔ (اصلاح الدین)

ہیں کہ ان کا حلیہ حضرت عیسی علیہ السلام کے ساتھ ملتا جلتا تھا ایک دفعہ آپ راولپنڈی جیل میں تھے جیل کا عیسائی داروغہ ہر وقت آپ کو کن انکھیوں سے دیکھا کرتا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ تم ہر وقت بخاری کو اس طرح کیوں دیکھتے ہو اس نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ کے خدوخال، رعب و وقار کی جتنی تفصیلات ہم تک پہنچی ہیں وہ سب شاہ جی صاحب میں دیکھ رہا ہوں۔

<u>حضرت ابراہیمؑ سے مشابہت:</u> **صاحبکم یعنی نفسه الکریمة:** یہ راوی نے اپنی طرف سے تفسیر کردی۔ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ملت ابراہیمی کا مجدد بنایا تھا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی ظاہری اور معنوی صفات آپ ﷺ کو عطا کی گئی تھیں۔ جسمانی صورت اور حلیہ میں بھی آپ ﷺ حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ مشابہ تھے۔ ایک جگہ آپ فرماتے ہیں کہ **أنا أشبه ولد إبراهيم.** میں ابراہیمؑ کی اولاد میں ان کے ساتھ سب زیادہ مشابہت رکھتا ہوں۔

ابراہیم کا لفظ یا تو ابٌ رحیم یعنی شفیق باپ سے نکلا ہے اور آپ تمام لوگوں کے لئے شفیق باپ ہی تھے۔ تمام ادیان و ملل کو آپ ﷺ سے بے انتہا محبت ہے۔ آپؑ کو حقیقت میں ایک شفیق باپ کا درجہ دیتے ہیں۔ تمام لوگ آپؑ کے اتباع کے مدعی ہیں۔ حتیٰ کہ ہندو جیسی مشرک قوم بھی ابراہیمؑ کے اتباع کے مدعی ہیں۔ ان کے بعض الفاظ مثلاً برہمن اور براھمہ کا رشتہ لفظ ابراہیم سے معلوم ہوتا ہے۔ یہودی اور عیسائی بھی سب آپ کو پیشوا تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کو اب رحیم کہا گیا ہے۔ قرآن میں ہے **وترکنا علیه فی الآخرین سلامٌ علی إبراهيم.(الایة)**

بعض شرّاح کے خیال میں ابراہیم ابراھام اور براہم سب عبرانی الفاظ ہیں۔ **ورأیت جبرئیل** یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے عرض کی بات ہو رہی تھی اور جبرئیل تو نبی نہیں۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ قول قصہ کی ابتداء یعنی ”**عرض علیّ**“ پر عطف ہے۔ یا جواب یہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ کا انبیاء کرام کے ساتھ زیادہ تعلق اور بہت اختلاط تھا جس کی وجہ سے ان کا ذکر بھی انبیاء کے ضمن میں کیا گیا جو غیر مناسب نہیں۔ گویا آپؑ بھی انبیاء کے ایک فرد ہیں جس طرح ابلیس کو جن ہونے کے باوجود کثرت اختلاط کی وجہ سے فرشتوں میں شمار کیا گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے فرشتوں کو سجدہ کا حکم اسے بھی شامل تھا۔ لہٰذا نبی

کریم ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ کا ذکر بھی انبیاء کے ساتھ فرمایا۔ ویسے بھی پروٹوکول اور تشریفات کیلئے مستقل شعبے ہوتے ہیں تو عرض انبیاء میں حضرت جبرئیلؑ کی موجودگی مناسب معلوم ہوتی ہے۔

دحیہ کلبی: دحیّۃ، حضرت دحیۃ بن خلیفہؓ دال کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ مشہور کلبی صحابی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حسن و جمال اور وجاہت سے نوازا تھا۔ رسول پاک ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شرکت کی۔ مثالی حسن کے مالک تھے۔ شہر میں داخل ہوتے تو عورتیں پردوں سے باہر نکل آتیں۔ نبی کریم ﷺ کی طرف سے سفارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ان کو قیصرِ روم کے پاس بھی بھیجا تھا۔ شام میں سکونت اختیار کی اور حضرت معاویہؓ کے زمانہ تک زندہ رہے۔

فرشتہ ہونے کی وجہ سے اگر چہ جبرئیل شخصی و معین انسانی شکل نہیں رکھتے تھے لیکن وحی لاتے ہوئے کبھی کبھار انسانی شکل میں آتے تو دحیہ کلبی کی شکل میں آتے تھے۔ دنیا کے سفارتی ضوابط میں سے ایک ضابطہ یہ بھی ہے کہ سفارتی تعلقات کیلئے وجیہ، حسین وجمیل، اور باوقار شخص کو منتخب کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہاں لوگ اس سے مرعوب اور متاثر ہوں۔ اسی طرح بھیجنے والے وفود میں ارکان کے علم اور عقل وکمال کے ساتھ ساتھ قوت وشجاعت اور جسمانی کیفیات سب کا لحاظ ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ باہر کے سفارتی پیغامات کیلئے حضرت دحیہ کو بھیجتے۔ کیونکہ آپ میں مذکورہ خوبیاں اور صلاحیتیں موجود تھیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کا سفیر بھی دحیہ کی شکل میں آتا تھا۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رسول اللہ ﷺ کا عظیم مقام ہے اسی وجہ سے وجیہہ اور مقبول شخصیت کے حامل انسان کی شکل میں اپنا قاصد آپ ﷺ کے پاس بھیجتے تھے۔

(۱۳) حدّثنا محمّد بن بشار سفیان بن وکیع المعنی واحد قال انا یزید بن ہارون عن سعید الجریریّ قال سمعت أبا الطفیل یقول رأیت رسول اللّٰہ ﷺ و ما بقی علی وجہ الأرض احدراہ غیری قلت صفہ لی قال کان ابیض ملیحا مقصّدا(۱).

---

(۱)صحیح مسلم۲/۲۶۶کتاب الفضائل باب صفۃ شعرہ ﷺ وصفاتہ وحلیۃ ابوداؤد۲/۳۲۰ کتاب الادب باب فی ھدی الرجل

ترجمہ: ابوطفیلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا اور آپ ﷺ کو دیکھنے والوں میں اب روئے زمین پر میرے سوا کوئی نہیں رہا۔ (سعید جریری کہتے ہیں) میں نے ان سے کہا کہ نبی کریم ﷺ کا کچھ حلیہ میرے لئے بیان فرمائیں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ سفید رنگت والے حسین اور معتدل جسم والے تھے۔

<u>ابوالطفیل</u>: ابوالطفیل عامر بن واثلہ لیثی کنانیؓ(۱) ہجرت کے سال یا غزوہ احد کے سال پیدا ہوئے۔ <u>اور ۱۰۰ھ یا ۱۱۰ھ</u> اور صحیح قول کے مطابق ۱۱۰ھ کو وفات پائی۔ **وما بقی علی وجه الارض احدا راه غیری** ۔ اس جملہ میں ایک طرف تو صحابیت پر تنبیہ ہے نیز اس بات کی ترغیب بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے متعلق جو کچھ سننا ہو مجھ سے سیکھو۔ کیونکہ صحابہ کی جماعت سے صرف میں باقی ہوں۔ میرے بعد اور کوئی نہیں ملے گا۔ گویا موقع اور اپنی موجودگی کی اہمیت بیان کرنے کے لئے آپؓ نے یہ بات کہہ دی۔ یہ وہ وقت تھا جب تمام صحابہ وفات پا چکے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپؓ کے بعد صحابہ میں سے کچھ لوگ مثلاً عمران بن حصین وغیرہ باقی تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوالطفیلؓ کو اپنے سوا کسی دوسرے صحابی کے حیات کا علم نہ تھا۔ بعد کے مؤرخین و محققین کو معلوم ہوا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس زمانہ میں اطلاعات کا موجودہ نظام نہ تھا۔ اسلئے یا تو آپؓ دوسرے زندہ صحابی کو جانتے نہ تھے یا انکی زندگی سے لاعلم تھے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جب تک جوانی کا اثر باقی ہو خود کو بوڑھا ظاہر کرنے سے ہر کوئی کتراتا ہے۔ بلکہ عموماً اپنی عمر کم بتا کر جوان دکھائی دینا پسند کرتا ہے۔ لیکن جب بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے تو اپنی عمر آٹھ دس سال زیادہ بتاتا ہے۔ اس سے دراصل دوسروں پر برتری اور اپنی تجربہ کاری کا احساس دلانا مقصود ہوتا ہے۔ حضرت ابوالطفیلؓ صحابی ہونے کے ناطے سے جھوٹ تو نہیں بول سکتے لیکن آپؓ کا یہ بیان حقیقت ہونے کیوجہ سے دوسرے لوگوں پر حقیقۃً آپکی برتری اور لوگوں کے درمیان ممتاز مقام پر دلالت کرتا ہے۔

یہاں پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوالطفیلؓ کی بات صحیح نہیں اسلئے کہ حضرت عیسی علیہ السلام بھی اس وقت زندہ تھے جنہوں نے نبی کریم ﷺ کو بھی دیکھا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوالطفیلؓ نے تصریح کی ہے کہ سطح زمین پر میرے سوا کوئی دوسرا دیکھنے والا موجود نہیں وہ آسمانوں کی بات نہیں کر رہا۔

---

(۱) امام ابوحنیفہؒ کو حضرت ابوطفیل عامر بن واثلہؓ سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ (مختار)

حضرت خضرؑ کی حیات وموت: باقی رہے حضرت خضرؑ جن کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ بھی زندہ ہیں اور بعض تکوینی امور کو سرانجام دینے کیلئے دنیا ہی میں رہتے ہیں۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بعض صوفیوں کا مسلک ہے جبکہ اکثر محققین مثلاً علامہ ابن قیمؒ، علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن حجرؒ وغیرہ جیسے محققین محدثین حیاتِ خضر علیہ السلام سے منکر ہیں۔ علامہ ابو حیانؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ **والجمهور على أنّه مات** یعنی جمہور علماء کے خیال میں وہ زندہ نہیں ہیں۔اگر چہ صوفیہ کا ایک معتد بہ گروہ کہتا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور تکوینی امور میں ان کو بڑا عمل دخل ہے۔حتیٰ کہ بعض جاہل اور خودغرض پیروں نے تو حد کردی وہ سڑک پر کھڑے ہوکر ہوائی معانقہ کرتے ہیں اور پوچھنے پر فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے ملاقات ہوگئی۔خضر علیہ السلام تو ان کے جیب ہی میں رہتے ہیں۔ جہاں بھی ضرورت پڑی تو جھٹ سے کہہ دیا کہ خضرؑ نے اس کام کے بارے میں مجھے یہ ہدایت دے دی۔بہر حال اگر چہ صوفیائے کرام میں چند قابل اعتماد لوگ بھی حضرت خضرؑ کے حیات کے قائل ہیں۔لیکن اس مسئلہ میں ان کا قول معتمد نہیں ہے۔ حضرت خضرؑ کی وفات کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہی ہیں تو کبھی تو نبی کریم ﷺ کے ساتھ مل چکے ہوتے۔حالانکہ ذخیرہ احادیث میں اور صحابہ کے سوانح میں کبھی بھی آپ ﷺ اور ان کی ملاقات کا ذکر نہیں ملتا۔احد اور بدر کے سخت معرکے ہوئے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے تمام سابقہ انبیاء کرام علیہ السلام سے نبی آخر الزمان ﷺ کی نصرت کا عہد بھی لیا تھا۔فرماتے ہیں کہ **واذا اخذ اللّٰه ميثاق النبيّين لما آتيتكم من كتاب وحكمة ثم جاء كم رسول مصدق لما معكم لتؤمنن به و لتنصرنّه**(الآية آل عمران آیت ۸۱)اور جبکہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا انبیاء سے کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں، پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو مصدق ہو، اس کا جو تمہارے پاس ہے۔تو تم ضرور اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس کی مدد بھی کروگے۔

تو کیا حضرت خضرؑ نے جو برسوں سے پیر صاحب کی خدمت میں مصروف ہیں، مگر اس عہد کے باوجود نبی کریم ﷺ سے ملاقات بھی گوارا نہیں کی۔لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت خضرؑ ابوالطفیلؓ کے اس قول کے وقت موجود نہیں تھے۔اور اگر بالفرض وہ زندہ بھی ہیں لیکن نبی کریم ﷺ سے نہیں ملے تو بھی حضرت ابوالطفیلؓ کی بات صحیح ہے کیونکہ انہوں نے ''**مابقی احدار أه غیری**'' کہہ دیا ہے۔اور حضرت خضرؑ تو

نبی کریم ﷺ سے نہیں ملے نہ انہیں دیکھا ہے۔ باقی اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کی کتب میں درج ہے کہ ہندوستان میں ایک شخص ۶۰۰ھ تک موجود تھا جو کہ بابا رتن کے نام سے مشہور تھا اور صحابہ کرام میں سے تھا۔ اسی طرح بعض لوگ معمر مغربی کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ طویل زمانے تک زندہ رہے۔ تو اول تو یہ خرافات ہیں علامہ ابن حجر عسقلانی نے ان باتوں کو افسانہ قرار دیا ہے۔ اور اگر بالخصوص کوئی نبی کریم ﷺ کو دیکھنے والا حضرت ابوالطفیلؓ کے بعد تک موجود رہا ہو تو بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا وجود حضرت ابوالطفیلؓ کو معلوم نہ تھا حتیٰ کہ انکو جھوٹا کہا جائے۔

کان أبیض ملیحاً ملیح کا ایک معنی حسین کے ہوتے ہیں ملح سے ہے جو حسن کے معنی میں ہے اور دوسرا معنی ملّح کا بیاض مشرب بالحمرۃ بھی ہے تو گویا آپ کا رنگ سرخ وسفید تھا۔

مقصداً قصد سے ہے(۱) جس کے معنی میانہ روی کے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے کہ

وعلی اللّٰہ قصد السبیل لوگوں پر اللہ کیلئے وسط سبیل کا اتباع واجب ہے۔ (نحل ۹)

یعنی وہ راستہ جو افراط وتفریط سے خالی ہے۔ علم معاشیات کو اقتصادیات اسی لئے کہتے ہیں کہ اچھے اور حقیقی معاشی نظام میں افراط وتفریط نہیں ہوتا۔ الغرض نبی کریم ﷺ اپنی خلقت اور اخلاق دونوں لحاظ سے بالکل اعتدال پر تھے۔ افراط وتفریط سے مبرّا تھے۔

(۱۴) حدّثنا عبداللّٰہ بن عبد الرحمان أخبرنا إبراهیم بن المنذر الحزامیّ أنا عبدالعزیز بن ثابت الزهریّ حدّثنی إسماعیل بن إبراهیم ابن اخی موسیٰ بن عقبة عن کریب عن ابن عباسؓ قال کان رسول اللّٰه ﷺ أفلج الثنیّتین إذا تکلّم رأی کالنّور یخرج من بین ثنایاه(۲).

---

(۱) باب تفعیل سے اسم مفعول ہے بمعنی متوسط کے ہے اس لئے کہا جاتا ہے رجل مقصّد ای متوسط. علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے **والمراد انّه ﷺ متوسط بین الطول والقصروبین الجسامة والنحافة بل جمیع صفاته علی غایة من الأمر الوسط فکان لونه وهیکله وشعره وشرعه مائلاً عن طرفی الافراط والتفریط (المواهب اللدینیة ص ۲۹) (مختار)**

(۲) مجمع الزوائد ۸/۲۹۸ کتاب علامات النبوة باب فی صفته ﷺ معجم الاوسط الطبرانی رقم الحدیث ۷۷۱، معجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث ۱۲۱۸۱

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اگلے دانت مبارک کچھ کشادہ تھے جب باتیں کرتے تو ایک نور سا ظاہر ہوتا جو دانتوں کے درمیان سے نکلتا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ: نبی کریم ﷺ کے چچازاد بھائی اور ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کے بھانجے حبــــر الامة، ترجمان القران حضرت عبداللہ بن عباسؓ فضل وکرم سخاوت اور علم کی وجہ سے تمام صحابہ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کے حق میں علم وحکمت اور فقہ وتاویل کی دعا فرمائی تھی۔ حضرت مسروقؒ فرماتے ہیں کہ جب ابن عباسؓ پر میری نظر پڑتی تو وہ لوگوں میں حسین ترین شخصیت دکھائی دیتے تھے۔اور جب وہ کوئی بات کرتے تو میں کہتا کہ وہ فصیح ترین شخص ہیں۔اور جب حدیث بیان کرتے تو میرے خیال میں وہ سب سے زیادہ علم والے دکھائی دیتے۔

ذہانت اور وسیع علم کی وجہ سے حضرت عمرؓ آپ کو اکابر صحابہ کے ساتھ بٹھاتے تھے اور مشوروں میں آپؓ کے مشورہ کو وقعت دیتے تھے۔حالانکہ آپ کی عمر نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت صرف تیرہ سال تھی آخر میں نابینا ہو گئے اور طائف میں ۶۸ھ یا ۸۷ھ کو وفات پائی۔

أفلج الثنيتين(۱)، ثنيتين ،ثنية کا تثنیہ ہے سامنے کے دو دانتوں کو کہا جاتا ہے اور افلج اس شخص کو کہتے ہیں جس کے سامنے کے دانتوں میں تھوڑی کشادگی ہو۔اس کی ضد الـص ہے جو کہ ملے ہوئے دانتوں والے کو کہتے ہیں جبکہ فرق سامنے کے صرف دو دانتوں کی کشادگی کے ساتھ مختص ہے۔ **رأیَ کـالنور** آپ ﷺ کے دانت مبارک ایسے چمکیلے اور سفید تھے کہ بات کرتے ہوئے جب کبھی دانت دکھائی دیتے تھے تو ایسا نور نکلتا ہوا دکھائی دیتا تھا گویا بادلوں کے درمیان بجلی چمک رہی ہے۔

---

(۱)علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے تـظـنـيـة ثـنـيـة بـتـشـديـد الياء وفی نسخ الثنايا بصيغة الجمع قال الطيبی الفلج هـنـا الـفـرق بـقـريـنـة اضافته إلى الثنايا إذا الفلج فرجة بين الثنايا و الرباعيات و الفرق فرجة بين الثنايا اهـ(المواهب اللدنية ص ۲۹)(مختار)

۲. باب ما جاء فی خاتم النبوة(۱)

آنحضرتﷺ کی مہر نبوت کا بیان

یہاں ایک بڑے جسمانی نشانی کا بیان ہے جو کہ نبی کریمﷺ کی نبوت اور ختم نبوت کی دلیل ہے۔

لفظ خاتم اور اس کا معنی: خاتم بفتح التاء اور خاتم بکسر التاء دونوں طرح مستعمل ہے لیکن بالکسر راجح ہے اور دونوں بمعنی ما یختم بہ یعنی آلہ ختم مہر لگانے کا آلہ جسے طابع بھی کہتے ہیں۔اور یہ دونوں عاقبة کل شئی یعنی ہر چیز کے آخر کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔مہر بھی عموماً خط یا دستاویز کے آخر میں لگتا ہے۔اس غرض سے کہ اب اس میں کمی بیشی نہ ہو سکے۔نبی کریمﷺ کا مہر انگوٹھی کی شکل میں تھا۔جس کی تفصیل کے لیے الگ باب آرہا ہے۔یہاں اول الذکر معنی لیا جائے گا لیکن یہاں کوئی طابع مراد نہیں بلکہ اس کا اثر مراد ہے۔یعنی وہ نشانی جو مہر لگانے کے بعد باقی رہ جاتی ہے کیونکہ اس مقام پر مقصود وہ ابھرا ہوا گوشت ہے۔جو مہر لگانے سے پیدا ہوا تھا۔چونکہ یہ مہر تمام کتب سماویہ میں نبی کریمﷺ کی نبوت اور ختم نبوت کی تصدیق کی علامت کے طور پر مذکور ہے۔اس لیے یہاں اس کی اضافت نبوت کی طرف کی گئی ہے(۲) اور قرآن کریم میں خاتم کی اضافت انبیاء کی طرف کی گئی ہے(۳)۔جو عاقبت اور آخر کے معنی میں مستعمل ہے یعنی وہ نبی جو سب سے آخر میں آئے۔وہاں جھوٹے نبیوں نے دجل و تلبیس کی متعدد تاویلات بھی کی ہیں۔مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی نے اس کے معنی میں تحریف کر کے کہا ہے کہ یہاں خاتم سے مہر مراد ہے اور نبی کریمﷺ آنے والے انبیاء کے لیے مہر یعنی مصدق ہیں۔تو آپﷺ کے بعد جو نبی آئے گا اس کی نبوت کی تصدیق کے لیے آپﷺ مہر کا کام دیتے ہیں اور میری نبوت کی تصدیق نبی کریمﷺ کر چکے ہیں۔لیکن یہ سراسر افتراء اور تلبیس ہے کیونکہ خود نبی کریمﷺ سے اس جملے کی توضیح

(۱)بفتح التاآلة کالقالب و الطابع وبالکسر لغة(مختار)

(۲)مہر نبوت آنحضرتﷺ کے خصائص میں سے ہے۔آپﷺ کے علاوہ کسی دوسرے نبی کو یہ خصوصیت نہیں دی گئی تھی(شرح الشمائل للمناوی علی حامش جمع الوسائل)(مختار)

(۳)ما کان محمدابااحدمن رجالکم ولکن رسول اللّٰہ و خاتم النبین (الاحزاب ۴۰)(اصلاح الدین)

مختلف طریقوں سے منقول ہے۔آپ ﷺ نے لانبی بعدی دوٹوک الفاظ فرمائے ہیں۔لہٰذا خاتم کے معنی مہر نہیں عاقبۃ اور آخر ہوگا اور اگر مہر کا معنی بھی لیں تو بھی اس کا مقصود حاصل نہیں ہوتا۔کیونکہ مہر آخر میں اس لئے لگتی ہے کہ اس میں کمی وبیشی نہ ہو سکے۔اور نبی کریم ﷺ اس لحاظ سے سلسلہ انبیاء کے لیے مہر ہیں یعنی آپ ﷺ پر یہ سلسلہ ایسے منقطع ہوگیا کہ اب اس میں کمی وبیشی کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔مجموعی لحاظ سے اس باب میں جو احادیث مذکور ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہر نبوت کندھوں کے درمیان میں نمایاں قسم کی چیز تھی۔

(۱) حدثنا قتیبة بن سعید انا حاتم بن اسمٰعیل عن الجعد ابن عبدالرحمان قال سمعت السائب بن یزید یقول ذهبت بی خالتی فقالت یا رسول اللّٰه ان ابن اختی و جع فمسح رسول اللّٰه ﷺ راسی و دعالی بالبركة و توضا فشربت من وضوئه و قمت خلف ظهره فنظرت الی الخاتم الذی بین كتفیه فاذا هو مثل زر الحجلة(۱).

ترجمہ: حضرت سائب بن یزیدؓ فرماتے ہیں کہ میری خالہ مجھ کو نبی کریم ﷺ کے پاس لے گئیں اور عرض کیا کہ میرا بھانجا بیمار ہے نبی کریم ﷺ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لیے برکت کی دعا فرمائی اور نبی کریم ﷺ نے وضو فرمایا تو میں نے آپ ﷺ کے وضو کا پانی پیا۔میں نبی کریم ﷺ کے پس پشت کھڑا ہوا تو میں نے مہر نبوت دیکھی جو مسہری کی گھنڈیوں جیسی تھی۔

سائب بن یزیدؓ: یہ مشہور صحابی ہیں ابو یزید کندی کنیت تھی۔۲ھ میں پیدا ہوئے۔حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے والد کے ہمراہ حج کو بھی آئے تھے۔۸۰ھ یا ۸۶ھ اور بعض روایات کے مطابق ۹۱ھ میں وفات پائی۔علامہ بیجوریؒ نے ۹۴ سال عمر لکھی ہے۔لیکن یہ محل نظر ہے کیونکہ خود انہوں نے تاریخ وفات ۸۰ھ بتائی ہے۔

ذهبت بی خالتی الخ بیماری کی وجہ سے میری خالہ مجھے نبی کریم ﷺ کے پاس لے گئیں اس

(۱)صحیح بخاری ۱/۱ ۵۰ كتاب المناقب باب خاتم النبوة، صحیح مسلم ۲/۲۵۹ كتاب الفضائل باب اثبات خاتم النبوة(مختار)

عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں اور نیک بندوں کے پاس تبرک کے لیے جانے میں کوئی حرج نہیں۔ اس عورت کا نام تو معلوم نہیں البتہ علامہ جزریؒ نے اس کی دوسری بہن کا نام نمر بنت قاسط اور ملا علی قاریؒ نے حضرت سائبؓ کی والدہ کا نام علبہ بنت شریح لکھا ہے۔

وَجِعٌ(۱): یہ لفظ فتح واؤ اور کسرۂ جیم کے ساتھ وجع سے صفت ہے اس کے معنی ہیں دردمند ہونا۔ یعنی ذو وجع دردوالا ہے۔ مذکورہ صحابیؓ کا یہ درد پاؤں میں ہو رہا تھا۔

بعض روایات میں وقع بھی آیا ہے یعنی إنّ ابن اختی وقع (۲) کے الفاظ آئے ہیں۔ لغۃً یہ سخت اور پتھریلی زمین پر چلنے کی وجہ سے پاؤں کے درد کو بھی کہتے ہیں اور اصل میں یہ پولیو کی طرح ایک خاص بیماری ہے۔ جو پاؤں میں درد اور لنگڑے پن کا سبب بنتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی مسیحائی شان: فمسح راسی (۳) یہاں یہ اشکال ہے کہ درد پاؤں میں ہوتا تھا اور نبی کریم ﷺ نے سر پر ہاتھ پھیرا؟ لیکن اس کا جواب آسان ہے۔ وہ یوں کہ نبی کریم ﷺ نے شفاء ہاتھ نہیں پھیرا تھا بلکہ محض شفقت کی بناء پر ہاتھ پھیرا تھا۔ ہاں ساتھ ساتھ کچھ دم وغیرہ بھی کیا ہوگا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ پاؤں کے ساتھ ساتھ سر میں بھی شکایت ہو۔ اور نبی کریم ﷺ نے پاؤں کی نسبت سر کے علاج کو اہمیت دے کر ہاتھ پھیرا۔ اور بعض شراح کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے پاؤں کے علاج کے طور پر ہی سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور نبی کریم ﷺ کا عظیم مسیحائی مقام ہے۔ کہ درد پاؤں میں ہے اور سر پر ہاتھ پھیرنے سے وہ درد جاتا رہا۔ آپ کو یہ اعجازی تاثیر بہت وافر مقدار میں ملی تھی۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام برص کے مریضوں اور اندھوں کا علاج کر سکتے تھے تو نبی کریم ﷺ تمام امراض کا علاج ایک توجہ سے کر سکتے تھے جس کے متعدد واقعات کتب احادیث میں منقول ہیں۔ مثلاً غزوہ خیبر کے موقع پر حضرت علیؓ کی دکھتی آنکھ

---

(۱)ای ذووجع وهويقع علی کل مرض(مواهب اللدنية ص ۳۵)(مختار)

(۲) وقع گر جانے کو کہا جاتا ہے الاتحافات میں ہے الوقع وجع القدمین، مطلب یہ ہے میرا بھانجہ گر گیا ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں میں تکلیف ہے۔ مگر زیادہ مشہور وجع ہے۔ (مختار)

(۳) دم کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جس جگہ تکلیف ہو اسی جگہ ہاتھ پھیرے کمافی المواهب یوخذ منه ان یسنّ للراقی ان یمسح محل الوجع من المریض(مختار)

آپ ﷺ کی اعجازی تاثیر سے فوراً ٹھیک ہوگئی۔ غار ثور میں ہجرت کے موقعہ پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سانپ نے ڈس لیا۔ آپ ﷺ نے اس پر لعاب لگایا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ ٹھیک ہوگئے۔ یہودی سردار ابورافع عبداللہ بن ابی الحقیق کے قتل کے بعد حضرت عبداللہ بن عتیک واپسی پر سیڑھی سے اترتے گر پڑے اور پنڈلی ٹوٹ گئی حضور اقدس ﷺ کے پاس پہنچ کر تفصیل بتلادی آپ ﷺ نے فرمایا پاؤں پھیلاؤ۔ حضور اقدس ﷺ نے اس پر ہاتھ پھیرا تکلیف ایسی زائل ہوگئی کہ کبھی تھی ہی نہیں۔ بہرحال آپ ﷺ کے صرف ہاتھ لگانے سے بہت سی مہلک بیماریاں فوراً ختم ہوچکی ہیں۔ حضرت سائبؓ کے سر پر جہاں ہاتھ لگا تھا روایت میں ہے کہ وہاں کے بال موت کے وقت تک سیاہ رہے۔

برکت: **ودعالی بالبرکۃ الخ** امام راغبؒ کے ہاں برکت کے معنی ہیں **وقوع الخیر الالٰھی فی الشیء الخ** یعنی کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کا وقوع۔ یہ عمر، صحت، علم، مال، رزق وغیرہ میں واقع ہوتی ہے۔ اوقات میں بھی برکت ہوتی ہے جس کا معنیٰ یہ ہے کہ تھوڑے سے وقت میں اللہ تعالیٰ بہت بڑا کام انسان سے کرائے۔ ہمارے بزرگوں نے بہت تھوڑے عرصہ میں علوم وفنون کے ذخائر چھوڑے ہیں۔ حضرت تھانویؒ کی ہزار کے لگ بھگ تصانیف ہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ کی تصانیف اتنی ہیں کہ روزانہ سینکڑوں صفحات اوسط نکلتے ہیں۔ امام سیوطیؒ کی تصانیف ہزار سے اوپر ہیں۔ مولانا عبدالحئی لکھنویؒ سے تھوڑی عمر میں اللہ تعالیٰ نے تصنیف وتالیف کا عظیم کام لیا۔ حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ سے مختصر زندگی میں کتنے بڑے کام لئے۔ یہ تھی برکت۔ حضرت سائبؓ کو بھی اللہ تعالیٰ نے طویل عمر کے ساتھ صحت وعافیت بھی بخشی تھی۔ اخیر عمر میں فرمایا کرتے تھے ''**إنّی ما متعت بسمعی و بصری إلاّ ببرکۃ دعاء النبی ﷺ**''

فتوضّأ (۱): یہ وضوء یا تو نماز کے لیے فرمایا یا قصداً حضرت سائبؓ کو وضوء کا پانی پلانے کیلئے آپ نے وضو کیا۔ **شربت من وضوئہ** واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے جو اس پانی کو کہتے ہیں جو وضو کرنے کیلئے رکھا گیا ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وضو کرنے کے بعد جو فاضل پانی بچ جاتا ہے اور بعض کے خیال میں

(۱) **وضؤ بضم الواو غسل الاعضاء** کو کہا جاتا ہے جو شرعی طریقہ سے ہو، **وضؤ بفتح الواو** اس پانی کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ وضوء کیا جاتا ہے۔ (مختار)

وہ مستعمل پانی جس سے وضو کیا جائے وضو کہلاتا ہے۔ یہاں پر اول معنی درست دکھائی نہیں دیتا کیونکہ نبی کریم ﷺ کے وضو کیلئے رکھے ہوئے پانی سے پینا سوء ادب ہے۔ دوسرا معنی محتمل ہے لیکن تیسرا معنی راجح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وضو کیا اور اعضاء مبارکہ سے جو پانی لگا تو اس کو پیا جس میں یقیناً شفاء کا اثر ہوگا۔

ماء مستعمل کا حکم: رہا یہ مسئلہ کہ مستعمل پانی پاک ہے یا نجس تو یہ فقہ کا مسئلہ ہے اور فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے یا ترمذی کے ابواب الطہارات اس کے بیان کیلئے مناسب جگہ ہے۔ یہاں صرف اتنا معلوم ہونا چاہیے کہ امام ابو حنیفہؒ سے معروف قول کے مطابق یہ نجاست غلیظہ کے ضمن میں آتا ہے اور اس کا منشاء یہ بتایا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کو اللہ تعالیٰ نے وافر مقدار میں فراست ایمانی سے نوازا تھا۔ آپ کسی کے وضو کا پانی دیکھ کر بتا دیتے کہ اس شخص نے فلاں گناہ کیا ہے جو کہ وضو کی وجہ سے دھل کر پانی میں شامل ہو گیا۔ اگر وضو کے مستعمل پانی میں کبیرہ گناہوں کی نجاست شامل ہوتی تو آپ نے حکم دیا کہ یہ نجس ہے اور اگر گناہ صغیرہ کا احساس ہو جاتا تو نجاستِ خفیفہ کہہ دیتے۔ یہ تو مزاج کی لطافت کی بات ہے۔ بعض لوگوں کو بول و براز سے بھی بدبو کا احساس نہیں ہوتا اور بعض لوگ بہت دور سے اس کا احساس کر لیتے ہیں۔ اسی طرح بعض اکابر محض سونگھ کر بتا دیتے تھے کہ یہ کھانا حلال ہے اور یہ حرام کمائی سے خریدا ہوا ہے۔ بہر حال حضرت امام ابو حنیفہؒ کے ہاں ایک قول میں وضو کا مستعمل پانی نجس ہے۔ روایت ہے کہ آپ نے اپنے اس فتوے سے بعد میں رجوع بھی کیا ہے۔ اس لئے احناف کا مسلک یہ ہے کہ یہ پانی طاہر ہے مطہر نہیں (۱)۔

---

(۱) شرح وقایۃ میں ہے والاختلاف الثالث فی حکمه فعند ابی حنیفةؒ هو نجس نجاسة غليظة وعند ابی يوسف هو نجس نجاسة خفيفة وعند محمد هو طاهر غير طهور (۱/۸۹) وهو رواية عن ابی حنيفة (الهداية ۱/۱۶۴) وعليه الفتوىٰ كما فی البناية وهو الاقوىٰ من حيث الدليل كما بسطناه فی السعاية (عمدة الرعاية ۱/۸۹) اور اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں ومن لطائف الاقوال ما فی الميزان لعبدالوهاب الشعرانیؒ قال سمعتُ سيدی علياً الخوّاص قال مدارک الامام ابی حنيفة دقيقة يطلع عليها الااهل الكشف من اكابر الاولياء وكان ابوحنيفة اذا رأى ماء الميضاة يعرف سائر الذنوب التی فيه فلذاجعل ماء الطهارة اذاتطهر به المكلف له ثلاثة احوال احدها انه كالنجاسة الغليظة لاحتمال ان يكون المكلف ارتكب كبيرة والثانی إنّه كالنجاسة المتوسطة لاحتمال ان يكون ارتكب صغيرة والثالث طاهر فی نفسه غير مطهّر لغيره لاحتمال ان يكون ارتكب مكروهاً او خلاف الأولىٰ (عمدة الرعاية ۱/۸۹) (مختار)

امام شافعیؒ اگر اس حدیث سے مستعمل پانی کی طہارت پر استدلال کریں تو یہ درست نہیں ہوگا۔اس لئے کہ اگر یہاں مستعمل پانی مراد بھی ہو پھر بھی یہ تو نبی کریم ﷺ کے وضو کا پانی تھا اور آپ گناہوں سے پاک تھے تو وضو کی وجہ سے نجاست کا خلط پانی میں متصور نہیں ہے جبکہ دوسرے لوگوں کے وضو کا مستعمل پانی اس پانی پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت سائبؓ نے استشفاء کی نیت سے وہ پانی پی لیا تھا جو نبی کریم ﷺ نے وضو میں مستعمل کیا تھا اور تداوی کیلئے استعمال عذر بھی ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ پہلے سے باوضو ہوں اور اس موقع پر محض وضو کی تجدید کی ہو ایسے وضو میں مستعمل پانی امام ابوحنیفہؒ کے ہاں بھی نجس نہیں ہے۔بعض حضرات نے نسخ کا احتمال بھی لیا ہے مگر درحقیقت تاریخ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یہ احتمال راجح نہیں ہے۔

<u>حضرت سائبؓ کا طفلانہ تجسس:</u> **فقمت خلف ظهره** میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اس وقت نبی کریم ﷺ وضو فرما رہے تھے۔ممکن ہے کہ یہ صحابی محض اتفاقاً آپ کے پیچھے آئے ہوں اور ہوسکتا ہے کہ چونکہ اس وقت حضرت سائب بن یزیدؓ چھوٹے تھے اور بچوں میں کرید اور تجسس کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔لہٰذا ممکن ہے کہ ختم نبوت کے بارے میں سننے کے بعد خود مشاہدہ کرنے کی تمنا ہو۔اور قصداً آپ ﷺ کے پیچھے آ کھڑے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مہر نبوت دیکھنے کی نیت سے نہیں بلکہ ادباً پشت کی جانب کھڑے ہونے کو ترجیح دی ہو۔نبی کریم ﷺ گاہے گاہے قمیص استعمال کرتے تھے مگر عموماً رداء یعنی چادر استعمال فرماتے تھے اور چادر کبھی کبھی بدن سے سرک کر ہٹ جاتی ہے۔خصوصاً وضو اور دوسرے کام کرتے ہوئے چادر کے سرکنے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے تو شاید یہ صحابی بھی اس انتظار میں کھڑے ہوں کہ مہر نبوت نظر آنے کا موقع ملے گا۔

<u>مہر نبوت کا محل:</u> **فنظرت إلىٰ الخاتم الذى بين كتفيه** ۔مہر نبوت آپ ﷺ کی پیٹھ پر کس جگہ واقع تھی راوی کے قول **الذى بين كتفيه** سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) کاندھوں کے درمیان میں واقع تھی۔

(۲) دوسرا قول اس بارے میں یہ ہے کہ **عند كتفه الايمن** یعنی داہنے کندھے کے قریب تھی۔

(۳) جبکہ ایک قول یہ ہے کہ بائیں کندھے کے قریب محاذاتِ قلب میں تھی۔

جیسا کہ علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اخبار اس پر متفق ہیں کہ یہ بائیں کندھے کے نزدیک تھی اور چونکہ نبوت کی صداقت وحقانیت کیلئے مہر بڑی علامت تھی اسلئے قلب سے اسکا قریبی تعلق بھی تھا۔ مستدرک حاکم نے ایک روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام کو نبوت کی ایک علامت بخشی تھی لیکن وہ انکے دائیں ہاتھ میں ہوتی تھی جبکہ نبی کریمﷺ کو خصوصی طور پر یہ علامت پیٹھ پر کندھوں کے درمیان میں عطا کی گئی تھی۔

<u>ظہور مہر نبوت کا زمانہ:</u> یہ مہر کب سے لگی تھی اس کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔

(۱) ایک قول یہ ہے کہ نبی کریمﷺ کی ولادت کے ساتھ ساتھ مہر نبوت کا ظہور بھی ہوا تھا۔

(۲) دوسرا قول یہ کہ ولادت کے بعد یہ علامت ظاہر ہوئی۔

(۳) ایک روایت کے مطابق شق صدر کا معجزہ ہوا تو یہ مہر بھی ظاہر ہوئی۔

علامہ ابن حجرؒ اور قاضی عیاضؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے لیکن امام نوویؒ وغیرہ نے اس کو غلط قرار دیا ہے(۱)۔

(۴) جبکہ بعض کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ عمر کے چالیسویں سال جب آپ کی بعثت ہو گئی تب یہ علامت ظاہر ہوگئی کیونکہ یہ نبوت کی علامت ہے اور اس سے پہلے نبوت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ تو ظہور علامت کی ضرورت نہ تھی اس کی تائید میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض روایات کے مطابق نبی کریمﷺ کی وفات کے بعد یہ علامت غائب ہوگئی(۲) لیکن محققین کے قول کے مطابق غائب ہونے کی بات درست نہیں جیسے کہ علامہ مناویؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

---

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے واختلفوا اهل ولدبه اووضع بعدولادته فعندابی نعیم أنّه لماولداخرج الملک صرة من حریرابیض فیها خاتم فضرب علی کتفه کالبیضة وفی حدیث البزاروغیره انّه قیل یا رسول اللّٰهﷺ کیف علمت انّک نبی وبم علمت حتی استیقنت قال اتانی اثنان وفی روایة ملکان وانابیطحاء مکة فقال احدهمالصاحبه اغسل بطنه غسل الاناء واغسل قلبه غسل الملاء ثم قال احدهما لصاحبه خط بطنه فخاط بطنی وجعل الخاتم بین کتفی کما هو الآن وولیاعنی وکأنیّ اری الأمرمعاینة(جمع الوسائل ۱/۷)اور بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ پیدائشی تھی۔(مختار)

(۲)<u>وفات کے بعد مہر ختم ہوا:</u> اور جب آنحضرتﷺ کا انتقال ہوا تو وہ مہر ختم ہوگئی۔ ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے روی البیهقی فی الدلائل عن شیوخه انّهم قالوالماشک الناس فی موت رسول اللّٰهﷺ وضعت اسماء بنت عمیس یدها بین کتفیه فقالت توفی رسول اللّٰهﷺ قدرفع الخاتم من بین کتفیه(جمع الوسائل ۱/۷۰)(مختار)

زر الحجلة: فاذا هو مثل زر الحجلة حجلہ سے حجلۂ عروسی مراد ہے عموماً خاص مہمان یا اہم شخصیت کیلئے مجلس میں ممتاز اور الگ جگہ بنائی جاتی ہے جسے منصہ بھی کہتے ہیں۔ جیسا کہ دارالحدیث میں شیخ الحدیث کیلئے بنا ہوا ہمارا چھوٹا سا تخت ہے جسے ہم مسند کہتے ہیں اسی طرح دلہا یا دلہن کو بھی نمایاں جگہ پر بٹھایا جاتا ہے جہاں چھوٹی سی چھت لگی ہوتی ہے چادروں اور پھولوں سے اس جگہ کی تزئین ہوتی ہے یہ ایک بیش قیمت تحت ہوتا ہے جسے چھپرکھٹ اور مسہری بھی کہتے ہیں۔ عربی میں اسے حجلۃ العروس کہا جاتا ہے۔

حجلہ یا چھپرکھٹ پر بیش قیمت پردے اور منقش چادریں ہوتی ہیں ان پر کپڑے وغیرہ سے بنے ہوئے گول گول بٹن ہوتے ہیں انہی کو ''زر'' کہتے ہیں اردو میں اسے گھنڈی کہتے ہیں جس کی جمع ازرار ہے۔ مختصر المعانی میں آپ نے یہ شعر پڑھا ہوگا **لا تعجبوا من بلى غلالته قدزر ازراه على القمر**

ترجمہ: اس محبوب کے بدن سے لگے ہوئے کپڑے کی بوسیدگی سے تعجب نہ کرو کیونکہ اس کی گھنڈیاں تو چاند کے اوپر باندھی گئی ہیں (اور چاند ریشمی کپڑے کو جلدی بوسیدہ کر دیتا ہے)

ایک اور روایت میں **مثل رز الحجلة** کے الفاظ منقول ہیں (۱) یعنی راء مقدم ہے۔

اس صورت میں **حجلة** سے مراد کبوتر کی جسامت کا ایک خاص قسم کا پرندہ ہے اس کی چونچ سرخ ہوتی ہے جسے چکور اور کبک کہتے ہیں۔ عربی میں **دجاج البر** کے نام سے مشہور ہے۔ رز اس کے انڈے کو کہتے ہیں اصل میں یہ لفظ **رزتِ الجرادة** سے ہے ٹڈی جب انڈے دیتی ہے تو وہ اپنی دم زمین میں دھنسا دیتی ہے اور انجکشن کی طرح ایک بار میں بہت زیادہ انڈے دے دیتی ہے۔ ٹڈی کے اس عمل کیلئے **رزت الجرادة** بولا جاتا ہے۔ بہر حال یہاں تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ حجم میں مہر نبوت **رز الحجلة** یعنی چکور کے

---

(۱) عن سائب بن يزيد قال ذهبت بى خالتى إلىٰ رسول الله ﷺ فقالت يا رسول الله إنّ ابن اختى وقع فمسح رأسى ودعالى بالبركة و توضأ فشربت من وضوئه ثم قمت خلف ظهره فنظرت إلىٰ خاتم بين كتفيه مثل زر الحجلة قال ابن عبدالله الحجلة من حجل الفرس الذى بين عينيه. وقال ابراهيم بن حمزة مثل رز الحجلة قال ابوعبدالله الصحيح الراء قبل الزاء (بخارى ج ۲ ص ۵۰۱).(اصلاح الدين)

انڈے جتنا تھا(۱)۔مہر کی سمت اور مقدار کی تعبیر کسی نے کم اور کسی نے زیادہ کردی کہ ہر ایک کا ایک اندازہ اور تخمینہ ہوتا ہے اس لئے روایات متعارض نہیں۔تفصیل آرہی ہے۔

(۲) حدثنا سعید بن یعقوب الطالقانی أخبرنا أیوب بن جابر عن سماک بن حرب عن جابر بن سمرة قال رأیت الخاتم بین کتفی رسول اللّٰہ ﷺ غدة حمراء مثل بیضة الحمامة(۲).

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی مہر نبوت کو آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان دیکھا جو سرخ رسولی جیسے تھی اور مقدار میں کبوتر کے انڈے جتنی تھی۔

<u>مہر نبوت کا رنگ:</u> **غدة حمرأ،الغدة القطعة المرتفعة من اللحم فی الجسم** یعنی بدن میں گوشت کے ابھرے ہوئے ٹکڑے کو غدہ کہتے ہیں اردو میں اسے غدود کہا جاتا ہے اس کی جمع غدود آتی ہے۔ یہاں پر مہر نبوت کا رنگ سرخ بتایا گیا ہے اس کے رنگ میں روایات مختلف ہیں کہیں زرد اور کہیں سبز بھی مروی ہے۔

مسلم کی ایک روایت میں سیاہ اور ایک دوسری روایت میں جلد کی رنگت کا ذکر آیا ہے۔لیکن روایات میں تطبیق آسان ہے کیونکہ یہ رنگ یا تو مختلف اوقات میں تبدیل ہوتا رہا اور موسم کی تبدیلیوں سے اس میں فرق آتا رہا(۳)اور یا یہ ہے کہ دیکھنے والے کو جس طرح محسوس ہوا اسی طرح روایت کردی۔

ایک روایت کے مطابق اس مہر پر باطن میں **وحدہ لا شریک لہ** اور ظاہر میں **توجہ**

---

(۱) چکور کا انڈا مرغی کے انڈے سے قدرے چھوٹا ہوتا ہے اور کبوتری کے انڈے سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔اور مولانا شیخ زکریاؒ نے فرمایا ہے کہ حقیقت میں یہ سب تشبیہات ہیں اور ہر شخص کی تشبیہ اس کے ذہن کے مطابق ہوتی ہے جو تقریبی حالت ہوتی ہے اور تقریب کے اختلاف میں اشکال نہیں ہوتا بندہ کے نزدیک یہ توجیہ زیادہ مناسب ہے(خصائل)(مختار)

(۲)مسلم ۲/۲۵۹ کتاب الفضائل باب اثبات خاتم النبوة، جامع ترمذی ۲/۱۸۴ کتاب المناقب باب فی خاتم النبوة(مختار)

(۳)قال شیخ إبراهیم البیجوریؒ ولا تدافع بین هذه الروایات لأنّه کان یتفاوت باختلاف الاوقات فکانت کلون جسده تارة وکانت حمراء تارة وهکذا بحسب الاوقات (المواهب اللدنیة ص ۳۱)(مختار)

حیث کنت قانت منصور کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔مگر یہ مرجوح ہے کیونکہ بعثت انبیاء بھی ایک آزمائش ہے ایمان لانا اور نہ لانا بندوں کے اختیار میں ہے۔اور بات ایسی ہوتی تو انکار کی گنجائش باقی نہ رہتی اور یہ اضطرار کے مترادف ہوتا دراصل اس وہم کا منشا یہ بنا کہ انگوٹھی کو بھی خاتم کہا جاتا ہے۔اور نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی پر کچھ الفاظ کندہ تھے۔اس سے بعض حضرات کو یہ وہم ہوا کہ یہ الفاظ خاتم نبوت پر لکھے ہوئے تھے۔

مہر نبوت کا حجم: مہر نبوت کے حجم یعنی کمیت اور مقدار میں بھی روایات مختلف ہیں ایک روایت میں مثل زر الحجلة آیا ہے یعنی چھپر کھٹ کے پردے کے گھنڈی جتنا تھا۔بعض نے ان کے معنی انڈے اور حجلہ کے معنی چکور کیلئے ہیں یعنی چکور کے انڈے جتنا تھا۔ ایک اور روایت میں صرف شعرات مجتمعات مروی ہے۔مصنفؒ کی روایت میں بضعة ناشزة یعنی گوشت کا ابھرا ہوا ٹکڑا ذکر ہے۔ابن حبان کی ایک روایت میں بیضة نعامة آیا ہے۔مسلم کی روایت میں کبیضة الحمام مذکور ہے۔بیہقی کی روایت میں سیب اور ابن عساکر کی روایت میں بندقہ یعنی غلیل کی گولی سے تشبیہ دی گئی ہے۔بعض روایات میں کـأثر المحجم ذکر ہے۔بعض نے صرف چمکتی روشنی بتایا ہے۔ابوسعید خدریؓ کی روایت میں مثل الجمع یعنی مٹھی جتنا کہا گیا ہے۔نیز یہ بھی ہے کہ اس کے اردگرد مسوں کی طرح سیاہ تل تھے۔بہر حال ان تمام روایات میں تطبیق آسان ہے اور وہ اس طرح کہ اس کے حجم اور کیفیت میں اختلاف زمانے پر مبنی ہے یعنی مختلف اوقات میں اس کا حجم بھی مختلف ہوتا رہا۔کبھی چھوٹا ہوتا تو کبھی بڑا ہو جاتا تھا۔اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت یہ تمام اقوال تشبیہات اور اندازے ہیں۔تحدیدی بات نہیں۔جس صحابی نے مہر نبوت کو دیکھا اس نے اپنی تقریبی تخمینے سے اس کی کمیت و کیفیت کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے اس وجہ سے رواۃ کے بیانات میں اختلاف واقع ہوا ہے(۱)۔

خلاصہ تمام روایات کا یہ ہے کہ مہر نبوت جلد پر ایک ابھری ہوئی چیز تھی جو کہ آپ ﷺ کی پیٹھ پر صاف اور واضح دکھائی دیتی تھی۔اس کے اردگرد بال بھی تھے اور رنگ میں تبدیلی بھی واقع ہوتی تھی۔غلیل کی

---

(۱)اور ایک جواب یہ بھی ہے کہ گزشتہ حدیث پاک میں گھنڈیوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے وہ اس کی خوبصورتی کے لحاظ سے ہے اور اب بناوٹ کے لحاظ سے بیان ہے کہ مہر نبوت اپنے بناوٹ میں کبوتری کے انڈے کے مشابہ تھی (فیض الباری)۔(مختار)

گولی جتنا چھوٹا ہوجاتا تھا اور کبھی کبھی بڑھ کر مٹھی جتنا ہوجاتا تھا(۱)۔

(۳) حدّثنا أبو مصعب المدنیّ أخبرنا یوسف ابن الماجشون عن أبیـه عـن عاصم بن عمر بن قتادة عن جدته رمیثة قالت سمعت رسول اللّٰـه ﷺ ولـو اشـاء ان اقبّـل الخاتم الذی بین کتفیه من قربه لفعلت یقول لسعد بن معاذ یوم مات اهتزله عرش الرحمان .

ترجمہ: حضرت رمیثہؓ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے (اتنے قریب سے) سنا کہ اگر میں چاہتی کہ قرب کی وجہ سے آپ ﷺ کے کندھوں کے درمیان کے مہر نبوت کو چوم لوں تو ایسا کرسکتی۔ آپ ﷺ حضرت سعدؓ کی وفات کے روز ان کے بارے میں فرمارہے تھے کہ ان کی موت کی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ کا عرش بھی جھوم اٹھا۔

الماجشون اور رمیثہؓ: عـن یـوسف بن الماجشون: یوسفؒ کے باپ یعقوبؒ اور ان کے دیگر آباء کو ماجشون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ یعقوب کے دادا ابوسلمہ تیمی کا لقب تھا۔

کہتے ہیں کہ چہرے کی سرخی کے سبب اسے ماجشون کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ جیم کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ منقول ہے۔ بعض نے فتحہ کو بھی درست قرار دیا ہے۔ اصل میں یہ فارسی لفظ ماہ گون یعنی چاند نمایا ے گون سے معرب ہے میگون کے معنی شراب جیسی رنگت والا ہوتے ہیں۔

عـن جـدتـه رمیثة بنت عمر و بن هشام عمرو بن ہشام کی بیٹی کم عمر صحابیہ ہیں ان سے دو حدیثیں مروی ہیں اس حدیث میں غزوہ خندق کے موقع کی روایت کرتی ہیں۔

لقربه: یعنی بسبب قربہ اور قرب کا مصدر اپنے مفعول کو مضاف ہے یعنی لقربی ایاہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ قرب کے بیان میں دراصل صحابیہ کا مقصد یقینی روایت اور کمال معرفۃ پر تنبیہ کرنا ہے یعنی اتنے

(۱) کتب سابقہ میں بھی آنحضرت ﷺ کے مہر نبوت کا ذکر موجود تھا۔ شاہ مقوقس کے پاس جب رسول اللہ ﷺ کا خط مبارک پہنچا تو اس نے کہا کہ کتب سابقہ میں نبی آخرالزمان کی تین علامات میں نے پڑھی ہیں (۱) اس کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی (۲) دراز گوش پر سوار ہوں گے (۳) معمولی چادر اوڑھنے میں بھی تکلف نہیں کریں گے۔ (مختار)

قریب سے مہر دیکھ لی کہ چاہتی تو چھوم بھی سکتی تھیں(۱)۔

سعد بن معاذ اور اھتزاز عرش الرحمن: **یقول لسعد بن معاذؓ یعنی یقول فی شانہ اوفی حقہ** ،یعنی حضرت سعد بن معاذؓ کے حق میں یا اس کے بارے میں فرمایا تو لام اس جگہ فی کے معنی پر مستعمل ہے۔قرآن مجید میں لام فی کی جگہ استعمال ہوا ہے۔جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **وقال الذین کفرو اللذین آمنوا لو کان خیراً ما سبقونا الیہ.** (الایۃ)

بہر حال اس جگہ بھی نبی کریم ﷺ حضرت سعدؓ کی مدح کرتے ہوئے ان کے بارے میں کچھ فرماتے ہیں۔حضرت سعد بن معاذؓ قبیلہ اوس کے سردار تھے۔۳۷ سال کی بھر پور جوانی میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔یہ ۵ھ کا واقعہ ہے جب جنگ خندق میں تیر لگنے کی وجہ سے خون زیادہ بہہ گیا اور شہادت پائی۔ستر ہزار فرشتے بھی نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔نبی کریم ﷺ نے آپؓ کی موت کے بارے میں فرمایا کہ **اھتزّ لہ عرش الرحمان** یعنی آپؓ کی وفات سے اللہ تعالیٰ کا عرش ہل گیا۔

اس کی کئی توجہات ہیں۔

(۱) **اھتزّ،ھزّ** سے باب افتعال کا ماضی ہے کہتے ہیں **ھززتہ فاھتزّ** میں نے اسے ہلایا تو وہ ہل گیا۔ **ھزّ** اور **اھتزّ** دونوں کے معنی حرکت کرنا اور جھومنا ہے۔لیکن **اھتزاز** کا لفظ خوشی میں بھی مستعمل ہے کیونکہ خوشی کے موقع پر بھی انسان جھومنے لگتا ہے دل کی دھڑکن بھی خوشی کی وجہ سے تیز ہو جاتی ہے۔اس لحاظ سے **اھتزاز** خوشی میں جھومنے کو بھی کہتے ہیں۔اگر چہ یہ نفسِ حرکت اضطراب، ہلنے اور جھومنے کا نام ہے۔اللہ

---

(۱) **ولو اشاء ان اقبّل الخاتم الذی بین کتفیہ من قربہ**، مہر نبوت کی جگہ کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ مہر نبوت دونوں مونڈھوں کے درمیان بائیں بازو کے مساوی بائیں کندھے کے نیچے قلب کے مقابل میں تھی اس کی علت یہ بیان کرتے ہیں کہ اسی جگہ سے شیطان وسوسہ ڈالتا ہے۔اس مہر نبوت کی وجہ سے آپ ﷺ شیطانی وسوسہ سے محفوظ ہو گئے تھے۔ملا علی قاریؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے اس بات کو نقل کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شق صدر کے موقع پر جب دل کو زمزم سے دھویا گیا اس کے بعد میری پیٹھ پر مہر نبوت لگا دی گئی جس کی ٹھنڈک کو میں نے اپنے دل میں محسوس کیا۔(مختار)

مہر نبوت کی خوشبو: اور اس مہر نبوت سے خوشبو آتی تھی۔ملا علی قاریؒ نے اس پر حضرت جابرؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے پیچھے بٹھایا تو میں نے آپ ﷺ کی مہر نبوت کو بوسا دیا تو اس سے مشک کی خوشبو آرہی تھی۔(مختار)

تعالیٰ کا عرش اس خوشی میں جھومنے لگا کہ حضرت سعد بن معاذؓ کی عظیم قربانی اور للّٰھیت اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوگئی۔

(۲) دوسری توجیہ یہ ہے کہ عرش سے مراد یہاں اہل العرش اور حملۃ العرش یعنی عرش کو اٹھانے والے فرشتے مراد ہیں جن کو ملائکہ کروّبیین کہتے ہیں(۱)۔شاعر کہتا ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھیں کروبیاں

قرآن کریم بتلاتا ہے کہ ان فرشتوں کو مومنین کے ساتھ بے انتہا محبت ہے حتیٰ کہ ان کے بال بچوں تک کیلئے دعا کرتے رہتے ہیں۔

الذین یحملون العرش و من حوله یسّبحون بحمد ربهم و یومنون به و یستغفرون للذین آمنوا ربّنا وسعت کل شئی رحمةً و علماً فاغفر للذین تابوا واتبعوا سبیلک و قهم عذاب الجحیم. ربّنا وادخلهم جنّٰت عدن التی وعدتهم ومن صلح من آباء هم وأزواجهم وذریّاتهم انّک انت العزیز الحکیم(۱).

ترجمہ:وہ فرشتے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے ارد گرد ہیں۔وہ اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔اور ایمان والوں کیلئے استغفار کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور علم ہر چیز کو شامل ہے۔سو ان لوگوں کو بخش دیجئے جنہوں نے توبہ کر لی ہے اور آپ کے راستے پر چلتے ہیں اور ان کو عذاب جہنم سے بچا لیجئے۔اے ہمارے رب! اور ان کو ہمیشہ رہنے کی بہشتوں میں جن کا تم نے ان سے وعدہ کیا ہے داخل کر دیجئے،اور ان کے ماں باپ اور

---

(۱)اور ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ اللہ کے عرش میں جنبش پیدا ہوئی ان کافروں پر غصہ کی وجہ سے کہ انہوں نے اسلام کے سچے جاں نثار کو زخمی کیا جس سے ان کی شہادت ہوگئی۔بقول ایک انصاری شاعر کے ؎

وما اهتزّ عرش اللّٰه من موت هالک سمعنا به إلّا لسعد ابی عمرو (کسی مرنے والے کی موت پر اللہ کا عرش نہیں ہلا مگر سعد ابی عمرو کی موت پر (ابو عمرو آپؓ کی کنیت ہے)(مختار)

(۲)سورۃ المؤمن ۷،۸

بیویوں اور اولاد میں سے جو لائق ہوں ان کو بھی داخل کر دیجئے بلا شک تو زبردست حکمت والا ہے۔

تو ان فرشتوں نے جب حضرت سعدؓ کی عجیب وغریب قربانی دیکھ لی تو بہت خوش ہو گئے اور کیف و وجد میں آئے اور جب حملۃ العرش حرکت کریں گے تو عرش میں بھی حرکت آئے گی۔

(۳) تیسری توجیہ یہ ہے کہ عرش ، کرسی، آسمان، اور زمین تمام کے تمام مومن کے اعمال صالحہ کی وجہ سے خوش ہوتے ہیں۔اعمال سیئہ کی وجہ سے انہیں دکھ ہوتا ہے جب تک اعمال صالحہ جاری ہوں گے وہ انبساط ومسرت میں ہونگے وہ جگہ جہاں مومن سجدے کیا کرتا تھا سجدوں کے انقطاع سے روتا ہے۔ وہ راستہ جن سے اس کے اعمال حسنہ گزرتے تھے اعمال کے سبب خوش ہوتا تھا۔اعمال کے انقطاع سے اسے دکھ ہوتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آسمان وزمین مومنین کی موت پر روتے ہیں کفار کے لئے وہ نہیں روتے۔اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

فما بکت علیھم السماء والارض و ماکانوا منظرین(دخان ۲۹)

پس نہ تو ان (فرعونیوں پر) آسمان وزمین کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت دی گئی۔

بہر حال یہ غم واضطراب کا رعشہ تھا جو عرش کی حرکت کا سبب بنا۔

(۴) چوتھی توجیہ یہ ہے کہ عرش سے مراد عرش الرحمان نہیں بلکہ مراد وہ چارپائی ہے جس پر لاش پڑی تھی جیسا کہ براء بن عازبؓ کی روایت میں ہے **اھتزّ السریر** (۱) چارپائی حرکت میں آئی۔یعنی جس چارپائی پر لاش پڑی تھی فرشتوں کے ہجوم کی وجہ سے وہ ہچکولے کھا گئی لیکن اس صورت میں پھر عرش الرحمان کا لفظ اچھی طرح منطبق نہیں ہوتا۔

<u>حضرت براءؓ کے بارے میں غلط فہمی اور اس کا ازالہ:</u> حضرت جابرؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ نے حدیث کی یہ تشریح اس لئے کی ہے کہ حضرت سعدؓ اوسی اور حضرت براءؓ خزرجی ہیں۔اور معاصرت کی وجہ سے دونوں قبیلوں میں بدگمانیاں تھیں۔اور چونکہ حضرت سعدؓ کے بارے

(۱)عن جابرؓ سمعت النبی ﷺ یقول اھتزّ العرش لموت سعد بن معاذؓ. فقال رجل لجابر فان البراءؓ یقول اھتزّ السریر فقال کان بین ھذین الحیین ضغائن سمعت النبی ﷺ یقول اھتزّ عرش الرحمان لموت سعد بن معاذؓ. (صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۳۶)(اصلاح الدین)

میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول اوس کیلئے بھی بڑا اعزاز تھا اس لئے اس نے پرانی چشمک کی بنا پر عرش الرحمٰن کا مفہوم السّریر سے بدل دیا۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو کسی جلیل القدر صحابی سے اس قسم کی عصبیت کا صدور بعید از قیاس ہے کہ وہ محض حسد کی بناء پر نبی کریم ﷺ کے قول میں بھی تحریف کرلے بلکہ اس قسم کی تبدیلی کرنے والا عادل ہی نہیں رہتا اس کی روایت قبول نہیں۔ لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ حضرت براءؓ کو اگرچہ غلط فہمی ہوئی ہے لیکن وہ اس پر مبنی نہیں کہ حضرات براءؓ خزرجی ہیں اور حضرت سعد اوسی بلکہ یہ الزام ہی بے بنیاد اور سراسر غلط ہے وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں صحابی اوسی (۱) ہیں لہٰذا مذکورہ وجہ تبدیلی کیلئے نہیں بن سکتی۔

رہا حضرت جابرؓ کی حدیث تو وہ درحقیقت حضرت براءؓ کی طرف سے اس کی توجیہ کیلئے اعتذار کر رہے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ انہوں نے یہ تبدیلی یا توجیہہ اس لئے نہ کی کہ اوسی ہونے کی وجہ سے حضرت سعدؓ کی فضیلت پر پردہ ڈال دے۔ اس لئے کہ یہ کام تو حضرت جابرؓ کے قبیلہ کے کسی شخص کو کرنا تھا کیونکہ خزرج کو حضرت سعدؓ کے قبیلہ اوس سے پرانی چشمک تھی۔ چنانچہ حضرات براء بن عازبؓ کی بات عجیب لگتی ہے کہ اوسی ہونے کے باوجود اپنے سردار کی فضیلت کا انکار کررہے ہیں اسلئے ظاہر ہے وہ کسی غلط فہمی کی بناء پر ایسا کررہے ہیں نہ کہ حسد کی بناء پر۔ بہرحال ان کے خیال میں بھی عرش الرحمان ہی درست ہے اور یہ راجح بھی ہے (۲)۔

---

(۱) علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حضرت براءؓ کا شجرہ یوں لکھا ہے۔ براء بن عازب بن الحارث بن عدی بن مجدعة بن حارثة بن الحارث بن الخرج بن عمرو بن مالک بن الاوس ۱۲ (اصلاح الدین)

(۲) وانّما قال جابر ذالک اظهاراً للحق واعترافاً بالفعل لاهله فکانّه تعجب من البراء کیف قال ذالک مع انّه اوسیّ ثم قال أمّا انا وان کنت حزرجیاً وکان بین الاوس والخزرج ضغائن لا یمنعنی ذالک ان اقوال الحق نذکر الحدیث والعذر للبراء انّه لم یقصد تغطیة فضل سعد وإنّما فهم ذالک فجزم به (فتح الباری) شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے یہی فرمایا ہے کہ جس کو حضرت جابرؓ بیان فرمارہے ہیں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ محقق ہے اس میں کسی قسم کی زیادتی و تحریف نہیں ہے حضرت براءؓ کو پورے الفاظ یاد نہیں کیونکہ میں خزرجی ہوں اور حضرت سعدؓ اوسی ہیں اوس اور خزرج میں مدتوں کینہ رہا ہے تو ایک قبیلہ والا دوسرے مقابل کے قبیلہ کے فضائل میں زیادتی نہیں کرسکتا بلکہ پورا بیان کیا ہے کہ عرش الرحمٰن کے الفاظ تھے (تقریر ترمذی) (مختار)

<u>غیر ذوی العقول کا ادراک:</u> یہاں ایک اشکال سامنے آتا ہے کہ عرش تو غیر ذی عقل ہے اور غیر ذی عقل سے کسی کی

(باقی اگلے صفحہ پر)

(۴) حدّثنا أحمد بن عبدة الضبیّ وعلی بن حجر وغیر واحد قالوا نبانا عیسیٰ بن یونس عن عمر بن عبداللّٰہ مولی غفرۃ قال حدّثنی إبراھیم بن محمّد من ولد علی بن ابی طالبؓ قال کان علیؓ اذا وصف رسول اللّٰہ ﷺ فذکر الحدیث بطولہ وقال بین کتفیہ خاتم النبوۃ وھو خاتم النبین(۱).

ترجمہ: ابراہیم بن محمد جو حضرت علیؓ کے پوتے ہیں کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ جب نبی کریم ﷺ کی صفت بیان کیا کرتے تو فرماتے ۔۔اور مذکورہ حدیث کو بیان کیا اس میں یہ بھی فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان مہر نبوت تھی اور آپ خاتم النبین تھے۔

(بقیہ پچھلے صفحہ کا)۔۔۔۔۔۔۔موت پر حرکت کرنا کیسے ممکن ہے؟ تو اہل علم نے لکھا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز عقل وشعور سے خالی نہیں حتیٰ کہ جمادات اور شجر وحجر بھی اپنی اپنی عقل کے مطابق اپنے رب کا ذکر اور تسبیح پڑھتے ہیں۔قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے تسبّح لہ السموات السبع والارض ومن فیھنّ وان من شئ إلاّیسبح بحمدہ(الایۃ) قرآن پاک میں خشیۃ الٰہی کی وجہ سے پہاڑی سے گرنا،اس میں شگاف پیدا ہوکر اس پتھر سے نہر کا جاری ہونا وغیرہ ثابت ہے۔وإنّ من الحجارۃ لمایتفجر منہ الانھٰروانّ منھالمایشقق فیخرج منہ الماء وإنّ منھالمایھبط من خشیۃ اللّٰہ(الایۃ سورۃ البقرۃ ایت ۷۴) اور رسول اللہ ﷺ سے ہاتھ مبارک میں کنکریوں کا ذکر وتسبیح ثابت ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اب بھی اس پتھر کو پہچانتا ہوں کہ جو نبوت سے پیشتر مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔اسی طرح صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ،ابوبکرؓ ،عمرؓاور عثمانؓ جبل اُحد یاحراء پر چڑھے تو پہاڑ کو جنبش ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنا قدم مبارک پہاڑ پر مارااور فرمایا کہ اے پہاڑ ٹھہر إنّ علیک نبی وصدیق وشھیدان ،اور حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ہم جب کبھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ سے باہر جاتے تو جس درخت یا پہاڑ پر گزر ہوتا تو یہ آواز آتی السلام علیک یارسول اللّٰہ ﷺ ،اور اسی طرح ستون حنانہ کا واقعہ صحیح بخاری شریف میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔اس لئے علامہ کاندھلویؒ نے لکھا ہے اہلسنت والجماعت کے نزدیک حیوانات اور جمادات میں بھی روح اور حیات ہے اور ان میں ایک خاص قسم کا شعور اور ادراک ہے جس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے(معارف القرآن ۲۱۰/۲۱۲،۲۱۲)

تو اسی وجہ سے عرش الرحمٰن کا حضرت سعدؓ کی موت کا ادراک کر کے حرکت کرنا ناممکن نہیں(مختار)

(۱)مشکوٰۃ المصابیح ۵۱۷/۲ باب اسماء النبی ﷺ، جامع ترمذی ۲۰۵/۲ ابواب المناقب باب صفۃ النبی ﷺ(مختار)

نے ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو میری انگلیاں مہر نبوت پر پڑیں۔ میں نے پوچھا کہ مہر نبوت کیا چیز تھی انہوں نے کہا کہ کچھ بالوں کا مجموعہ تھا۔

أبو زید عمر بن أخطب الأنصاریؓ مشہور بدری صحابی ہیں نبی کریم ﷺ کے زمانے میں جن چار صحابہ نے قرآن جمع فرمایا تھا ان میں آپ کا نام گرامی بھی ہے۔ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آپ کے بارے میں دعا کی تھی انکے پوتے کہتے ہیں کہ ایک سو بیس سال تک زندہ رہے اور آپ کی داڑھی اور سر میں صرف چند بال سفید تھے۔

یاأبا زید بعض نسخوں میں "یابازید" بغیر الف کے لکھا گیا ہے۔لیکن ہمزہ کا سقوط صرف کتابت میں جائز ہے قرأت میں یا ابازید ہی پڑھا جاتا ہے۔

صحابی کو مسح ظہر کا حکم: **فامسح ظهری الخ** کبھی کبھی کپڑوں میں حشرات میں سے کوئی چیز مثلا چیونٹی ، بچھو یا بھڑ وغیرہ گھس جائے تو اپنے ساتھیوں سے کہا جاتا ہے کہ ذرا اس کی تلاش کرنے میں مدد دے۔تو شاید آپ ﷺ کو بھی کسی موذی چیز کا احساس ہو چکا ہو لہذا صحابی سے کہا کہ وہ دیکھ لے کہ کہیں بچھو وغیرہ نہ ہو اور ممکن ہے کہ آپ ﷺ کی پیٹھ میں کھجلی اٹھی ہو اور صحابی کو کھجلانے کا حکم دیا ہو۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نور نبوت سے یہ محسوس کرلیا ہو کہ اس صحابی کو مہر نبوت دیکھنے کی خواہش اور تمنا ہے جیسا کہ بعض صحابہ کو تجسس ہوتا تھا اور اس علامت کو دیکھنے کے متمنی ہوتے تھے۔تو نبی کریم ﷺ نے یہ خواہش اپنی فراست سے محسوس کی اور صحابی کے اطمینان کے لیے مہر نبوت دیکھنے کی دعوت دی لیکن اس صحابی نے کپڑے کے اندر سے ہاتھ ڈال کر دیکھا ہے آنکھوں سے نہیں دیکھا نبی کریم ﷺ کے پاس عموماً قمیص نہیں ہوتی تھی اور ہوسکتا ہے کہ قمیص پہنے ہوئے ہوں تو شاید گریباں پیٹھ کی جانب بنا ہوا ہو۔جس طرح کہ آج کل بھی بعض علاقوں کا دستور ہے۔کہ گریباں سینہ کی بجائے پیٹھ پر بنایا جاتا ہے۔

قلت ما الخاتم شاگرد کا مقصد ماہیت سے سوال نہیں بلکہ وہ کیفیت کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے۔**شعرات مجتمعات** بالوں کا گچھا سا تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث کا دیگران احادیث سے بظاہر تعارض ہے جن میں مہر نبوت کو لحم نابت (ابھرے ہوئے گوشت) یا غدہ اور بضعہ ناشزۃ وغیرہ سے

تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک طرف مہر نبوت ابھرا ہوا گوشت تھا تو دوسری طرف اس کے اردگرد بال بھی تھے اب یا تو اس راوی کی انگلیاں صرف بالوں پر پڑی ہیں لہٰذا وہ ابھرے ہوئے گوشت کا ذکر نہیں کرتا یا پھر یہاں عبارت حذف مضاف سے ہے تقدیر یوں ہوگی کہ **لحم نات ذو شعرات** یعنی ابھرا ہوا گوشت تھا جس کے اردگرد بال تھے۔

علامہ بیجوریؒ نے علم قیافہ والوں کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ جس شخص کی پیٹھ پر سیاہ دھبہ ہو جس پر بال ہوں اس کی اپنی زندگی بھی تھکا دینے والی ہوگی۔ نیز اس کے اقارب اس کی وجہ سے دنیا میں شدائد جھیلیں گے۔ نیز اس کی موت بھی زہر سے ہوگی اور تینوں باتیں نبی کریم ﷺ کے حق میں ظاہر ہو چکی ہیں(۱)۔

(۲) حدثنا أبو عمّار الحسين بن حديث الخزاعی ثنا علی بن حسين بن واقد ثنی ابی عبدالله بن بريدة قال سمعت أبی بريدة يقول جاء سلمان الفارسی إلی رسول الله ﷺ حين قدم المدينة بمائدة عليها رطب فوضعها بين يدی رسول الله ﷺ فقال يا سلمان ما هذا فقال صدقة عليک وعلی اصحابک فقال ادفعها فانا لاناكل الصدقة قال فرفعها فجاء الغدبمثله فوضعه بين يدی رسول الله ﷺ فقال ما هذا يا سلمان فقال هدية لک فقال رسول الله ﷺ لاصحابه ابسطوا ثم نظر الی الخاتم علی ظهر رسول الله ﷺ فآمن به و كان لليهود فاشتراه رسول الله ﷺ بكذا و كذا درهماً علی ان يغرس لهم نخيلا فيعمل سلمان فيه حتی تطعم فغرس رسول الله ﷺ

---

(۱)واعلم أنّهم قالوا من كان علی ظهره شامة عليهاشعرنابت كان كثيرالعناء وأصاب أهل بيته لأجله مكروه ويكون موته من قبل السم وقدكان كذلک فكان ﷺ كثيرالعناء لمّالاقی من الشدائدوأصاب بنی هاشم لأجله مالايخفی وأماالموت بالسم فقدقال مازالت أكلة خيبرتعاودنی فهذاأوان انقطاع أبهری(المواهب اللدنية ص ۳۴)(مختار)

النخل إلاّنخلة واحدة غرسها عمر فحملت النخل من عامها ولم تحمل النخلة فقال رسول اللّٰه ﷺ ما شان هذه النخلة فقال عمر يا رسول اللّٰه ﷺ انا غرستها فنزعها رسول اللّٰه ﷺ فغرسها فحملت من عامه(۱).

ترجمہ: حضرت بریدۃ بن الحصیبؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو حضرت سلمانؓ ایک خوان لے کر آئے جس میں تازہ کھجوریں تھیں اور نبی کریمﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا آپﷺ نے فرمایا کہ اے سلمان یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ یہ آپﷺ پر اور آپﷺ کے ساتھیوں پر صدقہ ہے۔ نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے اس لئے اسے میرے پاس سے اٹھا لو۔ دوسرے دن پھر حضرت سلمانؓ اسی طرح کھجوریں لائے اور نبی کریمﷺ کے سامنے رکھ دیں۔ نبی کریمﷺ نے پھر پوچھا کہ اے سلمان یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ آپﷺ کیلئے ہدیہ ہے۔ نبی کریمﷺ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ ہاتھ بڑھاؤ پھر حضرت سلمانؓ نے نبی کریمﷺ کی پشت مبارک پر مہر نبوت دیکھی تو مسلمان ہو گئے۔ حضرت سلمانؓ اس وقت یہود کے غلام تھے پس نبی کریمﷺ نے ان کو اتنے دراھم دے کر خریدا (یعنی بدل کتابت ادا کرنے میں مدد دی نیز یہود نے یہ شرط لگائی) کہ سلمانؓ ان کے لیے (تین سو) کھجور کے درخت لگائیں اور پھل لانے تک ان کی خبر گیری بھی کریں۔ پس نبی کریمﷺ نے اپنے دست مبارک سے وہ درخت لگائے سوائے ایک درخت کے جسے حضرت عمرؓ نے لگایا۔ چنانچہ وہ تمام درخت اسی سال پھل لائے سوائے اس درخت کے کہ وہ پھل نہ لایا۔

نبی کریمﷺ نے اس درخت کے بارے میں دریافت کیا کہ اسے کیا ہو گیا ہے تو

(۱) المستدرک ۵۵۹/۳، مسند احمد ۳۵۴

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ ﷺ اسے میں نے لگایا تھا نبی کریم ﷺ نے اس کو اکھاڑا پھر خود اپنے ہاتھ سے لگایا۔ چنانچہ وہ درخت بھی اسی سال پھل لایا۔

سمعت أبی بریدۃ۔ بریدہ لفظ "أبی" سے بدل یا عطف بیان ہے۔اس کے والد کا نام حصیب بضم حاء ہے بریدہؓ صحابی ہیں۔غزوہ بدر سے پہلے اسلام لائے تھے مگر کسی وجہ سے اس میں شرکت نہ کر سکے۔بصرہ میں ۶۲ھ یا ۶۳ھ میں وفات پائی۔

سلمان فارسیؓ کی فضیلت اور قبول اسلام: حضرت سلمان فارسیؓ کی زندگی کے واقعات بڑے عجیب وعبرت ناک ہیں۔آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت طویل عمر بخشی تھی۔دوسو،ڈھائی سو،تین سو،ساڑھے تین سو،اور چار سو سال تک کی روایات موجود ہیں۔آپ کا تعلق اصفہان کے ایک شہر سے تھا۔چونکہ ایران کے لوگ گھڑسواری میں بہت ماہر تھے اسلئے عرب لوگ ایران اور اس سے ملحقہ علاقوں کو فارس کہتے تھے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نام ان کے دادا فارس بن کیومرث کی وجہ سے پڑا۔بہر حال علاقے کی وجہ سے آپؓ کو بھی فارسی کہا جاتا تھا۔آپؓ اصفہان کے ایک دولتمند آدمی کے بیٹھے تھے باپ خود مجوسی تھا اور بیٹے سے بہت محبت تھی اس نے بیٹے کو مجوسیت کیلئے وقف کر دیا۔یہاں تک کہ سلمان آتش کدہ کا محافظ بن گیا۔خوش قسمتی سے ایک دن آپ کا گزر ایک عیسائی گرجے پر ہوا اور محض سیر کی خاطر آپؓ اس میں داخل ہو گئے اندر جا کر ان کی عبادت اور دین حق کا نور دیکھا تو بہت متاثر ہوئے اور شام تک وہیں رہے پھر تو آپؓ کو عیسائیت پسند آ گئی اور جب بھی موقع ملتا عیسائی پادریوں کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔باپ نے پہلے تو سختی سے منع کیا مگر بے سود بالآخر آپ کو بیڑیاں پہنا کر گھر میں قید کر دیا مگر پادریوں سے آپ کا رابطہ بدستور رہا۔اور ان سے مذہب کے مرکز کے بارے میں دریافت کیا۔انہوں نے بتا دیا کہ اس کا مرکز شام میں ہے۔چنانچہ آپؓ نے پادریوں کو کہلا بھیجا کہ جب شام سے سوداگر لوگ آئیں تو مجھے اطلاع دے دیں۔کچھ مدت بعد سوداگر آئے اور آپؓ کو اطلاع ملی۔جب وہ واپس شام جانے لگے تو آپ نے بیڑیاں کاٹ دیں اور بھاگ کر ان کے ساتھ شام چلے گئے وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس مذہب کا سب سے زیادہ علم فلاں پادری کے پاس ہے۔چنانچہ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عیسائیت میں اپنی رغبت اور

خواہش ظاہر فرمائی۔ اس نے آپؓ کو اپنے ہاں رکھ لیا اور عیسائیت کی تعلیم دی۔ جب وہ مر گیا تو اس کی جگہ ایک اور پادری کو قائم مقام بنا دیا گیا۔ جو بقول سلمان فارسیؓ پہلے سے بہتر تھا۔ دنیا سے بے رغبت اور مخلص تھا۔ آپؓ اس کی خدمت میں رہنے لگے کچھ عرصہ بعد یہ شخص وفات ہونے لگا تو حضرت سلمان فارسیؓ نے پوچھا کہ آپ کے بعد میں کس کے پاس جاؤں اس نے بتایا کہ نصیبین میں فلاں شخص کے پاس چلے جاؤ۔ چنانچہ آپ وہاں گئے اور مذکورہ شخص کی تلاش کرکے تلمذ اختیار کی۔ وہ بھی وفات ہونے لگے۔ تو اس کی ہدایت کے مطابق آپ عموریا کے ایک پادری کی خدمت میں گئے۔ اس مقام پر آپؓ نے کچھ مال بھی کمایا اور کچھ گائیں اور بکریاں آپ کے پاس جمع ہو گئیں۔ یہ آدمی وفات ہونے کے قریب ہوا تو حضرت سلمانؓ نے اس سے پوچھا کہ اب کہاں جاؤں گا۔ اس نے بتایا کہ خدا کی قسم جس طریقہ پر ہم لوگ ہیں اس صحیح اور سچے طریقہ پر اب کوئی باقی نہیں رہا البتہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی کا زمانہ قریب آ گیا ہے جو ملت ابراہیمی کے علمبردار ہونگے اور عرب میں پیدا ہونگے۔ ان کی ہجرت کرنے کی جگہ میں کھجوریں زیادہ ہونگی۔ وہ ہدیہ تو قبول کریں گے لیکن صدقہ نہیں کھائیں گے۔ ان کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ پس اگر ہو سکے تو تم اس جگہ پہنچ جانا۔

حضرت سلمان فارسیؓ یہ سن کر تلاش حق میں نئی منزل کی طرف نکل پڑے۔ آخرکار بنو کلب کے کچھ تاجروں سے ملاقات ہوگئی۔ آپ نے ان کو اپنے ساتھ عرب لے جانے کی درخواست کی اور اس کے عوض بکریاں اور گائیں ان کی نذر کردیں۔ وہ آپ کو مکہ لائے لیکن یہاں پر ان کو اپنا غلام ظاہر کرکے بیچ ڈالا۔ پھر بنو قریظہ کے کسی یہودی نے انہیں اہل مکہ سے خریدا اور مدینہ لے آیا۔ جسے دیکھ کر آپ کو یقین ہو گیا کہ یہی نبی آخر الزمان کی ہجرت گاہ ہوگی۔ اگرچہ وہ آزاد تھے لیکن انہیں غلام کی طرح بیچا گیا۔ چنانچہ مدینہ میں آپ کے مختلف مالکوں کا ذکر ملتا ہے۔ کبھی کسی کے ہاں اور کبھی کسی کے ہاں۔ پے در پے آپ کے دس مالک تبدیل ہوتے رہے، بکتے رہے اور مدینہ میں رہتے رہے۔ ہجرت نبوی ﷺ کے وقت بھی آپ بنو قریظہ کے کسی یہودی شخص کی ملکیت میں تھے۔

الغرض دو ڈھائی سو سال تک یہ تکالیف اور مصائب جھیلتے ہوئے حق کی تلاش میں آپ سرگرداں

رہے۔طویل سفر، قید و بند اور صعوبتوں کے مراحل سے گزرے لیکن وہ مایوس نہ ہوئے نہ مطمئن ہوئے کہ بس حق مل گیا۔کہ اتنے میں اچانک اطلاع ملی کہ نبی آخرالزماں جس کی تلاش میں اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اس کے شہر مدینہ تشریف لا چکے ہیں۔ بنو قریظہ کے لوگوں میں نبی کریم ﷺ کی آمد ان کے استقبال اور علامات کے بارے میں جو کھسر پھسر ہوتی تھی آپ کے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی تھی لہٰذا آپ بھی دوڑے آئے لیکن اس بار وہ بند آنکھوں سے تقلید کرنے والے نہ تھے۔ مشقتیں اور تکالیف برداشت کر کر کے محتاط ہو گئے تھے۔دودھ کا جلا پانی کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے وہ تو ساری زندگی ٹھوکریں کھاتے رہے، دھوکے کھاتے رہے خصوصاً سفر اور غربت کے زمانہ میں غلط اور گمراہ لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا رہا۔ اب وہ صحیح تحقیق کرنا چاہتے تھے کہ کہیں کسی متنبی کذاب کے پنجے میں نہ آجائیں۔ کیونکہ کچھ راہب اور پادری لوگ جن سے ان کا واسطہ پڑا تھا بدعمل اور بدکردار بھی تھے۔آپ صرف ظاہری شکل و شباہت پر دھوکہ کھا جاتے اور بعد میں پچھتاتے۔اس لئے آج تحقیق کے لئے علامات سے امتحان لینا چاہا۔

سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ خیرات اور صدقہ قبول کرتے ہیں یا نہیں۔پھر ہدیہ پیش کرتے ہیں بعد میں مہر نبوت کی بھی تحقیق کرتے ہیں اور جب نبی کریم ﷺ آپؓ کے علم کے مطابق معیار نبوت پر پورا اترتے ہیں تو ایمان لے آتے ہیں۔ بلکہ اغلب یہ ہے کہ آپؓ اپنے تجربہ اور فراست کی بنا پر دیکھتے ہی ان کو پہچان چکے ہونگے۔اور اب مزید اطمینان کے لیے یہ تحقیق کرنا چاہا پھر جب ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے مزید قرب کی توفیق دے دی۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت اور خصوصی تعلق تھا۔آپ ﷺ ہی نے یہودیوں سے انہیں آزاد کرایا جس کا اجمالی تذکرہ حدیث میں موجود ہے۔حضرت علیؓ فرماتے تھے کہ **سلمان منا اھل البیت** کہ سلمان ہمارے گھر کا فرد ہے اور سلمان نے بھی دنیا کو یہ سبق دیا کہ قوم و وطن، جغرافیہ اور علاقائی و لسانی عصبیتیں کچھ بھی اسلام میں نہیں۔کوئی پوچھتا کون ہے؟ فرماتے سلمان۔پوچھا جاتا کہ کہاں کے ہو، کس قبیلہ کے ہو؟ تو فرماتے سلمان بن الاسلام بن الاسلام بن الاسلام فارس و اصفہان کو بھلا دیا۔حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ **علمہ علم الاول والاخر وھو بحر لا ینزف**۔آپ کو اولین کا علم حاصل تھا یعنی یہودیت و عیسائیت وغیرہ پر تو عبور تھا تمام علوم منحصر تھے آخر میں

نبی کریم ﷺ کا علم بھی حاصل ہوا۔طویل عمر کے باوجود آپ نے ہمیشہ زہد وقناعت کا دامن تھامے رکھا۔

مائدۃ اور چنے گئے اشیاء: مـائـدۃ مادیمید حرکت کے معنی میں ہیں اللہ تعالیٰ زمین کے بارے میں فرماتے ہیں ان تمید بکم. ای لئلا تمیدبکم ۔یعنی زمین میں ہم نے بڑے بڑے پہاڑ اس لیے پیدا کئے کہ یہ ہلنے سے محفوظ رہے۔اور چونکہ دسترخوان پر بھی سارے لوگ حرکت کرتے ہیں۔ہاتھ چلتے رہتے ہیں، برتن بھی حرکت میں ہوتے ہیں۔یہ لووہ لو کا شور ہوتا ہے۔خود دسترخوان اور جو کچھ اس پر ہوتا ہے سب متحرک ہوتے ہیں اس لئے دسترخوان کو بھی مائدہ کہا جاتا ہے(۱)۔

اس طرح ماد کا ایک اور معنی میں بھی مستعمل ہے کہتے ہیں مـادہ ای اعطاہ اور چونکہ دسترخوان بھی اپنی ساری چیزیں لوگوں کو پیش کر کے دیتا ہے اسلئے اسے مائدہ کہا گیا ہے۔

علیھا رطب: پکے ہوئے تازہ کھجور کو رطب کہتے ہیں۔خشک کھجور کو تمر کہتے ہیں کچا جو پکنے کے قریب ہوا سے بُسر کہتے ہیں اگر پختگی سر کی طرف سے ظاہر ہو چکی ہو اور دم کی طرف تھوڑا سا کچا پن باقی ہو تو اسے رطب مذنب کہتے ہیں اور اگر پختگی دم کی جانب سے ظاہر ہو اور کھجور کے سر کی جانب تھوڑا سا کچا پن باقی ہو تو اسے بسر مذنب کہتے ہیں۔طبرانی کی ایک اور روایت میں تمر کا لفظ بھی آیا ہے۔اب اشکال یہ ہے کہ ان روایات میں بظاہر تعارض ہے جس کی توجیہہ ضروری ہے تو اس کے دو جواب ہیں کہ یا تو یہ مختلف مواقع کے لحاظ سے ہے۔صحابی نے کبھی رطب، کبھی تمر اور کبھی ثرید پیش کیا ہوگا اور طعام سب کو کہا جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ واضح جواب یہ ہے کہ خوانچہ تو بڑی چیز ہے دسترخوان پر تو روٹی، سالن، چٹنی، پیاز اور پلاؤ پھل وغیرہ سب چیزیں ہو سکتی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ دسترخوان مذکورہ تمام انواع پر مشتمل ہو لیکن صحابہ میں سے کسی نے تمر کا

---

(۱) مگر ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے والـمشهـور عـنـد اربـاب الـلغة أنّ المائدة خوان عليه عام فاذالم يكن عليه طعام فلايسمٰى مائدة فعلى هذاقوله عليها رطب لتعيين ماعليهامن الطعام(جمع الوسائل ۱/۷۹)

اسی لئے علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے وقـد تـطـلق المائدة ويرادبهاماعليه من الطعام وان لم يكن خوانااه. لیکن وقـد يطلق على الطعام نفسه او انائه اه(شرح الشمائل لشيخ مناوی علی هامش جـمع ج ۱ ص ۷۹)كمافي القران الكريم وانزل علينا مائدة من السماء(الاية) اسلئے مائدۃ کا اطلاق ان سب پر ممکن ہے(مختار)

ذکر کیا ہو کسی نے رطب کا کسی نے ثرید کا کسی نے طعام کا۔ جبکہ حقیقت میں تمام چیزیں دسترخوان پر موجود تھیں۔

علم الغیب اور نبی کریم ﷺ: یاسلمان ماھذا خطاب کا صیغہ مستعمل ہے، بریلوی حضرات اس سے علم غیب کے ثبوت پر استدلال کرتے ہیں یوں کہ دیکھو اگر نبی کریم ﷺ کو علم غیب نہ تھا تو سلمانؓ کا نام آپ کو کیسے معلوم ہو گیا لیکن اس جہالت کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہاں علم غیب کا اثبات تو درکنار اس کی نفی ہوتی ہے اور وہ یوں کہ خود نبی کریم ﷺ پوچھتے ہیں کہ ماھذا؟ یہ کیا ہے؟ استفسار تو اس چیز کے بارے میں ہوتا ہے جو معلوم نہ ہو۔ اگر معلوم ہوتا تو وہ کیوں پوچھتے؟ اور اگر وہ کہتے ہیں کہ پھر نبی کریم ﷺ کو نام کیسے معلوم ہوا؟ تو اس کا واضح جواب یہ ہے کہ پہلی ملاقات کے وقت ضروری تو نہیں کہ نام بھی نہ سنا ہو اس وقت مجلس ہی میں صحابہ نے بتا دیا ہوگا کہ یہ نو وارد سلمان ہیں یا مجلس سے قبل غائبانہ تعارف ہو چکا ہوگا کہ اتنی لمبی عمر اور ایسی رنگت کا سلمان نامی ایک فارسی شخص بھی مدینہ میں رہتا ہے اسکے علاوہ اور بھی کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے علم کے مثلاً حضرت جبرئیلؑ نے بتایا ہوگا کہ یہ آنے والا سلمان ہے وہ باتیں تو راوی نہیں کرتا، راوی تو صرف واقعہ بیان کرتا ہے تو اس سے علم غیب کیونکر ثابت ہوگا۔ جبکہ ماھذا اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی چیز کی ماہیت یا کیفیت کے بارہ میں پوچھا جائے۔ لہٰذا یہ صراحت عدم علم پر دلالت کرتا ہے۔ بہر حال یہ عجیب علم غیب ہے کہ ساتھ جو چیز رکھی ہے وہ تو معلوم نہیں اور جب حضرت سلمانؓ کی دلجوئی، خاطر داری اور تالیف قلب کیلئے نبی کریم ﷺ نے نام لیکر پکارا۔ کیونکہ نام سے پکارنا بے تکلفی اور محبت پر دلالت کرتا ہے اور محبوب کے اس شفقت بھرے خطاب سے ان کی تکالیف اور طویل اسفار کی ساری تھکاوٹ کافور ہو گئی۔

صدقہ اور ہدیہ میں فرق: صدقة علیک: صدقة اور ھدیة میں تین وجوہ سے فرق ہے۔ ایک یہ کہ صدقہ جس کو دیا جائے وہ اس مال کا مالک ہو جاتا ہے۔ رجوع کر کے مال کو واپس نہیں کیا جا سکتا جبکہ ہدیہ میں امام ابو حنیفہؒ کے ایک قول کے مطابق رجوع جائز ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ صدقہ میں ترحم اور شفقت باعث بنتا ہے جس کو دیا جائے اس کے عجز و مسکنت کا اعتبار اور اس پر ترس ہوتا ہے جبکہ ہدیہ

میں ترحم وغیرہ نہیں ہوتا ہدیہ تو بادشاہوں، نوابوں، امیروں، غریبوں اور مسکینوں سب کو پیش کیا جاتا ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ صدقہ میں مصدق علیہ کی ایک گونہ تحقیر اور اہانت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم طبقہ اگرچہ اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے ہاں معزز اور مشرف ہوتا ہے لیکن محض خیرات خوری کی نظر سے لوگ انہیں دیکھتے ہیں تو ان کے رویئے سے حقارت ٹپکتی نظر آتی ہے جو چیز خراب اور باسی ہو جاتی ہے کہہ دیتے ہیں کہ طالب علموں کو دیدو۔ جبکہ ہدیہ کا مقصد ہی مھدیٰ لـہ کی تعظیم ہوتا ہے۔ ہدیہ دینے والا عزت واکرام اور عظمت کی نظر سے دیکھ کر ہی ہدیہ دیتا ہے۔

حضرت سلمان فارسیؓ صدقہ پیش کر کے آزمائش کرتے ہیں کہ صدقہ نہ لیا پھر تو پیغمبر برحق ہیں ورنہ نہیں۔

یہاں پر یہ اشکال پیش آتا ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ تو اس وقت غلام تھے جو کسی چیز کے مالک نہیں بن سکتے تو اس کا صدقہ صدقہ کیسے بنے گا۔ لیکن اس کا جواب آسان ہے وہ یہ کہ اس وقت غلاموں کے احکام میں یہ حکم موجود نہ تھا بلکہ یہ حکم اسلام میں نازل ہوا کہ غلام کا سب کچھ آقا کا ہوتا ہے لیکن یہ شبہ پھر بھی ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کا ہدیہ کیوں قبول کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت سلمانؓ کی غلامی دراصل شرعی غلامی نہ تھی بلکہ غیر شرعی طور پر اسے بیگار میں پکڑا گیا تھا۔ جنگ میں کہیں ان کو نہیں پکڑا تھا بلکہ محض ظالمانہ تسلط وتغلب کے ذریعے یہود کے قبضہ میں تھے اسلئے وہ اپنی کمائی کے خود مالک تھے۔ اس کا صدقہ اور ہدیہ دونوں درست تھے۔

فقال ارفعها یعنی اٹھالو یہ ہمارے کام کا نہیں اور ایک روایت میں ادفعھا بھی آیا ہے پھر مطلب یہ ہے کہ مجھ سے اٹھا کر میرے ساتھیوں کو دے دو جو صدقہ کے مستحق ہیں۔ مثلاً اصحاب صفہ غربت کے سبب اکثر فاقہ کشی کیا کرتے تھے۔ ان تکالیف اور مشقتوں کی برکت ہی تھی کہ ان کو علم کی بے پناہ دولت ملی۔ ان کو بھی طالب علموں کی طرح صدقات ملتے تھے لیکن ان صدقات کے ساتھ مشقت نہایت ضروری ہے۔

<u>حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ اور صدقات سے معاملہ:</u> والد ماجد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ قدس سرہ اپنی صحت کے زمانہ میں ابتدائے سال اور انتہائے سال میں تقریر وہدایات کے علاوہ عصر کی نماز پڑھانے کے بعد دس پندرہ منٹ تقریر فرماتے۔ جس میں بہت بڑا سبق اور کام کی باتیں

ہوتی تھیں آج ان ارشادات سے ہم محروم ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلبہ میں اخلاقی پستی سرایت کررہی ہے۔ اخلاقی تربیت، خلوص وللّٰہیت اور علم میں فنائیت کی باتیں سننے کی بناء پر پرانے فضلاء بڑے خوبیوں کے حامل ہوتے تھے۔

بہرحال مولاناؒ بعض اوقات یہ بتاتے کہ جو ہم کھاتے ہیں اوساخ الناس ہیں۔ زکوۃ اور خیرات گندہ میل کچیل ہے بلکہ سود، حرام، سمگلنگ، ملاوٹیں ہر گندی کمائی خیرات کی شکل میں بھی ہمارے ہاں آتی ہے۔ لیکن ان کو ہضم کرنا پھر بھی کارے دارد۔ اسلئے جس طرح سخت غذا کو ہضم کرنے کیلئے کھیل، دوڑ، مشقت ومحنت کرنی پڑتی ہے۔ سخت چیزیں کھائے اور محنت نہ کرے تو آدمی بیمار ہوکر ختم ہوجاتا ہے۔ آپ فرماتے کہ ان اموال میں باطنی سختی ہوتی ہے ان کو ہضم کرنے کا واحد راستہ طالب علم کیلئے سخت محنت ہے۔ تعلیم وتعلم درس وتدریس مطالعہ اور عمل کر کے محنت کی جائے تو یہ اوساخ الناس آدمی کو راست آئیں گے۔ ورنہ آدمی کو بیمار کر کے قریب الموت کردیتے ہیں۔ بہرحال نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ صدقہ کے مستحق ہیں ان کو دے دو۔ علامہ حافظ عراقیؒ فرماتے ہیں کہ **ادفعھا** کے نسخے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے کہا **کلوا وامسک** یعنی تم کھاؤ خود نہیں کھایا۔

حضور ﷺ کا صدقات سے احتراز: **أنـا لا نـأكـل الخ** جمع کا صیغہ لانے کیلئے تین توجیہات کی جاتی ہیں کہ یا تو تعظیماً اپنے آپ کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ یا پھر دوسرے انبیاء کو بھی اپنے ساتھ شامل کیا۔ یعنی **نحن معاشر الأنبیاء لانأكل الصدقة** یعنی ہم انبیاء کا طبقہ صدقہ نہیں کھاتے کیونکہ یہ تو **أوساخ الناس** ہیں اور ہم **أوساخ الناس** سے محفوظ ہیں یا پھر **أنا** سے مراد **أنا وأهل بيتي** یعنی میں اور میرا خاندان لینگے کیونکہ جو حکم اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کا تھا وہی بنو ہاشم کا بھی تھا۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ میں اور میرا خاندان صدقہ کا مال نہیں کھاتے (۱)۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلمانؓ کا یہ صدقہ نفلی صدقہ تھا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نہ

---

(۱) بنو ہاشم اور صدقات: یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ سادات اور بنو ہاشم کیلئے زکوۃ یا صدقات واجبہ کھانا جائز ہے یا نہیں۔ تو اکثریت کی رائے یہ ہے کہ سادات اور بنو ہاشم کیلئے کسی بھی صورت میں زکوۃ یا دیگر صدقات واجبہ جائز نہیں علامہ ابن قدامہؒ نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے فرماتے ہیں **لانعلم خلافاً فی أنّ بنی هاشم** (بقیہ اگلے صفحہ پر)

نفلی صدقہ کھاتے تھے نہ واجبی۔ اوراس کا سبب یہی ہے کہ صدقہ میں مصدق علیہ کے فقرو عجز اور مصدق کی نسبت حقارت کا پہلو ہوتا ہے۔ نیز اس طرح کسی تہمت سے بھی آپ بچ جاتے ہیں۔ کیونکہ اکثر و بیشتر یوں ہوتا ہے کہ مکاراور جعلی پیراور دھوکہ باز رہنما قسم کے لوگ کچھ مدت فاقہ مستیاں کرتے ہیں۔ پھر خود اسے اور اس کی اولاد کو سونے چاندی میں کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کا سد باب کیا تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ اولاد کیلئے شکرانوں اور نذرانوں کا راستہ کھول دیا ہے بلکہ نبی کریم ﷺ نے بتادیا کہ میرا ہر کام خالصتاً اللہ ہی کیلئے ہے۔ اعلان فرمایا کہ **ان اجری الا علی اللّٰہ** میرا اجر اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔

قال فرفعها اور دوسری روایات کے مطابق **فدفعها** ہوگا یہ بریدہ بن حصیب کا قول ہے۔

فجاء الغد بمثله، موقع شناسی اوراستادو شیوخ کی مزاج شناسی بہت بڑی خوبی ہے۔ حضرت سلمانؓ دوسرا تجربہ کر کے اپنے یقین کی تکمیل کرتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) **لاتحلّ لهم الصدقة المفروضة(المغنی ۲/ ۵۱۹)** اور علامہ عینیؒ نے لکھا ہے **وفی الایضاح الصدقات الواجبات کلّها علیهم لاتجوز باجماع الائمة الأربعة(البنایة شرح الهداية ۴/ ۲۰۳)** مگر جب رسول اللہ ﷺ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے اور اس کے بعد بنو ہاشم کا مال غنیمت میں حصہ خمس ختم ہوا تو بعض فقہاء کرام نے اس صورت میں جواز کا فتویٰ دے دیا۔ جس میں مذاہب اربعہ کے جلیل القدر فقہاء ومحدثین شامل ہیں خود امام ابوحنیفہؒ سے بھی جواز کا قول مروی ہے **وعن الامام انه یجوز لبنی هاشم فی زمانه لأنّ لهم فی عوضها خمس الخمس ولم یصل الیهم (مجمع الانهر ۱/ ۲۲۳)** اور اسی کو امام محمدؒ نے ترجیح دی ہے **فی الاثار للمحمّدعن الامام روایتان قال محمّدوبالجواز ناخذ لأنّ الحرمة مخصوصة بزمانه علیه الصلوة والسلام(فقه الزکوة ۲/ ۷۳۲)** اور امام طحاویؒ نے بھی اس کو راجح کہا ہے **وفی شرح الاثار عن ابی حنیفةؒ لابأس بالصدقات کلّها علی بنی هاشم والحرمة للعوض وهو خمس الخمس فلمّاسقط ذلک بموته ﷺ حلّت لهم الصدقة قال الطحاوی وبه نأخذ(البنایة شرح الهدایة ۴/ ۲۰۳)** اور اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے متاخرین اہل علم میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبدالغفور مدنیؒ، مولانا محمد معصومؒ، مولانا عبدالقدیرؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ، مولانا قاضی عبدالکریم مدظلہ، محدث کبیر مولانا مفتی محمد فرید مدظلہ، مولانا سیف اللہ رحمانی، علامہ وھبہ زحیلی مدظلہ، ڈاکٹر یوسف قرضاوی مدظلہ وغیرہ اکابر علماء امت نے فی زماننا خمس الخمس نہ ہونے اور بعض دوسرے حالات کی وجہ سے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ تفصیل کیلئے احقر کا رسالہ ''سادات اور بنو ہاشم کو زکوٰۃ کی شرعی حیثیت'' مطالعہ کیا جائے (مختار)

اشراف نفس اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا استغناء: سید الطائفہ حکیم الامت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا واقعہ ہے کہ اپنے طالب علموں اور مریدوں کے ساتھ بیٹھے تھے، خوب بھوکے تھے، اتنے میں ایک شخص اٹھ کر چلا گیا اور کھانے سے بھرا خوانچہ لایا۔ ساتھی بہت خوش ہوئے کہ کچھ کھانے کو مل گیا لیکن حاجی صاحب نے کہہ دیا کہ اٹھاؤ لیجاؤ ہم یہ نہیں کھائیں گے۔ اسلئے کہ ہم بھوکے تھے۔ تم نے محسوس کیا، تمہارے جانے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ تم کچھ لاؤ گے۔ چنانچہ ہمیں انتظار اور اشرافِ نفس پیدا ہو گیا۔ لہٰذا یہ ہمارے لئے جائز نہیں اسے لیجاؤ۔ وہ مرید خوانچہ لے کر نکلے اور غائب ہو گئے۔ پھر دوسرے دروازہ سے اچانک داخل ہو گئے اور خوانچہ رکھ کر کہا کہ لیجئے کھائیں۔ جب میں واپس گیا تو آپ کا طمع منقطع ہو گیا تھا۔ اب آپ کا تمہیں یقین تھا کہ میں کچھ نہیں لاؤں گا۔ لہٰذا اشراف نفس بھی ختم ہو گیا حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ واقعی اس شخص نے ہمیں شکست دی۔

فقال ما هذا ماہیت سے نہیں بلکہ کیفیت سے استفسار ہے کہ یہ طعام کس حیثیت سے لائے ہو۔ صدقہ ہے کہ تحفہ یا ہدیہ ہے۔ سلمانؓ نے فرمایا کہ **هدية لک** یہ تیرے لئے تحفہ اور ہدیہ ہے۔ صدقہ میں ترحم اور ہدیہ میں اکرام کا فرق **لام** اور **علی** سے بھی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ **علی** ترحم کیلئے ہوتا ہے اور **لام** میں اکرام ہوتا ہے تو معنی یہ ہوا کہ **اکراما لک** یعنی آپ کی تعظیم کیلئے یہ ہدیہ پیش کیا ہے(۱) اس سے قبل حضرت سلمانؓ نے **صدقة عليک وعلی اصحابک** کہا تھا لیکن چونکہ ہدیہ صرف **مهدی له** کا اکرام مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے اس مقام پر **هدية لک** و **لأصحابک** کی بجائے **لک** پر اکتفاء کیا۔

بسط اور نشاط: **فقال لا صحابه ابسطو** یہ صیغہ **بسط يبسط** سے ہے جس کے متعدد معانی ہیں **بسط** کے معنی ہاتھ بڑھانے کے ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ ہاتھ بڑھاؤ اور کھاؤ۔ نیز بسط کا معنی پھیلانے کے بھی آتے ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ مجلس میں کھانا پھیلاؤ تا کہ سارے حاضرین کھا سکیں۔ علاوہ ازیں بسط پھیل

---

(۱) صدقہ اور ہدیۃ میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ صدقۃ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف آتا ہے۔ اس لئے کہ مالدار اور صاحب ثروت لوگ فقراء و مساکین کو کچھ مال دیتے ہیں اور اس سے اللہ کی رضا اور اس کا تقرب مقصود ہوتا ہے جبکہ ہدیۃ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف جاتا ہے۔ اس میں بزرگوں کی خوشحالی اور خوشنودی کی غرض پائی جاتی ہے اور تقرب الی اللہ بھی ہوتا ہے مگر اس سے اصل دوسرے کا اعزاز مقصود ہوتا ہے (مختار)

جانے کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔تو مطلب یہ ہوگا کہ پھیل جاؤ تا کہ کھانا درمیان میں رکھا جاسکے۔یا تا کہ سلمانؓ کے بیٹھنے کے لیے جگہ بن سکے۔بعض لوگوں نے بسط کو انبساط کے معنی میں لیا ہے جس کے معنی کشادہ روئی ہیں۔پھر ترجمہ یہ ہوگا کہ کشادہ رو ہو جاؤ۔اور سلمانؓ سے دل لگی کی باتیں کرو۔کیونکہ وہ بھی تمہاری جماعت کا بننے والا ہے۔اور ایک روایت میں انشطوا آیا ہے جو نشاط سے ہے سرور کا معنی ہیں۔صحابہؓ اکثر اوقات میں بھوکے رہتے تھے۔پیٹ پر پتھر باندھے ہوتے تھے۔خصوصاً نبی کریم ﷺ کے اہل مجلس اصحاب صفہ جن کا ذریعہ معاش کچھ نہ تھا۔نبی کریم ﷺ نے اسی وجہ سے فرمایا کہ کھانے کی چیز ملی ہے خوش ہو جاؤ۔

<u>ہدیہ میں دوسروں کو شریک کرنا:</u> تمام صحابہ کرامؓ کو شریک فرما کر نبی کریم ﷺ نے اس بات کی تعلیم بھی دی ہے کہ اگر کسی کے پاس کوئی ہدیہ یا تحفہ وغیرہ آئے تو سارے کا سارا گھر نہ لے جائے بلکہ شاگردوں، دوستوں، اور ہم نشینوں کو بھی اس میں شریک کرلے۔رسول اللہ ﷺ کے مکارم اخلاق یہی ہیں۔اگرچہ فقہی اعتبار سے ہم مجلس لوگوں اور دوستوں کا حق تو نہیں ہے لیکن اخلاقی اقدار کی بات اور ہے۔صوفی اور فقیہ کے مسلک الگ الگ ہیں۔ایک بزرگ کے ساتھ مرید بیٹھے ہوئے تھے کسی نے ہدیہ پیش کیا۔مریدوں میں سے کسی نے کہا کہ **الھدایا مشترکۃ** تو انہوں نے سارا ہدیہ مریدوں کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا **أنا لا أحبّ الشرک** کہ ہم موحد ہیں۔شرک پسند نہیں کرتے۔دوسری طرف امام ابو یوسفؒ فقیہ ہیں۔ایک دفعہ شاگردوں کے ساتھ بیٹھے تھے کسی نے ہدیہ پیش کیا۔حاضرین میں سے کسی نے کہا **الھدایا مشترکۃ** آپ نے سختی سے منع کیا تا کہ یہ کہیں فقہی قانون نہ بن جائے(۱)۔بہرحال یہ فقہی مسئلہ

---

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے **ومن اللطائف ان الامام ابایوسف اتی بھدیۃ من النقود فقیل لہ الھدایا مشترکۃ فقال اللام للعھدای الھدایا من الرطب والزبیب وامثالھما(جمع الوسائل ۱/۸۳)** اور علامہ بدرالدین العینیؒ نے لکھا ہے **أنّ الرشید أھدیٰ إلیہ مالاً کثیراً وھو جالس مع أصحابہ فقیل لہ قال رسول اللّٰہ ﷺ جلساؤکم شرکاؤکم فقال أبو یوسف أنّہ لم یرد فی مثلہ وانّما ورد فیما خفّ من الھدایا من المأکل والمشرب ویروی من غیر ھذا الوجہ أنّہ کان جالساً وعندہ أحمد بن حنبل ویحییٰ بن معین فحضر من عند الرّشید طبق وعلیہ أنواع من التحف المثمنۃ(عمدۃ القاری ۱۳/۲۳۳)(مختار)**

نہیں بلکہ اخلاق حسنہ کی بات ہے۔عرب کا مقولہ ہے حدیث بھی نہیں ہے(۱)۔

سلمانؓ کا خاتم کا مشاہدہ: ثم نظر الی الخاتم علی ظهر رسول اللّٰهﷺ شروح حدیث میں ہے کہ ثم کے کلمہ سے تراخی کا فائدہ مقصود ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ تیسری علامت نبوت کا ظہور اسی موقع پر نہیں ہوا۔ بلکہ اسے دیکھنے کیلئے آپ نے انتظار کیا۔ کچھ عرصہ بعد نبی کریم ﷺ ایک انصاری کے جنازے میں شرکت کیلئے بقیع غرقد گئے۔ حضرت سلمانؓ بھی حاضر ہوگئے اور نبی کریم ﷺ کی پیٹھ کی جانب بیٹھ گئے۔ نبی کریم ﷺ کو آپؓ کے ارادہ کا احساس ہوگیا۔ چنانچہ پیٹھ سے چادر ہٹا دی۔ آپؓ نے تیسری علامت کا مشاہدہ کیا اور اسی موقع پر ایمان لئے آئے۔

اس جملہ سے حدیث کی ترجمۃ الباب سے مطابقت بھی واضح ہوگئی۔وکان للیهود یعنی ایمان لاتے وقت آپ بعض یہودیوں کی ملکیت میں تھے جنہوں نے بنی کلب سے آپ کو خرید لیا تھا۔

حضرت سلمانؓ کی آزادی کیلئے شرائط: فاشتراه اشتراء سے حقیقی خریدنا مقصود نہیں کیونکہ حضرت سلمانؓ غلام ہی نہ تھے بلکہ کتابت مراد ہے یا یہ کہ فدیہ دے کر آزاد کرانا مراد ہے۔

بکذا و کذا درهما دراہم کی مقدار دوسرے مقامات میں مفصل مذکور ہے۔بعض روایات میں چالیس اوقیہ سونا ذکر ہے۔ایک اوقیہ ساڑھے دس تولہ ہوتا ہے۔اس حساب سے چالیس اوقیہ چار سو بیس تولے سونے کے برابر بنتا ہے۔

---

(۱)حدیث پاک میں اس قسم کے الفاظ تو نہیں البتہ ایسے الفاظ کتب احادیث میں مرفوعاً وموقوفاً دونوں طرح مروی ہیں جن سے یہی معنی مفہوم ہوتا ہے چنانچہ علامہ بدرالدین عینیؒ نے لکھا ہے أن جلساء ه شركاء ه روى هذاعن ابن عباس مرفوعاًوموقوفاً والموقوف أصح اسناداً من المرفوع أماالمرفوع فرواه البيهقي من حديث محمد بن الصلت حدثنا مندل بن علي عن ابن جريج عن عمروبن دينارعن ابن عباس قال رسول اللّٰهﷺ من أهديت له هدية وعنده ناس فهم شركاؤه فيهاومندل بن علي ضعيف ورواه عبدالرزاق أيضا عن محمّدابن مسلم عن عمروعن ابن عباس مرفوعاً نحوه وعنده قوم واختلف على عبدالرزاق عنه في وقفه ورفعه والمشهورعنه الوقف وهوأصح الروايتين عنه وله شاهدمرفوع من حديث الحسن بن علي في مسند إسحاق بن راهوية وآخرعن عائشة عندالعقيلي واسنادهماضعيف أيضاً(عمدة القارى ۱۳/۲۳۳)(مختار)

سلمانؓ کی آزادی یہود کی ساہوکاری: یہود نے بہت اونچے دام بتائے کیونکہ ان کی خواہش یہی تھی کہ سلمان ہماری خدمت کرتا رہے۔اس میں زیادہ نفع ہے یہود بھی آخر بنیا قوم ہے کسی کو یک روپیہ دیتے ہیں تو دس نچوڑ لیتے ہیں۔اس وقت بھی یہود کے ساہوکاری نظام نے سارے عالم کو شکنجہ میں کس دیا ہے۔امریکہ میں یہ ظالم قوم بہت تھوڑی ہے لیکن ان کی معاشی گرفت کی وجہ سے امریکہ بے بس اور مجبور ہے تمام اقتصادیات، معاشیات اور بنکوں پر یہود کا قبضہ ہے۔ یہاں بھی وہ اپنے بنیا پن کا پورا مظاہرہ کررہے ہیں۔ قیمت کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ سلمان یہود کیلئے تین سو کھجور کا درخت لگائے گا اور تب تک وہ آزاد نہیں ہوسکتا جب تک ان درختوں میں پھل نہ آئے، کھجور کا درخت بویا جاتا ہے تو بونے والے کے پوتوں کو کہیں اس کا پھل کھانے کو ملتا ہے۔تیسری نسل میں جا کر یہ ثمر آور ہوتا ہے۔یہود کب سلمانؓ کی طرح دیانتداری، متقی اور مخلص غلام سے دستبردار ہونے پر راضی تھے۔وہ تو ہمیشہ کیلئے اسے شکنجہ میں رکھ کر اس کا خون چوسنا چاہتے تھے۔اسلئے قیمت کے ساتھ یہ غیر معقول شرط بھی لگائی کہ وہ مذکورہ تعداد میں کھجور بوئے گا۔اور تب تک ان کی آبیاری، گوڈی وغیرہ اس کے ذمے ہوگی جب تک یہ بار آور نہ ہوں اور سلمانؓ کب اس پر قادر تھے۔یہ تو نبی کریم ﷺ کا معجزہ تھا جو ظاہر ہونے والا تھا چنانچہ نبی کریم ﷺ نے سودا قبول کرلیا۔

یغرس: غرس نرسری کو کہتے ہیں یعنی پودے لگانا، حدیث مبارک میں ہے کہ **لایزال اللّٰہ یغرس لھذا الدین غرساً یستعملھم فی طاعتہ**(۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں اس دین کیلئے نئے نئے لوگ تیار کرائے گا جنہیں وہ اپنی اطاعت میں مصروف رکھے گا۔

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کو سلمانؓ سے تعاون کا حکم دیا۔چنانچہ انہوں نے تین سو پودے جمع کئے اور نبی کریم ﷺ نے خود جا کر پودے لگائے۔آپ ﷺ کا لگایا ہوا باغ، آپ ﷺ کی نسبت کی وجہ سے آج تک مدینہ میں مشہور ہے۔حجاج کرام وہاں زیارت کے لیے جاتے ہیں۔مسجد نبوی ﷺ سے سات اٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔کچھ عرصہ پہلے ہم بھی گئے تھے اس وقت بھی بعض کھجوریں اس میں باقی تھیں۔

---

(۱) ابن ماجہ ص ۲

لوگ اس کا پھل محبت سے خریدتے تھے آج کل وہ باغات وغیرہ آبادیوں میں تبدیل ہورہے ہیں۔شہر وسیع ہورہا ہے حتیٰ کہ جبل احد بھی اس میں آرہا ہے۔شاید کچھ مدت بعد جبل احد کا صرف نام ہی رہ جائے۔

إلاّنخلة واحدة ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ کو کہہ دیا ہو کہ کھجور میں خود لگاؤں گا لیکن شاید انہوں نے یہ سوچا ہو کہ نبی کریم ﷺ کو تکلیف ہوگی۔ان کا کچھ تو ہاتھ بٹانا چاہیے۔بہرحال ایک پوداان میں حضرت عمرؓ نے اپنے ہاتھ سے بویا۔

من عامها یہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ تھا کہ کھجور کے درخت صرف ایک سال میں پھل لے آئے لیکن جب ایک درخت پھل نہ لایا تو نبی کریم ﷺ نے پوچھا **ماشان هذا النخلة** اس کھجور کو کیا ہوگیا ہے۔حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تو میں نے بویا تھا۔نبی کریم ﷺ نے اسی وقت یا کسی دوسرے وقت اسے نکال کر دوبارہ بودیا اور وہ بھی پھل لے آیا۔یہ شرط تو پوری ہوگئی۔اور مقررہ قیمت اس طرح ادا ہوئی۔کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ سونا لے آیا جو مطلوبہ مقدار سے کم تھا۔نبی کریم ﷺ نے حضرت سلمانؓ سے کہہ دیا جاؤ۔اس مالک کے پاس لیجاؤ اس نے کہا یہ تو کم ہے آپ ﷺ نے پھر فرمایا کہ تم لے جاؤ وہ لے گیا اور تول کر دیکھا تو پورا چالیس اوقیہ نکلا۔اور حضرت سلمانؓ سونا دے کر آزاد ہوگئے۔

(۷) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا بشر بن الوضّاح أ نا أبو عقيل الدروقيّ عن أبى نضرة العوفيّ قال سألت أبا سعيد الخدريّ عن خاتم رسول الله ﷺ يعنى خاتم النبوة فقال كان فى ظهره بضعة ناشزة(١).

ترجمہ: ابونضرۃ عوفی کہتے ہیں کہ میں نے ابوسعید خدریؓ سے نبی کریم ﷺ کی مہر نبوت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ کی پشت مبارک پر گوشت کا ابھرا ہوا ٹکڑا تھا۔

ابوسعید خدریؓ کا مقام اور فضیلت: **ابـاسعيد خدرى الخ** آپ کا نام سعد بن مالک بن سنانؓ ہے۔خدرہ بنوخزرج کی ایک شاخ ہے جس کی طرف آپؓ منسوب ہیں۔آپؓ کے والد حضرت مالکؓ بھی

(۱)مسند احمد ۳/۶۹ من طریق غیاث الکبریٰ عن ابی سعید (مختار)

انصاری صحابی ہیں۔احد کے بعد کے غزوات میں شریک رہے ۶۴ھ کو چوراسی سال کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

بضعة ناشزة یہ کان کا خبر ہے جس کا اسم ضمیر خاتم نبوۃ کی طرف راجع ہے۔جبکہ فی ظهره پہلی خبر ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ فی ظهره خبر ہو اور بضعة ناشزة حال ہو۔بعض روایات میں بضعة ناشزة مرفوع بھی مروی ہے۔اس طرح یہ کان کا اسم اور فی ظهره خبر ہوگا اور یہ احتمال بھی ہے کہ کان تامه ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو۔بہرحال اس حدیث میں خاتم نبوت کی کیفیت اور مقام کا ذکر ہے(۱)۔

(۸) حدّثنا أبو الأشعث أحمد بن المقدام العجليّ البصريّ أنا حمّاد بن زيد عن عاصم الأحول عن عبدالله بن سرجس قال أتيت رسول اللهﷺ و هو فی ناس من أصحابه فدرت هكذا من خلفه فعرف الذی أريد فالقى الرداء عن ظهره فرأيت موضع الخاتم على كتفيه مثل الجمع حولها خيلان كانّها ثآليل فرجعت حتى استقبلته، فقلت غفرالله لک يا رسول الله فقال ولک فقال القوم استغفرلک رسول اللهﷺ فقال نعم ولكم ثمّ تلاهذا الاية واستغفر لذنبک وللمؤمنين والمؤمنات (الاية)(۲)

---

(۱) یہ بات تو مسلم ہے کہ مہر نبوت آنحضرتﷺ کے دونوں شانوں کے مابین تھی مگر یہ بات اختلافی ہے کہ اس پر کچھ لکھا ہوا تھا یا نہیں؟ تو مستند روایات میں اس کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی۔البتہ بعض روایات میں کچھ لکھا ہونے کا ذکر ملتا ہے اس لئے ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے کہ اس مہر نبوت پر محمد،رسول،اللہ لکھا ہوا تھا اور بعض کا کہنا ہے کہ اس پر یاسربانک المنصور لکھا ہوا تھا۔دلائل النبوۃ میں ہے کہ حاکم نے تاریخ نیشاپوری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ اس پر گوشت سے محمد،رسول،اللہ لکھا ہوا تھا۔اور محدث ابونعیم نے حضرت سلمانؓ سے نقل کیا ہے اس کے اندرونی حصے پر الله وحده لاشريک له محمّدرسول الله اور اوپر کے حصہ پر توجه حيث شئت فانّک المنصور لکھا ہوا تھا۔(آفتاب نبوت کی کرنیں ص ۱۳۹)(مختار)

(۲)صحيح مسلم ۲/ ۲۵۹ كتاب الفضائل باب فی اثبات خاتم النبوة الخ ،مسنداحمد ۵/ ۸۲(مختار)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سرجس کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نبی کریم ﷺ اس وقت صحابہؓ کی ایک جماعت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اس طرح آپ کی پشت کی جانب چکر لگایا۔ نبی کریم ﷺ میرا منشاء سمجھ گئے اور پشت مبارک سے چادر اتار دی۔ میں نے آپ ﷺ کے کندھوں کے درمیان مہر نبوت کی جگہ کو مٹھی کے ہم شکل دیکھا۔ جس کے ارد گرد تل تھے جو مسوں کے برابر دکھائی دیتے تھے۔ پھر میں واپس ہو کر نبی کریم ﷺ کے سامنے آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا، اور اللہ تیری مغفرت بھی فرمائے۔ لوگوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے تیرے لیے دعا مغفرت فرمائی۔ میں نے کہا۔ ہاں اور تم سب کے لیے بھی دعا کی۔ پھر حضرت عبداللہ نے یا نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ''اے رسول تم مغفرت کی دعا کرو۔ اپنے لئے بھی اور مؤمن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی''۔

عبداللہ بن سرجسؓ: سرجس نرگس کی طرح جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے یہ مزنی (بنو مزن) صحابی ہیں۔ بنو مخزوم کی طرف بھی آپ کی نسبت ہوتی ہے۔ جو غالباً ان کا حلیف ہونے کی وجہ سے ہے۔ بصرہ میں رہا کرتے تھے۔ اس لئے بصری صحابہؓ میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

فدرت ھکذا من خلفه دارید ورد ودوران سے ہے اور **ھکذا** میں اس کیفیت کو بیان کرتے ہیں جس کیفیت سے راوی چکر لگا کر آئے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ راوی حضرت عبداللہ ابن سرجس یہ حدیث مسجد نبوی ﷺ میں بیان کرتے ہوئے اس مکان کو اشارہ کر چکے ہوں۔ جہاں پر چکر کاٹ کر وہ نبی کریم ﷺ کی پشت مبارک تک پہنچے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ میں پیچھے سے آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے میرے تجسس کو محسوس کیا کہ میں خاتم نبوت دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ سامنے جگہ ہو اور پھر بھی کوئی قصداً پیچھے بیٹھے تو یہ تو یا ادباً ہوتا ہے یا پھر کوئی خاص مقصد ہوتا ہے۔ **علی کتفیه** یعنی مہر کندھوں پر نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ **مثل الجمع** اس روایت میں مہر کی مقدار اور کمیت بہت زیادہ بتائی گئی ہے۔ کیونکہ مکّا بڑا ہوتا

ہے لیکن در حقیقت یہ تحدید نہیں بلکہ تخمینی اور تقریبی اندازے ہیں۔ یا پھر مقصد یہ ہے کہ اس مہر کی بناوٹ اور کیفیت مکّے کی طرح تھی(۱)۔ **حولها خیلان** یعنی اس کے اردگرد تل بھی تھے۔ **خیلان** خال کی جمع ہے۔ پچھلے زمانہ میں ان کا رواج تھا سوئی چبھو چبھو کر جلد کے کسی حصہ کو زخمی کیا جاتا ہے پھر اس میں رنگ بھر دیا جاتا ہے۔ زخم ٹھیک ہو جانے پر نیلے اور سیاہ نشان بن جاتے ہیں ان نشانات کو خیلان کہا جاتا ہے۔ لیکن مہر نبوت کے اردگرد جو خال نما نشانات تھے وہ مصنوعی نہ تھے بلکہ قدرتی تھے۔ **ثآلیل** یہ ثولول کی جمع ہے کبھی کبھی بدن کے بعض حصوں پر چھوٹے چھوٹے دانوں کی طرح چیزیں نکل آتی ہیں جو دائمی ہوتی ہیں، اسے ثولول کہتے ہیں۔ اردو میں اسے مسا یا پھنسی کہا جاتا ہے۔ اس حدیث میں جو کیفیت مہر نبوت کی بیان ہوئی ہے وہ بھی دوسری روایتوں سے قدرے مختلف ہے جو کہ یا تو زمانہ کی تبدیلیوں کا اثر ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ **کل شبه بما سنح له فی رایه تخمینا لا تحدیداً** یعنی جس کسی نے مہر نبوت دیکھی تو اسے جیسے نظر آیا بیان کر دیا۔ ان کا یہ قول تحدید نہ تھا بلکہ تخمین اور اندازے سے جو رائے قائم کی تھی وہی بیان کر دی ہے۔

نبی کریم ﷺ کے لیے دعائے مغفرت کیوں: **فقلت غفر اللّٰہ لک:** خوشی، جذبات اور اظہار محبت میں دعا کی کہ اللہ تعالیٰ تیری مغفرت فرمائے۔ اپنے شیخ اور استاذ وغیرہ کو عموماً ایسے مواقع پر اس قسم کے الفاظ کہے جاتے ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کا یہ محض احسان تھا کہ جو مہر نبوت بڑی بڑی کتابوں میں مذکور تھی آپ ﷺ نے علامت کی زیارت کا موقع دیا تو اس احسان کا شکریہ ادا کرنے کیلئے صحابی دعا کرتے ہیں۔ ورنہ نبی کریم ﷺ تو بخشے بخشائے ہیں۔ **لیغفر لک اللّٰہ ما تقدم من ذنبک وما تاخّر ویتمّ نعمته علیک**(فتح۔ ۲)

''تاکہ اللہ تعالیٰ تیرے اگلے اور پچھلے سب گناہ معاف کر دے اور تم پر اپنی نعمت پوری فرمائے''

آیات اور نصوص اس پر ناطق ہیں کہ نبی کریم ﷺ معصوم اور مغفور ہیں۔ تو یہ دعا نبی کریم ﷺ کو بخشوانے

---

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے قال **حماد جمع الکف وجمع حماد کفه وضم اصابعه**(جمع الوسائل ۱/۸۸) اب سوال یہ ہے کہ یہ تشبیہ کس لئے ہے۔ تو بعض کا کہنا ہے کہ یہ تشبیہ بیان ہیئت کیلئے ہے اور بعض نے فرمایا ہے کہ یہ تشبیہ بیان مقدار کیلئے ہے۔ ملا علی قاریؒ نے زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ **ویحتمل ان یکون تشبیهًا به فی المقدار وان یکون تشبیهاً فی الهیئة المجموعة وهو أنسب**(جمع الوسائل ۱/۸۸)(مختار)

کے لئے نہیں بلکہ تشکر وامتنان کا اظہار ہے(۱)۔اور جس طرح کہ ہم درود وسلام بھیجتے ہیں تو نبی کریم ﷺ کے درجات بلند ہوتے جاتے ہیں۔اسی طرح ان دعاؤں سے آپ ﷺ کے درجات بلند ہوتے جاتے ہیں۔نیز دعا کرنے والے کو اس کا اجر ملتا ہے جس طرح کہ صلوٰۃ وسلام کے اثرات واپس درود بھیجنے والے کو آتے ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک شخص لاکھوں ووٹ لے کر بظاہر منتخب ہو چکا ہے اس کے بعد کوئی اسے ووٹ دے یا نہ دے اس کی کامیابی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔لیکن بایں ہمہ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ میرا ووٹ بھی اس کے ووٹوں میں شامل ہو اور اس کی حمایت کی سعادت مجھے بھی حاصل ہو جائے۔اسی طرح اگر اس شخص کے ووٹ دس لاکھ کی بجائے گیارہ لاکھ ہو جائیں تو اس کی وقعت ومقبولیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔تو نبی کریم ﷺ پر روزانہ کروڑوں لوگ جو درود بھیجتے رہتے ہیں اس سے آپ ﷺ کے درجات بلند ہوتے ہیں اور آپ ﷺ کو جو دعائیں دی جاتی ہیں وہ بھی رفع درجات کا سبب بنتی ہیں۔

عصمتِ انبیاء: انبیاء تو معصوم ہیں اور اگرچہ ان کے بعض اعمال کو ذنوب کا نام دیا جاتا ہے لیکن وہ بھی حقیقتاً گناہ نہیں بلکہ محض مجازی طور پر ترک اولیٰ کو ذنب کہا گیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نہایت قرب کی وجہ سے انبیاء کے لئے ترک اولیٰ بھی عیب سمجھا جاتا ہے۔ **حسنات الابرار سیئات المقربین**

مقرب جتنا قریب ہوتا ہے اتنی ہی اس کی ذمہ داری بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

نزدیک کے لوگوں کی معمولی نافرمانی شاق گزرتی ہے اور اگر کوئی سرکش ونافرمان ہے تو اس کی نافرمانی پر اتنا دکھ نہیں ہوتا۔اللہ تعالیٰ کے مقرب ترین بندے چونکہ انبیاء ہیں۔لہٰذا ان سے خلاف اولیٰ کام

(۱) بعض نے یہ کہا ہے کہ نبی سے کبھی کبھار خلاف اولیٰ کام اور اجتہادی خطاء ہو جاتی ہے تو اس پر استغفار کرنے کو کہا گیا ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ نبی کا استغفار کرنا امت کی تعلیم کیلئے ہوتا ہے کہ جب نبی معصوم ہے تو وہ استغفار کرتے ہیں تو امت تو خطاؤں کا پتلا ہے تو اس کا زیادہ حق ہے کہ وہ اللہ کے دربار میں اپنے گناہوں کی معافی مانگے۔اور بعضوں کا کہنا ہے کہ نبی طاعت اور نیکیوں پر استغفار کرتے تھے کہ جو اللہ تعالیٰ کا حق اطاعت ہے اور نیکی کا وہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان ادا نہ ہو سکا۔(مختار)

یا زلۃ ولغزش سرزد ہوتو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر ذنب کا اطلاق ہوتا ہے۔لیکن اس ذلت میں دوام نہیں ہوتا، لغزش کا معنی یہی ہے کہ آدمی جب گرنے لگتا ہے تو فوراً اپنے نفس کی جانب سے اس کی تنبیہ ہوتی ہے اور اس حالت پر استقرار نہیں رہتا۔جسم کا اعصابی نظام نہایت تیز ہے معمولی بے قاعدگی پر ہزاروں اعصاب بیدار ہو جاتے ہیں اور بجلی کی کرنٹ کی طرح جسم کا ہر حصہ چوکنا ہو جاتا ہے۔مثلاً اگر کہیں جلد کے کسی حصے میں سوئی چبھ جائے تو دماغ فوراً دفاعی اقدام کا بندوبست کرتا ہے۔ٹھوکر کھاتے ہی آدمی فوراً سنبھلنے کا بندوبست کرتا ہے۔اسی طرح نبی کا خلاف اولیٰ کام بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہوتی ہے تو توبہ کا حکم اور فوراً ہی بخشش کا اعلان بھی ہوتا ہے۔

یہ تشریح اس احتمال پر ہے کہ جملہ دعائیہ ہو۔اور یہ بھی محتمل ہے کہ یہ جملہ خبریہ ہو۔اور معنی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی بخشش فرما چکے ہیں۔جس طرح نصوص اس پر شاہد ہیں۔لیکن پہلا احتمال راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعد کا کلام ''ولک'' یقیناً دعائیہ کلمہ ہے جو کہ راوی کے لیے نبی کریم ﷺ نے ادا فرمایا ہے۔

<u>نبی کریم ﷺ کی دعائے استغفار کرنے پر صحابہ کو رشک:</u> **فقال ولک** یہ خوش قسمت صحابی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے جن کے لئے مغفرت کی دعا نکلتی ہے۔اس نے بھی نبی کریم ﷺ کو دعا دی تھی۔اور نبی کریم ﷺ نے احسان کا بدلہ احسان سے دیا۔ **هل جزاء الاحسان الا الاحسان** بلکہ نبی کریم ﷺ نے بہتر بدلہ دیا۔کیونکہ نبی کریم ﷺ کی دعا سے بڑی نعمت کوئی نہیں۔

گویا نبی کریم ﷺ نے دعا کا جواب دے کر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو بھی ملحوظ رکھا۔

واذا حييّتم بتحيّة فحيّوا بأحسن منها اوردّوها (نساء ۵۷)

فقال القوم : نبی کریم ﷺ کی معمولی توجہ اور عنایت بڑی سعادت ہے اس لئے سب لوگوں نے حضرت عبداللہ بن سرجس ؓ کو مبارکباد دیں۔کہ تم خوش قسمت ہو کہ پیغمبر ﷺ نے آپ کے حق میں استغفار کیا۔یا معنی یہ ہے کہ بعد میں حضرت عبداللہ ؓ جن لوگوں کو یہ واقعہ بیان کر رہے تھے انہوں نے یہ سوال کیا تو آپ نے فرمایا **نعم ولكم** صحابی نے جواب میں کہا کہ ہاں میرے لئے تو دعا ہوئی لیکن مایوس نہ ہونا تمہارے لیے مغفرت کی دعا کی ہے۔بلکہ ہر وقت کرتے رہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فاعلم انه لاالٰہ الااللّٰہ و استغفر لذنبک وللمؤمنین والمومنات(محمد ۱۹)

ترجمہ: پس جان لو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کر اور مومن مردوں اور عورتوں کے لئے بخشش طلب کر۔

ایک اور مقام پر فرمایا کہ **فاعف عنهم و استغفر لهم و شاورهم فی الامر(آل عمران ۵۹)**

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ **و استغفر لهم اللّٰه أنّ اللّٰه غفور رحيم(نور ۶۲)**

ترجمہ: اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت مغفرت اور رحم کرنے والا ہے۔

نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھ مومنین اور مومنات کے لئے بھی دعا مانگیں اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر ہے تو آپ ﷺ ضرور اس پر عمل بھی کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ **شانہ ان یستغفر لی ولکم** نبی کریم ﷺ کا مقام یہی ہے کہ وہ میرے لئے اور تمہارے لئے دعا کریں گے۔ وہ اس سعادت سے کسی کو محروم نہیں کرتے۔

<u>معراج میں مکالمہ کا کلمات تشہد میں اعادۃ:</u> تمام امت کے لئے آپ ﷺ کی غم خواری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ معراج کے موقع پر جب دربار رب العزت میں پیش ہوئے نہایت جامع انداز میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی فرمایا: **التحیات للّٰه والصلوات والطیبات**

تمام لسانی بدنی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔

اللہ نے جواب دیا **السلام علیک و رحمة اللّٰه و برکاته**

یعنی اے پیغمبر اللہ تعالیٰ کی سلامتی رحمت اور برکتیں تجھ پر ہوں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے خطاب خاص یعنی **علیک** کا صیغہ لایا لیکن آپ کی شان کریم نے یہ برداشت نہ کیا کہ اس سعادت سے دوسرے بندے محروم رہیں۔ لہٰذا فرمایا کہ

السلام علینا وعلی عباداللّٰه الصالحین

مجھ پر اور اللہ تعالیٰ کے تمام نیک بندوں پر سلامتی ہو۔

عباداللّٰہ الصالحین میں دوسرے انبیاء کرام اور فرشتے بھی داخل ہوجاتے ہیں چنانچہ جب انہوں نے آپ ﷺ کی یہ رحمت وشفقت دیکھی تو وہ سب یک زبان ہوکر بولے،

اشھد أنّ لا الہ الاّاللّٰہ و اشھد أنّ محمّداً عبدہ و رسولہ

سب نے اعتراف کیا کہ عبدیت و رسالت کے اہل اور اس منصب جلیلہ اور فضیلت کے لائق شخصیت نبی کریم ﷺ کی ہے۔ یہ یادگار مکالمہ تشہد کے طور پر محفوظ ہوکر جزونماز بن گیا اور قیامت تک دھرایا جائے گا۔

بہرحال صحابی کا مقصد یہاں بھی یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی امت کو دعائے مغفرت سے محروم نہیں کرتے۔

ثمّ تلا ھذہ الایۃ یعنی جب صحابی نے **نعم ولکم** کہہ کر حاضرین کے لئے نبی کریم ﷺ کے استغفار کا دعویٰ کیا تو استشہاد کے لئے یہ آیت پیش کردی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود اس آیت کو پیش کر کے صحابی کے اس دعوے کی تصدیق کردی ہو۔ واللہ اعلم

۳: باب ماجآء فی شعر رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے بالوں کا بیان

شَــعَــر اور شَــعَــرٌ (۱) یعنی سکون عین فتح عین دونوں درست ہیں اس کا واحد شعرۃ آتا ہے۔ گزشتہ ابواب میں نبی کریم ﷺ کے بالوں کے بارے میں ضمناً کافی بحث ہو چکی ہے اب اس سلسلے میں امام ترمذیؒ مستقل باب لا رہے ہیں۔اس باب میں دراصل بالوں کی مقدار، کثرت وطول کا بیان مقصود ہے ۔علامہ ابن عربیؒ نے بال بڑھانے کو سنت اور منڈھانے کو بدعت کہا ہے(۲) لیکن جمہور کے نزدیک سر کے بال منڈھوانا بھی جائز ہے۔جس طرح کہ صحابہ سے منقول ہے۔اس باب میں آٹھ احادیث کا ذکر ہے۔

(۱) حدّثنا علیّ بن حجر انا إسماعیل بن إبراھیم عن حمید عن أنس بن مالک قال کان شعر رسول اللّٰہ ﷺ إلیٰ نصف اذنیه(۳).

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بال مبارک کانوں کے نصف تک تھے۔

<u>بالوں کی مقدار میں اختلاف:</u> **الی نصف اذنیه** اس حدیث میں کانوں کی نصف تک کا ذکر ہے۔بعض دوسری روایات میں ’’**شحمة اذنیه**‘‘ یعنی کانوں کی لوتک ،بعض میں وفرہ اور جمہ کے درمیان اور بعض میں جمہ کی تصریح ہے۔ پہلے مرحلہ پر وفرۃ دوسرے میں لمۃ اور تیسرے میں جمہ کہلاتے ہیں اور اس کی ترتیب لفظ ولج کے مطابق ہے۔ بظاہر ان احادیث میں تعارض معلوم ہو رہا ہے لیکن ان میں تطبیق ممکن

---

(۱) **شعر بفتح الشین** جس کی جمع **شعرات** آتی ہے جس کا معنی ہے بال اور بکسر الشین سمجھ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی سے شاعر ہے اسلئے کہ شاعر میں عام لوگوں کے مقابل احساس زیادہ ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے **وما یشعرون** کہ ان میں شعور نہیں (مختار)

(۲)قال ابن العربی والشعر فی الرأس زینة وترکه سنة وحلقه بدعة وحالة مذمومة جعلها المصطفیٰ شعار الخوارج ففی الصحیح عن أبی سعید أنّ النّبیّ ﷺ ذکر قوماً یکونون فی امته یخرجون فی فرقة سیماها التحقیق(شرح الشمائل للمناوی علی هامش جمع الوسائل ج ۱ ص ۹۰)(مختار)

(۳)صحیح مسلم ۲/۲۵۸ باب صفة شعر النبی ﷺ کتاب الفضائل وسنن ابی داؤد ۲/۲۲۰ کتاب الترجل باب ماجاء فی الشعر(مختار)

ہے۔اس طرح کہ نبی کریم ﷺ نے زندگی میں کئی بار سر منڈھوایا ہے۔مثلاً صلح حدیبیہ، عمرة القضاء، اور حجۃ الوداع میں تو آپ ﷺ سے حلق ثابت ہے۔بخاریؒ اور مسلمؒ کی روایات کے مطابق صرف ایک دفعہ آپ ﷺ سے قصر بھی ثابت ہے۔پھر آپ ﷺ احرام سے نکلتے وقت حلق کو پسند بھی فرماتے تھے۔اسی لئے سر منڈھانے والوں کو آپ ﷺ نے دعا فرمائی۔

رحم اللّٰہ المحلقین (۱) اللہ تعالیٰ بال مونڈھنے والوں پر رحم فرمائے۔

لہٰذا قاضی عیاضؒ اور امام نوویؒ وغیرہ محققین کی رائے کے مطابق یہ اختلاف دراصل اختلاف زمانہ پر مبنی ہے۔اور"**کلّ روی حسب رویتہٖ**"یعنی ہر راوی نے روایت اپنے مشاہدہ کے مطابق کی ہے۔جس نے جس حالت میں نبی کریم ﷺ کی بالوں کو دیکھا اسی مقدار میں بیان کیا۔مثلاً **حلق الراس** کے کچھ مدت کے بعد بال کانوں تک بڑھے۔کسی نے دیکھ کر اس حالت کی روایت کی۔پھر کچھ مدت بعد کانوں کے درمیان تک بڑھے۔تو بعض صحابہ نے اس کو دیکھا اور اس کو روایت کیا۔اسی طرح بعد میں بال بڑھتے رہے۔تو کسی نے بالوں کو کانوں کی لووٴں تک بڑھنے کا مشاہدہ کیا۔کسی نے لمہ کو دیکھا اور کسی کو جمہ نظر آیا(۲)۔اور جو دیکھا وہی بیان کیا۔لہٰذا درحقیقت یہاں کوئی تعارض نہیں۔بلکہ آپ ﷺ کے بال ان تمام کیفیات سے گزر چکے ہیں(۳)۔

---

(۱)**جامع ترمذی ۱ / ابواب الحج. باب ماجاء فی الحلق والتقصیر ۱۱۱**۔

(۲)اور ملا علی قاریؒ نے قاضی عیاض کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ کے سر کے اگلے حصے کے بال نصف کان تک پہنچتے تھے اور وسط سر کے بال اس سے نیچے اور آخر حصے کے بال اس کے نیچے پہنچ جاتے تھے(آفتاب نبوت کی کرنیں ص۱۴۴)(مختار)

(۳)مگر کندھوں سے بال بڑھانا منع ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خریمؓ کے بارے میں فرمایا کہ خریم کیا ہی اچھا آدمی ہے کاش اس کے بال لمبے اور ازار نہ لٹکتے جب حضرت خریمؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے بالوں کو کاٹ کر کان کی لو تک کرلیا اور ازار کو نصف پنڈلیوں تک کرلیا(ابن سعد بحوالہ آفتاب نبوت کی کرنیں ص۱۵۲)اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا معمول تھا کہ وہ جمعہ کے دن محافظین کو مساجد کے دروازوں پر متعین کیا کرتے تھے کہ وہ لوگوں کے لمبے لمبے بال کاٹ دیں **عن اسامة قال کان عمر بن عبدالعزیز اذاکان یوم الجمعة بعث الأحراس فیاخذون بابواب المسجد ولایجدون رجلاً موفر الشعر یعنی مبذر الشعر إلاجزوا ه(مصنف ابن ابی شیبة ٦ / ٦٠)(مختار)**

(۲) حدثنا هنّاد بن السریّ انا عبدالرحمٰن بن أبی الزناد عن هشام بن عروة عن ابیه عن عائشة رضی اللّٰه عنها قالت كنت اغتسل انا ورسول اللّٰه ﷺ من انآءٍ واحدٍ و كان له شعر فوق الجمة و دون الوفرة(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں اور نبی کریم ﷺ ایک ہی برتن میں سے غسل کیا کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ کے بال جمہ سے اوپر اور وفرہ سے کم تھے۔

حضرت عائشہؓ: أمّ المومنین حضرت عائشة صدیقة بنت ابی بکرؓ الصدیق کی والدہ کا نام ام رومان تھا۔ ۴ نبوی کو مکہ میں ولادت ہوئی۔ اور ہجرت سے تین سال قبل شوال ۱۰ نبوی کو نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ اور نو سال کی عمر میں شوال ۱ھ کو نبی کریم ﷺ کے گھر منتقل ہوگئیں۔ نبی کریم ﷺ کے پاس نو سال تک رہیں۔ آپؓ کے سوا کوئی کنواری عورت نبی کریم ﷺ کے نکاح میں نہیں آئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و فضل، تفقہ اور فراست سے نوازا تھا۔ عرب کے بہت سے واقعات اور اشعار بھی یاد تھے۔ مغلق مسائل میں فقہاء صحابہ کرام عموماً آپؓ سے رجوع فرماتے تھے(۲)۔ نبی کریم ﷺ کو آپ سے بہت محبت تھی۔ اور آپ ﷺ پیار سے حمیرا کے نام سے آپ کو یاد فرماتے۔ اور دوسری بیویوں پر آپؓ کی فضیلت کا کئی بار ذکر کیا تھا۔ واقعہ افک میں اللہ تعالیٰ نے خود آپؓ کی برآءت کا اعلان فرمایا۔ اور اسطرح آپ کی پاکدامنی کا تذکرہ قیامت تک جاری رہے گا۔ آپؓ کے مناقب کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ صحابہؓ اور تابعینؒ نے آپ سے ۲۲۱۰ احادیث روایت کی ہیں(۳)۔ مدینہ طیبہ میں سترہ رمضان المبارک ۵۷ھ کو وفات پائی بعض روایات میں ۵۶ھ اور بعض میں ۵۸ھ کا ذکر ہے۔ حضرت ابوھریرہؓ نے نماز جناہ پڑھائی اور آپ کی وصیت کے مطابق رات کے وقت جنت البقیع میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۳۰۳ کتاب اللباس باب ماجاء فی الجمة واتخاذالشعر وابوداود ۲/۲۲۰ کتاب الترجل باب ماجاء فی الشعر(مختار)

(۲)كان فقهاء اصحاب رسول اللّٰه ﷺ یرجعون إلیها(تذکرة الحفاظ ۱/۲۷)(مختار)

(۳)اور صرف بخاری شریف میں آپؓ سے ۲۴۲ احادیث مروی ہیں۔(مختار)

ان کی سوانح کے لئے مؤرخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی کی تصنیف سیرۃ عائشہ کا مطالعہ بہت مفید رہے گا(۱)۔

ایک برتن سے غسل: قالت کنت اغتسل أنا و رسول اللہ ﷺ من اناء واحد ام المومنین حضرت عائشہؓ کا مقصد اس جملہ سے دراصل قرب کا اظہار ہے(۲) اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ میں قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ کے بالوں کی کیفیت بیان کرنے والی ہوں۔

اس زمانہ میں یہ غسل خانہ، ٹب، سبیل اور نلکے وغیرہ نہیں تھے بلکہ آج کل بھی بعض پسماندہ علاقوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی حالت ہے۔ایک بڑا برتن پانی سے بھر دیا جاتا ہے۔اسی سے وضو، غسل اور دھونے دھلانے کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔چنانچہ نبی کریم ﷺ نے بھی ایک برتن سے حضرت عائشہؓ کے ساتھ غسل کیا۔

ضرورت اور حیا کی پاسداری: منکرین حدیث اگرچہ خود تو بے حیائی کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن حدیث میں جب کوئی معمولی سی بے تکلفی کی بات دیکھتے ہیں۔زبانیں کھول دیتے ہیں کہتے ہیں کہ اس قسم کی بے حیائی نبی کریم ﷺ کی شان کے منافی ہے۔لہٰذا ایسی احادیث قابل قبول نہیں۔حالانکہ مذکورہ اور اس قسم کی احادیث میں عیب کی کوئی بات نہیں۔خاوند اور بیوی میں کیا پردہ ہوتا ہے؟ ان کے لیے ایک جگہ کھانا، پینا، سونا، نہانا کوئی عیب نہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ھن لباس لکم وانتم لباس لھن (بیویاں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کیلئے لباس ہو) ایک ہی برتن سے دونوں کا نہانا اجماعاً جائز ہے۔اگر ایک ہی کپڑے میں برہنہ ہو کر سونا جائز ہے تو ایک جگہ نہانے کی اجازت کیوں نہیں۔مزید یہ کہ نبی کریم ﷺ نے کمال حیا کی جو مثالیں قائم کی ہیں اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔حتیٰ کہ خود حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ما رأیت من رسول اللہ ولا رأیٰ منی. یعنی کمال اختلاط کے باوجود کبھی بھی ہم میں

---

(۱) حضرت عروہ بن زبیرؓ نے کہا ہے ما رأیتُ احداً من النّاس أعلم بالقرآن ولا بفرضية ولا بحلال وحرام ولا بشعر ولا بحديث العرب ولا انسب من عائشةؓ (تذكرة الحفاظ ۱/۲۸)(مختار)

(۲) اسلئے ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے افادت الحكاية الماضية بصيغة المضارع استحضاراً للصورة المتقدمة واشارة الى تكراره واستمراره اى اغتسلتُ مكرراً (جمع الوسائل ۱/۹۱)(مختار)

سے کسی نے دوسرے کی شرمگاہ نہیں دیکھی۔حالانکہ میاں بیوی کیلئے ان امور سے بچنا مشکل ہوتا ہے۔لہٰذا آپکی عادت شریفہ کوملحوظ رکھ کر یہ کہنا قرین قیاس ہے کہ یہاں بھی دونوں کوئی کپڑا باندھ کر نہار ہے ہونگے یا پھر دونوں کے درمیان پردہ حائل ہوگا۔آجکل بھی یہ رواج ہے کہ جہاں غسل خانہ میسر نہیں تو غسل کی فوری ضرورت پورا کرنے کیلئے کوئی کپڑا وغیرہ لگا کر پردہ بنایا جاتا ہے۔اوراگر چہ برہنہ حالت میں بھی میاں بیوی کیلئے اکٹھے نہانا کوئی شرعی عیب نہیں۔لیکن مجسمۂ حیاء نبی کریم ﷺ کی ذات ہے جوکہ عزیمت اوراستحباب کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔یہ بعید ہے بہرحال اکٹھا نہانے کے باوجود بے پردگی کا احتمال نہیں ہے۔

اکٹھےاور یکے بعد دیگرے نہانے کا حکم: فقہی لحاظ سے بھی دونوں میاں بیوی کا اکٹھے نہانا بالاجماع جائز ہے۔ہاں تقدیم وتاخیر کی صورت فقہاء کے نزدیک محل بحث ہے۔امام ابوحنیفہؒ کے ہاں بیوی پہلے نہائے اور خاوند بعد میں یہ بھی جائز ہے(۱)۔اور بیوی بعد میں نہائے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ ہاں کسی غیرمحرم عورت کے تنہا نہانے کے بعد اس کے باقی ماندہ پانی سے احتیاطاً احتراز کرے۔جبکہ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک یہ صورت جائز نہیں۔کیونکہ اس طرح غلط خیالات کا احتمال پیدا ہوتا ہے اور عورت سے بچے ہوئے پانی سے نہانے کی صورت میں خیالات وتصورات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے جوکہ خطرناک ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسی عورت پر جوخوشبو لگا کر گھر سے نکلی ہو زانیہ کا حکم لگایا ہے(۲)۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ اس عورت کے پیچھے شیطان لگا ہوا ہوتا ہے۔**استشرفها الشیطان (الحدیث)** بہرحال سد ذرائع معصیت کیلئے اس قسم کا احتیاط فقہاء سے منقول ہے کہ مرد کسی غیرعورت کے باقی ماندہ پانی سے غسل نہ کرے۔

جمہ اوروفرہ کا معنیٰ: **فوق الجمة و دون الوفرة** نبی کریم ﷺ کے بالوں میں تین قسم کی روایات منقول ہیں۔بعض میں وفرہ بعض میں لمہ اور بعض میں جمہ کا ذکر ہے۔مذکورہ الفاظ کے بارے میں

---

(۱)امام مالک اورامام شافعیؒ بھی امام صاحب کے ساتھ ہیں اوراس صورت کوجائز سمجھتے ہیں(حقائق السنن ۱/۲۷۱)مختار

(۲)**عن أبیٰ موسیٰ الأشعری ایّما إمرأة استعطرت فمرت علی قوم لیجدوا من ریحها فهی زانیة.**

(سنن نسائی ۲/۲۸۶ کتاب الزینة باب ما یکره للنساء من الطیب)(مختار)

جمہور اہل لغت کا قول یہ ہے کہ وفرہ وہ بال ہیں جو کانوں کی لوؤں تک پہونچیں۔ اس سے کچھ نیچے ہوں تو اسے لمہ کہتے ہیں اور کندھوں تک بڑھ کر پہنچ جائیں تو جمۃ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کانوں سے بڑھے ہوئے بالوں کو جمہ اور کندھوں کو چھونے والے بالوں کو لمہ کہا ہے مگر صحیح قول جمہور اہل لغت کا ہے۔

اس حدیث میں ''فوق الجمّة و دون الوفرة'' کا ذکر ہے(۱) اس جملے کا ایک معنی تو یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کے بال جمہ سے اوپر یعنی اس سے لمبے اور وفرۃ سے کم یعنی چھوٹے تھے۔ مگر جمہ اور وفرہ کے مذکورہ معانی کو مدنظر رکھا جائے تو یہ تشریح درست معلوم نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس مقام پر مقدار میں فوقیت یعنی لمبا ہونا مراد نہیں۔ بلکہ ''فوق الجمّة'' سے مراد محل کے اعتبار سے فوقیت یعنی اونچا ہونا مراد ہے۔ جبکہ ''دون الوفرہ'' کا معنی انزل من الوفرة یعنی وفرہ سے لمبا ہونا مراد ہے اس طرح حضرت عائشہؓ کے اس جملے کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ آپ ﷺ کے بال جمہ سے اونچے یعنی چھوٹے تھے۔ اور وفرہ سے نیچے یعنی لمبے تھے۔ گویا اس وقت آپ ﷺ کے بال لمہ کی حالت میں تھے۔

ابوداؤد اور ابن ماجہ کی ایک روایت میں اس کی تصریح موجود ہے۔ چنانچہ وہاں الفاظ اس طرح

---

(۱) جبکہ ابوداؤد شریف میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کان شعر رسول اللّٰہ ﷺ فوق الوفرة دون الجمّة(سنن ابی داؤد ۲/ ۲۲۰ کتاب الترجل باب ماجاء فی الشعر) تو ان دونوں روایات میں بظاہر تعارض ہے اس تعارض کو حل کرنے کیلئے علامہ احمد عبدالجواد الدومیؒ لکھتے ہیں وھذه الروایة تخالف روایة ابی داؤد (فوق الوفرة دون الجمة) لعل الجمع بینهما ان تقول إنّ روایة ابی داؤدبالنسبة لکثرة الشعرو روایة الترمذی بالنسبة لوصول الشعر قال ابن حجرؒ وھوجمع جید (الاتحافات ص ۶۵)

اور ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ فوق اور دون دونوں کے معنی دونوں میں الگ الگ لے جائیں ابوداؤد کی روایت میں فوق کے معنی زائد اور دون کے معنی کم یعنی ناقص لئے جائیں۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ وفرہ سے زائد اور جمہ سے کم ان دونوں کے درمیانی درجہ تھا۔ یعنی لمہ اور ترمذی کی روایت میں فوق کے معنی اوپر لئے جائیں اور دون کے معنی اسفل لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کے بال جمہ سے ذرا اونچے اور وفرہ سے ذرا نیچے تھے۔ تو اس کا مصداق بھی لمہ ہے (الدرالمنضور شرح ابی داؤد ۶/۲۱۲) اس لئے کہ فوق اور دون اضداد میں سے ہیں تو گویا دونوں روایات کا معنی ہے کان شعره متوسطاً بین الجمّة و الوفرة (المواھب اللدنیة ۴۶)(مختار)

ہیں ''فوق الوفرة دون الجمّة'' جن کا معنی یہ ہے کہ وفرہ سے بڑھے ہوئے اور جمہ سے چھوٹے تھے۔

چنانچہ وہاں پر فوق الوفرة کا معنی اکبر من الوفرة اور دون الجمّة کا معنی اقل من الجمة ہوگا۔ پھر یہ مقدار بھی بعض احوال پر محمول ہوگی کیونکہ روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ کے بال کندھوں تک پہنچ جاتے تھے۔ یعنی بعض حالات میں بال کنگھی کرنے کی وجہ سے یا ویسے وقت گزر جانے کے سبب لمبے ہوکر کندھوں کو چھونے لگتے تھے۔

(۳) حدّثنا احمد بن منیع انا ابو قطن أناشعبة عن أبیٰ إسحاق عن البراء بن عازب قال کان رسول اللّٰہ ﷺ مربوعاً بعید ما بین المنکبین و کانت جمّته تضرب شحمة اذنیه (۱)

ترجمہ: حضرت براأء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ میانہ قد آدمی تھے۔ آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان وسعت تھی۔ آپ ﷺ کے بال کانوں تک ہوتے تھے۔

کانت جمّته تضرب شحمة اذنیه: جمۃ سے اگر وہ عرفی معنی مراد ہو جو پہلے گزر چکا ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کے جمہ کا بڑا حصہ کانوں تک پہنچتا تھا۔ اور کچھ بال کندھوں تک بڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ اور اگر صرف کانوں تک پہنچنا مراد ہو تو پھر جمہ اس مقام پر وفرۃ کے معنی میں مستعمل ہے۔ لہٰذا کوئی اشکال نہیں ہوگا جبکہ بعض لوگوں نے جمہ کو مطلق بالوں کے معنی میں بھی لیا ہے۔ پھر معنی یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کے بال کانوں کی لو تک پہنچتے تھے۔ پہلے باب میں اس کے بارے میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ حدیث کے بقیہ حصوں کی تشریح بھی پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

(۴) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا وهب بن جریر بن حازم ثنی أبی عن قتادة قال قلت لأنس کیف کان شعر رسول اللّٰہ ﷺ قال لم یکن

---

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۲۲۰ باب ماجاء فی الشعر کتاب الترجل، صحیح ابن حبان ۸/۶۸ باب صفته ﷺ و أخبان شرح السنة للبغوی ۱۳/۲۲۴ باب صفة النبی ﷺ (مختار)

بالجعد ولا بالسبط كان يبلغ شعره شحمة اذنيه (۱)

ترجمہ: حضرت قتادہؒ کہتے ہیں میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کے بال کیسے تھے۔ انہوں نے فرمایا نہ بالکل گھنگریالے تھے اور نہ بالکل ہموار۔ آپ ﷺ کے بال کانوں کی لوتک پہنچے تھے۔

اس حدیث کی تشریح بھی باب اول میں گزر چکی ہے۔

(۵) حدّثنا محمّد بن يحيىٰ بن أبى عمر المكى أنا سفيان ابن عيينة عن ابن أبى نجيح عن مجاهد (۲) **عن ام هانى بنت أبى طالب قالت قدم رسول اللّٰه ﷺ علينا بمكة قدمة وله اربع غدائر** (۳)

ترجمہ: حضرت ام ہانیؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کے بال مبارک چار حصوں میں گندھے ہوئے تھے۔

امّ هانیؓ: آپؓ کا نام فاختہ، عاتکہ یا ہند تھا۔ ابو طالب کی بیٹی اور نبی کریم ﷺ کی چچا زاد بہن تھیں فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئیں۔ مسجد حرام کے قریب ہی گھر تھا۔ نبی کریم ﷺ ان کا بڑا احترام کیا

---

(۱)ابو داؤد ۲/۲۲۰ باب فی الرجل یعقص شعرہ کتاب الترجل، سنن ابن ماجة ص۲۵۸ کتاب اللباس باب اتخاذ الجمّة والذوائب، مصنف ابن ابی شیبة ۵۸/۶ باب فی اتخاذالجمّة والشعر کتاب اللباس والزینة(مختار)

(۲)اس روایت کو حضرت مجاہدؒ بن جبر نے ام ہانیؓ سے روایت کیا ہے جب کہ امام بخاریؒ فرماتے ہیں لانعرف لمجاهد سماعاً من أمّ هانی البتہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فتح الباری باب الجعد میں فرماتے ہیں رجال هذاالحدیث ثقات واخرجه ابو داؤد ایضاًوقال فی موضع اخرجه ابو داؤ دو الترمذی بسندحسن. توملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اقول ولامنافاة اذاالعلة التی ذکرهاالبخاری انّماتمنع الصحة عنده(جمع الوسائل ۱/۹۵)(مختار)

(۳)ابوداؤد کے کتاب الترجل باب فی الرجل یضفر شعره رقم حدیث ۴۱۸۵ میں بھی روایت کچھ اضافی کلمات کے ساتھ مروی ہے عن مجاهد قال قالت أمّ هانیؓ قدم النبیّ ﷺ إلیٰ مکة وله اربع غدائرتعنی عقائص اھ. مگر علامہ ابی طیب محمد شمس الحق عظیم آبادیؒ نے تعنی عقائص کے اضافہ کے بارے میں لکھا ہے وهوتفسیر من بعض الرواة یہ حدیث مصنف ابن ابی شیبه ۵۷/۶ کتاب اللباس والزینة باب فی اتخاذالجمه والشعر میں بھی موجود ہے(مختار)

کرتے تھے۔فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ نے اعلان کیا تھا کہ ام ہانیؓ کے گھر میں پناہ لینے والوں کیلئے بھی امن ہے نبی کریم ﷺ نے انہیں نکاح کا پیغام بھی دیا تھا مگر انہوں نے معذرت ظاہر کردی(۱) کل چونسٹھ احادیث آپؓ سے روایت کی گئی ہیں۔حضرت معاویہؓ کی خلافت کے زمانہ میں وفات پائیں۔

قدم رسول اللّٰہ ﷺ الخ نبی کریم ﷺ ہجرت کے بعد چار بار مکہ آئے۔اول عمرۃ القضاء کے موقع پر۔دوم فتح مکہ کے موقع پر۔سوم عمرۃ الجعرانہ کیلئے۔اورآخری بار حجۃ الوداع کے موقع پر۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ کی یہ آمد عمرہ کی غرض سے تھی لیکن راجح خیال یہ ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو مسجد حرام آکر خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا۔اور جب حالات معمول پر آئے تو تھوڑی دیر ستانے کی نیت سے حرم کے قریب ام ہانیؓ کے گھر تشریف لے گئے۔وضو کر کے نماز پڑھی اور جو کچھ تیار تھا امّ ہانیؓ نے کھانے کو پیش کیا۔علامہ بیجوریؒ نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے کہ آپ ﷺ کی یہ آمد فتح مکہ کے موقع پر تھی۔

<u>غدائر اوراس کا حکم:</u> **لہ اربع غدائر غدائر** غدیرۃ کی جمع ہے۔اصل میں غدر ترک کو کہتے ہیں۔تالاب کو غدیر اس لئے کہتے ہیں کہ پانی اس میں چھوڑ کر جمع کیا جاتا ہے۔اس طرح اگر بال چھوڑ کر بڑھادیئے جائیں اور پھر اس سے منڈھیاں بنادی جائیں تو انہیں غدیرہ کہا جاتا ہے۔اسی طرح اسے ذوابۃ اور ضفیرۃ بھی کہتے ہیں۔

امرؤالقیس کا یہ شعر تم نے پڑھا ہے۔-------------------

غدائر ھا مستشزرات الی العلیٰ تضل العقاص فی مثّنیٰ و مرسل.

(۱)رسول اللہ ﷺ آپؓ ہی کے گھر سے معراج تشریف لے گئے تھے۔آپ ﷺ نے ان سے نکاح کرنے کا ارادہ بھی فرمایا تھا۔مگر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان خواتین سے نکاح کریں جو آپ کے ساتھ ہجرت کریں۔اور یہ آیت نازل ہوئی (ھاجرن معک) یعنی آپ ﷺ ان خواتین سے نکاح کریں جو آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی ہو۔چونکہ حضرت ام ہانیؓ نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی بلکہ مکہ معظمہ ہی میں رہی۔اس لئے آپ ﷺ سے نکاح نہیں فرمایا۔اور ہجرت کی نوبت حضرت ام ہانیؓ کو اس لئے نہیں آئی کیونکہ آپؓ نے اسلام ہی فتح مکہ کے بعد قبول کیا تھا(مختار)

عام حالات میں بالوں کا عورتوں کی طرح مینڈھیاں بنانا ناجائز ہے۔ کیونکہ اس میں تشبہ بالنساء آتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ سفر اور جہاد کی حالت ہے۔ اور سفر بھی مہینوں کا تھا۔ صفائی اور کنگھی کرنے کو فرصت نہیں ملتی تھی۔

لہٰذا گرد و غبار سے بچانے کے لیے بالوں سے مینڈھیاں بنانا ہوتی تھی۔ خصوصاً جہاد کے لئے تو بالوں کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ اور انتشار اور پریشانی سے بچانے کے لئے اضطراراً ان سے مینڈھیاں بنانی پڑھتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ نبی کریم ﷺ نے بالوں کو تقسیم کرکے چار مینڈھیاں بنائی تھیں (۱)۔ مگر یہ آنحضرت ﷺ کا معمول نہ تھا ایسا کرنا ضرورۃً تھا تاکہ سفر کی وجہ سے بال گرد و غبار سے بچ جائیں۔

(۶) حدثنا سوید بن نصر ثنا عبداللّٰہ بن المبارک عن معمر عن ثابت عن أنس أنّ شعر رسول اللّٰہ ﷺ کان الی انصاف اذینہ (۲).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بال مبارک نصف کانوں تک ہوتے تھے۔

أنصاف أذنیہ انصاف نصف کی جمع ہے اور اس سے **مافوق الواحد** مراد ہے یا عین نصف کے قریب قریب دیگر مقدار میں بھی ساتھ مراد ہیں۔ لہٰذا انصاف متحقق ہوجاتی ہیں۔

(۷) حدّثنا سوید بن نصر انا عبداللّٰہ بن المبارک عن یونس بن یزید عن الزھری أنا عبید اللّٰہ بن عبداللّٰہ بن عتبة بن عبداللّٰہ عن ابن عباسؓ أنّ رسول اللّٰہ ﷺ کان یسدل شعرہ و کان المشرکون تفرقون رؤوسھم و کان اھل الکتاب یسدلون رؤوسھم و کان یحبّ موافقة

---

(۱) مگر شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے فرمایا ہے کہ یہ لٹیں اس طرح نہیں تھیں جیسے عورتوں کی ہوتی ہیں۔ (خصائل نبوی ۳۴) کیونکہ خواتین کی طرح چوٹیاں بنانا مردوں کیلئے منع ہے۔ (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۲/۲۲۰ باب ماجاء فی الشعر کتاب الترجل، سنن النسائی ۲/۲۷۵ کتاب الزینة باب اتخاذ الشعر. (مختار)

اهل الکتاب فیما لم یؤ مرفیه بشئی ثم فرّق رسول اللّٰه ﷺ راسه(۱)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اولاً بالوں کو مانگ نکالے بغیر چھوڑ دیتے تھے۔جبکہ مشرکین مانگ نکالا کرتے تھے۔اور اہل کتاب نہیں نکالتے تھے۔اور نبی کریم ﷺ ان امور میں اہل کتاب کی موافقت پسند کیا کرتے تھے جن کے بارے میں آپ ﷺ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوتا تھا۔ پھر بعد میں نبی کریم ﷺ نے مانگ نکالنا شروع فرمایا۔

بالوں کے سدل اور فرق میں نبی کریم ﷺ کا رجحان: **کان یسدل شعره،سدل** کے معنی ہیں بالوں میں مانگ بنائے بغیر ان کو کھلا چھوڑ دینا۔ارسال کا بھی یہی مفہوم ہے۔اس کے برعکس کنگھی کر کے مانگ نکالنے کو فرق کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو طبعی لحاظ سے فرق پسند تھا۔لیکن چونکہ یہ عرب مشرکین کی تہذیب تھی۔اور آپ ﷺ کو ان کی اقتدا قطعا پسند نہ تھی۔لہٰذا آپ ﷺ اس سے کتراتے تھے تو فرق کو چھوڑ کر ارسال اختیار کیا۔کیونکہ اہل کتاب ایک دین سماوی، کتاب اور پیغمبر کا اقرار کرتے تھے۔چنانچہ مشرکین کی نسبت ان کی حالت مذہبی لحاظ سے بہتر تھی۔علاوہ ازیں فرق کی بجائے ارسال کو اختیار کرنے میں نبی کریم ﷺ کا مقصد یہود و نصاریٰ کی تالیف قلبی تھا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی تالیف قلب کیلئے آپ ﷺ کو نماز میں بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا تھا۔ بعد میں جب اسلام کو قوت وغلبہ حاصل ہوا اور اہل کتاب کی طرف سے بھی نہ تعاون کی توقع رہی نہ مقابلے کا خطرہ،تو تالیف قلب کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔اور آپ ﷺ پھر سے فرق کرنے لگے جس طرح آپ ﷺ کو بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا۔

تشبّہ بالغیر کا حکم: جو کام کفار کے شعائر یعنی امتیازی نشانیوں میں سے تھے اس میں تشبّہ جائز نہیں۔اسی طرح بعض امور ایسے بھی ہیں جن میں تشبّہ بالنساء بھی آتا ہے۔اصولی طور پر رسول اللہ ﷺ نے

---

(۱)مصنف ابن ابی شیبة ۵۸/۶ کتاب اللباس والزینة باب فی اتخاذالجمه والشعر ،صحیح بخاری ۷۷/۲ باب الفرق کتاب اللباس ، صحیح مسلم ۲۵۷/۲ کتاب الفضائل باب فی سدل النبیﷺ ، ابو داؤد ۲۲۰/۲ باب ماجاء فی الفرق کتاب الترجل.(مختار)

ہمیشہ تشبّہ بالکفار اور تشبّہ بالنساء سے منع فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان مردوں پر لعنت فرمائے جو عورتیں بننے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان عورتوں پر لعنت فرمائے جو مرد بننے کی کوشش کرتی ہیں (۱)۔

آج کل تو تہذیب اتنی گندی ہو رہی ہے کہ مرد اور عورت میں تمیز مشکل ہوگئی ہے۔ سامنے سے آنے والے مرد عورتوں کی طرح اور عورتیں مردوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ ایک ہی طرح کا لباس ایک ہی طرح کا وضع قطع ہے۔ مرد مخنث بنتے جا رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت شدہ مردانگی کی تمام علامات مردوں نے ہٹا دی ہیں۔

ثمّ فرّق رسول اللّٰہ الخ ۔اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرق یعنی مانگ بنانا شروع کیا کیونکہ مشرکین کے غلبہ کا خوف اور ان کی تہذیب وتمدن سے خطرہ نہ رہا۔ اس کے بعد اہل کتاب کی تہذیب سے ٹکر لینی تھی۔ جو مانگ نکالنے کی صورت میں آپ ﷺ نے پورا کیا۔ رہی یہ بات کہ فرق اور سدل دونوں میں سے کونسا راجح ہے؟ تو علماء نے اس کی تصریح کی ہے کہ دونوں جائز ہیں۔ لیکن فرق مستحب ہے (۲)۔ کیونکہ بعض روایات میں "**ثم امر بالفرق و کان الفرق آخر الامرین**" (۳) کے الفاظ مروی ہیں۔ جس سے کم از کم فرق کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض صحابہ آپ ﷺ کے زمانے کے بعد تک سدل بھی کیا کرتے تھے۔

---

(۱)جامع ترمذی ج۲ ابواب الادب باب ما جاء فی المشبہات بالرجال من النساء ۱۰۲ (اصلاح الدین)

(۲)اور ملا علی قاریؒ نے مانگ کو سنت کہا ہے اور قاضی عیاض اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ حضرات صحابہ کرامؓ کا دونوں پر عمل تھا۔ تاہم بالوں میں مانگ نکالنا سنت اور ویسے بال چھوڑنا جائز ہے۔ علامہ نوویؒ کے ہاں دونوں برابر ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **والفرق سنة لأنّه رجع إليه رسول اللّٰه ﷺ والظاهر إنّه انّما رجع اليه بوحی لقوله مالم يؤمر فيه بشئ وقال القاضی عياض نسخ السدل فلايجوز فعله اه، (جمع الوسائل ۱/۹۷)وفی المطالع الحديث يدلّ على جواز الأمرين والأمر فيه واسع لكن الفرق افضل لكون النبیّ رجع اليه آخراً وليس بواجب فقد نقل أنّ من الصحابة من سدل بعده ولو كان الفرق واجباً لماسدلوا(المواهب اللدنية ص ۴۲)** اور علامہ عینیؒ نے لکھا ہے **والصحيح أنّ الفرق مستحب لاواجب وهو قول الجمهور وبه قال مالک وقال النوویّ الصحيح جواز السدل والفرق (عمدة القاری ۲۲/۸۷)(مختار)**

(۳) مصنف عبدالرزاق۔ جمع الوسائل ج۱ ص۹۸

۸. حدّثنا محمّد بن بشّار انا عبدالرحمٰن بن مهدی عن إبراهیم بن نافع المکیّ عن ابن أبی نجیح عن مجاهد عن امّ هانی قالت رأیت رسول اللّٰه ﷺ ذا ضفائر اربع.

ترجمہ: حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو چار گیسوؤں والا دیکھا۔

اس حدیث کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

۴. باب ما جاء فی ترجّل رسول اللہ ﷺ

بالوں کی دیکھ بھال کا بیان

گزشتہ باب میں بالوں کا بیان ہے۔ بال رکھنے کے بعد ان کی صفائی اور حفاظت کرنا بھی لازمی امر ہے۔ بال گندے ہوں، میل، گرد وغبار اور جوؤں سے بھرے ہوں، کنگھی اور صفائی کا بندوبست نہ ہو تو انسان جانوروں کی طرح لگتا ہے۔

ترجّل اور **ترجیل** بالوں کو صاف رکھنے اور ان میں تیل اور کنگھی کے اہتمام کو کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ انتہائی درجہ کے نظافت پسند اور نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ نظافت کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "**النظافة من الایمان**" نیز فرمایا کہ "**من کان له شعر فلیکرمه**" (۱) آپ ﷺ نے بال رکھے تھے تو ان کی خوب حفاظت اور صفائی بھی کیا کرتے تھے۔

بالوں کی حفاظت سنت ہے: آج کل تو بالوں کو بنانے اور سنوارنے کے بڑے بڑے سسٹم بنائے جاتے ہیں۔ ان کو ترتیب وتزیین کے لئے مشینوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ان کو گھنگریلا بنانے اور ان کے رنگ بدلنے کے لیے بھی آلات واوزار کا استعمال ہوتا ہے۔ شہر شہر گلی گلی میں بیوٹی پارلر ہیں۔ لیکن یہ بھی محض تکلف اور تصنع ہے کیونکہ بالوں کو ستھرا رکھنا اور ان میں تیل اور کنگھی کا اہتمام کرنا کسی حد تک مسنون امر ہے۔ جس طرح کہ اس باب میں احادیث سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر اس میں مبالغہ کرنے سے احتراز کرنا بھی ضروری ہے۔ بعض دوسری احادیث میں اس کی تصریح ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ ارفاہ سے منع کیا کرتے تھے (۲)۔ جس سے مراد یہ ہے کہ کنگھی وغیرہ میں اس قسم کے تکلفات سے احتراز کیا جائے جس قسم کی تکلفات عورتیں اپنے بالوں میں کرتی ہیں۔ تو اعتدال کے ساتھ بالوں کی خدمت کرنے سے متعلق اس باب میں احادیث لائی گئی ہیں۔

---

(۱) سنن ابی داؤد ۲/ کتاب الترجل باب ماجاء فی اصلاح الشعر

(۲) سنن ابی داؤد ۲/ کتاب الترجل باب اصلاح الشعر

(۱) حدثنا اسحاق بن موسیٰ الأنصاری ثنا معن بن عیسیٰ ثنا مالک بن أنس عن هشام بن عروة عن أبیه عن عائشةؓ قالت کنت أرجّل رأس رسول الله ﷺ وأنا حائض(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں حیض کی حالت میں نبی کریم ﷺ کے سر مبارک پر کنگھی کرتی تھی۔

حالت حیض میں بیوی سے تعلق: **کنت أرجّل رأس رسول الله ﷺ وأنا حائض.** حضرت عائشہؓ کی اس حدیث میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ حالتِ حیض میں زوجین کے درمیان جماع کے سوا باقی کاموں میں اختلاط ناجائز نہیں ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

فاعتزلو ا النساء فی المحیض عورتوں سے حیض کی حالت میں کنارہ کش رہو۔

نیز فرمایا کہ **و لا تقربو هنّ حتیٰ یطهرن** جب تک وہ پاک نہ ہوں ان کے قریب نہ جانا۔

ان آیتوں سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حیض کے وقت بیوی سے مکمل قطع تعلق ہو۔ یہی جاہلیت کے زمانے کا رواج بھی تھا۔ حائضہ کو کتیا کا درجہ حاصل تھا۔ اسے گھر کے ایک کونے میں علیحدہ بٹھا دیا جاتا تھا۔ اور دور سے اسے کھانا دلایا جاتا تھا۔ یہی حالت نفاس اور عدتِ وفات میں بھی تھی۔

لیکن درحقیقت اعتزال اور منع قرب سے مراد جماع سے احتراز ہے۔ جماع کے بغیر حیض ونفاس کی حالت میں میاں بیوی کا ایک جگہ رہنا، کھانا، سونا اور مکمل مخالطت جائز ہے۔ اس حدیث میں بھی اس کے جواز کی تصریح ہے۔ اس لئے یہ حدیث ان قرآنی آیتوں کی تفسیر کر رہی ہے کہ وہاں ہر قسم کے اختلاط کی ممانعت مقصود نہیں ہے۔

میاں بیوی کے باہمی حقوق: نیز حدیث مذکور میں اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ بیوی کو شوہر کی خدمت کرنی چاہیے اگرچہ اس میں لزوم نہیں بلکہ یہ استحباب کے درجہ میں ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ہاں

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۴۳ کتاب الحیض باب غسل الحائض رأس زوجها، سنن نسائی ۱/۶۸ کتاب الحیض و الاستحاضة باب غسل الحائض رأس زوجها(مختار)

بہت زیادہ بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں۔ پٹھان اور بعض دوسرے قبائل بیوی کو بالکل کنیز کا مرتبہ دیتے ہیں۔ بیوی کا کام ہی گویا کھانا پکانا، دھونا اور پاؤں دبانا وغیرہ امور ہیں۔ اور آئے دن کی مار پیٹ اس پر مستزاد ہوتی ہے۔ حالانکہ شرعی لحاظ سے بیوی پر کسی قسم کی خدمت واجب نہیں۔ بلکہ فقہاء میں امام ابو یوسفؒ تو اس کے لئے دو خادم رکھنے کا حکم دیتے ہیں۔ ایک گھر کے کام کاج کیلئے اور دوسرا باہر کے کاموں کے لئے۔ البتہ امام محمدؒ ایک خادم پر اکتفاء فرماتے ہیں۔ لہٰذا حق تو یہ ہے کہ بیوی کو کپڑے، اور نان ونفقہ پکی پکائی گھر کے اندر ملنی چاہیے۔ ہاں جماع کا جو حق شوہر کا بیوی پر ہے وہاں مرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو بیوی کو نفل روزہ رکھنے سے بھی منع کر سکتا ہے۔ لیکن استخدام کا حق مرد کے لیے نہیں ہے۔

<u>حقوق نسواں کے نام پر توہین نسواں:</u> دوسری طرف عورت کو اسلام نے یہ اخلاقی تعلیم دی ہے کہ وہ گھر کی حفاظت اور اس کے اندر کے کام کاج خود کرے۔ نیز حتی الوسع شوہر کی خدمت میں کوتاہی نہ کرے۔ آج کل حقوق نسواں کے نام پر ساری دنیا میں بڑا فتنہ برپا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ عورت بھی آخر انسان ہے۔ اسے انسانوں جتنے حقوق تو ملنے چاہئیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ ہم نے کب کہا ہے کہ وہ انسان نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے جو مقاصد، مراتب اور فرائض مقرر کئے ہیں اور جو کہ عین فطرت سے موافق بھی ہیں۔ ان کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ آج جو شخص حقوق نسواں کا نعرہ لگاتا ہے وہ فرائض نسواں سے چشم پوشی کر جاتا ہے۔ بچے کی حفاظت، تربیت، آرام وراحت اور رضاعت کا خیال رکھنا، شوہر کے گھر کی دیکھ بھال کرنا، اور اپنی عصمت کا خیال رکھنا وغیرہ جو فرائض عورت کے ذمے لگائے گئے ہیں۔ نئی روشنی کے دعویدار حضرات وہ پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ بلکہ ان کے بارے میں اسلامی احکام اور قرآن وحدیث کے ساتھ استہزاء کا معاملہ برتا جاتا ہے۔ اور آزادئ نسواں کے نام پر گمراہی کی ترغیب وتعلیم بھی دی جاتی ہے۔

مغربی تہذیب میں تو باقاعدہ بیوی اور شوہر کے درمیان اجنبیوں کی طرح کمائی، خرچ اور رہائش تک کے امور میں علیحدگی رائج ہے۔ مرد عورت کی نجی زندگی سے بے خبر ہے اور عورت کو مرد کی نجی زندگی کا کوئی پتہ نہیں۔ خاوند ایک دفتر میں تو بیوی دوسرے دفتر میں کام کرتی ہے۔

درحقیقت مرد کا عورت پر ایک ظلم یہ بھی ہے کہ اسے مرد کے ساتھ مساوی ہونے کا احساس دلا کر

اسے باہر نکالنے کی شہہ دیتا ہے۔مغرب کا بوالھوس مرد اپنی عیش وعشرت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عورت کو چار دیواری سے باہر نکال رہا ہے۔حقیر سے حقیر چیز کا اشتہار کیوں نہ ہو،عورت کی تصویر سے خالی نہیں۔عورت ان کے ہاں جنسی تسکین کے لئے محض ایک آلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔وہاں کے مرد نے عورت سے بڑی زیادتی کی ہے۔عورت پریشان ہے کہ وہ بچوں کی حفاظت کرے،کارخانہ اور دفتر جائے،یا پھر اپنی حفاظت کرے۔اس صریح ظلم کی آگ میں مغربی عورت ہر وقت جلتی رہتی ہے۔

دیت کس کی آدھی؟ اسلام نے عورت کو بڑی عزت،احترام اور تقدس سے نوازا۔اسے گھر بٹھا کر مرد کو حکم دیا کہ جہاں سے بھی ہو،کماؤ اور بیوی کو کھلاؤ۔خورد ونوش،رہائش اور لباس کا بندوبست کرو،اسلام نے ہر جگہ عورت کی رعایت کی ہے۔لیکن آج کی عورت سمجھائے نہیں سمجھتی۔دیت کے مسئلہ میں آجکل دنیا میں ایک ہنگامہ برپا ہے۔وہ اعتراض کرتے ہیں کہ عورت کی دیت آدھی کیوں ہے۔کیا وہ نصف انسان ہے۔ لیکن دراصل اس میں بھی عورت ہی کی رعایت کی گئی ہے۔شریعت بل کے ہنگامہ میں عورتیں میرے پیچھے بھی پڑی تھیں۔کہ تم کیوں عورت کے نصف دیت پر مصر ہو۔میں نے ان سے کہا کہ دیکھیں اگر میاں بیوی میں کسی ایک کو قتل کر دیا جائے تو دیت تو مرنے والے کو نہیں،بلکہ دوسرے کو ملے گی۔اب اگر مرد مر گیا،تو بیوی کو مثلاً اپنا حصہ ایک لاکھ روپے ملیں گے اور عورت مر گئی تو مرد کو ملنے والی دیت پچاس ہزار روپے ہوگی۔ لہٰذا اگر نعوذ باللہ شریعت نے ظلم کیا ہے تو مرد پر کیا ہے عورت پر نہیں کیونکہ مرد نے اپنی شادی وغیرہ پر لاکھوں روپے بھی خرچ کئے،اور دیت آدھی ملی۔جبکہ عورت نے شادی کے موقع پر بھی بڑی مقدار میں رقم لے لی اور دیت بھی دگنی ملی۔بہر حال دراصل دیت مرد کی آدھی ہے عورت کی پوری ہے۔

نصف دیت کی حکمت: درحقیقت اس میں بھی بڑی حکمت پوشیدہ ہے وہ یہ کہ دیت کا فائدہ چونکہ وارث کو ملتا ہے اور بیوی کے اخراجات خاوند کی زندگی میں اس کے ذمے تھے۔خاوند کے مرنے کے بعد اسے بچوں کی پرورش اور خود اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے مال کی زیادہ ضرورت ہے۔اس کے برعکس بیوی کی موت پر سارا گھر نہیں اجڑتا۔کیونکہ اخراجات اور نفقہ پہلے سے مرد کے ذمے ہیں۔اب مرنے کے بعد بھی اس کی ذمہ داریوں میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔لہٰذا از روئے عقل اسے بیوی کی نسبت کم رقم ملنی

چاہیے۔بہر حال مرد کا بیوی پر استخدام کا حق تو نہیں۔لیکن مکارم اخلاق کا تقاضا ہے کہ بیوی محبت وشرافت سے خاوند کی خدمت کرتی رہے۔جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے عملاً ہمیں بتلایا کہ عورت کو مرد کی خدمت کرنی چاہیے۔

(۲) حدثنا یوسف بن عیسیٰ أنا وکیع أنا الربیع بن صبیح عن یزید بن أبان ھو الرقاشیّ عن أنس بن مالک قال کان رسول اللّٰہ ﷺ یکثر دھن رأسه و تسریح لحیته و یکثر القناع حتی کان ثوبه ثوب زیّات(۱).

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کثرت سے سر میں تیل لگایا کرتے تھے اور بکثرت داڑھی میں کنگھی کیا کرتے تھے، حتی کہ آپ ﷺ کا کپڑا کسی تیلی کا کپڑا معلوم ہوتا تھا۔

<u>بالوں میں تیل اور کنگھی کا استعمال</u>:دھن رأسه:دَھن کا دال مفتوح اور ہاء ساکن ہے۔یہ مصدر ہے اور معنی یہ کہ آپ ﷺ تیل کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے(۲)۔و تسریح لحیة دھن راسه پر عطف ہے، یعنی آپ ﷺ داڑھی میں کنگھی بھی زیادہ کرتے تھے۔احادیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سفر وحضر میں اپنے ساتھ مسواک، کنگھی، آئینہ، سرمہ دانی، تیل کی شیشی اور قینچی وغیرہ رکھا کرتے تھے(۳)۔و یکثر القناع قناع قاف مکسورہ کے ساتھ ما یتقنّع به کو کہتے ہیں۔یعنی وہ چھوٹا سا کپڑا جو ٹوپی یا پگڑی کے نیچے سر پر باندھتے ہیں۔تاکہ تیل کے اثر سے ٹوپی یا عمامہ محفوظ رہے۔نبی کریم ﷺ کی طبیعت میں بہت نفاست تھی۔آپ ﷺ کے کپڑے تیل وغیرہ کے داغوں سے محفوظ ہوتے تھے۔اس لئے سر پر تیل لگانے

(۱)الشرح السنة ۱۲/ ۸۲ باب ترجیل العر و تدھیه ،مشکوٰۃ المصابیح ۲/ ۳۸۱ باب الترجل(مختار)

(۲)موجودہ زمانے کے سائنس دان بھی کہتے ہیں کہ سر پر تیل لگانا یہ ذہنی دباؤ اعصابی کھچاؤ،سر درد کے پرانے مریض،گرد پھٹوں کے درد، شانوں کے درد، کھچاؤ نگاہ کی کمزوروی اور چہرے کی سرخی کیلئے بہت مفید ہے(آفتاب نبوت کی کرنیں ص۱۵۶)(مختار)

(۳)ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کبھی کبھار دن میں دو مرتبہ بھی تیل استعمال فرما لیتے تھے(مختار)

کے بعد ٹوپی یا پگڑی پہننے سے قبل سر پر کپڑا ڈال دیتے تھے۔ کان ثوبه ثوب زیات ثوبه سے آپ ﷺ کے بدن کا کپڑا مراد نہیں کیونکہ اس کا میلا اور تیل سے آلودہ ہونا نظافت کے خلاف ہے۔ بلکہ ثوبہ سے مراد ہی قناع ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے اور قناع کا تیل سے آلودہ ہونا قبیح بات بھی نہیں ہے بعض روایات کے مطابق ''حتی کان ملحفته ملحفة زیات'' کے الفاظ مروی ہیں۔

(۳) حدّثنا هنّادبن السریّ أنا أبوالأحوص عن أشعث بن أبی الشعثاء عن أبیه عن مسروق عن عائشةؓ قالت کان رسول اللّٰہﷺ لیحبّ التیمن فی طهوره اذا تطهّر و فی ترجّله اذا ترجّل و فی انتعاله اذا انتعل(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ طہارت کے وقت پانی کے استعمال میں کنگھی کرتے وقت کنگھی کرنے میں اور جوتے پہنتے وقت جوتیاں پہننے میں دائیں طرف سے شروع کرنا پسند فرماتے تھے۔

کان رسول اللّٰہ ﷺ الخ اِن مخفف من المثقل ہے۔ اسم محذوف ہے اور تقدیر انه کان الخ ہے۔ اور لیحب کا لازم اس کا قرینہ ہے۔ کیونکہ ان قافیہ ہونے کی صورت میں خبر پر لام داخل نہیں ہوتا۔

لیحبّ التیمن فی طهوره الخ طہور کی طاء مفتوح ہو تو اس پانی کو کہتے ہیں جس سے طہارت حاصل کی جائے اس صورت میں مضاف مقدر ہوگا یعنی ''فی استعمال طهوره'' اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں پر مصدری معنی مراد ہو۔ اور طاء مضموم ہو گویا وضوء کرنے میں پہلے دائیں اعضاء سے ابتداء کرتے۔ اس صورت میں تقدیر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اسی طرح کنگھی کرنے اور جوتا پہننے میں بھی تیامن کی عادت تھی۔

<u>تیامن اور تیاسر کے اصول:</u> بلکہ ہر اچھے کام میں تیامن ملحوظ رکھتے تھے۔ ضابطہ یہ ہے کہ جو کام مکرم، مشرف اور تزئین کا ہو تو وہاں تیامن مسنون ہے اور جس کام میں شرف و کرامت اور تزئین نہ ہو تو اس

(۱) صحیح بخاری ۱/۲۸ کتاب الوضوء باب التیمن فی الوضوء، سنن نسائی ۲/۲۹۲ کتاب الزینة باب التیامن فی الترجل(مختار)

میں تیاسر چاہئے۔ مثلاً مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں اور نکلتے وقت بایاں پاؤں آگے کرنا چاہیے۔ جبکہ بیت الخلاء میں اس کے برعکس ہونا چاہیے۔ اسی طرح کپڑا پہننے میں دائیں جانب سے اور اتارنے میں بائیں جانب سے نکالنا بہتر ہے۔ کیونکہ ستر زینت اور کرامت ہے اور عریانی اس کے برعکس ہے۔

بخاری اور مسلم کی حدیث میں اس روایت کے آخر میں "وفی شانہ کلہ" کے الفاظ کا اضافہ ہے۔ یہاں شاید راوی کو یہ عبارت مستحضر نہیں تھی۔ اس لئے اسے نہیں لایا۔ درحقیقت تمام افعالِ خیر میں آپ ﷺ تیامن پسند فرماتے تھے۔

اتباع سنت کے اہتمام کی عجیب مثالیں: بزرگوں کے ہاں سنت کا بہت زیادہ پاس ہوتا تھا۔ المدخل میں ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ اس نے بے دھیانی سے پہلے اپنا بایاں جراب پہنایا، بائیں پاؤں کی جوتی پہنی۔ بعد میں خیال آیا تو کفارہ کے طور پر 36 من کا غلہ صدقہ دیا۔ نبی کریم ﷺ سے محبت کرنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اتباع سنت کے کتنے دینی اور دنیوی برکات ہیں۔ زندگی کے تمام معمولات اور عادات میں بھی اتباع سنت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

ایک بزرگ جس کا نام غالباً محمد بن اسلم ہے نے ساری عمر تربوز نہیں کھائی اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے تربوز کیسے کھایا ہے۔ چھلکے اتار کر یا قاشیں بنا کر یا گودا نکال کر۔ اس لئے میں سنت کے خلاف نہ کر بیٹھوں۔ بہرحال وہ لوگ لاعلمی میں بھی خلاف سنت کا ارتکاب برداشت نہیں کرتے تھے۔

حضرت حسن بصریؒ نے جب پہلی مرتبہ ایک شخص کو بدعت میں مبتلا دیکھا۔ تو آپ کو اتنا دکھ ہوا کہ جب پیشاب کرنے بیٹھے تو پیشاب کی جگہ خون نکل آیا۔ اتباع سنت سے لاپرواہی کے سبب آج ہم سے فرائض بھی چھوٹ گئے ہیں۔ کیونکہ جو شخص مستحبات میں تکاہل برتتا ہے وہ سنن سے محروم ہو جاتا ہے۔ جو شخص سنن سے بے پرواہ ہوتا ہے۔ اسے واجبات کی توفیق نہیں ہوتی۔ اور واجبات سے جو شخص لاپرواہی برتتا ہے اسے فرائض سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ مشہور بزرگ حضرت شبلیؒ نے اپنی موت کے وقت شاگردوں سے فرمایا کہ مجھے وضو کراؤ۔ نزع کی حالت تھی سکرات موت میں مبتلا تھے۔ شاگردوں نے بڑی تکلیف سے وضوء

کروایا۔لیکن وضوء کے بعد آپ نے شاگردوں سے کہا۔کہ تم نے تو مجھے خلال نہیں کروایا۔اس لئے دوبارہ وضوء کراؤ۔انہوں نے کہا کہ خلال سنت یا مستحب چیز ہے۔ادھر تمہیں شدید تکلیف ہے۔اس لئے رہنے دیں اس نے کہا کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایسی حالت میں ملاقات نہیں کرنا چاہتا کہ میں نے ان کی ایک سنت کو ترک کردیا ہو۔لہٰذا آپ نے دوبارہ وضوء کروایا تاکہ خلال بھی ہوجائے وضوء کے ختم ہوتے ہوتے آپ کی روح بھی پرواز کرگئی۔

(۴) **حدّثنا محمّد بن بشّار أنا یحییٰ بن سعید عن ھشام بن حسان عن الحسن البصریّ عن عبداللّٰہ بن مغفّل قال نھیٰ رسول اللّٰہ ﷺ عن الترجّل الاغبّاً**(۱)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مغفل ؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کنگھی کو منع فرماتے مگر گاہے گاہے۔

عن عبداللّٰہ بن مغفل: عبداللہ بن مغفل مزنی صحابی ہیں۔بیعت رضوان سے مشرف ہوئے تھے اور فتح مکہ کے دن سب سے پہلے مکہ میں داخل ہونے والے شخص تھے۔بصرہ میں ۵۷ھ یا ۶۰ھ کو وفات پائی۔

<u>بالوں کے بناؤ سنگھار میں اعتدال:</u> **الاّغبّاً الخ** اسلام اعتدال کا درس دیتا ہے۔وہ ہر وقت تعیش، تزیین اور بناؤ سنگھار میں لگے رہنے سے منع کرتا ہے۔جس طرح کے بعض طلبہ درس میں بھی کنگھی آئینہ کا اہتمام کرتے ہیں۔تو اگرچہ اسلام ایک طرف صفائی اور نظافت کا حکم دیتا ہے۔اور میلے رہنے کو ناپسند کرتا ہے لیکن عورتوں اور مترفین کی طرح ہر وقت بناؤ سنگھار کے اہتمام کو بھی پسند نہیں کرتا۔

<u>لفظ غب:</u> **غب** کا اصلی معنی ہے **ورود الابل الماء یوماً و ترکہ اخریٰ** یعنی اونٹ کا ایک دن پانی پینے کے لئے آنا اور دوسرے دن چھوڑنا۔پرانے زمانے میں صحرائی علاقوں میں پانی کی دوری اور قلت کے سبب روزانہ اونٹوں کو پانی پلانا مشکل تھا۔اس لئے ایک دن انہیں پانی پلاتے تھے اور دوسرے دن ناغہ ہوتا تھا۔

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۲۱۷ کتاب الترجل، سنن نسائی ۲/۲۷۵، کتاب الزینۃ باب الترجل غباً،جامع ترمذی ۱/۳۰۵ کتاب اللباس باب ماجاء فی النھی عن الترجل الاغباً(مختار)

اونٹ کواللہ تعالیٰ نے یہ طاقت دی ہے کہ وہ کئی کئی دن تک بغیر پانی پیئے گزارہ کرسکتا ہے۔بعض لوگوں کے خیال میں اونٹ کے پیٹ میں پانی کو ذخیرہ کرنے کیلئے الگ جگہ ہوتی ہے۔لیکن یہ غلط ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اونٹ کو صحرائی علاقوں سے بہت مناسب فطرت دی ہے۔اونٹ کے کوہان میں چربی ہوتی ہے، جو پیاس کی صورت میں پگھل پگھل کر پیاس بجھاتی رہتی ہے۔لہٰذا وہ کئی کئی دن تک بغیر پانی کے گزارہ کرسکتا ہے۔اور اسی وجہ سے جس شخص کا پیٹ بڑھ جائے اسے ڈاکٹر پانی نہ پینے یا کم پینے کا مشورہ دیتے ہیں۔بہر حال پیاس کی کمی کے باعث اونٹ کو ہمیشہ پلانے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ کبھی کبھی پلاتے ہیں۔ اسی کو غب کہتے ہیں عرب کا مشہور مقولہ ہے **زرغباً تزددحبّاً**۔کبھی کبھی ملاقات کرنے جاؤ محبت بڑھتی جائے گی۔یہاں بھی غب ناغہ کے معنی پر مستعمل ہے۔ہر وقت کسی دوست کے پیچھے پڑے رہو گے تو بیزاری آئے گی۔

اور چونکہ ہر وقت کنگھی کرنا عیش پرستوں اور عورتوں کا کام ہے اس لئے کنگھی بھی کبھی کبھار ہونی چاہیے۔علامہ ابن عربیؒ نے کنگھی کے بارے میں کیا خوب فرمایا ہے کہ **مو الاتہ تصنع و ترکہ تدنس واغبابہ تسنن**. اس میں ہر وقت لگے رہنا، تصنع اور تکلف ہے۔اس کا بالکل چھوڑ دینا میلا پن ہے۔اور اسے کبھی کبھی کرنا سنت ہے(۱)۔

(۵) حدّثنا الحسن بن عرفة قال ثنا عبدالسلام بن حرب عن يزيد بن أبي خالد عن أبي العلاء الأودیّ عن حميد بن عبدالرحمٰن عن رجل من أصحاب النبیّ ﷺ أنّ النبیّ ﷺ كان يترجل غباً(۲).

ترجمہ: ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی عادت مبارک کبھی کبھی کنگھی کرنے کی تھی۔

---

(۱)قال ملاعلی قاریؒ وقيل هو ان يفعل يوماًويترک يوماًونقل عن الحسن فی کل السبوع قال القاضی والمرادالنهی عن المواظبة عليه والاهتمام به لانّه مبالغة فی التزين تهالک به

(جمع الوسائل ۱/۷ ۰ ۱)(مختار)

(۲)تفرد به الترمذی:

عن یزید بن ابی خالد اس راوی کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ یہ یزید بن ابی خالد نہیں بلکہ یزید بن خالد ہیں۔ بہت متقی اور پرہیز گار تھے۔ **عن رجل الخ** صحابی مجہول ہے لیکن چونکہ تمام صحابہ عدول ہیں۔ اس لئے یہ جہالت مضر نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس صحابی کی تعین کی ہے۔ کسی نے حکم بن عمروؓ کا نام لیا ہے۔ کسی نے عبداللہ بن سرجسؓ کا نام لیا ہے اور بعض لوگوں کے خیال میں یہ صحابی عبداللہ بن مغفلؓ ہیں۔ جو سابقہ حدیث کے راوی ہیں البتہ یہ حدیث فعلی ہے اور گزشتہ حدیث میں نبی کریم ﷺ کا قولی حکم بیان کیا گیا تھا(۱)۔

---

(۱) علامہ ابن عربیؒ نے فرمایا ہے کہ بار بار کنگھی کرنا یہ تصنع اور بناوٹ میں داخل ہے اور کنگھی بالکلیہ ترک کرنا بالوں میں میل وکچیل جمع ہونے کا باعث بنتا ہے جو باعث ضرر ونقصان ہے اس لئے اعتدال سے کام لینا چاہئے۔

کنگھی اور جدید سائنس: آج کل سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ کنگھی سے ایک حرارت اور انرجی بدن میں پیدا ہوتی ہے جو بالوں کے ذریعے جسم انسانی کی طرف منتقل ہوتی ہے اور اعصابی نظام میں قوت پیدا کرتی ہے اور اگر کنگھی نہ کی جائے تو پھر بالوں میں جراثیم اٹک جاتے ہیں۔ اور بدن انسانی میں منتقل ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔(مختار)

۵. باب ماجاء فی شیب رسول اللّٰہ ﷺ
حضور اقدس ﷺ کے بالوں کی سفیدی کا بیان

اس سے قبل بالوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔اور چونکہ عمر کے آخر میں بالوں کو سفیدی عارض ہو جاتی ہے۔اس لئے اب اس باب میں نبی کریم ﷺ کے بالوں کی سفیدی کا بیان ہے. **شیب شاب یشیب** کا مصدر ہے جس کے معنی سیاہ بالوں کا سفید ہونا ہے۔اسی طرح اس کا اطلاق اس حالت پر بھی ہوتا ہے جس میں بال سفید ہو جاتے ہیں۔عمر کی زیادتی کی وجہ سے قُویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں، طاقت چلی جاتی ہے بڑھاپا آجاتا ہے۔تو اسے بھی شیبۃ اور شیب کہتے ہیں۔

(۱) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا ابو داؤد أنا همّام عن قتادة قال قلت لأ نس بن مالک هل خضب رسول اللّٰه ﷺ قال لم يبلغ ذلک إنّما کان شيبا فی صدغيه و لکن ابو بکر خضب بالحناء و الکتم(۱).

ترجمہ: حضرت قتادہؒ کہتے ہیں میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ حضور اقدس ﷺ خضاب لگایا کرتے تھے۔انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے بالوں کی سفیدی خضاب کی حد کو نہیں پہنچی تھی۔سفیدی نبی کریم ﷺ کی دو کنپٹیوں میں تھوڑی سی تھی۔ البتہ ابو بکرؓ مہندی اور کتم کا خضاب لگایا کرتے تھے۔

ابو داؤد: ائمہ حدیث میں سے یہ کنیت دو افراد کے لئے بولی جاتی ہے ایک ابوداؤد سلیمان بن داؤد طیالسیؒ ہیں دوسرے ابوداؤد مصاحفیؒ اور چونکہ ابوداؤد مصاحفیؒ کا ہمامؒ سے سماع ثابت نہیں اس لئے یہاں پر اول الذکر ہی مراد ہونگے۔

لم یبلغ ذالک : **لم یبلغ** کی ضمیر مستتر میں تین احتمال ہیں۔اول یہ کہ ضمیر نبی کریم ﷺ کو راجع ہو اور **ذالک** سے **حد الخضاب** کو اشارہ ہو۔جس پر قرینہ حضرت قتادہؒ کا سوال ''**ھل خضب**'' ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری ۱/ ۵۰۱ باب صفة النبی ﷺ کتاب المناقب، سنن نسائی ۲/ ۲۷۸ کتاب الزینة باب الخضاب بالعضرة (مختار)

(۱) تقدیر یوں ہوگی کہ "لم یبلغ رسول اللہ ﷺ حدالخضاب" یعنی بالوں کو خضاب لگانے کی نوبت نہیں آئی۔(۲) دوم یہ کہ ضمیر شیب کوراجع ہوتو عبارت کی تقدیر یوں ہوگی کہ "لم یبلغ الشیب حدالخضاب" یعنی آپ کے بال اتنے سفید ہی نہیں تھے کہ خضاب کی ضرورت پڑے۔(۳) سوم یہ کہ ضمیر شعرالنبی ﷺ کوراجع ہوتو تقدیر یوں ہو کہ "لم یبلغ شعرہ ﷺ حدالخضاب" یعنی آپ ﷺ کے بال مبارک خضاب کی حد تک سفید نہیں ہوئے تھے۔

بہرحال اس جملے کا مقصد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بالوں میں معدودے چند بال سفید تھے۔ اس لئے آپ ﷺ کو خضاب لگانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔اگلے باب میں یہ بات تفصیل سے آجائے گی کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب کا استعمال کیا ہے یا نہیں۔

انما کان شیبا فی صدغیه الخ: صدغ آنکھ کے گوشے اور کان کے درمیان کے حصے کو کہتے ہیں لیکن اس حصے پر موجود بالوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔اس لئے یہاں پر اس کی مراد میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ **ھو الشعر المتدلی بین الاذن و العین** یعنی آنکھ اور کان کے درمیان بالوں کی پٹی۔ جسے اردو میں کنپٹی کہتے ہیں۔بالوں میں سفیدی کی ابتداء کن پٹی سے ہوتی ہے نبی کریم ﷺ کی کن پٹیوں میں چند سفید بال ظاہر ہوگئے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خضاب(۱): **ولکنّ أبا بکر الخ** حضرت انسؓ کے بیان کے مطابق نبی کریم ﷺ نے خضاب کا استعمال نہیں کیا تھا۔جس سے معلوم ہوا کہ خضاب لگانا ناجائز نہ تھا۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے خضاب نہیں لگایا تو آپ ﷺ کے قریب ترین دوست سب سے بڑے اور بزرگ صحابی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیوں لگایا تھا؟ اس وہم کے دفعیہ کے لئے حضرت انسؓ نے اس جملہ کا اضافہ کردیا کہ اگرچہ ابوبکر صدیقؓ نے خضاب لگایا تھا لیکن وہ بھی خالص خضاب نہ تھا بلکہ درحقیقت وہ سیاہی مائل مہندی استعمال کرتے تھے۔اور کتم کی سیاہی کو ختم کرنے کے لئے اس میں مہندی

---

(۱) خضاب یعنی بالوں کو رنگنے کا رواج پُرانے زمانے سے ہے۔پہلے ادوار میں عام طور پر مہندی یا وسمہ یا کتم (ایک قسم کا بوٹا ہے) استعمال کیا جاتا تھا، البتہ اس وقت بہت سارے ہیئر کلرز بازاروں میں ملتے ہیں اس میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔(مختار)

ڈالتے تھے۔اسی لئے تو ابوبکر صدیقؓ نے اسے استعمال کیا تھا ورنہ ابوبکر صدیقؓ خلاف سنت کام کبھی بھی نہیں کرتے تھے۔اس تشریح کے مطابق حضرت انسؓ کی اس حدیث سے خضاب کے جواز کی نفی ہوتی ہے۔

ایک دوسری تشریح کے مطابق اس حدیث میں دراصل خضاب لگانے کو جائز کہا گیا ہے اور خضاب کے عدم جواز کیلئے حدیث بیان نہیں ہوئی بلکہ دراصل یہ بات اس لئے کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خضاب لگا کر کوئی جرم نہیں کیا۔رہی یہ بات کہ ان کا عمل نبی کریم ﷺ کے عمل کے خلاف تھا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ ﷺ کے نزدیک خضاب ناجائز تھا بلکہ دراصل نبی کریم ﷺ حد خضاب کو نہیں پہنچے تھے۔اگر ابو بکر صدیقؓ کی طرح آپ ﷺ کے بال بھی سفید ہوجاتے تو آپ ﷺ بھی استعمال کرتے۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ یہاں پر سائل نے نبی کریم ﷺ کے عمل کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ لیکن حضرت انسؓ نے جواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عمل ذکر کیا۔کیونکہ نبی کریم ﷺ کے بعد امت میں آپؓ ہی کا نمبر آتا ہے۔تو گویا حضرت انسؓ کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ نبی کریم ﷺ نے خضاب نہیں لگایا۔ لیکن امت کی تأسی اور اقتداء کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عمل موجود ہے جنہوں نے خضاب لگایا تھا۔ اس سے صحابہؓ کے نزدیک صدیق اکبرؓ کا مرتبہ اور مقام بھی بخوبی معلوم ہوتا ہے۔

<u>کتم:</u> اس حدیث میں کتم(۱) کا ذکر ہے جس کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔صحیح قول کے مطابق ایک پودا ہے جو میدانی علاقوں میں ہوتا ہے۔اس کا قد انسان جتنا ہوتا ہے زیتون کی طرح پتلے پتلے پتے ہوتے ہیں مرچ کے دانوں کی طرح دانے اس میں آتے ہیں۔جس کو کوٹ کر ابالا جاتا ہے۔اور سیاہ رنگ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔لکھنے کی سیاہی بنانے کے کام بھی آتا ہے۔مہندی سے مل کر اس کا رنگ سرخی مائل سیاہ ہوجاتا ہے۔اس حدیث میں درحقیقت خضاب کا بیان ہے۔اس لئے شراح نے لکھا ہے کہ یہ حدیث اس باب کی نسبت اگلے باب سے زیادہ مناسب ہے۔

---

(۱) بعض اہل علم فرماتے ہیں کتم رنگ کے اعتبار سے کالا ہوتا ہے جب اس کو مہندی کے ساتھ ملایا جائے تو سرخ بن جاتا ہے۔اور بعض کا کہنا ہے کہ کتم کا رنگ سبز ہوتا ہے لیکن جب مہندی سے ملایا جائے تو سیاہ بن جاتا ہے مگر غلبہ کے اعتبار سے ہو یعنی اگر مہندی غالب ہو تو سرخ بن جاتا ہے اور اگر کتم غالب ہو تو سیاہ بن جاتا ہے۔علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے فرمایا ہے **الکتم الصرف یوجب سواداً مائلاإلی الحمرة والحناء توجب الحمرة فاستعمالهمایوجب مابین السوادوالحمرة اھ(جمع الوسائل ۱/۱۱۰)(مختار)**

خضاب کا حکم: بعض لوگوں کے خیال میں نبی کریم ﷺ نے خضاب کبھی نہیں لگایا۔اوران کا اعتماد ان روایات پر ہے جن میں نبی کریم ﷺ سے خضاب کی نفی ثابت ہے۔لیکن صحیح روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب استعمال کیا ہے۔اور چونکہ مثبت روایت نافی روایت سے فی ذاتہ راجح ہوتی ہے کیونکہ ایک علم اور دوسری عدم علم پر مبنی ہوتی ہے۔اس لئے بہت سے لوگوں نے جن میں امام احمد بن حنبلؒ بھی شامل ہیں خضاب کو جائز کہا ہے۔جبکہ بعض روایات میں نبی کریم ﷺ نے مشروط اجازت دی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے والد ابی قحافہؓ جن کا سر اور داڑھی بالکل سفید ہو چکے تھے۔نبی کریم ﷺ کے پاس فتح مکہ کے روز آئے۔رسول اللہ ﷺ آپ کا سر دیکھ کر فرمایا۔**غیّر و اھذا بشئی و اجتنبو ا السواد** (۱) یعنی اس کے بالوں کا رنگ بدل دو لیکن سیاہ رنگ سے اجتناب کرو۔

اس طرح دیگر احادیث میں بھی خضاب کے جواز کی تصریح موجود ہے۔البتہ سیاہ خضاب کے بارے میں نہی بھی وارد ہے۔احادیث کے درمیان تطبیق کیلئے علماء کے دو طبقے ہیں۔بعض علماء سیاہ خضاب کے جواز کے بھی قائل ہیں۔ہاں ممانعت صرف اس صورت پر حمل کرتے ہیں۔جس میں تدلیس کا شبہ ہو۔ اسلام تزیین و تحسین کے خلاف نہیں۔لیکن بعض اوقات دھوکہ اور فریب کیلئے بالوں کو سیاہ کیا جاتا ہے۔ایسی حالت میں اسلام خضاب کو ممنوع قرار دیتا ہے تاکہ دھوکہ کا انسداد ہو سکے۔کیونکہ تدلیس اور فریب میں دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص کے بال سفید ہو چکے ہیں۔کوئی رشتہ نہیں ملتا جس سے رشتہ طلب کرتا ہے، وہ سفید بال دیکھ کر بوڑھا سمجھ لیتا ہے۔اور رشتہ سے انکار کر دیتا ہے۔چنانچہ وہ خضاب کا سہارا لیتا ہے اور لوگ اسے جوان سمجھ کر رشتہ دے دیتے ہیں۔بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ تو بوڑھا ہے۔اسی طرح وہ عورت بھی کبھی کبھی دھوکہ دے سکتی ہے جس کی عمر زیادہ ہے بال سفید ہیں۔لیکن وہ بیوٹی کلینک سے بن سنور کر نکلی کسی کی نظر پڑی۔اور اسے جوان سمجھ کر شادی رچائی۔بعد میں معلوم ہوا تو پچھتاتا رہا۔اسی طرح پرانے زمانے میں عموماً غلاموں اور کنیزوں کی فروخت کے وقت بھی تدلیس سے کام لیا جاتا تھا۔مالک اپنے غلام یا کنیز کی

(۱) مسلم ج۲ ص۱۹۹

قیمت بڑھانے کے لئے ان کو خضاب لگا کر اور میک اپ کروا کر نوجوان ظاہر کرتے۔ تاکہ خریدار لوگ دھوکہ کھا کر خرید لیں۔ ان صورتوں میں چونکہ دھوکہ فریب اور دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس لئے خضاب لگانا ممنوع ہے۔ لیکن اگر دھوکہ فریب نہ ہو۔ مثال کے طور پر میاں بیوی میں سے کسی کے بال سفید ہیں اور دوسرے کو اس کے بڑھاپے کا خوب پتہ ہے۔ بلکہ خود کہہ دیتا ہے کہ سفید بالوں کو خضاب لگا دیا جائے تو ایسے موقع پر خضاب خواہ وہ خالص سیاہ کیوں نہ ہو۔ لگانے میں کوئی حرج نہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے بھی اس کی تصریح کر دی ہے۔

بعض دوسرے علماء کا خیال ہے کہ اگر خضاب خالص سیاہ نہ ہو۔ بلکہ کوئی دوسرا رنگ مثلاً سرخ مہندی وغیرہ اس میں ملا دیا جائے تو سرخی مائل خضاب کے لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے بھی اگر خضاب استعمال کیا ہے تو وہ بھی خالص سیاہ نہ تھا۔ بلکہ یہی مخلوط خضاب تھا۔ بلکہ بعض علماء نے خضاب لگانے کو مستحب قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس میں اہل کتاب کی مخالفت ہے۔ اور جہاں ممانعت کا ذکر ہے تو سواد بحت یعنی خالص سیاہ خضاب مراد ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں بڑے اکابر صحابہ کے نام بھی لکھے ہیں جنہوں نے خضاب کا استعمال کیا تھا۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے نام بھی شامل ہیں۔ اور ایک بڑی تعداد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سیاہ خضاب استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں بھی یہی توجیہ کی جائے گی کہ انہوں نے تدلیس کے لئے نہیں کیا تھا۔ نیز جو خضاب لگایا تھا وہ بھی خالص سیاہ نہیں تھا۔ بلکہ مہندی سے مخلوط تھا۔

(۲) حدثنا إسحاق بن منصور و یحییٰ بن موسیٰ قالا ثنا عبدالرزاق عن معمر عن ثابت عن أنس قال ما عددت فی راس رسول اللّٰہ ﷺ ولحیته إلاّ أربع عشرة شعرة بیضاء(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے سر مبارک اور داڑھی مبارک میں چودہ سے زائد بال نہیں گنے۔

---

(۱) صحیح ابن حبان ۸/۷۰ باب من صفته ﷺ وأخباره شرح السنة ۱۳/۲۲۸ باب شیبة وخضابه ﷺ (مختار)

<u>بالوں میں موجود سفید بالوں کا تخمینہ:</u> **إلاّ أربع عشرة شعرة** اس حدیث میں چودہ بال مذکور ہیں۔ آگے ایک اور حدیث میں تقریباً بیس اور حضرت انسؓ ہی کی ایک حدیث میں سترہ اور اٹھارہ بالوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔اور اگر چہ مذکورہ روایات میں اعداد مختلف ہیں۔لیکن ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔کیونکہ اختلاف زمانہ کی وجہ سے سفید بالوں کے عدد میں کمی بیشی آتی رہتی ہے علاوہ ازیں ایک شخص کا گننا دوسرے شخص کے گننے سے مختلف ہوتا ہے۔ہر کوئی تو جوؤں کی طرح تلاش کر کے ایک ایک بال نہیں گنتا۔پھر نبی کریم ﷺ کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے ہر شخص اتنی گہرائی سے آپ ﷺ کے چہرہ انور کو کب دیکھ سکتا تھا۔ بس دور سے تخمینہ لگا کر صحابہ نے اعداد بتائے ہیں۔چنانچہ کسی نے چودہ تک گن لئے۔کسی نے سترہ کسی نے اٹھارہ اور کسی نے بیس تک گنے ہیں۔ممکن ہے کہ بال اور بھی ہوں لیکن شمار میں نہ آئے ہوں۔بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب سفید بالوں کا عدد چودہ ہو کر دوسرے عشرہ میں داخل ہوا تو بیس کا نصف سے بڑھ کر بیس سے قریب ہو گیا۔اس لئے اگلی روایت میں **نحواً من عشرين** کا قول تقریبی ہے۔لیکن بہتر توجیہ یہی ہے کہ یہ سب اقوال تخمین پر مبنی ہیں۔یا پھر اختلاف زمانہ کی وجہ سے عدد میں اختلاف آیا ہے۔علاوہ ازیں حضرت انسؓ کی دونوں حدیثوں میں تطابق کی ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ یہاں پر انہوں نے "**ماعددت فی رأس الخ**" کا لفظ کہا ہے۔جس کا معنی ہے کہ میں نے چودہ گنے تھے۔اب درحقیقت بال چودہ سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں تو دوسری روایات میں سترہ اٹھارہ کا جو ذکر ہے وہ دوسرے موقع پر گننے کے مطابق ہوگا۔

(۳) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ أنا أبو داؤد أنا شعبة عن سماک ابن حرب قال سمعت جابر بن سمرة يسئل عن شيب رسول اللّٰه ﷺ فقال كان اذا ادّهن راسه لم ير منه شيب فاذا لم يدّهن روى منه (۱)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے نبی کریم ﷺ کے سفید بالوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ جب نبی کریم ﷺ تیل کا استعمال فرماتے تھے تو بالوں کی سفیدی دکھائی نہیں دیتی تھی اور جب تیل استعمال نہیں فرماتے تھے تو کچھ سفیدی دکھائی دیتی تھی۔

---

(۱)صحیح مسلم ۲/۲۰۸ کتاب الفضائل باب شیبة، سنن نسائی ۲/۲۸۱ کتاب الزینة باب الدهن (مختار)

اذا دّهن راسه: دهن ثلاثی مجرد کے صیغے سے بھی مروی ہے۔اور ادهن افتعال کے صیغے کے ساتھ بھی مروی ہے۔جوکہ اصل میں ادتھن تھا۔تاءکودال سے بدل کردال کودال میں مدغم کیا گیا۔دونوں کا معنی ایک ہے۔لم یر منه شئی اس کی وجہ یہ تھی کہ بالوں میں تیل لگانے سے چمک آجاتی ہے جس کی وجہ سے سفیدی مغلوب ہوجاتی ہے اور دکھائی نہیں دیتی۔فاذالم یدهّن یہاں پر بھی باب افتعال اور ثلاثی مجرد دونوں طرح مروی ہے۔پہلی صورت میں دال مشدد اور دوسری صورت میں غیر مشدد ہوگا۔ رُوی منه جب بال خشک اور پریشان ہوں تو سفید بال نمایاں نظر آتے ہیں بہرحال اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے بالوں میں سفید بال بہت کم تعداد میں تھے۔

(۴) حدّثنا محمّد بن عمر بن الولید الکندیّ الکوفّی أنا یحیی بن ادم عن شریک عن عبداللّٰہ بن عمر عن نافع عن ابن عمرقال إنّما کان شیب رسول اللّٰہ ﷺ نحوا من عشرین شعرة بیضاء(۱)

ترجمہ:حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے سفید بال تقریباً بیس تھے۔

عن عبداللّٰه بن عمرؒ یہ تبع تابعی ہیں اور مشہور صحابی حضرت ابن عمرؓ کے بھتیجے حفص بن عاصمؒ کے پوتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ: عن ابن عمر بن الخطابؓ یہ مشہور صحابی ہیں۔۔نبی کریم ﷺ کی بعثت کے کچھ عرصہ بعد پیدا ہوئے نام عبداللہ تھا۔والد کے ساتھ ہجرت کی۔بعض علماء کے خیال میں جنگ احد میں شریک ہوئے جبکہ بعض کے خیال میں جنگ احد میں صغرسنی کی وجہ سے آپ کو شرکت کی اجازت نہیں ملی۔البتہ بعد کے تمام غزوات نیز بیعتِ رضوان میں شریک رہے۔نبی کریم ﷺ سے ایک ہزار چھ سو تین احادیث روایت کی ہیں۔اتباع سنت اور کثرتِ صدقہ کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔۷۳ھ یا۷۴ھ میں وفات پائی۔

---

(۱)سنن ابن ماجة ۲۵۸ کتاب اللباس من ترک الخضاب، صحیح ابن حبان۸/۷۰باب صفة النبی ﷺ و اخباره(مختار)

نحواً من عشرین الخ اس حدیث میں بیس کے قریب بالوں کا ذکر ہے۔اور پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ حضرت انسؓ کی حدیث سے اس کا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(۵) حدثنا ابو کریب محمّد بن العلاء أنا معاویة بن ھشام عن شیبان عن أبی إسحاق عن عکرمة عن ابن عباس قال قال أبو بکر یا رسول اللّٰہ ﷺ قد شبت قال شیّبتنی ھود والواقعة والمرسلات و عم یتساء لون واذا الشّمس کوّرت (۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ تو بوڑھے ہوگئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے **سورة ھود، سورة واقعه، سورة مرسلات، عمّ یتساء لون** اور **سورة اذا الشّمس کوّرت** نے بوڑھا کردیا۔

یا رسول اللّٰہ ﷺ قد شبت حضرت ابوبکر صدیقؓ کو نبی کریم ﷺ سے انتہائی درجہ کا عشق تھا۔ ہروقت یہ غم ہوتا کہ کہیں جدائی نہ آجائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب نبی کریم ﷺ کے بالوں میں سفید بال دیکھے۔ چہرۂ انور پر کمزوری اور جسمانی قوتوں میں اضمحلال محسوس ہوا تو کہا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ تو بوڑھے ہوگئے ہیں۔

احساس ذمہ داری کی انتہا: **شیّبتنی ھود** نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ مجھے سورۂ ھود نے بوڑھا کردیا۔ مطلب یہ کہ وحی اور قرآن کے احکام، فریضہ نبوت کی ذمہ داریوں اور اللہ تعالیٰ کے براہ راست خطاب کے بوجھ اور تقاضوں نے فکرمند کردیا ہے۔ کہ یہ ذمہ داریاں پوری بھی ہونگیں یا نہیں اور یہ فرض ادا کرنے کی توفیق بھی ملے گی یا نہیں۔ اور فکروں کی زیادتی اور احساس کی دامنگیری بڑھاپے کا سبب بنی۔ کیونکہ افکار انسان کو کمزور ولاغر اور بوڑھا کردیتے ہیں۔ متنبّی کہتا ہے ؎

والھمّ یخترم الجسیم نحافة ولیشیب ناصیة الصبی و یخرم

(۱) مستدرک للحاکم ۲/۳۴۳ کتاب التفسیر تفسیر سورة ھود، جامع الترمذی ۲/۱۴۴ کتاب التعبیر باب ومن سورة الواقعه (مختار)

اور قرآن مجید تو ہر قدم پر ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے۔ پھر بعض سورتوں میں تو وعیدیں اور جہنم و آخرت کے احوال و شدائد بکثرت مذکور ہیں۔ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کا یقین اور عالمِ آخرت پر پختہ ایمان سونے پر سہاگہ تھا۔

سورۃ ہود میں استقامۃ کا حکم: خصوصاً **سورۃ ہود** کا حکم کہ **"فاستقم کما امرت"** بہت بھاری حکم تھا کیونکہ اس میں ثابت قدمی اور قواعد وضوابط کی پابندی کی تاکید ہے۔ ویسے بھی استقامت بڑا مشکل کام ہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں **الاستقامة خير من ألف كرامة** استقامت ہزار کرامتوں سے افضل ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس میں تکلیف زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص ایک دو روز عشاء کے بعد دس گھنٹے تک مطالعہ بھی آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں لیکن اگر وہ عزم کرے کہ وہ ہمیشہ کیلئے عشاء کے بعد صرف ایک گھنٹہ تسلسل اور پابندی سے مطالعہ کرے گا۔ چاہے اس وقت اس کا باپ یا عزیز دوست اس کا منتظر کیوں نہ ہو۔ جلسہ، جلوس یا کوئی دوسرا پروگرام کیوں نہ ہو۔ وہ ایک گھنٹہ ضرور مطالعہ میں صرف کرے گا۔ تو یہ استقامت مشکل کام ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اس انضباط اوقات اور پابندی میں بڑی کامیابی بھی مضمر ہیں۔

شرح السنة میں لکھا ہے کہ کسی نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ سورۂ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں ایک آیت ہے۔ کہ **واستقم کما امرت** کہ استقامت خود بھی مشکل کام ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ امر کے موافق ہونا بھی شرط ہے۔ انسان ہزار بار کوشش کرے۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کما حقہ نہ ہو سکے۔ خود نبی کریم ﷺ کو بھی اس بات کا اعتراف و احساس تھا۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ **ما عبدناک حق عبادتک** یعنی اے اللہ ہم نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا۔

نبی کریم ﷺ نے اس مقام پر سورۂ ہود کی آیت کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ سورۂ شوریٰ میں بھی بالکل اسی قسم کی آیت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **فَلِذٰلِکَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ**۔ اسی دین کی طرف بلاؤ اور جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ویسے ثابت قدم رہو۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ ہود میں

''فاستقم کما امرت'' کے ساتھ ''ومن تاب معک'' کا اضافہ بھی آیا ہے۔یعنی نبی کریم ﷺ کو حکم ہے کہ وہ خود بھی ضوابط کے مطابق رہیں۔اور مومنین کو بھی استقامت پر رکھنا تھا۔نبی کریم ﷺ کو یہ فکر زیادہ دامن گیر تھا کہ میں تو توفیق الٰہی سے استقامت پر رہ سکوں گا۔لیکن امت سے اس میں کوتاہی ہوئی تو اس کا جواب کون دے گا۔اگر اس کا محاسبہ بھی مجھ ہی سے ہوا تو یہ مشکل ہے۔علاوہ ازیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سب سے پہلے یہ امر سورۃ ہود میں نازل ہوا ہو لہٰذا شوریٰ کے امر کا اعتبار نہیں کیا گیا۔

والواقعة والمرسلٰت:ان تمام سورتوں میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اصطلاح کے مطابق **تذکیر بآلاء اللّٰہ ، تذکیر بما بعد الموت** اور **تذکیر بایام اللّٰہ** تینوں مضامین بکثرت آئے ہیں۔

اور بعض روایات میں **سورة الحاقة، سورة القارعة** اور **سورة الغاشية** کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان تمام سورتوں میں قیامت،جہنم اور آخرت کی دہشت اور ھول کا بیان ہے۔

(۲) حدّثنا سفیان بن وکیع أنا محمّد بن بشر عن علیّ بن صالح عن أبی إسحاق عن أبی جحیفة قال قالو یا رسول اللّٰہ نراک قد شبت قال شیّبتنی ھو دوا خواتھا (۱).

ترجمہ: حضرت ابوجحیفہؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ بوڑھے ہوچکے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے سورۂ ھود اور اس کے مثل سورتوں نے بوڑھا کردیا۔

عن أبی حجیفة الخ جحیفۃ تصغیر کے وزن پر ہے ان کا نام وھب بن عامر بن صعصعہ سوائی کوفی تھا۔حضرت علیؓ آپؓ سے محبت کرتے تھے اور آپؓ کو وھب الخیر کہا کرتے تھے۔نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت آپؓ نابالغ تھے۔آپؓ سے کل پچاس حدیثیں مروی ہیں ۷۴ھ کو وفات پائی۔

قد شبت الخ. صرف بالوں کی سفیدی مراد نہیں کیونکہ روایات کے مطابق وہ تو برائے نام تھی بلکہ مراد یہ ہے کہ بدن بھاری اور مضمحل ہوگیا ہے اور اُٹھنے کے لئے بھی سہارے کی ضرورت ہوتی تھی۔

---

(۱)الحلیة الاولیاء لابی نعیم ۳۵۰/۴ بطریق آخر(مختار)

شیبّتنی ھود الخ. جس میں قیامت وجہنم کے مصائب کا ذکراوراستقامت کا حکم ہے علامہ زمخشری کا بیان ہے کہ ایک شخص نے خواب میں جہنم اور قیامت کا منظر دیکھا۔صبح ہوئی تو راتوں رات سیاہ داڑھی بالکل سفید ہوچکی تھی۔تو نبی کریم ﷺ کو بھی جہنم اوراس کے عذاب پر یقین بلکہ مشاہدہ تھا لہٰذا آپ ﷺ کے بڑھاپے کا سبب بھی عذابوں کا ذکر بن سکتا ہے۔

بعض دیگرروایات میں سورۃواقعۃ ، سورۃالحاقۃ، سورۃسائل، سورۃاقتربت الساعۃ کا ذکربھی آیا ہے جن میں قیامت اوراس کے عذابوں کا امتیازی ذکر ہے(۱)۔

(۷) حدّثنا علیّ بن حجر قال أنبانا شعیب بن صفوان عن عبدالملک بن عمیر عن أیاد بن لقیط العجلیّ عن أبی رمثۃ التیمیّ تیم الرّباب قال أتیت النبی ﷺ و معی ابن لی قال فَأُرِیتُہ فقلت لمّا رأیتہ ھذا نبی اللّٰہ وعلیہ ثوبان أخضران ولہ شعر قد علاہ الشیب و شیبہ احمر(۲).

ترجمہ: حضرت ابو رمثۃ التیمیؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔مجھے نبی کریم ﷺ دکھائے گئے۔میں نے دیکھا تو مجھے بے اختیارفوراًیہ کہنا پڑا کہ واقعی یہ اللہ کے سچے نبی ہیں۔اس وقت نبی کریم ﷺ سبز کپڑوں میں ملبوس تھے۔اورآپ ﷺ کے چند بالوں پر بڑھاپے کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔لیکن وہ سرخ تھے۔

تیم الرِباب: عن أبی رمثۃ التیمیّ تیم الرِباب ۔رمثہ کا راءمکسور ہے۔مشہور صحابی ہیں آپؓ کے نام میں اختلاف ہے۔اس سلسلے میں چار نام خباب(۳)، رفاعہ، جندب، اور خشخاش مروی ہیں۔

(۱)اس لئے مفسرین حضرات نے لکھا ہے کہ اخوات سے مراد وہ سورتیں جس میں آخرت کی عذاب، قیامت اور جہنم کے عذاب کا ذکر ہو ماقبل حدیث میں ذکر شدہ سورتوں میں انحصار نہیں۔(مختار)

(۲)ابو داؤد ۲/۲۲۲ کتاب الترجل باب فی الخضاب (مختار)

(۳)علامہ بیجوریؒ نے خباب کی جگہ حیان لکھا ہے(اصلاح الدین)

تیم عرب کا ایک بڑا قبیلہ ہے اس میں پانچ شاخیں ہیں۔ضبہ،ثور،عکل،تیم اور عدی ان لوگوں نے کسی موقع پر تیل کی تلچھٹ میں ہاتھ ڈبوڈبو کر آپس میں مدد کی قسمیں کھائیں۔چونکہ تلچھٹ کو رباب کہتے ہیں اسلئے ان کو تیم الرباب کہا جانے لگا۔بنو بکر کا بھی ایک قبیلہ تیم ہے جس کو تیم قریش کہتے ہیں اور چونکہ مراد اول الذکر قبیلہ تھا اس لئے التیمی کے بعد تیم الرباب کا لفظ بڑھا دیا۔

فاریته مجہول کا صیغہ ہے غالباً صحابی نے اہل مجلس میں سے کسی سے پوچھا ہو جس کے بعد کسی نے اشارہ کر دیا ہو کہ نبی کریم ﷺ وہ ہیں۔

هـذا نبـي اللّٰه مطلب یہ ہے کہ میں نے جان لیا کہ واقعی یہ شخص اللہ کے نبی ہیں۔گویا نورِ نبوت اس قدر واضح تھا کہ دیکھتے ہی یقین ہو گیا۔

وعليه ثوبان أخضران. یعنی آپ سبز چادروں کا جوڑا زیبِ تن کئے ہوئے تھے۔

بالوں میں سرخی کیوں تھی: **ولـه شـعـر قـد علاه الشيب ـ شعرٌ** میں تنوین تقلیل کیلئے ہے یعنی معدودے چند بالوں پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ **وشيبـه احـمـر** یعنی جن بالوں کا رنگ متغیر ہو چکا تھا۔وہ سرخ تھے۔شراح میں سے بعض کا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب لگایا تھا۔ لیکن یہ مہندی کا سرخی مائل خضاب تھا جبکہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ سرخی خضاب یا مہندی کی سبب نہ تھی بلکہ ذاتی سرخی تھی۔ کیونکہ بال مکمل سفید ہونے سے پہلے سرخ ہو جاتے ہیں۔ تو یہ نبی کریم ﷺ کے بالوں میں سفیدی آنے کی ابتدائی حالت تھی۔

(۸) حدّثنا أحمد بن منيع أنا سريح بن النعمان أنا حمّاد بن سلمة عـن سـمـاک بـن حـرب قـال قيـل لـجابربن سمرة أمّا كان في راس رسـول الـلّـه ﷺ شيـب قال لم يكن في راس رسول الله ﷺ شيب إلاّشعرات في مفرق راسه اذا دّهن واَرَاهنّ الدّهن(۱) .

ترجمہ: سماک بن حرب ؓ کہتے ہیں کہ حضرت جابر بن سمرہ ؓ سے کسی نے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ کے سر کے بالوں میں سفیدی نہیں تھی تو انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ کے

---

(۱)المستدرک للحاکم ۲/۶۰۷ باب ذکر خضاب رسول اللّٰہ ﷺ(مختار)

سر مبارک میں صرف چند بال مانگ پر سفید تھے۔ جب آپ ﷺ تیل لگا لیتے تھے تو تیل ان کو چھپا دیتا تھا۔

إلا شعرات فی مفرق رأسه الخ مانگ پر جہاں بال جدا ہوں کچھ سفید بال تھے مگر یہ بال تھوڑے تھے کیونکہ شعرات کی تنوین تقلیل کے لئے ہیں۔

واراهن الدهن مواراة سے ماضی کا صیغہ ہے۔ چھپانے میں مبالغہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ **فاواری سؤة اخی** (تاکہ میں اپنے بھائی کی لاش چھپالوں) مطلب یہ کہ بالوں میں تیل لگنے کی وجہ سے چمک آجاتی ہے۔ اور وہ جم جاتے ہیں۔ تو سفید بال بھی غائب ہو جاتے تھے۔

۶. باب ما جاء فی خضاب رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے خضاب لگانے کے بیان میں

خضاب کا معنی: خضاب لغت میں مایخضب بہ کو کہتے ہیں یعنی وہ چیز جس سے بالوں کو رنگا جاتا ہے اور عموماً وہ مہندی اور کتم ہوا کرتا ہے۔ جس طرح کہ حضرت ابوذرؓ کی ایک حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے فرماتے ہیں۔ أحسن ما غیّر بہ ھذا الشیب الحناء و الکتم(۱)۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خضاب خضب یخضبُ سے مصدر ہے۔ بالوں کو رنگ دینے کے معنی میں مستعمل ہے اور چونکہ دیگر ابواب میں بھی الفاظ مصدری معانی پر محمول ہیں اس لیے اس مقام پر مؤخر الذکر معنی راجح بھی ہے۔ اس باب میں امام ترمذیؒ نے چار احادیث لائے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے خضاب لگایا یا نہیں؟ روایات اس سلسلے میں مختلف ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب کا استعمال کیا ہے یا نہیں۔ بعض روایات سے اثبات معلوم ہوتا ہے اور بعض روایات سے خضاب لگانے کی نفی ہوتی ہے۔ مسلمؒ اور بخاریؒ کی ایک حدیث میں خضاب کا حکم بھی آتا ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ أنّ الیھود و النصاریٰ لا یصبغون فخالفوا ھم (۲)۔ کہ بیشک یہود اور نصاریٰ بالوں کو نہیں رنگتے۔ لہٰذا تم ان کی مخالفت کرو۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ أنّ رسول اللّٰہ ﷺ کان یصبغ بالصفرۃ(۳)۔ اسی طرح اس باب کی دوسری حدیث سے بھی رسول اللہ ﷺ کے عمل کی تصریح موجود ہے۔

جبکہ جامع ترمذیؒ میں امام ترمذیؒ نے کعب بن مرۃؓ کی حدیث ذکر کی ہے جس سے خضاب کی مخالفت معلوم ہوتی ہے۔

---

(۱)ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۲۲، کتاب الترجل باب فی الخضاب ، ترمذی جلد ۱ ص ۲۰۸ .ابواب اللباس باب ماجاء فی الخضاب ص۳۰۵(مختار)

(۲) بخاری جلد ۲ ص ۸۷۵ کتاب اللباس باب الخضاب، ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۲۲ کتاب الترجل باب فی الخضاب(مختار)

(۳)بخاری جلد ۲ ص ۸۷۰ باب النعال السبتیّۃ وغیرھا کتاب اللباس(مختار)

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ من شاب شیبة فی الاسلام کانت له نوراً یوم القیامة (۱) جس شخص کے بال اسلام کی حالت میں سفید ہو گئے۔ تو یہ سفیدی قیامت کے روز اس کیلئے نور ہو گی۔

اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ أنّ النّبیّ ﷺ کان یکره تغییره الشیب (۲)۔ نبی کریم ﷺ سفید بالوں کا رنگ بدلنے کو بُرا مانتے تھے۔

شراح کہتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب کا استعمال نہیں کیا۔ جیسا کہ پہلی حدیث میں امام ترمذیؒ نے اپنی رائے خوب واضح طور پر دیدی ہے۔ اور پچھلے باب کی تقریباً تمام احادیث بھی اس کی دلیل ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب نہیں لگایا۔ صحابہ میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کا خضاب لگانا ثابت ہے۔ جبکہ حضرت علیؓ، حضرت سلمۃ بن الاکوعؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ سے خضاب نہ لگانا ثابت ہے۔

علماء احناف کا بھی اسی طرف میلان ہے۔ درمختار میں اس بات کی تصریح ہے کہ وہ روایات زیادہ صحیح ہیں جو نبی کریم ﷺ کے خضاب نہ لگانے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں مفصل بحث ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔ اور جن روایات میں خضاب لگانے کا بیان ہے تو ان کا مختلف طریقوں سے جواب دیا جاتا ہے۔

(۱) یہ کہ نبی کریم ﷺ کے بالوں میں سیاہی کے بعد سرخی نمودار ہو چکی تھی۔ جس طرح کہ عموماً بالوں میں سفیدی آنے سے قبل سرخی آتی ہے۔ اس فطری سرخی کو مجازاً خضاب سے تعبیر کیا گیا تھا۔ دراصل یہ خضاب نہ تھا بلکہ وہ ذاتی سرخی تھی جو سفیدی آنے سے قبل بالوں کو لگتی ہے۔ اور رأیت شعر رسول اللّٰہ مخضوباً کا یہی معنی ہے کہ وہ رنگ شدہ دکھائی دے رہے تھے دراصل اس کو خضاب لگا نہ تھا۔

(۲) بعض لوگوں نے اختلاف روایات کو اختلاف اوقات پر حمل کیا ہے۔ گویا نبی کریم ﷺ کبھی کبھی خضاب لگاتے تھے لیکن اکثر خضاب نہیں لگاتے تھے۔ چنانچہ بعض صحابہ نے خضاب کی حالت میں

---

(۱) جامع ترمذی جلد ۱ ص ۱۹۷ و مثله السنن النسائی ۲/۲۲۵ کتاب اللباس باب فی نتف الشیب، کنز العمال ۱۵/۶۶۶ رقم الحدیث ۴۲۶۴۳ (مختار)

(۲) و مثله فی السنن النسائی ۲/۲۲۶ کتاب اللباس باب ماجاء فی خضاب السواد (مختار)

آپ ﷺ کو دیکھا اور بعض دوسرے صحابہ نے آپ ﷺ کے خضاب کونہیں دیکھا تھا۔لہٰذا اس کی خبر دی۔
علامہ ابن حجرؒ نے بھی اس اختلاف کواختلافِ زمانہ پرحمل کیا ہے۔

(۳) بعض لوگوں نے خضاب نہ لگانے کی تاویل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اگر چہ بعض اوقات کتم یا مہندی سے خضاب لگایا ہے لیکن وہ دراصل بالوں کو رنگنے کی نیت سے نہ تھی۔ بلکہ بالوں کے آخرعمر تک سیاہ ہونے کے سبب آپ کوتلوین الشعر کی ضرورت ہی پیش نہ آئی اور اگر کبھی نبی کریم ﷺ سے خضاب لگانا ثابت بھی ہے تو وہ گرمی کی شدت کوکم کرنے یا کسی دوسری تکلیف کی وجہ سے بطور دواء آپ ﷺ نے کیا ہے۔جیسا کہ عام طور پر تبرید کے لئے ہاتھ پاؤں پر بھی مہندی لگاتے ہیں۔تو نبی کریم ﷺ نے سردی یا مرض کے علاج اور تداوی کیلئے مہندی لگائی ہوگی۔ بالوں کو رنگنے کی غرض سے نہیں گویا آپ ﷺ نے خضاب کے اصل مقصد سے خضاب نہیں لگایا۔لہٰذا دونوں قسم کی روایات میں کوئی تعارض نہیں۔

بہرحال امام ترمذیؒ کے نزدیک زیادہ راجح یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب استعمال نہیں کیا۔ اور آگے اس کی وجہ کی طرف بھی ''لم یبلغ الشیب ''میں اشارہ کردیا کہ آپ ﷺ کے بال سیاہ ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کوخضاب کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔

(۱) حدّثنا أحمد بن منیع أنا ھشیم أنا عبدالملک بن عمیر عن أیاد بن لقیط قال أخبرنی أبو رمثة قال أتیت رسول اللّٰہ ﷺ مع ابن لی فقال ابنک ھذا فقلت نعم اشھدبه قال لایجنی علیک و لا تجنی علیه قال ورأیت الشیب أحمر قال أبو عیسیٰ ھذا أحسن شئی روی فی ھذا الباب و افسّره لان الروایات الصحیحة اَنّ النّبیّ ﷺ لم یبلغ الشیب و أبورمثة إسمه رفاعة بن یثربی التیمیّ(۱).

ترجمہ: حضرت ابورمثہؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے بیٹے کوساتھ لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تیرا بیٹا یہ ہے میں نے کہا۔ہاں

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/ ۲۲۶ باب الخضاب کتاب الترجل ،سنن نسائی باب الخضاب بالحناء و الکتم کتاب الزینة ج ۲ ص ۲۷۷ (مختار)

یہ میرا بیٹا ہے۔آپ اس کے گواہ رہئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کی جنایت کا
بدلہ تجھ پر نہیں اور تیری جنایت کا بدلہ اس پر نہیں۔ابو رمثہؓ کہتے ہیں کہ اس وقت میں
نے آپ ﷺ کے بعض بالوں کو سرخ دیکھا۔

ابنک هذا الخ یہاں پر ھمزہ استفہام محذوف ہے **ابنک مبتدا** اور **ھذا** اس کی خبر ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو پہلے سے حضرت ابو رمثہؓ کے بیٹے کے بارے میں اجمالی پتہ چلا ہو۔اب دیکھا تو پوچھا کہ کیا تیرا بیٹا یہی ہے۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ ہذا مبتداء مؤخر ہو اور ابنک خبر ہو۔پھر سوال یوں ہوگا کہ کیا یہ تیرا بیٹا ہے۔**فقلت نعم اشهد** عام شراح کے نزدیک یہ امر کے صیغے سے مروی ہے۔گویا حضرت ابو رمثہؓ نبی کریم ﷺ کو اس بات پر گواہ بنانا چاہتے ہیں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ تا کہ اگر کبھی کسی ایک کا دوسرے کی جگہ مواخذے کی ضرورت پڑی تو میرا یہ اقرار بالنسب معلوم ہو۔ نبی کریم ﷺ کا جواب بھی اس تشریح سے مناسبت رکھتا ہے۔اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مضارع سے متکلم کا صیغہ ہو۔اور اخبار ہو۔اس صورت میں یہ **نعم** کی تاکید ہوگی۔اور مقصود وہی ہوگا کہ جاہلیت کے رسم کے مطابق ہم ایک دوسرے کی جگہ مواخذے کے لئے تیار ہیں۔اور اخبار ہو یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔

<u>ایک کے بدلے دوسرے کا مؤاخذہ رسم جاہلیت:</u> **قال لا یجنی علیک الخ** اس جملہ کے تین مطلب بیان کئے جاتے ہیں۔

(۱) اول یہ کہ یہ قول نبی کریم ﷺ کی طرف سے حضرت ابو رمثہؓ کو دعا ہو۔مطلب یہ ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لئے عافیت وسلامتی کا باعث بنو۔باپ پر بیٹے کی وجہ سے اور بیٹے پر باپ کی وجہ سے جرمانہ نہ آئے۔اللہ تعالیٰ تم میں سے ہر ایک کو جرائم و جنایات سے محفوظ رکھے۔تا کہ وہ دوسرے کے لئے تکلیف اور پریشانی کا سبب نہ بنے۔

(۲) دوم یہ کہ یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے پیشن گوئی ہے کہ مستقبل میں نہ تم جرم کروگے۔جس کی سزا تیرا بیٹا بھگتے اور نہ تیرا بیٹا ارتکاب جرم کرے گا کہ جس کی سزا تم کو بھگتنا پڑے۔

(۳) تیسری اور سب سے واضح تشریح یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اس صحابی کے قول سے جاہلیت کے

فرسودہ رسم کی بو آئی۔ وہ یہ کہ دراصل یہ صحابی اپنے نسب پر نبی کریم ﷺ کو اس لئے گواہ بنانا چاہتے تھے کہ اس کا بیٹا آئندہ کیلئے اس سے سرزد جرائم میں اس کی جگہ ماخوذ ہو سکے۔ کیونکہ اس وقت کے رواج کے مطابق باپ جرم کرتا تو بیٹا پکڑا جاتا تھا۔ اور اگر بیٹا جرم کرتا تو باپ پکڑا جاتا۔ باپ کے جرم میں بیٹے کو قتل بھی کیا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ بیٹے کے جرم میں باپ کو قتل کیا جاسکتا تھا۔ مالی جرمانوں کی حالت بھی یہی تھی کہ ایک کی جگہ دوسرے سے وصول کئے جاسکتے تھے۔ اسلام نے آکر جاہلیت کی یہ رسم مٹادی۔ دنیا کے معاملات میں بھی یہی حکم ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کیلئے جوابدہ ہے۔ دنیا کا معاملہ ہو یا آخرت کا معاملہ۔ بہر صورت ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا۔ ایک شخص دوسرے کی جگہ ماخوذ نہیں ہوگا۔ اس توجیہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے۔ کہ ابوداؤدؒ کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابورمثہؓ کو یہ بھی فرمایا کہ لَاتَزِرُوَازِرَةٌ وِّزْرَاُخْرٰی (۱) کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور یہی فطری ضابطہ اسلام کا مستقل قانون بن گیا۔ بہر حال نبی کریم ﷺ نے اس صحابی کے اس خیال کی تردید کے لئے یہ جملہ کہا کہ قال ورأیت الشیب أحمر ابورمثہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے وہ بال جن کا رنگ بدل چکا تھا سرخ دیکھے۔ اس میں دو احتمال ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ آپ ﷺ کے بال خلقةً سرخ تھے۔ اور یہ مصنوعی رنگ نہ تھا۔ بلکہ قدرتی طور پر آپ ﷺ کے بالوں میں سُرخی آگئی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ راوی کا مقصد یہ ہو کہ آپ ﷺ نے خضاب لگا کر بالوں کو سرخ کردیا تھا۔ مؤخر الذکر احتمال کی تائید حضرت ابورمثہؓ ہی کی ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں آپ نے تصریح فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حنا اور کتم سے خضاب لگایا کرتے تھے (۲)۔ دونوں صورتوں میں تطبیق کی تفصیل ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔

امام ترمذیؒ نے یہی حدیث پچھلے باب میں بھی ذکر کی ہے۔ اور اس باب میں بھی لے آئے۔ اس کی توجیہ بعض لوگوں نے یہ کی ہے کہ پچھلے باب میں اس حدیث کا مطلب یہ تھا کہ حضرت ابورمثہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے بالوں کو متغیر دیکھا تھا۔ جو کہ سیاہی سے سرخ رنگ کیطرف مائل ہو چکے تھے۔ وہاں خضاب لگانے یا نہ لگانے کی بات مقصود نہیں جبکہ یہاں حضرت ابورمثہؓ کے قول کا مطلب یہ ہوگا کہ

---

(۱) جمع الوسائل جلد ۱ ص ۱۱۶ اور ص ۱۱۹

(۲) عن ابی رمثۃ قال کان رسول اللہ ﷺ یخضب بالحناء والکتم (کتاب الوفاء لابن الجوزی)(مختار)

آپ ﷺ کے بالوں کے رنگ کا سرخ ہونا خضاب کی وجہ سے تھا۔ جس طرح کہ ہم پہلے اس کیلئے مؤید بھی لا چکے ہیں اور امام ترمذیؒ کا حدیث کو اس باب میں ذکر کرنا بھی اس کی دلیل ہے۔

قال ابو عیسیٰ هذا احسن شئی الخ. امام ترمذی کہتے ہیں کہ خضاب کے اثبات کے باب میں جو احادیث مروی ہیں ان سب میں راجح اور واضح ترین حدیث یہی ہے کیونکہ دوسری صحیح روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے خضاب نہیں لگایا۔ کیونکہ آپ ﷺ کو اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ امام ترمذیؒ کے ہاں دوسری احادیثِ صحیحہ کو ملحوظ رکھ کر اس حدیث میں تاویل کی جائے گی۔ کہ خلقی سرخی کو دیکھ کر حضرت ابو رمثہؓ کو خضاب کا شبہ ہوا۔ گویا راجح یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خضاب کبھی نہیں لگایا(۱)۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسری صحیح احادیث کے اس جملے کا مقصد کہ ''ان النبی ﷺ لم یبلغ الشیب'' کا معنی یہ لیا جائے کہ آپ ﷺ کے سفید بال بہت کم تعداد میں تھے اور یہ بات خضاب لگانے کے منافی نہیں ہے۔

اور اگر یہ مان لیا جائے تو پھر امام ترمذیؒ کا مقصد یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب استعمال فرمایا تھا۔ البتہ بالوں کو رنگنے کی ضرورت پیش نظر نہیں بلکہ کسی اور مقصد کے لئے ہوگا۔ جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے۔

---

(۱) اور یہی رائے علماء احناف کی ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی خضاب نہیں لگایا تھا وہ قدرتی سرخ تھے۔ **والأصح أنه عليه السلام لم يفعله قال ابن عابدين فانّه لم يحتج إليه لأنّه توفى ولم يبلغ شيبه عشرين شعرة فى رأسه ولحيته بل كان سبع عشرة كما فى البخارى وغيره (ردالمحتار ۶/۴۲۲)** اگرچہ علامہ زبیدی حنفیؒ نے شرح احیاء میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بعض مواقع پر خضاب کا استعمال فرمایا ہے اور یہی مختار ہے (اتحاف السادۃ المتقین) اور یہی بات علامہ بیجوریؒ نے بھی لکھی ہے۔ البتہ حضرات صحابہ کرام سے مثلاً ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ وغیرہ نے سفید بالوں پر خضاب لگائیں ہیں۔ اس لئے علماء احناف کے ہاں بغیر لڑائی کے بھی خضاب لگانا نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔ **ويستحب للرجل خضاب شعره ولحيته ولوفى غير حرب فى الاصح وقال ابن عابدين أن ابابكرؓ خضب بالحناء والكتم (ردالمحتار و درمختار ۶/۴۲۲)(مختار)**

اور شوافع کے ہاں سیاہ خضاب کے علاوہ دوسرے خضاب لگانا سنت ہے اور سیاہ خضاب حرام ہے۔ علامہ بیجوریؒ فرماتے ہیں **وهو عندنا معاشر الشافعية بغير السواد سنة وبالسواد حرام يدل لنا مافى الصحيحين لما جئ بأبى قحافة يوم الفتح للنبىّ ﷺ ولحيته ورأسه كالثغامة بياضاً فقال غيّروا هذا الشيب واجتنبوا السواد (المواهب اللدنية ص ۵۰)(مختار)**

لان الروایات الخ یہ دراصل ماسبق کی علت نہیں بن سکتا بلکہ یہاں معلول محذوف ہوگا۔ خلاصۂ عبارت یہ ہوگا کہ یہ حدیث احسن اور زیادہ واضح تو ہے لیکن اس کے مقابلے میں زیادہ صحیح روایات خضاب کی عدم ضرورت پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا مقصد کے لحاظ سے یہ اصح نہیں ہے۔ علامہ بیجوریؒ نے تقدیر عبارت یہ نکالی ہے کہ ''ھذا أحسن شئی روی فی ھذا الباب وافسر وانّما لم یکن صحیحا لانّ الرویات الخ''(۱)

وأبو رمثة إسمه الخ امام ترمذیؒ صحابی کا تعارف کراتے ہیں لیکن ان کے نام میں اختلاف منقول ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔

(۲) حدثناسفیٰن بن وکیع قال أنا أبی عن شریک عن عثمان ابن موھب قال سئل أبو ھریرة ھل خضب رسول اللّٰہ ﷺ قال نعم قال أبو عیسیٰ وروی أبو عوانة ھذا الحدیث عن عثمان بن عبداللّٰہ ابن موھب فقال عن أمّ سلمة(۲).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا نبی کریم ﷺ خضاب لگایا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ ھل خضب رسول اللّٰہ کا سائل غیر معلوم ہے لیکن عثمان بن عبداللہ بن موہب تیمی کی ملاقات حضرت ابو ہریرہؓ سے ثابت ہے۔ قال نعم اس میں نبی کریم ﷺ کے خضاب لگانے کی تصریح ہے۔ گویا کبھی کبھی آپ ﷺ نے خضاب لگایا تھا۔ لیکن یہ بال رنگنے کے لئے نہ تھا کیونکہ آپ ﷺ کے بالوں میں معدودے چند بال سفید تھے۔ بلکہ شاید دوسرے اغراض سے آپ ﷺ نے خضاب استعمال فرمایا تھا۔

---

(۱)المواھب اللدنیة ص ۵۹

(۲)صحیح البخاری جلدثانی کتاب اللباس باب الخضاب ص ۸۷۵، وابن ماجه کتاب اللباس باب الخضاب ص ۲۵۸ (مختار)

قال ابو عیسیٰ (۱) **وروی أبو عوانة الخ** اس سند کے لحاظ سے یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی جگہ حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے۔امام ترمذیؒ کی غرض یا تو پہلے سند کی تقویت اور اثبات ہے۔اور یا اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ سند میں شریک کو وہم ہوا ہے۔جبکہ حقیقت میں یہ حدیث ابو ہریرہؓ کی بجائے حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے۔ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ "**بل لم یر دعن ابی هریرة فی هذا الباب شئی فدلّ علی أنّ مراد المصنف با یراد طریق ابی عوانة الاشارة إلیٰ أنّ روایة شریک شاذة بل منکرة**"نیز اس طریق کے بیان میں یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ موھب عثمانؓ کے دادا کا نام ہے والد کا نہیں۔

(۳) **حدثنا إبراهیم بن هارون قال أنبانا النضر بن زرارة عن أبی جناب عن أیاد بن لقیط عن الجهذمة امراة بشیر بن الخصاصیة قالت أنا رأیت رسول اللّٰه ﷺ یخرج من بیته ینفض راسه وقد اغتسل وبراسه ردع او قال ردغ من حناء شک فی هذا الشیخ**(۲).

ترجمہ: بشیر بن الخصاصیۃ کی بیوی جہذمہؓ سے روایت ہے۔فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو مکان سے باہر تشریف لاتے ہوئے دیکھا کہ آپ ﷺ نے غسل فرمایا تھا چنانچہ آپ ﷺ سر مبارک کے بال جھاڑ رہے تھے اور آپ ﷺ کے سر پر حنا کا اثر تھا۔

جهذمة رضی اللّٰه عنها: الجهذمة جلیل القدر صحابیہ ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے ان کا نام تبدیل کر کے لیلیٰ رکھا تھا۔جبکہ ان کے خاوند کا نام زحم تھا۔اسے بھی رسول اللہ ﷺ نے بدل کر بشیر نام رکھ دیا تھا۔ابن الخصاصیۃ علانیہ کے وزن پر یہ کبشہ نامی عورت کا لقب ہے جو کہ بشیر کے جدات میں سے ہے اور خصاصۃ بن عمرو بن کعب کی طرف منسوب ہے۔

---

(۱)**قال ابو عیسیٰ** میں دو احتمال ہیں (۱) یہ تلامذہ کا اضافہ ہے (۲) مصنف کا اپنا کلام ہے۔اس لئے کہ آپؒ کی کنیت آپ کے اسم (نام) پر غالب ہے۔علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **بناء علی غلبة کنیته علی اسمه وهو فی ذلک تبع لشیخه ومقتداه وهو الإمام أبو عبداللّٰه محمّد بن إسماعیل البخاریّ حیث عبّر فی صحیحه وسائر تصانیفه ایضاً عن نفسه بأبی عبداللّٰه (جمع الوسائل ۱/۱۱۹) (مختار)**

(۲)**تفرد به الامام الترمذی بهذا الحدیث**

بر أسہ ردع: علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ **ردع** کے معنی رنگ کے ہوتے ہیں۔جبکہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ کے نزدیک ورس یا زعفران سے لتھیڑنے کو کہتے ہیں۔یعنی زعفران کو پانی میں ملا کر گھاڑا کیا گیا تھا اور اسے سر مبارک پر مہندی کی طرح لگایا تھا۔

جبکہ دوسرے محققین کہتے ہیں کہ ردع خود زعفران کو کہتے ہیں۔تو گویا نبی کریم ﷺ نے سر پر مہندی کی طرح لگایا تھا۔ **او قال ردغ** امام ترمذیؒ کے استاد ابراہیم بن ہارون کو شک ہوا ہے کہ نضرؒ نے ردع کہا تھا یا ردغ۔ردغ اور ردغۃ کیچڑ کو کہتے ہیں لیکن مجازاً اس سے مراد زعفران ہی ہوگا جسے کیچڑ کی طرح گاڑھا بنا کر سر پر لگایا گیا تھا۔بعض نسخوں میں **او ردغ من حناءٍ** مذکور ہے۔بہر حال پہلی روایت راجح ہے۔

(۴) حدثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن أنا عمرو بن عاصم أنا حمّاد بن سلمۃ أنا حمید عن أنس قال رأیت شعر رسول اللّٰہ ﷺ مخضوباً قال حمّاد و أخبرنا عبداللّٰہ بن محمّد بن عقیل قال رأیت شعر رسول اللّٰہ ﷺ عندأنس بن مالک مخضوبا(۱)

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے بالوں کو خضاب لگا ہوا دیکھا۔

رأیت شعر الخ اس سے قبل خود انسؓ سے نبی کریم ﷺ سے خضاب کی نفی منقول تھی۔لہٰذا اس حدیث کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ بعض احوال میں نبی کریم ﷺ نے خضاب لگایا بھی تھا۔جبکہ اکثر نہیں لگاتے تھے۔یا پھر خلقۃً سرخی کو خضاب کہا گیا ہے۔گویا کہ کلام تشبیہ پر مبنی ہوگا۔تقدیر یہ ہوگی کہ **رأیت شعر رسول اللّٰہ أحمر کالمخضوب.**

قال حمّاد و أخبرنا عبداللّٰہ الخ پچھلی سند میں مذکور حماد بن سلمہ ہی مراد ہیں۔وہ اپنے استاد عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت انسؓ کے ہاں نبی کریم ﷺ کے خضاب لگائے بال دیکھے۔

<u>تبرکات نبوی ﷺ سے عشق:</u> **عند أنس مخضوباً** حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے سر مبارک کے بال مونڈھ لئے تھے اور بال صحابہؓ میں تقسیم فرمائے تھے۔اب بھی اگر کہیں وہ موجود

(۱) تفرد بہ الامام الترمذی بھذا الحدیث

ہوں تو اگر چہ ثبوت قطعی نہ بھی ہو۔لیکن محض نسبت کی وجہ سے بھی ہمارے لئے قابل احترام اور واجب التعظیم ہیں۔اور کچھ بعید بھی نہیں کہ یقیناً وہ موجود ہوں ۔کیونکہ صحابہ آپ ﷺ کے تبرکات کی حفاظت کا اہتمام بھی فرماتے تھے۔حضرت امیر معاویہؓ نے آپ ﷺ کا ایک کٹورا کئی لاکھ درہم میں خریدا تھا۔اسی طرح کئی لاکھ درہم دے کر آپ ﷺ کے ناخن مبارک خرید لئے تھے۔اور مرتے وقت وصیت فرمائی تھی کہ مجھے دفن کرتے وقت یہ ناخن میری آنکھوں میں ڈال دو۔صحابہؓ کے عشق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے وضوء کا پانی بلکہ تھوک بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے تھے۔حضرت انسؓ تو آپ ﷺ کے خاص خادم تھے۔ان کے پاس نبی کریم ﷺ کے بال موجود تھے اور تابعین گاہے گاہے ان کی زیارت سے مشرف ہوتے تھے۔

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے خضاب لگانے کا ذکر نہیں۔ہاں بالوں کا ذکر ہے کہ وہ رنگے ہوئے معلوم ہورہے تھے۔شاید یہ وہی قدرتی سرخی ہو جو سفیدی آنے سے قبل بالوں میں لگتی ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خضاب سے ان کا رنگ بدلا ہو۔بعض شراح نے یہ احتمال بھی لکھا ہے کہ حضرت انسؓ نے رسول اللہ ﷺ کی موت کے بعد از خود بالوں پر مہندی یا کتم لگائی ہو کہ یہ تادیر محفوظ رہیں۔ بہر حال اس روایت سے رسول اللہ ﷺ کا خضاب لگانا یقینی طور پر معلوم نہیں ہوتا۔

۷. باب ما جاء فی کحل رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے سرمہ لگانے کے بیان میں

زینت،تطیب اور تطہر کے سلسلۂ ابواب میں ترجل اور خضاب کے بعد سرمہ کے استعمال کا باب منعقد کر رہے ہیں۔پچھلے باب سے مناسبت یوں ہے کہ پچھلے باب میں تلوین شعر سے بحث کی۔اس باب میں تلوین العیون سے بحث ہورہی ہے۔سرمہ کا استعمال تزین کیلئے بھی ہوتا ہے اور دوا کے طور پر استشفاء کیلئے بھی سرمہ کا استعمال مروج ہے۔اس باب میں مصنفؒ نبی کریم ﷺ کے زیر استعمال سرمہ کی ماہیت اور کیفیت استعمال کے بارے میں احادیث لاتے ہیں۔کحل فتح کاف سے ہو تو مصدر ہے۔آنکھوں میں سرمہ ڈالنے کو کہتے ہیں اور ضم کاف سے کل ما یوضع فی العین کو کہتے ہیں۔یعنی ہر اس چیز کا نام ہے جو کہ آنکھوں میں ڈالی جاتی ہے۔

<u>سرمہ کا حکم اور فوائد:</u> سرمہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا قول وعمل اس بات پر دلیل ہے کہ یہ جائز ہے۔لیکن چونکہ یہ تزئین اور دوا دونوں کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور دونوں منافع دنیوی سے ہیں۔اس لئے علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ سرمہ کے استعمال کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا امر ندب اور ارشاد پر محمول ہوگا(۱)۔جبکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرمہ اور خصوصاً اثمد لگانا سنت(۲) ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اسکے بارے میں امر کے علاوہ آپ ﷺ کی مواظبت بھی مروی ہے۔رسول اللہ ﷺ کے پاس جو اسکندرانی ڈبہ

---

(۱)علامہ مرغینانی فرماتے ہیں ولا بأس بالاکتحال للرجال اذاقصد به التداوی دون الزینة(الھدایة ۱/۲۰۳ کتاب الصوم باب یوجب القضاء الخ) اور اسی کے تحت مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے لکھا ہے قوله بالاکتحال الخ قال الأترازیّ یعنی اکتحال الرجل بالکحل الأسود مباح إذاقصدبه الدواء فأمّا الزینة فلاقال العینی معترضاً علیه لاأدری مافائدة تقیید الکحل الاسود(باب مایوجب القضاء الخ الھدایة ۱/۲۰۳)فإنّ الکحل لایکون إلاالأسود أقول لیس کذلک فإنّ الکحل یکون أسود وأبیض وأحمر وقد شاھدناھذه الأقسام فأمّا الأحمر والأبیض فلیسا للزینة وإنّماھو الأسود فلذاقیّدالأترازی به یتعلق قوله اذا لم یکن من قصده الزینة لأنّ غیرالأسود ینفع العین وغیره فھو کان دواء الرمد وغیره ولیس للزینة اھ

(حاشیة الھدایة ۱/۲۰۳ کتاب الصوم باب مایوجب القضاء والکفاره(مختار)

(۲) والاکتحال عندنا معاشر الشافعیة سنةٌ للاحادیث الواردة فیه۲۱ المواھب اللدنیه ۶۲مختار)

تھا اس میں شیشہ، ہاتھی دانت کی کنگھی، قینچی اور مسواک کے علاوہ سرمہ دانی بھی تھی۔ امام مالکؒ اسے امراض میں دواء کے طور پر مردوں کیلئے جائز سمجھتے ہیں۔ البتہ زینت کیلئے سرمہ کا استعمال ان کے ہاں مکروہ ہے۔ لیکن علامہ ابن عربیؒ کہتے ہیں کہ زینت کے لئے بھی ہو تب بھی یہ ممنوع تصنع کے زمرہ میں نہیں آتا۔ بہر حال سنت کی نیت سے یا آنکھوں کی حفاظت کے لئے سرمہ کا استعمال بالاتفاق جائز بلکہ مندوب ہے۔

(١) حدّثنا محمّد بن حميد الرازيّ أنبانا أبو داؤد الطيالسيّ عن عبّاد بن منصور عن عكرمة عن ابن عباس ؓ أنّ النبيﷺ قال اكتحلوا بالاثمد فانّه يجلو البصر وينبت الشعر وزعم أنّ النّبيّﷺ كانت له مكحلة يكتحل منها كل ليلة ثلاثة في هذه وثلاثة في هذه(١).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اثمد کا سرمہ آنکھوں میں ڈالا کرو۔ اس لئے کہ وہ نظر کو تیز کرتا ہے۔ اور پلکیں بھی زیادہ اُگاتا ہے نیز ان کو یقین تھا کہ نبی کریمﷺ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس سے دونوں آنکھوں میں ہر رات تین تین سلائی کا سرمہ لگایا کرتے تھے۔

اكتحلوا بالاثمد: یہاں امر ندب اور استحباب کے لئے ہے۔ وجوب کے لئے نہیں ہے۔ اثمد میں دو لغت ہیں اول ہمزہ اور میم دونوں کے کسرہ کے ساتھ دوسرا ہمزہ کے کسرہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔

<u>اثمد کیا ہے؟</u> اثمد شراح کے اقوال کے مطابق سرخی مائل سیاہ سرمہ ہوتا ہے بعض اسے اصفہانی سرمہ کہتے ہیں اور بعض توتیا(٢) بتاتے ہیں۔ طبی لحاظ سے نبی کریمﷺ نے کئی باتوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس

---

(١)جامع ترمذی جلد٧ص ٣٠٥، كتاب اللباس باب ماجاء في الاكتحال جلد ١ ص ٣٠٥، سنن ابن ماجة ص ٢٥٠، كتاب الطب باب من الكتحل ص ٢٥٠، وتراً شرح السنة للبغوي كتاب اللباس باب الاكتحال ١١٦/١٢ (مختار)

(٢) علامہ ذہبیؒ اثمد کے بارے میں فرماتے ہیں **اثمد الكحل الأصبهانيّ بارد يابس يقويّ عصب العين و يحفظ صحتها وقولهُ إنّ خيرا كحالكم الا ثمداى في حفظ صحتها لا في أمرا ضها(الطب النبوى على هامش تسهيل المنافع ص ٤٠)(مختار)** صاحب منجد نے انتیمو ان کو اثمد بتایا ہے جس کا کیمیکل کوڈ (SB) ہے۔(اصلاح الدین)

سلسلے میں امام ترمذیؒ مستقل ابواب بھی لائے ہیں۔آنکھوں کے بارے میں بھی نبی کریم ﷺ نے متعدد قسم کے علاج بتائے ہیں۔

آج تک حکماء اور ڈاکٹر بڑی تحقیق کے بعد نبی کریم ﷺ کے اقوال کی تائید کرتے ہیں۔اور قیامت تک کرتے رہیں گے۔اثمد بھی آنکھوں کی حفاظت اور تقویت کیلئے ایک مفید سرمہ ہے۔بالخصوص جب اس میں مشک کی تھوڑی مقدار ملا دی جائے۔آنکھوں کے امراض میں یہ مضر بھی ہوسکتا ہے۔اس لئے نبی کریم ﷺ نے اگرچہ آنکھوں کی بیماریوں کے دیگر متعدد علاج بتائے ہیں لیکن بیمار آنکھوں کو اثمد کا محل استعمال نہیں بتایا کیونکہ یہ تندرست آنکھوں کے لئے مفید ہے(۱)۔

فإنّه یجلّوا البصر یعنی آنکھوں کے نور کو بڑھاتا ہے۔ **ویُنبتُ الشعو** شعر سے پلکیں مراد ہیں جن کے بڑھانے کے لئے اثمد مفید ہے۔

زعَم کی حقیقت اور مراد: زعَم یعنی ابن عباسؓ کا زعم تھا۔زعم گمان کے معنی میں آتا ہے لیکن اس مقام پر قول محقق مراد ہے یعنی ابن عباسؓ یقین کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک سرمہ دانی رکھی تھی۔

آج کل تو گمان اور زعم جھوٹ تراشنے کا بہانہ ہے۔اخبار والے ہر قسم کا جھوٹ چھاپ کر قانون سے بچنے کیلئے،خیال کیا جاتا ہے اور گمان کیا جاتا ہے کے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔لوگ بھی آپس میں باتیں کرتے ہوئے جھوٹ بولنے کے لئے ان جملوں سے مدد لیتے ہیں۔اسی لئے تو حدیث میں آیا ہے کہ **بئس مطیّة الرجال زعموا** یعنی زعموا کا کلمہ آدمی کیلئے بری سواری ہے۔

حدیث میں قول محقق مراد ہے۔محض احتیاط کیلئے جزمی بات کو زعم کہا ہے۔بعض شراح نے زعم کا فاعل ترمذی کا شیخ محمد بن حمیدؒ بتایا ہے۔علامہ مناویؒ نے اسے ترجیح دی ہے۔مگر علامہ بیجوریؒ اور دیگر شراح

---

(۱)اور خصوصاً بچوں اور عمر رسیدہ افراد کیلئے زیادہ مفید ہے۔رات کے وقت سرمہ لگانے سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ سرمہ اچھی طرح آنکھوں کے کونوں میں سرایت کر جاتا ہے اور دیر تک آنکھوں میں باقی رہتا ہے جو طبی لحاظ سے مفید ہے۔

(جمع الوسائل ۲/۷ اختیار)

زعم کوحضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کرتے ہیں(۱)۔

مکحلة ضم میم کے ساتھ سرمہ دانی کو کہتے ہیں۔قیاساً میم کا کسرہ ہونا چاہیے تھا۔خلاف القیاس ضمہ آیا ہے۔

کل لیلة نبی کریم ﷺ رات کوسرمہ استعمال کرتے تھے۔جس میں حکمت یہ ہے کہ رات کوآدمی سوتا ہے تو سرمہ آنکھوں میں خوب نفوذ کرتا ہے۔اور گندہ مواد بھی باہر لاکر زیادہ فائدہ دیتا ہے۔جبکہ دن کو آنکھیں کھلے رہنے اور بار بار دھونے کی وجہ سے سرمہ آنکھوں میں سرائیت نہیں کرسکتا۔

__سرمہ کے استعمال کاطریقہ__: **ثلاثة فی هذه وثلاثة فی هذه** ہرایک آنکھ میں حسب روایت تین تین دفعہ سرمہ لگایا ہے۔اس طرح ہرآنکھ میں طاق دفعہ سرمہ ڈالا ہے۔جس کا حکم نبی کریم ﷺ نے ایک اور حدیث میں بھی دیا ہے فرماتے ہیں کہ **من اکتحل فلیوتر**(۲)۔جوشخص سرمہ لگائے توطاق مرتبہ لگائے۔

بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ دائیں آنکھ میں تین دفعہ اور بائیں میں دو دفعہ سرمہ لگانا چاہیے۔

طبرانیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نبی کریم ﷺ کے سرمہ لگانے کا یہی طریقہ نقل کیا ہے تاکہ دائیں آنکھ سے یہ عمل شروع ہواوراسی پرختم بھی ہو۔اسی صورت میں **ایتار من حیث المجموع** آیا ہے۔بہرحال سرمہ لگانے میں ایتار مستحب ہے۔فرداًفرداً ہو یا **من حیث المجموع** لیکن علامہ ابن حجرؒ نے قولِ اوّل کوترجیح دی ہے۔یعنی پہلے دائیں آنکھ میں تین بارسرمہ ڈالے اور پھر بائیں آنکھ میں تین بار

---

(۱)اب سوال یہ ہے کہ جب **قال** کا فاعل بھی عبداللہ بن عباسؓ ہیں اور **زعم** کا فاعل بھی آپؓ ہی ہیں تو پھر وہاں **قال** اور یہاں **زعم** کو کیوں استعمال کیا گیا ہے؟__ازالہ__ اس اشکال اور شبہ کا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ **قال** اور **زعم** کا فاعل اگرچہ عبداللہ بن عباسؓ ہی ہے مگر دونوں کا معنی الگ الگ ہے۔یعنی یہاں عبداللہ بن عباسؓ کو کچھ معمولی سا شک وشبہ ہوا ہوگا۔اس لئے آپؓ نے یہاں **زعم** کا لفظ استعمال کیا۔جبکہ بعض اہل علم نے یہ جواب دیا ہے کہ یہاں عبداللہ بن عباسؓ کی قولی حدیث وفعلی حدیث دونوں ذکر ہیں اسلئے دونوں میں امتیاز پیدا کرنے کیلئے قال اور زعم کے الفاظ استعمال کئے گئے۔**ایماء الی أنّ الاوّل حدیث مرفوع والثانی موقوف اوالاوّل قولی والثانی فعلی**(جمع الوسائل ۱/۱۲۶)(مختار)

(۲)ابن ماجة ۲۵۰ ابواب الطب باب من اکتحل وتراً (مختار)

ڈالے۔مذکورہ حدیث میں بھی اسی طرف اشارہ ملتا ہے(۱)۔

(۲) حدّثنا عبداللّٰہ بن الصبّاح الهاشمی البصریّ انا عبیداللّٰہ ابن موسیٰ أنا إسرائیل عن عبّاد بن منصور ح و حدّثنا علیّ بن حجر ثنا یزید بن هارون أنبانا عبّاد بن منصور عن عکرمة عن ابن عباسؓ قال کان النّبیّ ﷺ یکتحل قبل ان ینام بالاثمد ثلاثا فی کل عین وقال یزید بن هارون فی حدیثه أنّ النّبیّ ﷺ کانت له مکحلة یکتحل منها عند النوم ثلاثا فی کل عین(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سونے سے قبل ہر آنکھ میں اثمد کے سرمہ سے تین سلائی سرمہ ڈالا کرتے تھے۔ اور یزید بن ہارونؒ اسی حدیث میں (حضرت عبداللہ بن عباسؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس سے سونے کے وقت تین تین سلائی آنکھ میں ڈالا کرتے تھے۔

تحویل کی حقیقت اوراس مقام پراس کی ضرورت: **ح و حدّثنا تحویل من اسناد الی آخر** کا مخفف ہے مصنفؒ جب دوسری سند بیان کرتا ہےاور متن ایک ہوتو صرف سند لاتا ہےاور''ح'' کے حرف سے تحویل سند پر تنبیہ کرتا ہے۔

اس باب کی پہلی حدیث میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث دو واسطوں سے امام ترمذیؒ عباد بن منصورؒ سے روایت کرتے ہیں۔اس لحاظ سے پہلی سند عالی اور دوسری سند سافل معلوم ہوتی ہیں لیکن ملاعلی

---

(۱)اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہر آنکھ میں دو دو سلائی ڈالیں اور پھر ایک سلائی دونوں آنکھوں میں ڈالیں۔ملاعلی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ پہلا طریقہ راجح ہے **وأرجحها الاوّل لحصول الوتر شفعاًمع انّه یتوصّل ان یکتحل فی کل عین واحدة ثم وثم ویؤل امره الی الوترین بالنسبة إلی العضوین.(جمع الوسائل ۱/۱۲۷)(مختار)**

(۲)شرح السنة۱۲/۱۱۷ باب الاکتحال کتاب اللباس المعجم الکبیر للطبرانی ۱۱۹/۳(مختار)

قاریؒ کہتے ہیں کہ معنوی اعتبار سے پہلی سند کی نسبت دوسری سند قوی ہے۔ کیونکہ محمد بن حمید الرازی کو بعض محدثین ضعیف کہتے ہیں جبکہ عبداللہ بن الصباح قوی روای ہے۔ اسی لئے اول الذکر سے شیخین روایت نہیں کرتے جبکہ مؤخر الذکر شیخین کے راوی ہیں۔ اور شاید تقویت کے حصول کیلئے مصنفؒ نے تحویل کے ذریعے اس سند کو عالی کردیا ہے۔ سند کے علاوہ متن کے الفاظ میں جو اختلاف ہے وہ خود امام ترمذی بیان کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک وہ صحت اسناد کی علامت ہے۔ اور ''**صح هذا الاسناد**'' یا ''**هذا الاسناد صحیح**'' سے کنایہ ہے اور تیسرا قول اس میں اہل مغرب کا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ ''الحدیث'' سے مخفف ہے۔ جبکہ بعض لوگ اسے حیلولۃ یا حائل سے عبارت سمجھتے ہیں۔ لیکن سب سے پہلا قول سب سے راجح ہے۔ اس کلمہ پر تلفظ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کے خیال میں اس پر تلفظ نہیں ہوتا بعض لوگ اس کی جگہ ''الحدیث'' کا لفظ بولتے ہیں۔ لیکن جمہور کے نزدیک راجح یہ ہے کہ اس کلمہ کو اسی طرح ادا کیا جائے گا جس طرح یہ لکھا جاتا ہے یعنی ''حاء'' بولا جائے گا۔

وقال یزید بن هارون: پہلی سند کی خصوصیت کا بیان ہے۔ اس میں سابق حدیث کی تائید بھی ہوتی ہیں اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہاں زعم سے گمان نہیں بلکہ قول محقق مراد ہے۔ کیونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ یزید بن ہارونؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جو روایت کرتے ہیں اس میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس سے سوتے وقت تین تین سلائی ہر آنکھ میں ڈالا کرتے تھے۔ نیز اس میں اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ اسرائیل اور یزید کی روایتوں میں معنوی اتحاد ہے لیکن لفظی مغائرت ہے۔

(۳) حدّثنا أحمد بن منیع أنبانا محمّد بن یزید عن محمّد ابن إسحاق عن محمّدابن المنکدر عن جابر قال قال رسول اللّٰه ﷺ علیکم بالإثمد عندالنوم فانّه یجلو البصر و ینبت الشعر(۱).

ترجمہ: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اثمد کا سرمہ نیند سے

---

(۱)شرح السنة للبغوی ۱۲/۱۱۷ کتاب اللباس باب الاکتحال (مختار)

پہلے آنکھوں میں ضرور ڈالا کرو۔ کیونکہ یہ نظر کو بھی روشن کرتا ہے اور پلکیں بھی خوب اُگاتا ہے۔

بشر بن الفضل: یہ مشہور زاہد و عابد ولی تھے۔ چار سو رکعات نفل ہر رات پڑھتے تھے اور صوم داؤدی علیہ السلام بھی معمول تھا۔

تصحیح نیت: عند النوم یعنی نیند سے قبل اثمد کا سرمہ لگایا کرو۔ یہ حکم تندرست آنکھوں کے لئے ہے۔ بیمار آنکھوں کے لئے اثمد مضر بھی ہوسکتا ہے۔ اور اس حدیث میں اس پر تنبیہ ہے کہ سرمہ کا اصل مذکورہ دو امور ہیں اور اسی نیت سے استعمال ہونا چاہیے۔ اگر چہ زینت بھی ضمناً حاصل ہوگی بلکہ رات کے وقت استعمال میں شاید تزئین سے اجتناب کی جہت بھی ملحوظ ہے۔

(۴) حدّثنا قتيبة بن سعيد قال أنا بشر بن المفضّل عن عبدالله ابن عثمان بن خثيم عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ إنّ خير اكحالكم الاثمد يجلو البصر و ينبت الشعر(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے سرموں میں سے اثمد بہترین سرمہ ہے۔ یہ نظر کو تیز کرتا ہے اور پلکیں خوب اُگاتا ہے۔

إنّ خير اكحا لكم الخ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی پہلی روایت اور اس روایت میں معنوی لحاظ سے مناسبت خوب واضح ہے۔

(۵) حدّثنا إبراهيم بن المستمر البصريّ ثنا أبو عاصم عن عثمان ابن عبدالملک عن سالم عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ عليكم بالاثمد فإنّه يجلوا البصر و ينبت الشعر(۲).

---

(۱) سنن نسائی ص ۲/۲۸۱، کتاب الزینة باب الکحل، سنن ابن ماجة ۲۵۰، کتاب اللب باب الکحل بالاثمد المستدرک للحاکم ۴/۴۰۸ (مختار)

(۲) ابن ماجة ص ۲۵۰ کتاب الطب باب الکحل بالاثمد (مختار)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم اثمد کا سرمہ ضرور استعمال کیا کرو۔ کیونکہ یہ آنکھوں کے نور کو تیز کرتا ہے(۱) اور پلکیں خوب اُگاتا ہے۔

مصنفؒ نے اس حدیث کو متعدد اسانید کے ساتھ مکرر اس لئے ذکر کیا کہ اس طرح مذکورہ حدیث کو تقویت ملتی ہے۔

سُرمہ اور جدید سائنس:

(۱) جدید سائنس نے بھی سرمہ لگانے کے بہت سارے فوائد بیان کئے ہیں مثلاً

(۱) سرمہ میں اعلیٰ درجہ کا دافع تعفن یعنی انٹی سیپٹک (Anti Septic) ہوتا ہے۔

(۲) سرمہ سے آنکھوں کے اوپر پھنسی انفکشن (Lead Infection) اور ککرے بالکل نہیں ہوتے۔

(۳) سورج کی تیز شعاعیں آنکھوں کی پتلی (Reting) کو نقصان نہیں پہونچا سکتیں۔

(۴) آشوب چشم کیلئے سرمہ لگانا بہت ہی زیادہ مفید ہے۔

(۵) ان امراض سے اللہ تعالیٰ حفاظت رکھتے ہیں جو لاعلاج سمجھے جاتے ہیں۔

(٦) آنکھوں کے زخم پر خراش اور سوزش کیلئے سرمہ بہت مفید ہے نیز یہ کہ ہر قسم کے چھوٹے جراثیم Contafious germs کو ختم کر دیتا ہے۔(آفتاب نبوت کی کرنیں ص ۱۸۴)(مختار)

۸. باب ماجاء فی لباس رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے لباس کا بیان

لباس "**ما یلبسه الانسان**" کو کہتے ہیں۔ پردہ، تن بدن اور سر یا پاؤں کو چھپانے کیلئے جو قمیض، شلوار، چادر، جبہ اور واسکٹ وغیرہ پہنے جاتے ہیں سب لباس ہیں۔ اسے ملبس اور لبوس بھی کہتے ہیں۔

ایک چیز کو دوسری چیز میں لپیٹنے کو لبس کہا جاتا ہے جس سے تلبیس بنا ہے۔ لباس سے بھی انسان کے ظاہری اعضاء چھپ جاتے ہیں۔ جسمانی عیوب بھی مثلاً داغ، دھبے، سفیدی اور سیاہی وغیرہ مستور ہو جاتے ہیں۔ ماقبل ابواب سے مناسبت یہ ہے کہ اس سے قبل مختلف قسم کی زینتوں کا بیان تھا اور لباس بھی بدن کیلئے زینت ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی تعبیر زینت کے لفظ سے کی ہے۔ اس سے پردہ پوشی ہوتی ہے اور اس کے بغیر انسان حیوانات سے بھی زیادہ قبیح المنظر دکھائی دیتا ہے۔ اسلئے زینت کے ابواب کے سیاق میں لباس کے باب کا بیان زیادہ مناسب ہے۔

نبی کریم ﷺ نے جو کچھ بھی پہنا تھا امام ترمذیؒ اس باب میں بیان فرمائیں گے اگر چہ وہ محض اتفاقاً اور صرف ایک بار کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں امام ترمذیؒ سولہ احادیث لائے ہیں۔

<u>لباس کا حکم:</u> لباس کے پہننے کے مختلف احکام ہیں (۱) کبھی کبھی یہ واجب ہوتا ہے۔ مثلاً مرد کیلئے ناف سے گھٹنوں تک اور عورت کا سوائے بعض اعضاء کے تمام بدن کو ڈھانپنے کے لئے کپڑا پہننا واجب ہے۔ (۲) کبھی کبھی یہ مندوب ہوتا ہے۔ مثلاً سفید کپڑے، عید و جمعہ کیلئے بہترین کپڑے اور عمامہ پہننا مستحب ہے (۳) بعض صورتوں میں لباس حرام بھی ہوتا ہے مثلاً مردوں کیلئے ریشمی لباس پہننا (۴) کبھی کبھی یہ مکروہ بھی ہوتا ہے۔ مثلاً مرد کے لئے ایسا لباس جو ٹخنوں سے نیچے ہو، پہننا۔ اور غنی کے لئے دائماً بوسیدہ لباس پہننا جس میں وہ محتاج نظر آئے (۵) ان کے علاوہ عام طور پر جو لباس پہنے جاتے ہیں وہ مباح ہیں(۱)۔

---

(۱) حضرت عمرؓ کا فرمان ہے کہ دو قسم کی لباس سے پرہیز کرو (۱) شہرت کے لباس سے (۲) حقارت کے لباس سے (مختار)

لباس میں نبی کریم ﷺ کا معمول: نبی کریم ﷺ نے دیگر امور کی طرح لباس میں بھی اعتدال کو معمول بنایا تھا۔ نہ زیادہ مشہور اور بیش قیمت لباس کے استعمال کی عادت تھی۔ نہ نہایت گرا ہوا اور حقیر کپڑا پہنتے تھے۔ عموماً قیمتی کپڑا ہاتھ لگتا تو ایثار کر کے احباب کو دے دیتے تھے۔ ایک عظیم سلطنت کے امیر ہونے کے باوجود بھی آپ ﷺ کی زندگی فقر سے زیادہ قریب تھی۔ لباس فاخرہ سے احتراز کرتے تھے۔ اور یہی رنگ آپ ﷺ کے صحابہؓ میں بھی پایا جاتا ہے۔

(۱) حدثنا محمّد بن حميد الرازیّ أنبانا الفضل بن موسیٰ وأبو تميلة وزيد بن حباب عن عبدالمؤمن بن خالد عن عبدالله بن بريدة عن أمّ سلمة قالت كان احبّ الثياب إلیٰ رسول الله ﷺ القميص(۱)

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو قمیص سب کپڑوں سے زیادہ پسندیدہ لباس تھا۔

أمّ سلمةؓ: عن أمّ سلمة ام المؤمنین ام سلمہؓ کا نام ھند بنت حذیفہ تھا۔ ان کا بنو مخزوم سے تعلق تھا۔ حضرت ابو سلمہؓ کی وفات کے بعد نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ حضرت ابو سلمہؓ کی معیت میں حبشہ کی طرف سب سے پہلے ہجرت آپؓ نے کی۔ رسول اللہ ﷺ کی ۳۷۸ احادیث آپؓ کے واسطہ سے مروی ہیں۔ ۶۲ ھ میں وفات پائیں اور امہات المؤمنین میں سب سے آخری موت آپ کی واقع ہوئی۔ آپؓ سے پے در پے تین احادیث مروی ہیں۔

احبّ الثياب ...القميص: قمیص کی تعریف کرتے ہوئے شراح کہتے ہیں کہ هو اسم لما يلبس من المخيط له كمّان وجيب ولا يكون من صوف. یعنی قمیص پہننے کے لئے سلا ہوا کپڑا ہوتا ہے جس کے دو آستین ہوں اور ایک گریبان لیکن وہ اون کا نہ ہو۔ بلکہ روئی کا کتان کا ہو۔ یہ نام یا تو تقمص سے ماخوذ ہے جس کے معنی تقلب یعنی بدلنا ہے۔ کیونکہ انسان اس میں ایک جگہ سے دوسری جگہ

(۱)سنن ابی داؤد ج۲ ص ۲۰۲، کتاب اللباس باب ماجاء فی القمیص ج۲ ص ۲۰۲، سنن نسائی ج۲ ص ۲۰۲، کتاب الزینة، ابن ماجة ص ۲۵۵ کتاب اللباس باب لبس المقیص (مختار)

کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔ نیز قمیص اچھلنے کودنے کو بھی کہتے ہیں اور قمیص بھی جسم کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتی ہے۔ یا پھر یہ لفظ **قمیص الجنین** اور **قمیص القلب** سے ماخوذ ہے جن کے معنی بچے کے اوپر کی جھلی اور دل کے غلاف کے ہوتے ہیں۔ قمیص بھی بدن پر جھلی کی طرح محیط ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کی قمیص کی ساخت کے بارے میں کچھ باتیں اگلی حدیثوں میں آئیں گی۔ لیکن مذکورۃ الصدر تینوں حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قمیص آپ ﷺ کا محبوب ترین لباس تھا۔

<u>قمیص کی پسندیدگی کی وجہ</u>: اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں ستر بدن اچھی طرح اور آسانی سے ہوسکتا ہے۔ اسے پہن کر آدمی بے فکر ہوجاتا ہے جبکہ رداء وغیرہ کو باندھنا پڑتا ہے۔ نیز ہوا، بارش اور چلنے پھرنے سے اس کے کھلنے اور گرنے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ اور اگرچہ بالائی بدن کی ستر ضروری نہیں پھر بھی گرمی اور سردی کی تکلیف تو ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قمیص میں انسان گرمی اور سردی سے محفوظ رہتا ہے۔ نیز اگر ازار کھل جائے تو بھی قمیص ستر عورت کیلئے کافی ہوتی ہے۔ اس کا استعمال بھی دوسرے لباسوں کی نسبت آسان ہے اور بعض لوگوں کے ہاں اس میں تکبر سے بھی آدمی محفوظ ہوتا ہے۔ ان امور کے ساتھ ساتھ عرب کی قدیم تاریخ بھی قمیص سے مربوط ہے قرآن نے حضرت یوسفؑ کی زبان سے یہ بھی کہا ہے کہ **اذھبوا بقمیصی ھذا فالقوہ علی وجہ ابی**. میری قمیص لے کر میرے باپ کے چہرے پر ڈالنا

مفسرین کے ہاں یہ قمیص حضرت یوسفؑ کے اجداد کی قمیص تھی۔ جو ان کو والد کی طرف سے ملی تھی آج کل بھی عرب کے قومی لباس میں ایک لمبے قمیص کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ آپ ﷺ کی قمیص کی تفصیل دوسری کتابوں میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ کا ایک کرتا تھا، یا متعدد۔ حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی وفات کے بعد ایک ایک کر کے قمیص نکالتی تھی اور صحابہؓ کو بتاتی تھیں کہ یہ نبی کریم ﷺ کی قمیص تھی۔

(۲) حدّثنا علیّ بن حجر ثنا الفضل بن موسیٰ عن عبدالمؤمن ابن خالد عن عبداللّٰہ ابن بریدۃ عن أمّ سلمۃ قالت کان أحبّ الثیاب إلیٰ رسول اللّٰہ ﷺ القمیص (۱)

---

(۱) جامع ترمذی ج۲ ص۲۵۷ کتاب اللباس (مختار)

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ سب کپڑوں میں قمیص کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

حدّثنا عليّ الخ: یہ حدیث پہلے حدیث سے متن میں مختلف نہیں ہے البتہ سند دوسری ہے لیکن اس سند میں بھی عبداللہ بن بریدہ کی ماں کا ذکر نہیں جس کا ذکر اگلی سند میں ہے۔ نبی کریمﷺ کی قمیص کے بارے میں جو روایات مذکور ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوتی کپڑے سے بنا ہوتا تھا۔ زیادہ لمبا نہیں تھا آستینیں بھی لمبی نہیں تھیں کشادہ بھی تھا(۱)۔

(۳) حدّثنا زياد بن أيوب البغداديّ ثنا أبو تميلة عن عبدالمؤمن ابن خالد عن عبدالله بن بريدة عن أمّه عن أمّ سلمة قالت كان أحبّ الثياب إلىٰ رسول الله ﷺ يلبسه القميص قال أبو عيسىٰ هكذا قال زياد بن ايوب في حديثه عن عبدالله بن بريدة عن امّه عن امّ سلمة وهكذا روى غير واحد عن أبي تميلة مثل رواية زياد بن ايوب وابو تميلة يزيد في هذا الحديث عن امه وهو أصحّ (۲).

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریمﷺ کو پہننے کے لئے سب کپڑوں میں کرتہ زیادہ پسند تھا۔

قال أبو عيسىٰ الخ: مصنف کی غرض اس عبارت سے آخری سند کی ترجیح ہے۔ گویا یہ روایت پہلی دو روایتوں کی نسبت اصح ہے۔ کیونکہ سابقہ دو روایتوں کی سندوں میں عبداللہ بن بریدہ کی ماں کا ذکر نہیں ہے جبکہ زیاد بن ایوب کے واسطے سے ابوتمیلہ کی سند میں یہ کمی پوری کی گئی ہے۔ اور زیاد بن ایوب اس زیادۃ میں منفرد بھی نہیں بلکہ امام ترمذیؒ کے بقول یہ زیادۃ اس کے کئی دیگر شیوخ سے بھی ثابت ہے۔

---

(۱) علامہ عراقیؒ نے فرمایا ہے کہ کُرتا پہننا مندوب ومستحب ہے اس لئے کہ آنحضرتﷺ کو پسندیدہ تھا اور یہ اس لئے کہ اس میں ستر پوشی زیادہ ہے۔ ملاعلی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ کُرتا بدن پر ہلکا ہوتا ہے اور اس میں تواضع بھی ہوتی ہے۔
(جمع الوسائل ۱/۱۰۷)(مختار)

(۲) جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۵۷ کتاب اللباس (مختار)

وھو اصح: اس میں دو احتمال ہیں۔ایک یہ کہ یہ ابوتمیلہ کا قول ہو اور اس کی زیادۃ کا حصہ ہو یعنی ابوتمیلہ نے ''عن امہ وھو اصح'' کی زیادت کی ہو اور دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ امام ترمذیؒ کا قول ہو پھر معنیٰ یہ ہوتا کہ ابوتمیلہ نے عن امہ کا اضافہ سند میں ذکر کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے اسی وجہ سے ابوتمیلہ کی اس روایت کو اصح کہا ہے علاوہ ازیں اس روایت کے متن میں ''یلبسہ'' کا لفظ بھی زائد مذکور ہے جو کہ دوسری روایتوں میں نہیں ہے۔

(۴) حدّثنا عبداللّٰہ بن محمّد بن الحجاج ثنا معاذ بن هشام حدثني أبي عن بديل العقيلي عن شهر بن حوشب عن أسماء بنت يزيد قالت كان كم قميص رسول الله ﷺ إلىٰ الرسغ(۱).

ترجمہ:اسماء بنت یزیدؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قمیص کی آستین پہنونچے تک ہوتی تھی۔

أسماء بنت يزيدؓ: عن أسماء بنت يزيدؓ، علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ یہ یزید بن سکن انصاریؓ کی بیٹی اور حضرت معاذ جبلؓ کی پھوپھی زاد بہن ہیں۔بہت دلیر صحابیہ تھی۔یرموک کی لڑائی میں خیمہ کا بانس لے کر نو رومی فوجیوں کو ہلاک کر ڈالا۔علامہ بیجوریؒ کہتے ہیں کہ کچھ اور لوگوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ نبی کریم ﷺ سے اکیاسی احادیث روایت کر چکی ہیں۔

آستینوں کی لمبائی اور اختلاف کی توجیہات: الی الرسغ کلائی کے جوڑ کو کہتے ہیں۔اور ایک روایت میں کلائی تک قمیص کی آستینوں کا بیان ہے جبکہ بعض روایات میں اسفل من الرسغ کا لفظ آتا ہے۔بلکہ بعض میں یہ بھی آیا ہے کہ ان الکُمّ کان یصل إلیٰ الأصابع یعنی آستین انگلیوں تک پہنچتی تھی۔بظاہر یہ تعارض معلوم ہوتا ہے۔

(۱) لیکن اس کا جواب ممکن ہے کیونکہ یہ تعدّد اقمصہ پر حمل ہے، یعنی آپ ﷺ کی متعدد قمیصیں تھیں جن میں سے اکثر قمیصوں کی آستینیں کلائی تک ہوتی تھیں جبکہ بعض کی اس سے لمبی بھی ہوا کرتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس بادشاہوں اور امراء کی طرف سے بطور ہدیہ لباس بھی آیا کرتے تھے۔اس لئے

(۱)سنن ابی داؤد ج۲ص۲۰۳،کتاب اللباس ماجاء فی القمیص، جامع ترمذی کتاب اللباس ج۲ص۲۵۷باب ماجاء فی القمیص(مختار)

قمیصوں کا تعدد محتمل ہے۔اوران کی آستینوں میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ کلائی تک کا قول تخمین واندزاہ پرمبنی ہے۔آستینیں اس سے لمبی یا چھوٹی بھی ہوسکتی ہیں۔جیسا بعض جبوں کی آستینیں بہت لمبی ہوا کرتی ہیں۔

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ آستینیں کلائی تک ہوتی تھیں اورسفر کی حالت میں ایسی قمیص ہوتی تھی کہ آستینوں سے ہاتھ چھپ جاتے تھے تا کہ گرمی اورسردی سے حفاظت ہوسکے۔

(۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ شاید جب پہلی دفعہ قمیص نئی نئی پہنی ہوتو آستینیں لمبی ہوں بعد میں دھونے کی وجہ سے یہ چھوٹی ہوچکی ہوں جس طرح کہ سوتی کپڑے میں ہوتا رہتا ہے۔

(۵) پانچواں جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف ہاتھ کی وضع پرمبنی ہے۔کبھی ہاتھ لمبا ہوتا تھا تو آستین کلائی تک پہنچتی تھی اوراگر ہاتھوں کو کھینچ لیتے تھےتو آستین لمبی ہوکر سارا ہاتھ ڈھانپ لیتی تھی۔

(۶) چھٹا جواب یہ کہ وضوءوغیرہ سے جب آستین کا کپڑا گیلا ہوجاتا تھا تو سکڑ جاتا تھااورکلائی تک پہنچ جاتا تھا۔ورنہ عام حالت میں یہ قدرے لمبا ہوتا تھا۔بہرحال یہ اختلاف زیادہ اہم اختلاف نہیں۔

(۵) حدثنا ابو عمّار الحسين بن حريث انا أبو نعيم انا زهير عن عروة بن عبدالله بن قشير عن معاوية بن قرّة عن أبيه قال أتيت رسول الله ﷺ في رهط من مزينة لنبايعه وإنّ قميصه لمطلق اوقال زر قميصه مطلق قال فادخلت يدى في جيب قميصه فمسست الخاتم(۱)

ترجمہ: قرۃ بن ایاسؓ سے روایت ہےانہوں نےفرمایا کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں قبیلہ مزینہ کی ایک جماعت کے ساتھ حاضر ہوا تا کہ ہم آپ ﷺ سے بیعت کریں۔آپ ﷺ کی قمیص کھلی ہوئی تھی (یا یوں کہا کہ) آپ ﷺ کی قمیص کی گھنڈی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے آپ ﷺ کے گریبان کے اندر ہاتھ ڈالا اور(تبرکاً)مہرنبوت کو چھوا۔

---

(۱)سنن ابی داؤد ج۲ص ۲۰۹باب ماجاء فی حل الازار، ابن ماجه ص۲۵۶ كتاب اللباس باب حل الازار(مختار)

عن ابیہ حضرت معاویہؓ کے والد کا نام قرۃ بن ایاس بن ہلال مزنی ہے۔ مشہور صحابی ہیں ۶۴ھ کو بصرہ میں وفات پائی۔

رھط: **فی رھط الخ** رھط میں ہاء کا سکون اور فتحہ دونوں صحیح ہیں۔ تین سے دس تک آدمیوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ان میں عورت نہ ہو۔ بعض کے مطابق چالیس تک کے مردوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسلام لانے کی غرض سے مزینہ قبیلہ کے چار سو افراد وفد کی صورت میں نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تھے۔ لہٰذا ان پر **رھط** کا اطلاق یا تو مجازاً ہے یا پھر سارے کے سارے نبی کریم ﷺ کے پاس یکجا نہیں آئے تھے بلکہ مجلس میں حاضر ہوتے وقت چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔

وإنّ قمیصہ لمطلق او قال زر قمیصہ لمطلق: امام ترمذیؒ کے استاد کو شک ہے کہ راوی نے زر یعنی گھنڈی کا لفظ ذکر کیا تھا یا نہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ بٹن بند نہ تھے۔ گریبان کھلا ہوا تھا(۱)۔ عظیم ذمہ داریوں کے فکر کے سبب اتنا خیال نہ رہا کہ بٹن بند کئے جائیں۔ گویا مقصد سے عشق اور لگاؤ یا کیفیت جذب ومحبت نے گریبان بند کرنے کا موقع نہ دیا۔ ویسے بھی نبی کریم ﷺ کو تکلف کے ساتھ بیٹھنے کی عادت نہ تھی(۲)۔

---

(۱) یہ آنحضرت ﷺ کی سنت مستمرہ نہ تھی بلکہ کبھی آپ ﷺ کے قمیص کے بٹن کبھی بند رہتے تھے تو کبھی کھلے رہتے تھے چونکہ آپ ﷺ سادہ اور بے تکلف زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے کبھی کھلے گریبان بھی اپنے ساتھیوں میں بیٹھتے تھے۔ مگر اس وقت گریبان کھلا رکھنا بدمعاش، اور آوارہ لوگوں کا شعار بن چکا ہے۔ اور ہمارے معاشرے میں کھلے گریبان کو خلاف مروت سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں کھلے گریبان سے پرہیز کرنا ہی مناسب ہے اور ویسے بھی بند گریبان سنت ہے۔ (مختار)

مرد اور عورت کے گریبان میں فرق: علامہ ابن نجیمؒ نے لکھا ہے مرد کے کرتے کو قمیص اور عورت کے کرتے کو درع کہا جاتا ہے کیونکہ مرد کے قمیص کا گریبان سینے پر ہوتا ہے اور عورتوں کے کرتے کا گریبان ستر کی وجہ سے جنگی زرہ کی طرح مونڈھے پر ہوتا ہے۔ (البحر الرائق ۲/۶/۱۷)(مختار)

(۲) حضرت عروہؒ جو اس حدیث کو معاویہ بن قرۃؓ سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے معاویہؓ اور اس کے باپ قرۃؓ کو جس موسم میں بھی دیکھا۔ ان کے گریبان کھلے رہتے تھے یہ عشق ومحبت کی انتہاء ہے کیونکہ محبوب کی ہر ادا محبوب ہوتی ہے ایک عربی شاعر کہتا ہے کہ **وکل ما یفعل الحبیب حبیب** (اصلاح الدین)

ہمارے شیخ الشیوخ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ اکثر یہ شعر گنگناتے تھے جس میں اس صورتحال کی طرف اشارہ ہے

ہم نے تو اپنے آپ گریبان کیا ہے چاک   اس کو سیا، سیا، نہ سیا پھر کسی کو کیا؟

ادخلت یدی فی جیبہ الخ مہر نبوت کی شہرت اور کچھ اپنی تجسس کی وجہ سے گریبان سے ہاتھ اندر داخل کیا یا پھر تبرک یا مزید طمانیت اور علامت حقانیت کے مشاہدے کے لئے ہاتھ ڈالا (۱)۔ یہاں جیب سے گریبان مراد ہے اور آج کل کا مروج گریبان سامنے یا اس کے ایک طرف یا پھر پیچھے کی طرف ہوتا ہے لیکن اس جگہ شراح کے نزدیک وہی گریبان مراد ہے جو سینے پر ہوتا ہے۔

(۲) حدّثنا عبد بن حمید ثنا محمّد بن الفضل أنا حمّاد بن سلمة عن حبیب بن الشهید عن الحسن عن أنس بن مالک أنّ النبی ﷺ خرج و هو متّکی علی أسامة بن زید علیه ثوب قطری قد توشّح به فصلّی بهم و قال عبد بن حمید قال محمّد بن الفضل سألنی یحیٰ ابن معین عن هذا الحدیث اوّل ماجلس إلیّ فقلت ثنا حمّاد بن سلمة فقال لو کان من کتابک فقمت لاخرج کتابی فقبض علی ثوبی ثمّ قال امله علیّ فانّی أخاف ان لاّ ألقاک قال فاملیته علیه ثمّ اخرجت کتابی فقرأت علیه(۲) .

خرج و هویتکئی علی اسامةؓ یعنی بوجہ ضعف آپ ﷺ نے گھر سے نکلتے ہوئے حضرت اسامہؓ پر ہاتھ رکھ کر ان کا سہارا لیا تھا یہ مرض الوفات کا واقعہ ہے کیونکہ دوسری روایات میں تصریح

---

(۱) شرعی مسئلہ یہ ہے کہ کسی کے گریبان میں ہاتھ ڈالنا بغیر اجازت کے جائز نہیں۔ اور یہاں حدیث پاک میں آنحضرت ﷺ کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت کا ذکر بھی نہیں۔ تو ایک صحابیؓ رسول ﷺ نے کیسے اس بے ادبی کا ارتکاب کیا تو اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ کسی صحابیؓ سے بے ادبی کی توقع بھی ممکن نہیں۔ لازماً انہوں نے آپ ﷺ سے اجازت طلب کی ہوگی۔ اور آپ ﷺ نے اجازت دی ہوگی۔ یا آنحضرت ﷺ اس کے انداز سے سمجھ چکے ہوں گے۔ تو آپ ﷺ نے خود بخود اجازت مرحمت فرمائی ہوگی۔ (مختار)

(۲) جامع الترمذی ج ۲ ص ۲۵۷ کتاب اللباس باب ماجاءء فی القمیص (مختار)

ہے کہ مرض وفات میں آپ ﷺ فضل بن عباسؓ اور اسامہ بن زیدؓ پر تکیہ کر کے گھر سے نکلتے تھے۔

اور ممکن ہے کہ کوئی دوسرا مرض ہو۔ قطریؓ قاف کی مکسور اور طاء کو ساکن پڑھا جاتا ہے۔ یہ بیش قیمت چادریں ہوتی تھیں جن کی نسبت علاقہ کی طرح کی جاتی تھی۔ یعنی قطر اور اس کے قرب و جوار میں یہ کپڑا بنایا جاتا تھا۔ اور ان میں سرخ لکیریں ہوتی تھیں۔ **قدتو شّح به:** آپ ﷺ نے چادریوں کندھوں کے اوپر ڈال کر دونوں طرف لٹکائی تھی جیسے ہار گلے میں ڈالا جاتا ہے۔ یا پھر توشح اضطباع مراد ہے یعنی جس طرح محرم دائیں بغل کے نیچے سے چادر کا ایک طرف نکال کر بائیں کندھے پر ڈالتا ہے۔ لیکن عام طور پر شراح پہلا معنیٰ لیتے ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قمیص کے علاوہ دوسرے کپڑے بھی بطور تزین یا گرمی سردی سے بچنے کے لئے کبھی کبھی استعمال فرمائے ہیں۔ **فصلّی بهم** اگر یہ مرض الموت کا واقعہ ہو تو پھر معنیٰ یہ ہوگا کہ **فصلّی معهم** یعنی نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کے ساتھ نماز پڑھی۔ کیونکہ روایات کے مطابق آپ ﷺ نے مرض الوفات میں صحابہؓ کے ساتھ جو نماز پڑھی تھی اس میں آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو پیچھے آنے سے منع فرمایا تھا اور امامت ان ہی سے کروائی تھی۔

<u>یحیٰ بن معینؒ اور حرصِ طلب علم</u>: **قال محمد بن فضل سالنی یحیٰ بن معینؒ۔** یحیٰؒ عظیم محدث، اور جرح و تعدیل کے امام ہیں۔ حفاظ حدیث میں بڑا درجہ رکھتے تھے۔ لاکھوں احادیث یاد تھیں دس لاکھ تو اپنے ہاتھ سے لکھی تھی امام احمدؒ فرماتے ہیں **کل حدیث لا یعرفه یحیٰ فلیس بحدیث** یحیٰ کو جو حدیث معلوم نہ ہو وہ حدیث ہی نہیں۔ نیز فرمایا کہ **السماع من یحیٰ شفاء لما فی الصدور** یحیٰ سے حدیث سننا دل کا علاج ہے۔

<u>۲۸۲ھ</u> کو مدینہ میں وفات پائی۔ اور نبی کریم ﷺ کو جس تختہ پر غسل دیا گیا تھا اسی پر آپ کو بھی غسل دیا گیا۔ ان کے استاد محمد بن فضل فرماتے ہیں کہ یحیٰ پہلی دفعہ آ کر میری مجلس میں بیٹھے۔ تو اس حدیث کے بارے میں پوچھا۔ دراصل یہ لوگ سند کو متصل کرنے کے لیے مشقتیں برداشت کرتے۔ اور بڑے بڑے سفر کیا کرتے تھے۔ کبھی تو متعدد طرق سے حدیث معلوم بھی ہوتی۔ لیکن کسی اچھے شیخ سے سماع مقصود ہوتا یا پھر سند کے اختصار کی غرض سے اتنے لمبے سفروں کا اہتمام کیا جاتا۔ آج کل کی طرح احادیث کا تیار

مجموعہ ملنے کا رواج نہ تھا بلکہ بعض اوقات تو محض ایک حدیث کے لئے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کیا جاتا تھا۔ایک شخص مدینہ سے شام تک کا سفر کرتا ہے میزبان اس کی آمد سے خوش ہوتا ہے لیکن مہمان بیٹھتا بھی نہیں۔حدیث کھڑے کھڑے بیان کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور حدیث سننے کے بعد واپس ہو جاتا ہے۔یحییٰ بن معینؒ کو بھی حدیث معلوم تھی لیکن صرف سند کے اتصال کی خاطر محمد بن فضلؒ کے پاس آئے تھے۔

لو کان من کتابک: یحییٰ بن معینؒ کو استاد کے حافظہ پر اعتماد ہے اور حافظہ سے حدیث سنانا جائز ہے۔لیکن احتیاط اس میں تھی کہ کتاب سے پڑھے تاکہ خطا کا احتمال ہی نہ ہو۔اس لئے انہوں نے استاد کو کتاب سے حدیث بیان کرنے کا التماس کیا۔

فقبض علّی ثوبی. محمد بن فضلؒ کہتے ہیں کہ جب میں اٹھنے لگا کہ کتاب لاؤں تو یحییٰؒ نے مجھے پکڑا کہ حدیث کا معاملہ ہے اور غم عشق است و ہزار بدگمانی۔

اس لئے درخواست کی کہ کتاب لانے سے پہلے حدیث بیان کر ہی دیں۔کیونکہ ممکن ہے کہ یہاں سے نکلتے ہی ہم دونوں میں کسی کی موت آئے اور حدیث سننے سنانے کا موقع نہ ملے۔اس لئے علم کی عظیم نعمت سے محرومی سے بچنے کی خاطر پہلے زبانی حدیث بیان کردیں۔چنانچہ انہوں نے پہلے زبانی بیان کرنے کے بعد کتاب لاکر دوبارہ کتاب سے بھی بیان کی۔

<u>**اسلاف اور وقت کی قدر و قیمت کی چند مثالیں:**</u> شمائل ترمذی میں تحصیل علم کے سلسلے میں کوشش، تڑپ اور جذبہ عشق سے بھرپور اس مقام پر جب بھی میں نے غور کیا۔تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ موت کے ڈر سے بھی حدیث کا درس ضائع نہیں ہونے دیتے۔کتنی نزاکت سے اہتمام ہے تحصیل علم کا۔اس کے برعکس ہمارے اوقات کس طرح ضائع ہوتے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔طلبہ فضول مشاغل کے لئے درس حدیث کو قربان کرتے ہیں۔ہمارے اسلاف کو وقت کے لحاظ کا شدت سے احساس تھا۔

غالباً حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ میری زندگی میں روٹی کھانے اور قضائے حاجت کے اوقات میرے ہاتھ سے فضول نکل گئے ہیں۔جن میں علم کے مشغلہ سے کٹ جاتا ہوں۔وہ طبعی ضروریات پر بھی وقت لگانے کے لئے کف افسوس ملتے ہیں۔

امام ابو یوسفؒ کا مشہور واقعہ ہے۔ حضرت ابراہیم بن الجراحؒ کی روایت ہے کہ امام یوسفؒ بیمار ہوئے تو میں ان کی عیادت کیلئے حاضر ہوا۔ تو سکرات الموت کی حالت تھی آپ بیہوش تھے۔ کچھ افاقہ ہوا تو نزع کی حالت ہی میں مجھ سے دریافت فرمایا کہ ابراہیم بتاؤ رمی جمار پیدل کرنا افضل ہے یا سوار ہوکر۔ ہمیں سخت تعجب ہوا کہ حالت نزع میں بھی علم سے یہ شغف ہے۔ میں نے منع کیا تو انہوں نے فرمایا کہ بتاؤ کہ میں اس مسئلہ میں عالم مروں یہ بہتر ہے یا جاہل؟ چنانچہ مسئلہ کے بارے میں ابھی بحث وتنقیح ہو رہی تھی کہ میں اُٹھ کر جانے لگا اور ابھی مشکل سے دروازے تک پہنچا تھا کہ گھر سے عورتوں کے رونے کی آواز آئی۔ میں پلٹا تو معلوم ہوا کہ امام صاحبؒ انتقال فرما چکے ہیں۔

ان لوگوں کے دلوں میں کبھی خیال بھی نہ گزرا کہ بس کافی ہے۔ ہم علامہ بن گئے بلکہ حصول علم کا جذبہ ہوتا تھا اور ہروقت اس کی تڑپ اور پیاس لگی رہتی۔ حدیث میں آیا ہے کہ **منھو مان لا یشبعان منھوم فی العلم لا یشبع منه و منھوم فی الدنیا لا یشبع منھا** (۱)۔ کہ دو حریص کبھی بھی سیر نہیں ہوتے۔ ایک علم کا حریص جو اس سے سیر نہیں ہوتا۔ دوسرا دنیا کا حریص جو اس سے سیر نہیں ہوتا۔

<u>ایک مستشرق پروفیسر کا جذبۂ حصول علم:</u> مولانا سید سلیمان ندویؒ نے حیات شبلی میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ وہ حضرت شبلی سے روایت کرتے ہوئے ان کے ایک سفر نامے کے بارے میں لکھتے ہیں یا علامہ شبلیؒ نے خود اپنے سفرنامے ''سفر نامۂ مصر وشام'' میں لکھا ہے کہ جس بحری جہاز میں ہم سوار تھے۔ اس میں ہمارا استاد پروفیسر آرنلڈ بھی سوار تھا۔ یہ علی گڑھ یونیورسٹی کا مشہور مستشرق پروفیسر تھا۔ جس نے مشہور کتاب دعوتِ اسلام (Preaching of Islam) لکھی۔

علامہ لکھتے ہیں کہ دوران سفر اچانک جہاز کو طوفان نے آگھیرا۔ شور اٹھا کہ جہاز ڈوب رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ سمندری جہاز ڈوبنے کا منظر بڑا ہولناک ہوتا ہے۔ ہر کوئی اپنے لئے حفاظتی کشتی کی تلاش میں ہے۔ خطرے کا سائرن بجا۔ اس حالت میں مجھے یاد آیا کہ پروفیسر آرنلڈ ہروقت کتاب مطالعہ میں ڈوبا رہتا ہے۔ دیکھوں تو اسکی کیا حالت ہے۔ میں دوڑ کر گیا اور کیبن کا دروازہ کھولا دیکھا کہ وہ کتاب پڑھ رہا ہے۔ میں چیخا کہ سر! جہاز ڈوب رہا ہے۔ اس نے اچھا کہہ کر مجھے ٹال دیا۔ اور مزید استغراق سے

---

(۱) مشکوٰۃ کتاب العلم فصل ثالث ص ۳۷

کتاب پڑھنے لگا۔ میں نے پھر کہا تو اس نے کہا کہ اگر جہاز ڈوب رہا ہے اور موت آنے والی ہے تو مجھے چھوڑ دو کہ یہ صفحہ ختم کردوں۔ صفحہ چھوڑ کر مروں تو کیا فائدہ۔ کافروں میں بھی ایسے لوگ ہیں جنہیں تحصیل علم میں اتنا انہماک ہوتا ہے۔

امام مالک اور یحییٰ مصمودیؒ: امام مالکؒ کے ساتھ طلبہ بیٹھے تھے۔ درسِ حدیث شروع تھا۔ مؤطا امام مالکؒ کے راوی حضرت یحییٰ بن یحییٰ مصمودیؒ بھی بیٹھے تھے۔ کسی نے کہا کہ مدینہ میں ہاتھی لایا گیا ہے۔ ہاتھی کو دیکھنے کے لئے سارے طلبہ امام مالکؒ کو چھوڑ کر دوڑے۔ کیونکہ ہاتھی عجیب جانور ہے اور اہل مدینہ نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ صرف یحییٰ بن یحییٰ مصمودیؒ تھے جو نہ اٹھے۔ امام مالکؒ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ ''ھذا عاقل'' یہی عقلمند ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت یحییٰ بن یحییٰ مصمودیؒ کی روایت کردہ مؤطا کو شہرت حاصل ہوئی۔ سترہ یا اٹھارہ نسخے مؤطا کے دنیا میں بیان کئے گئے ہیں(۱)۔ لیکن سوائے آپ کے نسخے کے دوسرے نسخے متداول نہیں ہو سکے۔

حقوق الاوقات کی تلافی ممکن نہیں: ہمارے شیخ حضرت مولانا عبدالغفور مدنیؒ نے ایک بار یہاں دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک حقوق اللہ فی الاوقات ہیں اور ایک حقوق الاوقات ہیں۔ مثلاً نماز کسی سے قضاء ہوئی یا روزہ توڑ دیا تو قضاء یا کفارہ سے اس کی تلافی ممکن ہے لیکن حق الوقت یہ ہے کہ وقت بے مقصد خرچ نہ ہو، صحیح طریقہ پر صرف ہو۔ اگر یہ وقت ضائع ہوا تو قیامت تک اس کی تلافی ممکن نہیں کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ قیامت کے روز وقت کے ضیاع پر پچھتانا پڑے گا۔ اسی لئے تو قیامت کے دن کو یوم الحسرۃ بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ **الوقت سیف قاطع إمّا تقطعه وإمّا یقطعک** وقت تیز تلوار ہے یا تو اسے استعمال کر کے صرف کردے گا۔ یا وہ تجھے کاٹ کر رکھ دے گا۔

بہر حال یہاں بھی حضرت محمد بن فضلؒ نے پہلے زبانی اور بعد میں کتاب سے حدیث بیان کر کے حضرت یحییٰ بن معینؒ کی تشنگی کا مداوا کیا۔ اور امام ترمذیؒ نے یہ حکایت صرف اس لئے بیان کی کہ اس میں مذکورہ سند کی مزید تقویت ہے۔

(۱) بلکہ مؤطا کے رواۃ کی تعداد پچاس سے بھی زائد بیان کی جاتی ہے۔ (اصلاح الدین)

(۷) حدّثنا سوید بن نصر أنا عبداللّٰہ بن المبارک عن سعید ابن أیاس الجریریّ عن أبی نضرة عن أبی سعید الخدریّ قال کان رسول اللّٰہ ﷺ اذا استجد ثوباسمّاہ باسمه عمامة او قمیصا اورداء ثمّ یقول اللّٰهمّ لک الحمد کما کسوتنیه أسالک خیرہ و خیر ما صنع له وأعوذبک من شرّہ و شرّ ما صنع له.

حدّثنا هشام بن یونس الکوفیّ أنبانا القاسم بن مالک المزنیّ عن الجریری عن أبی نضرة عن أبی سعید الخدریّ عن النبیّ ﷺ نحو(۱).

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تو (اظہار مسرت کے طور پر) اس کا نام لیتے۔ مثلاً فرماتے کہ یہ پگڑی ہے یا قمیص ہے یا چادر پھر دعا فرماتے کہ اے اللہ تیرے ہی لئے تمام تعریفیں ہیں۔ جیسے کہ تو ہی نے مجھے یہ کپڑا پہنایا۔ اے اللہ میں تجھ سے اس کپڑے کی بھلائی چاہتا ہوں۔ اور جن مقاصد کے لئے یہ بنا ہے ان کی بھلائی چاہتا ہوں۔ اور تجھ سے اس کپڑے کی شر سے پناہ مانگتا ہوں اور جن مقاصد کے لئے یہ بنا ہے اس کی شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

اذا استجد ثوباًالخ یعنی جب آپ ﷺ کو کہیں سے نیا کپڑا ملتا مثلاً بازار سے لاتے یا کہیں بطور ہدیہ پیش کیا جاتا۔ یا معنی یہ ہے کہ جب کبھی آپ ﷺ کوئی نیا کپڑا پہنتے۔

تسمیۂ لباس کے مختلف احتمالات: **سمّاہ باسمه،** اس جملے کے مقصد میں مختلف احتمالات ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ کپڑا ملتا تو جو چیز اس سے بنانی مطلوب ہوتی تھی وہ نامزد کر دیتے تھے۔ مثلاً یہ فرماتے کہ اس سے قمیص بناؤں گا، یا اس سے عمامہ بناؤں گا۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اگر قمیص، عمامہ یا

---

(۱) سنن ابی داؤد ج۲ ص ۲۰۲، کتاب اللباس مصنف ابن ابی شیبة ۱۰/۴۰۳ عمل الیوم واللیلة لابن السنی ص (مختار)

کوئی دوسرا کپڑا کوئی پیش کرتا تو شکر یہ ادا کرتے اور فرماتے کہ اچھی قمیص ہے یا اچھا عمامہ ہے۔ بعض مقامات میں یہ بھی آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعض لباسوں کے مستقل نام بھی تھے۔ مثلاً آپ ﷺ کی ایک پگڑی کا نام سحاب (بادل) تھا، پھر یہ معنی بھی ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی طرف سے کپڑے پر مناسب نام رکھ دیتے تھے۔ علامہ بیجوریؒ لکھتے ہیں کہ یہ احتمال بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس کپڑے کے مادے کی حیثیت سے اس کی جنس کا نام لیتے تھے۔ مثلاً یہ سوتی کپڑا ہے اونی ہے یا کتان کا ہے۔

الحمد للّٰه کما کسوتنیه الخ(۱): **کـمـا** تشبیہ کے لئے ہے۔ حمد اور تشکر کو اللہ تعالیٰ کی خلعت نوازی سے تشبیہ دی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسوۃ یعنی کپڑا پہنانا تیرے ساتھ مختص ہے دنیا کی کوئی قوت مجھے کپڑا نہیں دے سکتی تھی۔ اسی طرح حمد بھی تیرے ساتھ خاص ہے۔ یا پھر یہاں تشبیہ سے مقصود یہ ہے کہ جس طرح کپڑا اللہ تعالیٰ دیتے ہیں اور ہم فقر واحتیاج کی بناء پر اس کے مستحق بن جاتے ہیں۔ اس طرح ہماری حمد کا مستحق فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لحاظ سے تشبیہ محض استحقاق میں ہے(۲)۔

خیـره' کپڑے کے خیر ہونے کی متعدد صورتیں ہیں مثلاً یہ کہ دیرپا ثابت ہو۔ صاف رہے جس مقصد کیلئے اسے حاصل کیا گیا ہو۔ اسی میں استعمال ہو۔ ثواب کے کاموں میں صرف ہو اور گناہوں میں استعمال نہ ہو۔ اسی طرح شر کی صورت یہ ہوگی۔ کہ جلد بوسیدہ ہو جائے، جل جائے، پھٹ کر بیکار ہو جائے اور سب سے بدترین شر یہ ہے کہ انسان میں عجب تکبر اور خود پسندی پیدا ہونے کا سبب بنے۔

حدّثنا هشام بن یونس الخ سابقہ متن کو دوسری سند سے ذکر کر رہے ہیں جس سے پہلی سند کی تائید ہوتی ہے۔

---

(۱) جب کوئی نیا کپڑا پہنے تو یہ دعا پڑھے **وحدیث معاذ بن أنس مرفوعاً من لبس ثوباً جدیداً فقال الحمدللّٰه الذی کسانی هذا ورزقنیه من غیر حول ولاقوة غفراللّٰه له ماتقدم من ذنبه** زادابوداؤد ج۲ص ۲۰۲ **فی روایته وماتأخر(المواهب اللدنیة ص ۱۲۱)(مختار)**

(۲) یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں کاف لام تعلیل یا علی کے معنی میں ہو دونوں صورتوں میں یہ تعلیل کے معنی میں ہوگا یعنی اے اللہ اس کپڑے کے بخشنے پر ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔ (اصلاح الدین)

(۸) حـدّثنا محمّد بن بشار أنبانا معاذ بن هشام ثنی أبی عن قتادہ عـن أنـس بن مالک قال کان أحبّ الثیاب إلیٰ رسول اللّٰہ ﷺ یلبسه الحبرة (۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو یمنی منقش چادر کپڑوں میں زیادہ پسند تھی۔

الحِبـرة حاء کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے پسندیدہ لباس میں سے ایک حبرہ بھی تھا۔ یہ تحبیر سے ماخوذ ہے جو تحسین وتزئین اور منقش بنانے کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد وہ یمنی چادر ہے جس میں لکیریں ہوتی تھیں۔ دراصل یہ ملائم سوتی چادر ہوتی تھی۔ نبی کریم ﷺ اس لئے بھی اس کو پسند فرماتے تھے کہ اس کی لکیریں عموماً سبز (۲) ہوتی تھیں۔ اور اہل جنت کے کپڑوں کا رنگ بھی سبز ہوگا۔ نیز ملائمت، ساخت کے لحاظ سے نفاست اور میل خوری کی وجہ سے بھی آپ ﷺ کو یہ چادر پسند تھی۔

زیادہ محبوب قمیص یا حبرہ: واضح رہے کہ جن روایات میں قمیص کو زیادہ محبوب کپڑا کہا گیا ہے ان کا حضرت انسؓ کی اس حدیث سے بظاہر تعارض معلوم ہورہا ہے۔ لیکن اس کی توجیہ یہ ہے کہ دراصل دونوں لباسوں کی حیثیتوں میں فرق ہے۔ چنانچہ چادروں اور ان سلے رومالوں میں آپ ﷺ کو حبرہ زیادہ پسند ہوگا، سلے ہوئے پہننے کے کپڑوں میں قمیص، اور کوٹ کے قسموں میں چغہ زیادہ پسند ہوگا۔ یا یہ کہ گھر میں قمیص اور باہر حبرہ پسند تھا۔

(۹) حـدّثـنـا مـحـمـود بن غیلان أنبانا عبدالرزاق أنبانا سفیان عن عون بن أبی جحیفة عن أبیه قال رأیت النّبیّ ﷺ وعلیه حلّة حمراء

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب اللباس ص ۸۶۵، باب البروز والحبر والشملة، صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۰۱ کتاب اللباس والزینة باب فضل لباس، سنن نسائی ج ۲ ص ۲۰۳ کتاب الزینة باب الحبرة (مختار)

(۲) بعض روایات کے مطابق اس میں سرخ یا نیلی لکیریں ہوتی تھیں جس طرح اگلی حدیث سے سرخ رنگ میں ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ (مختار)

کانیّ انظر الی بریق ساقیہ قال سفیان أراھا حبرۃ (۱).

ترجمہ: حضرت ابو جحیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو سرخ جوڑا پہنے ہوئے دیکھا۔ حضور ﷺ کی پنڈلیوں کی چمک گویا اب بھی میرے سامنے ہے۔ راوی حدیث سفیان کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ حبرہ تھا۔

<u>سرخ لباس استعمال کرنے کی توجیہات</u>: **وعلیہ حلّۃ حمراء** حضرت ابو جحیفہؓ کی یہ ملاقات نبی کریم ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے موقع پر بطحاء مکہ میں ہوئی تھی۔ جس کی تائید بخاری شریف کی روایت سے ہوتی ہے۔ اس روز آپ ﷺ سرخ چادر اور ازار پر مشتمل جوڑا پہنے ہوئے تھے (۲)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احادیث میں سرخ رنگ کے کپڑے کے استعمال کی ممانعت آئی ہے تو نبی کریم ﷺ نے خود کیسے استعمال فرمایا۔ اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) اول یہ کہ ممکن ہے آپ ﷺ کا یہ عمل تحریم سے پہلے کا ہو۔ یعنی ابھی تک سرخ کپڑے کے استعمال کی ممانعت نہ ہوئی ہو۔

(۲) دوم یہ کہ یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہو کہ ان کے لئے مباح ہو۔ دوسرے لوگوں کے لئے نہ ہو۔ اور اس سے تکبر اور خود پسندی کی بیماری پیدا ہونے کا اندیشہ نہ تھا۔ جبکہ دوسرے لوگ شاذ و نادر ہی اس مرض سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم ص ۱۹۵ کتاب الصلوٰۃ باب سترۃ المصلی، ابوداؤد ج ۱ ص ۸۴ کتاب الصلوٰۃ باب فی المؤذن یستدیر فی آذانہ، سنن نسائی ج ۲ ص ۲۵۸ کتاب الزینۃ باب اتخاذ القاب الحمر (مختار)

(۲) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے والمراد بالجملۃ الحمراء بردان یمانیان منسوجان بخطوط حمر مع سود کسائر البرود الیمنیۃ وھی معروف بھذا الاسم باعتبار مافیھا من الخطوط الحمر وإلّا فالأحمر البحث منھیّ عنہ ومکروہ لبسہ لحدیث أخرجہ أبو داؤد من حدیث عبداللّٰہ بن عمرو قال مرّ بالنّبیّ ﷺ رجلٌ وعلیہ حلّتان حمراوان فسلّم علیہ فلم یرد علیہ وحملہ البیھقی علی ماصبغ بعد النسج وإمّا صبغ غزلہ ثمّ نسج فلاکراھۃ فیہ والظاھر أنّہ لافرق بینھما لأنّہ زینۃ الشیطان وموجب للخیلاء والطغیان وقد روی الحسن عن النبی ﷺ أنّ الحمرۃ من زینۃ الشیطان. (جمع الوسائل ۱/۱۴۱، ۱۴۲) (مختار)

(۳) سوم یہ کہ یہ کپڑا خالص سرخ نہ تھا بلکہ سرخ لکیروں پر مشتمل تھا۔جس کی طرف امام ترمذیؒ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ سفیانؒ کے خیال میں یہ حبرہ تھا۔اورتحریم وکراہت خالص سرخ کپڑے میں ہوگی لکیردار ہوتو مضائقہ نہیں۔

(۴) چہارم یہ کہ ممکن ہے کہ سرخی سیاہی مائل ہو۔جس کی وجہ سے اس میں اباحت کی جہت پیدا ہوچکی ہو۔

(۵) پنجم یہ کہ ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ بیان جواز کے لئے کیا ہو۔جیسا کہ بعض فقہاء کی رائے ہے۔بلکہ بعض نے تو سرخ لباس کو مستحب قرار دیا ہے۔

فقہاء کی آراء: بہرحال اس سلسلے میں فقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض تو تحریم کے قائل ہیں۔بعض کراہت تحریمی اور کچھ تنزیہی کے قائل ہیں۔اور کچھ لوگ اباحت کا قول بھی کرتے ہیں۔ملاعلی قاریؒ نے شمائل شرح جمع الوسائل میں تمام اقوال نقل کئے ہیں۔علامہ گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ ایک تقویٰ ہے اور ایک فتویٰ ہے۔تقویٰ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی تو اس کے استعمال سے رک جانا چاہیے۔اوراگر فتوے کی بات ہوتو اس میں جواز کا ثبوت بھی موجود ہے۔

کانّی أنظر إلیٰ بریق ساقیه صحابی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی پنڈلیاں اس وقت جس خوبصورتی کے ساتھ چمک رہی تھیں گویا اب بھی وہ چمک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

نبی کریم ﷺ اس روز اونٹنی پر سوار تھے۔پاؤں مبارک ازار سے کھلے ہوئے تھے۔بریق کا لفظ برق سے ہے جو اگر نصر ینصر سے آئے تو لمعان اور چمکنے کے معنی میں مستعمل ہے اور سمع سے ہو تو پھر چمک کی وجہ سے آنکھیں چندھیانے کو کہتے ہیں جس طرح عموماً سورج کی طرف دیکھنے سے ہوتا ہے۔

---

(۱) اس لئے مردوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنا ازار ٹخنوں سے اونچا رکھیں اور نصف ساق تک رکھنا مستحب ہے۔علامہ مناویؒ نے لکھا ہے فیسنّ للرّجل إلیٰ نصف ساقیه ویجوز إلیٰ کعبیه ومازادحرم ان قصدالخیلاو إلاّکره (مناوی شرح شمائل علی هامش جمع الوسائل ۱۴۲/۱) وفی الفتاویٰ الهندیة ینبغی ان یکون الازار فوق الکعبین الیٰ نصف الساق وهذا فی حق الرجال واماالنساء فیرخین ازارهنّ أسفل من کعب یستر ظهر قدمهنّ.(مختار)

أراھا حبرة همزہ کا ضمہ اور فتحہ دونوں منقول ہیں لیکن ضمہ راجح ہے۔ یعنی میرا خیال ہے کہ یہ سرخ کپڑا جس کا ذکر ہو رہا ہے حبرہ تھا۔

(۱۰) حدّثنا علّی بن خشرم أنا عیسیٰ بن یونس عن اسرائیل عن أبی إسحاق عن البراء بن عازب قال مارأیت احداً من الناس أحسن فی حلة حمراء من رسول اللّٰہ ﷺ ان کانت جمّته لتضرب قریباً من منکبیه(۱).

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی سرخ جوڑے والے کو نبی کریم ﷺ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا آپ ﷺ کے بال آپ ﷺ کے مونڈھوں کے قریب پہنچ رہے تھے۔

فی حلّة حمراء سرخ جوڑے کے ذکر کی وجہ سے یہ حدیث یہاں دوبارہ لائے۔ ورنہ یہ حدیث پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

(۱۱) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمان بن مهدی أنبانا عبیداللّٰه بن ایاد عن أبیه عن أبی رمثة قال رأیت النّبیّ ﷺ وعلیه بردان أخضران(۲).

ترجمہ: حضرت ابو رمثہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دو سبز چادریں اوڑھے ہوئے دیکھا۔

رأیت النّبیّ ﷺ الخ یہ حدیث اس سے قبل باب ماجاء فی خلق الرسول اللّٰہ ﷺ میں بالتفصیل گزر چکی ہے۔

وعلیه بردان أخضران بردان بُرد کا تثنیہ ہے جس کی جمع برود آتی ہے۔ یہ لکیردار کپڑا ہوتا

---

(۱) صحیح بخاری ۸۷۹/۲ کتاب اللباس باب الثوب الإحمر ، سنن نسائی ج۲ ص۲۴۸ کتاب الزینة باب إتخاذالشعر.(مختار)

(۲) ابو داؤد ج۲ ص۲۰۷، کتاب اللباس باب فی الخضرة، سنن نسائی ۲۳۳/۱ کتاب الصلوٰة والعیدین باب الزینة للخطبة العیدین.(مختار)

ہے۔کبھی اس پر نقوش بھی ہوتے ہیں جبکہ بعض لوگوں کے خیال میں بردسیاہ چارخانہ دار کپڑا ہوتا ہے۔لیکن یہاں پراس کا رنگ سبز بتایا گیا ہے(۱)۔آپﷺ کو سبز لباس بھی سفید لباس کی طرح پسند تھا کیونکہ اہل جنت کے کپڑوں کا رنگ ہے۔اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ حبرہ ہو کیونکہ حبرہ بیش قیمت منقش لکیر دار چادر کا نام ہے۔رنگ کوئی بھی ہو۔

نبی کریمﷺ کی چادریں: حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ کی وہ چادر جس میں آپﷺ وفود سے ملتے تھے چار ذراع لمبی اور دو ذراع اور ایک بالشت چوڑی تھی۔آپﷺ وفات کے بعد دو چادریں چھوڑ گئے تھے۔

چونکہ نبی کریمﷺ کو چادر پسند تھی اس لئے اموی اور عباسی خلفاء جمعوں اور عیدوں میں چادر کو بطور شعار استعمال کرتے تھے۔بعض روایات کے مطابق یہ وہی چادریں تھیں جو نبی کریمﷺ چھوڑ گئے تھے۔

چنانچہ علامہ ماوردیؒ کے مطابق حضرت ابان بن ثعلبؓ سے روایت ہے کہ حضرت کعب بن زبیرؓ نے اپنا مشہور قصیدہ ''بانت سعاد الخ'' نبی کریمﷺ کو سنایا۔تو جب اس شعر پر پہنچے

ان الرسول لسیف یستضاء به مهنّد من سیوف الله مسلول

تو نبی کریمﷺ نے ان کو ایک چادر مرحمت فرمائی۔

امراء بنی عباس و بنوامیہ کے پاس حضور اقدسﷺ کی چادریں: حضرت معاویہؓ نے اپنی امارت کے زمانہ میں حضرت کعبؓ کو اس چادر کے لئے دس ہزار درہم کی پیش کش کی۔تو حضرت کعبؓ نے جواب دیا کہ نبی کریمﷺ کے کپڑے کے بارے میں میں اپنے سوا کسی دوسرے شخص کو ترجیح نہیں دے سکتا۔لیکن حضرت کعبؓ کی وفات کے بعد حضرت معاویہؓ نے وہ چادر بیس ہزار درہم دے کر خرید لی۔یہ چادر بعض اقوال کے مطابق حضرت معاویہؓ کے کفن میں شامل کی گئی اور بعض اقوال کے مطابق بعد میں بنی امیہ کے زوال کے بعد لاپتہ ہوگئی۔

عباسی خلفاء کے پاس بھی نبی کریمﷺ کی ایک چادر کا ذکر ملتا ہے۔کہتے ہیں کہ وہ چادر دراصل

(۲) ملاعلی قاریؒ نے فرمایا ہے سبز سے مراد مکمل سبز نہیں بلکہ اس میں سبز رنگ کی دھاریاں تھیں (جمع الوسائل ۱/۱۴۴) (مختار)

نبی کریمﷺ نے اہل ایلہ کو امان دیتے ہوئے بطور نشانی دی تھی۔ بعد میں والی ایلہ سعید بن خالد نے یہ چادر حاصل کر کے خلیفہ کے پاس بھیج دی۔

بہر حال عباسی خلفاء بھی امویوں کی طرح بڑے اہتمام سے نبی کریمﷺ کی چادر کو اہم مواقع میں استعمال کرتے رہے۔ علامہ کرمانیؒ لکھتے ہیں کہ یہ چادر سقوط بغداد کے بعد ہلاکو کے ہاتھ لگی۔ اس نے اسے جلا کر اس کی راکھ دریائے دجلہ میں بہادی۔

(۱۲) حدثنا عبد بن حميد أنا عفّان بن مسلم قال أنبانا عبدالله ابن حسان العنبرىّ عن جدّتيه دُحيبة و عليبة عن قيلة بنت مخرمة قالت رأيت النبىّ ﷺ و عليه اسمال مليّتين كانتا بز عفران وقد نفضته و فى الحديث قصّة طويلة(۱).

ترجمہ: حضرت قیلۃ بنت مخرمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریمﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپﷺ پر دو پھٹی پرانی چادریں تھیں۔ جو زعفران میں رنگی ہوئی تھیں لیکن ان سے زعفران کا اثر جاچکا تھا۔ اور اس حدیث میں ایک طویل قصہ بھی ہے۔

قيلة اور دحيبة و عليبة کا تعارف: عن جدتيه دحيبة و عليبة. دحیبہ اور علیبہ دونوں تصغیر کے صیغہ سے مروی ہیں۔ اس حدیث کی سند کے بیان میں مؤلف سے غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ کیونکہ دراصل علیبہ دحیبہ کا باپ ہے(۲)۔ جس کی دوسری بیٹی کا نام صفیہ ہے۔ دحیبہ اور صفیہ کے والد علیبہ بن حرملہ کی نانی کا نام قیلۃ بنت مخرمہؓ ہے۔ علامہ بیجوریؒ کہتے ہیں **وھی جدة ابيهما لانّهاامّ امّه الخ** جو صحابیہ ہیں۔ حضرت قیلہؓ نے اپنے نواسے علیبہ کی ان دونوں بیٹیوں کی پرورش کی تھی۔ اور ان دونوں سے عبداللہ بن حسان روایت کرتے ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ صفیہ اور دحیبہ میں سے ایک عبداللہ کی دادی اور دوسری نانی ہے۔ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں اور امام ابوداؤدؒ نے مندرجہ بالا صحیح طریق سے

---

(۱) ابو داؤد كتاب الخراج والامارة باب فى اقطاع الارضين، الادب المفرد للامام البخارى رقم حديث ۱۱۷۸، (مختار)

(۲) علامہ مناویؒ نے علامہ سیوطی سے نقل کرتے ہوئے علیبہ کو دحیبہ اور صفیہ کی ماں بتایا ہے۔ مگر ملا علی قاریؒ نے مضبوط شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ یہ ان کے والد کا نام ہے۔ نیز علامہ بیجوریؒ نے بھی یہی تحریر کیا ہے۔ (اصلاح الدین)

اسی سند کو ذکر بھی کیا ہے۔لہٰذا صحیح عبارت یوں ہونی چاہیے کہ "عبداللہ بن حسان العنبری عن جدتیہ دحیته و صفیة بنتا علیبة عن قیلة بنت مخرمة الخ"

قیلة بنت مخرمة الخ یہ صحابیہ ہیں بعض نے عنز یہ، بعض نے عنبر یہ اور بعض لوگوں نے تمیمیہ کہا ہے امام بخاریؒ اور امام ابوداوٗدؒ نے بھی امام ترمذیؒ کی طرح ان کی روایت کو نقل کیا ہے۔

وعلیه إسمال ملیّتین اسمال سمل(۱) کی جمع ہے پرانے کپڑے یعنی چھیتڑے کو کہتے ہیں۔

یہ صفت ہے اس کے جمع سے مفرد بھی موصوف ہوسکتا ہے اور جمع بھی۔ثوب اسمال بھی کہتے ہیں۔

ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ اس وقت یہ جمع کے وزن پر مفرد کا صیغہ ہوتا ہے اور اثواب اسمال بھی کہا جاتا ہے۔

ملاءۃ کا مطلب: ملیّتین ملاءۃ کی تصغیر ملیۃ کا تثنیہ ہے۔ملائۃ وہ کپڑا ہے جس کے حصوں کو دھاگے کے ذریعے سیانہ گیا ہو۔ بلکہ ایک ہی تانے کا بنا ہوتا ہے۔ جو چادر درمیان میں سلی ہوتی ہے وہ ملائۃ کی تعریف میں داخل نہیں ہوگی۔تو ملائۃ کھدر قسم کی موٹی اور بڑی چادر کو کہتے ہیں۔بعض لوگوں کے خیال میں یہ ملاء سے ہے جو بھرنے کے معنی میں ہے۔یہ فراخ چادر سر سے پاؤں تک بدن کو ڈھانپ لیتی ہے اس لئے اسے ملاءۃ کہتے ہیں۔ یہاں پر اسمال کی اضافت تثنیہ کی طرف ہوئی ہے جو اضافۃ الصفۃ الی الموصوف کے قبیل سے ہے۔یعنی یہ ملیّتین تھے جو کہ اسمال یعنی پھٹے پرانے چھیتڑے تھے۔اور چونکہ جمع سے مافوق الواحد بھی مراد ہوسکتا ہے۔لہٰذا تثنیہ کی صفت اسمال سے صحیح ہوگی۔یا پھر تثنیہ کو اس لئے جمع سے موصوف کیا گیا ہے کہ دونوں کپڑوں میں سے ہر ایک مختلف اجزاء پر مشتمل تھا۔اس اعتبار سے ان میں تکثر آیا ہے۔نیز یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اضافت بیانی ہو یعنی وہ اسمال ملیّتین تھے۔ بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ آپ ﷺ دو لمبی چوڑی پرانی چادریں اوڑھے ہوئے تھے جو بوسیدہ اور پھٹے پرانی تھیں۔

زعفرانی لباس: بزعفران عبارت میں تقدیر ہے یعنی کانتا مصبوغتین بز عفران۔مطلب یہ

---

(۱) سمل کا لفظ صاحب منجد نے صرف میم کے کسرہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔جبکہ اس کا ایک ہم معنی لفظ سملۃ بھی منجد میں ذکر ہے جو میم مفتوحہ اور آخر میں تاء کے ساتھ ہے۔لیکن سمل کا فتحہ بھی منقول ہے۔شمائل ترمذی کے شراح نے تصریح کی ہے کہ الاسمال جمع سمل ہے۔صاحب مقامات حریری تیرویں مقامہ میں لکھتے ہیں اذوقف بنا شخص علیه سمل و فی مشیته قزل (اصلاح الدین)

ہے کہ دونوں کپڑے زعفران سے رنگے ہوئے تھے(۱)۔ قد نفضته الخ ۔فاعل کا ضمیر اسمال کو راجع ہے۔ اور بعض روایات میں نفضتا تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ پھر فاعل کا ضمیر ملیتین کو راجع ہوگا۔ جس کپڑے پر زعفران لگا ہوا ہو۔ ایسے مزعفر کپڑے سے چونکہ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ اس لئے اس تو ہم کو دفع کرنے کے لئے کہ نبی کریم ﷺ نے مزعفر کپڑا کیسے استعمال فرمایا؟ قیلہؓ نے یہ کہا کہ زعفران کا بہت تھوڑا اثر باقی تھا۔ دھونے سے اس کا غالب اثر چلا گیا ہے اور رنگ پھیکا پڑ چکا تھا(۲)۔

<u>لباس فاخرہ کا استعمال:</u> لباس فاخرہ کے استعمال میں ضابطہ یہ ہے کہ اگر تکبر اور غرور کا اندیشہ ہو تو استعمال ناجائز ہے ورنہ جائز ہے۔ بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر لباس فاخرہ کا استعمال مستحب ہوگا۔ خود نبی ﷺ کو ایک بار ایک جوڑا ہدیہ کیا گیا جو کہ تینتیس اونٹوں یا اونٹنیوں کے عوض خریدا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے پہن کر اسے زینت بخشی۔

نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا کہ کیا اس کے پاس کوئی مال ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کس قسم کا مال ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی دولت میں اونٹ اور بھیڑ بکریاں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ فلیر اثر نعمة اللّٰہ علیک و کرامته(۳)۔ یعنی پس اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام کا اثر تم پر نظر آنا چاہیے۔

لیکن یہ تب جائز ہوگا کہ ترفہ اور خود پسندی سے خالی ہو۔ خود آپ ﷺ نے بالخصوص کسی خاص نوعیت کے کپڑوں کے استعمال پر اصرار نہیں کیا۔ نہ استعمال میں تکلفات سے کام لیا۔ بلکہ حسب ضرورت آپ ﷺ نے مختلف قسم کا لباس استعمال و پسند فرمایا۔ ازار ورداء عمومی لباس تھا۔ لیکن قمیص کا استعمال بھی

---

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کانتا بزعفران ای مصبوغتین به او اماقول الحنفی ای مخلوطتین ففیه تسامح لایخفی(جمع الوسائل ۱/۱۴۵)(مختار)

(۲) اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے یہ زعفرانی رنگ کا کپڑا انھی سے قبل استعمال کیا ہو ویدل علیه مافی القصة الطویلة انها کانت فی اول الاسلام(جمع الوسائل ۱/۵٦)(مختار)

(۳) المواهب اللدنیة ص۷۵

مذکور ہے۔ پاجامہ کا اگرچہ آپ ﷺ سے استعمال تو ثابت نہیں لیکن آپ ﷺ کے ترکہ میں پایا گیا تھا۔(۱)

پھر قیمت کے لحاظ سے خوش پوشی کوئی عیب نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے اغنیاء کو اس کی ترغیب دی ہے۔ اوراسی وجہ سے بعض ائمہ کرام اور بزرگوں نے اسی جہت کو اختیار کر کے نبی کریم ﷺ کے مرغوب لباس کا استعمال کیا ہے اور بلاضرورت رہبانیت اور تصنع کو ناپسند فرمایا ہے۔

<u>لباس اور اکابر کا طرز عمل</u>: حضرت شاذلیؒ بھی انہی بزرگوں میں سے ہیں ایک دفعہ ایک شخص نے آپؒ کی خوش پوشی کو ناپسندیدہ کہا۔ تو آپؒ نے فرمایا کہ **یا ھذا ھیئتی ھذہ تقول الحمدللّٰہ ھیئتک ھذہ تقول اعطونی.** ارے بھائی! میرا لباس زبان حال سے خدا کا شکر ادا کر رہا ہے اور تیرا لباس زبان حال سے تیری گداگری کی ترجمانی کر رہا ہے۔

بہر حال لباس اپنی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ لیکن صوفیاء کرام اور اہل اللہ کا عمومی شیوہ یہی ہے کہ وہ اس سلسلے میں ترفہ اور عیاشی سے دور رہتے تھے۔ طلبہ کو بھی زیادہ تکلفات سے دور رہنا چاہیے۔

حضرت علامہ گنگوہیؒ ایک بار بیت اللہ کے طواف میں مصروف تھے۔ دیکھا کہ ایک اندھا شخص مطاف میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اندھا ہونے کے باوجود جب علامہ گنگوہیؒ پاس سے گزرتے تو وہ سمجھ لیتے کہ حضرت گزر رہے ہیں۔ شاید کوئی اللہ تعالیٰ کے ولی تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک بار جب علامہ گنگوہیؒ پاس سے گزرے، تو انہوں نے کہا کہ **البس لباس الصالحین** نیک لوگوں کا لباس پہنا کرو۔ دوسری بار جب آپ ان کے پاس گزرے، تو اس شخص نے پھر یہی کہا۔ تیسری بار بھی یہی کہا۔ تو حضرت گنگوہیؒ نے پوچھا کہ صالحین کا لباس کیسے ہوتا ہے؟ اس نے کہا خشن خشن یعنی کھردرا کھردرا۔ بہر حال طلبہ کو بھی اپنے آپ کو بدعتیوں کی طرح قبر نہیں بنانی چاہیے۔ جو کہ ریشمی رومالوں اور منقش چادروں سے ڈھکی ہوئی ہوتی ہے۔ ابھی سے محنت اور جفاکشی کی عادت ڈالنی چاہیے۔ بعد میں یہ کام آئے گی۔

<u>نبی کریم ﷺ کی ہیبت</u>: **وفی الحدیث قصة** چونکہ اس قصہ کا تعلق لباس سے نہ تھا۔ اس لئے اسے یہاں ذکر نہیں کیا۔

---

(۱)مشکوٰۃ کتاب اللباس ص ۳۷۵(مختار)

طبرانی میں تفصیلاً وہ قصہ مذکور ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک آدمی نبی کریمﷺ کے پاس آیا سلام عرض کیا۔ آپﷺ نے جواب دیا۔ قصہ کی روایت کرنے والی حضرت قیلہ بنت مخرمہؓ فرماتی ہیں کہ اس وقت آپﷺ دو پھٹی پرانی چادروں میں ملبوس تھے۔ ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی جو پتوں سے خالی تھی۔ نبی کریمﷺ اکڑوں بیٹھے تھے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے جب نبی کریمﷺ کو اس حالت میں دیکھا (اور سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبر اور اتنی تواضع کہ فنائیت طاری ہے۔ مسکنت کا لباس، مسکینوں جیسی نشست، غریبوں جیسی ہیئت جبکہ اللہ تعالیٰ کے بعد کوئی عظمت میں آپﷺ کے ہمسر نہیں) تو رعب اور خوف کی وجہ سے مجھ پر رعشہ چھا گیا۔ نبی کریمﷺ کے ایک ہمنشین نے آپﷺ سے کہا۔ کہ اس بیچاری کو تو آپﷺ نے خوفزدہ کر دیا۔ آپﷺ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا عـلیـک السـکیـنة یعنی اطمینان اور قرار پاؤ۔ اس کے بعد جو ہیبت اور رعب مجھ پر چھائی ہوئی تھی ختم ہوگئی۔

(۱۳) حدّثنـا قتيبة بـن سعيد ثنا بشر بن المفضل عن عبد اللّٰه ابن عثمـان بـن خثيـم عـن سعيـد بن جبير عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللّٰهﷺ عليكم بالبياض من الثياب ليلبسها احياء كم و كفّنو ا فيها موتا كم فانّها من خيار ثيابكم(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ سفید کپڑوں کو اختیار کرو۔ تمہارے زندوں کو سفید کپڑے پہننا چاہیے اور سفید کپڑوں ہی میں مردوں کو دفن کرنا چاہیے۔ کیونکہ سفید کپڑے تمہارے بہتر لباسوں میں سے ہیں۔

عليكم بالبياض من الثياب الخ اس حدیث میں سفید کپڑے پہننے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ خود نبی کریمﷺ نے اگلی حدیث میں بیان فرمائی ہے۔ دوسرے مقامات میں نبی کریمﷺ سے زرد، سیاہ، سرخ اور سبز رنگ کے کپڑوں کا استعمال بھی منقول ہے۔ لیکن وہ نبی کریمﷺ کا عمل ہے جبکہ سفید لباس کے بارے میں آپﷺ کی طرف سے حکم ہے۔ اور ضابطہ یہ ہے کہ قولی حدیث فعلی حدیث نبیﷺ پر راجح

---

(۱) سنـن ابـن مـاجة ص ۱۰۶ كتـاب الـجـنـائز باب ماجاء فيما يستحب من الكفن ، جامع ترمذی ۱/۱۹۳ كتاب الجنائز باب مايستحب من الاكفان ، ابوداؤد كتاب اللباس باب في البياض (مختار)

ہوتی ہے کیونکہ عمل کی اطلاع صحابہؓ کا بیان ہوتا ہے جس میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ خصوصیت یا بعض حالات اور اوقات کے ساتھ خصوصیت کا احتمال ہوتا ہے۔ جبکہ قول امت کے لئے ہدایت ہوتی ہے۔ پھر بخاری شریف میں یہ تصریح (۱) بھی آتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سفید بالوں کو بھی زینت بخشی ہے۔ لہٰذا عمل کے مقابلے میں عمل بھی مروی ہے۔ بہر حال سفید لباس کی ترجیح میں شک نہیں (۲) اور یہاں اسی ترجیح کو مدنظر رکھ کر اس حدیث کو باب میں جگہ دی گئی ہے۔ ورنہ اس میں نبی کریم ﷺ کے پہننے کا ذکر نہیں۔

(۱۴) **حدّثنا محمّد بن بشّار أنبانا عبدالرحمان بن مهدی أنا سفيان عن حبيب بن أبی ثابت عن ميمون بن أبی شبيب عن سمرة بن جندب قال قال رسول اللّٰه ﷺ البسوا البياض فانّهاأطهر و أطيب و كفّنوا فيها موتاكم** (۳)

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندبؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سفید کپڑے پہنا کرو۔ اس لئے کہ وہ زیادہ پاک صاف رہتے ہیں اور اسی میں اپنے مردوں کو کفن دیا کرو۔

سفید لباس کی افضلیت کی وجہ: **فانّها أطهر و أطيب الخ** یہ دراصل سفید کپڑوں کی ترجیح کی علت ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسان پاک اور صاف کپڑے پہنے۔ اس لحاظ سے سفید رنگ بہت زیادہ مفید ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ سفید کپڑے پر دوسرے کپڑوں کی نسبت نجاست جلد ظاہر ہوتی ہے۔ رنگدار کپڑے پر نجاست کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے سفید کپڑا زیادہ صاف رکھا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ دھوتے وقت سفید کپڑے کو خوب محنت کے ساتھ دھویا جاتا ہے تاکہ اچھی طرح صاف ہو۔ جبکہ رنگدار کپڑے کو جلد صاف

(۱) عن ابی ذرؓ قال اتيت النبی ﷺ وعليه ثوب ابيض و هونائم الحديث (بخاری ج ۲ ص ۸۶۶ کتاب اللباس باب الثياب البيض) (مختار)

(۲) اسلئے علامہ عبدالجواد الرومیؒ فرماتے ہیں فی هذاالحديث يرغب نبينامحمد ﷺ فی البياض ويحببه لنا فی الحياة و بعدالممات والتعليل كما جاء فی الحديث الآتی (الاتحافات ص ۱۱۱) (مختار)

(۳) ابن ماجة ص ۲۵۵ کتاب اللباس باب البياض من الثياب، جامع ترمذی ج ۲ ص ۵۶۹ کتاب الادب باب ماجاء فی لبس البياض، (مختار)

ہونے کی وجہ سے یا رنگ کے جانے کی خوف سے کم دھویا جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زیادہ دھونے سے نجاست کا ازالہ بھی خوب ہوگا۔ اس لئے سفید کپڑے کو اطہر کہا۔ اور اطیب اس لئے فرمایا کہ یہ اچھا رنگ ہے اور اطمینان قلب میں بہت مدد ہے۔

سیاہ لباس:

(۱۵) حدّثنا احمد بن منیع أنبانا یحییٰ بن زکریا بن أبی زائدة أنا أبی عن مصعب بن شیبة عن صفیة بنت شیبة عن عائشة قالت خرج رسول اللہ ﷺ ذات غداة و علیه مرط من شعرأ سود(۱)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ صبح کو مکان سے باہر تشریف لائے تو آپ ﷺ کے بدن پر سیاہ بالوں کی چادر تھی۔

حضرت صفیّة بنت شیبة یہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں۔ بعض لوگ انکی صحابیت کے منکر ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ صحابیہ ہیں۔ امام بخاریؒ نے تصریح کی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ان کا سماع بھی ثابت ہے۔ وعلیه مرط من شعر اسود الخ مرط اون، ریشم یا بکری کے بالوں سے بُنے ہوئے کمبل کو کہا جاتا ہے۔ سردی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عموماً ازار کے طور پر مستعمل ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی کبھی اس سے لنگی باندھی تھی۔ اس میں تکلف وترفہ نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت جفاکشوں کا کپڑا ہے۔ اسود مرط کی صفت ہے اور شعر کی صفت بھی ہوسکتی ہے لیکن پھر دال مفتوح پڑھا جائے گا۔ اس حدیث میں ایک اور رنگ یعنی سیاہ کپڑے کے استعمال کی خبر دی گئی ہے۔ مسلم اور ابوداؤد(۲) کی روایات کے مطابق اس چادر میں کچھ دوسرے رنگ بھی تھے لیکن چونکہ سیاہ رنگ غالب تھا۔ اسلئے یہاں صرف سیاہ رنگ کا ذکر ہے۔

(۱)صحیح مسلم ج۲ ص ۲۰۲ کتاب اللباس والزینة باب التواضع فی اللباس الخ، ابوداؤد ج۲ ص ۲۰۳ کتاب اللباس باب فی لبس الصوف والشعر، ج۲ ص ۵۷۰ جامع ترمذی کتاب الادب باب ماجاء فی الثوب الأسود (مختار)

(۲)عن عائشةؓ قالت خرج النبی ذات غداة وعلیه مرط مرحل من شعر اسود(ابوداؤد ص۲۰۳ کتاب اللباس باب فی لبس الصوف والشعر مسلم ج ۲ کتاب اللباس باب التواضع فی اللباس) (مختار)

(۱۶) حدّثنا یوسف بن عیسیٰ أنا وکیع أنا یونس بن أبی إسحاق عن أبیه عن الشعبیّ عن عروة بن المغیرة بن شعبة عن أبیه أنّ النبیّ ﷺ لبس جُبّة رومیة ضیّقة الکمّین(۱).

ترجمہ: حضرت مغیرۃ بن شعبہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک رومی جبہ زیب تن فرمایا تھا جس کی آستینیں تنگ تھیں۔

حضرت مغیرۃ بن شعبہؓ: عن ابیه عروہ کے باپ مغیرہ بن شعبہؓ مشہور ثقفی صحابی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے خدام میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جنگ خندق کے سال اسلام لائے اور ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ بعد میں کوفہ میں رہائش اختیار کی۔ اور امیر معاویہؓ کی طرف سے کوفہ کے امیر بھی ہوئے۔ تہذیب میں لکھا ہے کہ ''قیل انه احصن ثلث مأة امرأة فی الاسلام'' ۵۰ھ کو ستر سال کی عمر میں کوفہ ہی میں وفات پائی۔

جبہ، رومی، یا شامی: جبۃ رومیۃ بعض روایات میں شامی جبہ کا ذکر آیا ہے۔ اب ہوسکتا ہے کہ یہ دو مواقع ہوں۔ ایک موقع پر رومی اور دوسرے موقع پر شامی جبہ پہنے ہوئے ہوں۔

لیکن غالب خیال یہ ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ کی حکایت ہے۔ اور ایک ہی جبہ کو شامی اور رومی کہا گیا ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ یہ شامی جبہ تھا لیکن اس پر رومی کا اطلاق بھی جائز ہے۔ کیونکہ شام روم کا حصہ تھا۔ اس وقت کے نوآبادیاتی نظام میں شام پر رومۃ الکبریٰ کا تسلط تھا جس کی حکومت بہت وسیع تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عراق کی جنگ میں شکست کو بھی رومیوں کی شکست تعبیر کیا گیا اور ''الم غلبت الروم'' نازل ہوئی۔ یہ بالکل اس طرح جیسے ہندوستان کو کبھی برطانوی علاقہ یا روسی تسلط کے بعد افغانستان کو روسی علاقہ کہا جاتا تھا۔

کفار کی مصنوعات کا استعمال: اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کفار کی مصنوعات استعمال کی ہیں۔ لہٰذا کفار کی مصنوعات کا استعمال جائز ہوگا(۲)۔ ان کے توپ، مشین اور دیگر

(۱) صحیح مسلم ج۲ ص ۲۰۲، جامع ترمذی ص ۲۳۹ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الجبة والخفین، ابوداؤد ج۲ ص۲۰۳ (مختار)

(۲) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے ومن فوائد الحدیث الانتفاع بثیاب الکفر حتّی یتحقق نجاستها لأنّه ﷺ لبس الجبة الرومية ولم يتفصل(جمع الوسائل ۱/۱۵۱)(مختار)

اسلحہ کا استعمال بھی جائز ہیں۔ان کے بنائے ہوئے کپڑے طہارت کی تحقیق کے بغیر بھی پہننا جائز ہیں۔ جبکہ ان کی نجاست کی یقینی دلیل یا غالب امکان نہ ہو۔کئی بار نبی کریم ﷺ نے کفار کا بنایا ہوا کپڑا بطور تحفہ قبول کیا ہے اور اسی موقع پر پہنا بھی ہے۔

ہاں وہ ملبوسات جو کافر استعمال کر کے پھینک دیں۔اور ہمارے ہاں لنڈا بازاروں میں فروخت ہوتے ہیں۔انہیں استعمال سے قبل دھونا ضروری ہے۔کیونکہ غالب خیال یہ ہے کہ ان پر نجاست مثلاً شراب وغیرہ گری ہوگی۔اوران کی تطہیر کا خاطر خواہ انتظام بھی نہیں ہوتا۔**ضیقة الکمین** نبی کریم ﷺ عموماً کھلے آستینوں والا کپڑا پہنتے۔تاکہ وضوء اور دوسرے کاموں کیلئے آستین آسانی کے ساتھ چڑھائے جاسکیں۔اور اسباغ الوضوء میں فرق نہ آئے۔اب بھی اگر تنگ آستینوں کا کپڑا وضوء کے لئے رکاوٹ ہو۔ تو نہیں پہننا چاہیے۔اور اگر وضوء کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں تو حرج نہیں۔بعض ائمہ حدیث (۱) کا خیال ہے کہ یہ غزوہ تبوک کا موقع ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے شامی جبہ پہنا تھا۔اور ظاہر ہے کہ سفر کے دوران تنگ آستینوں والے کپڑے پہننے میں سہولت ہوتی ہے۔مجاہد لوگ ویسے بھی ہلکے پھلکے اور تنگ لباس استعمال کرتے ہیں جس میں تگ و دو آسان ہو۔فوجیوں کیلئے مخصوص وردی بھی اسی لئے بناتے ہیں۔لہٰذا آپ ﷺ نے یہ جبہ جنگی مصالح کے تحت پہنا تھا۔جبکہ اقامت کے دوران کھلے آستینوں کا کپڑا آپ ﷺ کو پسند تھا۔اور صحابۂ کرامؓ کی آستینیں بھی کھلی ہوتی تھیں۔

---

(۱) ابوداؤد اور امام احمد نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔جمع الوسائل (اصلاح الدین)

۹۔ باب ماجاء فی عیش النبی ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے گزراوقات کا بیان

عربی میں عیش زندگی گزارنے کو کہتے ہیں۔ یہ عاش یعیش معیشۃ کا مصدر بھی ہے۔اور عیش سے ''مایعاش بہ الرجل '' کا معنی بھی لیا جاتا ہے۔یعنی زندگی کے وہ لوازم جو زندگی کی بقا کیلئے ضروری ہیں۔اور روٹی، کپڑا، مکان جیسی بنیادی ضروریات جن پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ہم جسے گزارہ اور گزراوقات کہتے ہیں عیش کہلاتا ہے۔تو اس باب میں نبی کریم ﷺ کے گزارے کا بیان ہے۔ یعنی کہ آپ ﷺ کو وقت گزارنے کی چیزیں میسر تھیں یا نہ تھیں۔پھر عیش کیلئے بالکل بنیادی چیز کھانا ہے کیونکہ اسی پر بدن کا قوام اور دارومدار ہے۔تو اب اس بات کا بیان ہوگا کہ آپ ﷺ کی روٹی سالن وغیرہ کی کیفیت کیا تھی۔عیش اڑاتے تھے، یا محض قوت لایموت پر گزارا تھا؟ بہرحال یہاں عیش کو کھانے سے خاص کیا گیا ہے۔آج کل عرب ملکوں میں روٹی طلب کی جاتی ہے تو کہتے ہیں اعطنی عیش کذا۔(اتنی روٹی دے دو)

<u>تکرار باب عیش کی وجہ</u>: یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ یہ باب امام ترمذیؒ بعد میں تفصیل سے لا رہے ہیں۔تو اس تکرار کی کیا ضرورت تھی۔وہاں بھی اسی فقر و فاقہ اور جفاکشی کا بیان مقصود ہے۔اس کے جواب میں بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ گزشتہ زمانہ تصنیف میں ترتیب ابواب کا اتنا اہتمام نہ تھا۔تکرار سے احتراز کوئی اہم بات نہ تھی لیکن یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔کیونکہ اسلاف نے اتنی نظم وضبط، دقیقہ سنجی اور جامعیت کے ساتھ کتابیں لکھی ہیں۔کہ وہ آج کل کے مصنفین کے لئے چیلنج ہیں۔لہٰذا اس مقام پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام ترمذیؒ نے یہ باب دو جگہ سہواً درج کیا ہے۔لیکن اس سے زیادہ بہتر جواب یہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے قصداً ایسا کیا ہے جس میں دراصل اس بات کو اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا اس قسم کا گزارہ اور تنگ وترش زندگی اختیاری اور دائمی تھی۔اضطراری نہ تھی تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ نبی کریم ﷺ کو دولت ملتی نہ تھی، اور غربت وتنگدستی کی وجہ سے قوت لایموت پر اضطراراً گزارہ کرتے تھے۔پھر جب مدینہ میں خوشحالی

آئی تو پُر تکلف زندگی اپنالی ہوگی۔ تو امام ترمذیؒ اس وہم کا دفعیہ کرتے ہوئے اس بات پر تنبیہ کرنے کیلئے دو باب لائے ہیں۔ کہ آپ ﷺ کی زندگی کی ابتداء اور انتہاء ایک جیسی ہے۔ مکہ میں ہو یا مدینہ میں یہ فاقہ کشی اور زہد وقناعت زندگی کے تمام ادوار پر محیط ہے۔

ملا علی قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس باب میں نبی کریم ﷺ کی اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کی زندگی کے حالات بیان کرنا مقصود ہوں۔ اور آگے جو طویل باب آرہا ہے اس میں نبی کریم ﷺ اور اس کے اہل خانہ کا خصوصی ذکر کرنا مقصود ہو۔ گویا پہلے اس دور کی عمومی غربت بیان ہوئی اور آخر میں خود نبی کریم ﷺ کے زہد وقناعت سے اجتناب کا ذکر ہے۔

جبکہ علامہ بیجوریؒ نے دونوں بابوں میں فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دراصل یہاں پر نبی کریم ﷺ کی زندگی کی کیفیت تنگی اور کفاف پر اکتفاء کا بیان مدنظر ہے۔ جبکہ آگے جو باب آرہا ہے اس میں بنیادی طور پر ماکولات ومشروبات کا ذکر ہے جو کہ ناکافی اور غیر معیاری ہونے کے باعث آپ ﷺ کے زہد وفقر اور ترفہ اور تعیش سے اجتناب کو اجاگر کرتی ہیں۔ مگر اس اعتزار کے باوجود ایک ہی عنوان اور تقریباً ایک ہی مقصد کے حامل ہونے کی وجہ سے دونوں بابوں کو الگ الگ لانے کو انہوں نے نامناسب خیال کیا ہے۔

(۱) حدّثنا قتیبة بن سعید ثنا حمّاد بن زید عن أیوب عن محمّد ابن سیرین قال کنّا عندأبی هریرة و علیه ثوبان ممشّقان من کتّان فیتمخّط فی احدهما فقال بخ بخ یتمخّط أبو هریرة فی الکتان لقد رأیتنی و أنّی لاخرّ فیما بین منبر رسول اللّٰه ﷺ و حجرة عائشة مغشیًّا علّی فیجئی الجائی فیضع رجله علی عنقیٔ یُریٰ انّ بی جنوناً و ما بی جنون و ما هو الّا الجوع (۱).

ترجمہ: ابن سیرینؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس تھے وہ کتان کی دو چادروں میں ملبوس تھے جو مشق سے رنگی ہوئی تھیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے

---

(۱) صحیح بخاری ۲/۱۰۸۹ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة باب ماذکر النبی ﷺ وحضّ علی اتفاق اهل العلم، جامع ترمذی ۲/۶۱ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة اصحاب النبی ﷺ (مختار)

ان میں سے ایک سے ناک صاف کیا۔ پھر تعجب کے ساتھ فرمایا کہ واہ واہ۔ ابو ہریرہ کتان کے کپڑے سے ناک صاف کرتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں منبر نبوی ﷺ اور حضرت عائشہؓ کے حجرے کے درمیان بے ہوش ہوکر گر پڑتا۔ پھر کوئی آتا اور مجھے مجنون سمجھ کر میری گردن پر علاج کی نیت سے اپنا پاؤں رکھ دیتا تھا۔ حالانکہ مجھے جنون وغیرہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ یہ حالت تو صرف بھوک کی شدت کے سبب ہو جاتی تھی۔

وعلیه ثوبان ممشقان من کتّان. یعنی مشق سے رنگی ہوئی دو چادریں آپ پہنے ہوئے تھے۔

مشق: مشق ایک خاص قسم کی سرخ خوشبودار مٹی ہے۔ جسے طین احمر بھی کہتے ہیں۔ کپڑے کو اس سے رنگ دیا جاتا ہے تو وہ خوشبودار ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے سرخ کپڑے کو مُمَشَّق کپڑا کہتے ہیں۔ آج کل بھی بعض خوشبودار صابنوں میں اس مٹی کی اقسام کو شامل کیا جاتا ہے۔ صاحب صحاح کی تحقیق کے مطابق پٹ سن کی قسم کا ایک پودا ہے جسے اردو میں السی کہتے ہیں۔ اس کی چھال کی تاروں سے بُنا ہوا پردہ بہت باریک اور ملائم ہوتا ہے۔ اور اس سے جو کپڑے بُنتے ہیں اسے کتان کہتے ہیں۔ یہ اس عہد کا بیش قیمت کپڑا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ممشق بھی تھا۔ ابو ہریرہؓ ایسے کپڑے سے ناک صاف کرتے ہیں۔ اور تعجب وحیرت کے انداز سے اظہار تشکر کرتے۔ تنگی کا زمانہ یاد کرتے ہیں۔

ابو ہریرہؓ اور سرخ کپڑے کا استعمال: اب یہ بات کہ یہ تو سُرخ کپڑا ہے جس کا استعمال ممنوع ہے اور یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ یہ تحریم سے پہلے کی بات ہے۔ کیونکہ یہ وفات النبی ﷺ کے بعد کی بات ہے۔ اس کا جواب یا تو یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے محض بیان جواز کے لئے یہ کپڑا پہنا ہوگا۔ تا کہ اس بات پر تنبیہ ہو کہ اس کا استعمال ناجائز نہیں۔ ملا علی قاریؒ نے بھی اس سلسلے میں جتنے اقوال لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک قول اباحت کا بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رنگدار اور معطر ومنقش کپڑا اس وقت استعمال کرنا ناجائز ہے جب انسان میں غرور اور تبختر پیدا کرنے کا سبب بنے۔ اور اگر یہ خطرہ نہ ہو تو تحریم بھی نہیں ہوگی۔ اور ابو ہریرہؓ کے ہاں تکبر کہاں۔ جبکہ بعض حضرات نے اس اعتراض کا ایک اور دقیق جواب دیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ چادر مشق کے ساتھ رنگی گئی تھی۔ جو سرخ مٹی ہے اور شیطان لعین کو مٹی سے سخت نفرت ہے۔ انسان کو سجدہ نہ

کرنے کے لئے تو یہی عذر اس نے بیان کیا تھا کہ خلقتنی من نار و خلقته من طین. بہرحال شیطان کو مٹی سے فطری دشمنی ہے۔اس لئے اس کے ساتھ رنگے ہوئے کپڑے کے استعمال سے خوش ہونا تو کجا وہ دور بھاگتا ہے جبکہ سرخ رنگ سے ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔اور پھر مٹی سے رنگدار ہونے کے سبب تکبر سے بھی بعید ہے۔

بخ بخ: باء مفتوحہ اور خاء ساکنہ کے ساتھ عموماً استعمال ہوتا ہے۔دوسری لغتیں بھی اس میں ہیں۔کسی بات پر راضی اور خوش ہو کر کسی امر کی تعظیم کے موقعہ پر یہ کلمہ بولا جاتا ہے۔

ابو ہریرہؓ پرانے وقتوں کو بھلاتا نہیں۔اور بھلانا مناسب بھی نہیں۔ ہمارے بزرگوں نے طالب علمی میں کتنی تکلیفوں میں وقت گزارا ہے۔نہ چھت نہ پنکھا، درختوں کے نیچے وقت گزارتے۔طلبہ گھر گھر روٹی مانگنے جاتے۔اگر آج ہم اپنی حالت کا ان حالات سے موازنہ کریں تو ہم کتنی عیش وعشرت کی زندگی گزارتے ہیں۔ برکتیں دراصل ان کی زندگی میں تھیں۔جنہون نے ان تکالیف وشدائد میں علم حاصل کیا ہے وہی حقیقی علماء تھے۔ہمیں تو آج اپنی حالت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

ابو ہریرہؓ بھی شکر اور تحدیث بالنعمة کے طور پر خود سے کہتے ہیں۔کہ واہ واہ اب تو مزے ہیں۔ پہلے کھانے کو کچھ نہ ملتا تھا اور آج بیش قیمت کپڑے سے ناک صاف کرتے ہیں۔یہ وہ زمانہ تھا جب آپ ایک علاقے کے گورنر تھے۔

إنّی لأخِرُّ الخ خرّ یخرّ باب ضرب سے گرنے کے معنی میں آتا ہے یعنی میں حضرت عائشہؓ کے حجرے اور منبر رسول ﷺ کے درمیان بے ہوش ہو کر گر جاتا۔اسی جگہ کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا ''مابین قبری و منبری روضة من ریاض الجنّة ''(۱) بعض روایات میں منبر کی بجائے حضرت ام سلمہؓ کا حجرہ مذکور ہے۔یعنی حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے حجروں کے درمیان میں گر جاتا تھا۔

لیکن یہ کوئی تعارض نہیں کیونکہ مذکورہ دونوں چھوٹے چھوٹے حجرے قریب قریب تھے۔اور دونوں کے دروازے مسجد کی جانب کھلتے تھے۔تو یہ تقریباً ایک ہی جگہ کا نام ہے۔یا پھر جواب یہ ہے کہ یہ دو

(۱) بخاری جلد ۱ ص ۱۵۹ باب فضل مابین القبر والمنبر، ۲۵۳ باب بلاترجمة (مختار)

الگ الگ واقعوں کا بیان ہے۔ اور اگر واقعہ ایک ہو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بیہوشی کی حالت میں انسان ایک جگہ بیہوش ہو کر گر جاتا ہے۔لیکن پھر قلابازیاں کھاتے ہوئے دوسری جگہ تک پہنچ جاتا ہے۔شاید آپؓ کو بھی کچھ اس قسم کا واقعہ پیش آیا ہے۔رجلہ علی عنقی الخ مرگی اور جنات کی وجہ سے جب آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے۔تو لوگوں کے ہاں اس کے علاج کے لئے مختلف ٹونے ٹوٹکے کئے جاتے ہیں۔شاید اس زمانے میں مرگی کے علاج کا یہی طریقہ رائج ہو کہ مریض کی گردن پر پاؤں رکھ دیا جائے۔جیسا کہ اب بھی بعض لوگ جوتا سونگھاتے ہیں۔اس لئے شاید ابو ہریرہؓ کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا۔حالانکہ آپؓ کے قول کے مطابق آپ کو مرگی وغیرہ کا عارضہ نہیں ہوتا تھا۔بلکہ بھوک کی شدت ہی اس بیہوشی کا سبب ہوا کرتی تھی۔

صحابہ اور حضور اقدس ﷺ کی فاقہ کشی: اب سوال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی عیش کا بیان کرنا مقصود ہے۔لیکن یہاں تو صحابیؓ کے عیش کا بیان ہو چکا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو بہت قریب کے صحابی ہیں نبی کریم ﷺ تو بہت دور کے صحابی کی بھی یہ حالت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کچھ گھر میں موجود ہوتا تو ضرور حضرت ابو ہریرہؓ کو دے دیتے۔اور ان کی یہ حالت نہ ہوتی۔لیکن آپ ﷺ کے پاس یقیناً کچھ نہیں تھا اور نہ آپ ﷺ کے مقرب خاص اور محبوب طلبہ کی یہ حالت کیوں ہوتی۔اس طرح اس روایت سے نبی کریم ﷺ کی فقر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

(۲) حدّثنا قتیبة ثنا جعفر بن سلیمان الضبعیّ عن مالک بن دینار قال ما شبع رسول اللّٰہ ﷺ من خبز قطّ ولا لحم الاّعلیٰ ضفف قال مالک سالت رجلاً من أھل البادیة ما الضفف فقال ان یتنا ول مع النّاس(۱).

ترجمہ: مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے روٹی یا گوشت سے کبھی بھی سیر ہو کر نہیں کھایا مگر ضفف پر۔مالکؒ کہتے ہیں میں نے ایک بدوی سے ضفف کے معنی پوچھے تو اس نے کہا کہ ضفف کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے ساتھ کھانا کھایا جائے۔

(۱) تفرد بھذا الحدیث الامام الترمذی

مالک بن دینار: مشہور زاہد تابعی ہیں۔ بصرہ کے رہنے والے تھے ۱۳۰ ھ میں یا اس کے قریب وفات پائی(۱)۔ لہٰذا یہ حدیث مرسل ہوگی۔ بلکہ بعض اقوال کے مطابق یہ روایت حضرت حسن بصریؒ کے واسطہ سے روایت کی گئی ہے جو یہاں سند میں مذکور نہیں۔

ما شبع رسول اللہ ﷺ من خبز الخ(۲) یعنی فاقہ کشی کی یہ حالت تھی کہ نہ کبھی روٹی پیٹ بھر کر کھائی نہ گوشت کبھی پیٹ بھر کر کھانے کو ملا۔

الاعلی ضفف ضفف کا ترجمہ بعد میں خود امام ترمذیؒ ذکر کر رہے ہیں۔ یعنی "**ان یتناول مع الناس**" بعض شراح نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب آپ کسی کے ہاں مہمان بنتے تھے یا دعوت پر جاتے۔ تب کہیں پیٹ بھرنے کے لئے کافی کھانا آپ ﷺ کو ملتا۔ لیکن علامہ بیجوریؒ اور علامہ عبدالرؤف مناویؒ شارح شمائل نے اس کو ہفوۃ کہہ کر اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ بات جناب رسول اللہ ﷺ کی شان کے مناسب نہیں بلکہ یہ تو ہم اپنے حق میں برداشت نہیں کرتے کہ کوئی ہمارے بارے میں یہ کہے کہ گھر میں تو پیٹ بھر کر نہ کھائیں اور دوسروں کے ہاں پیٹ بھر کر کھائیں۔ کیونکہ یہ تو بخل کی صورت ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آپ ﷺ کے لئے عیب نہیں کیونکہ صحابہؓ آپ ﷺ کو بہت زیادہ محبت اور اصرار کے ساتھ لے جاتے۔ ان کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ آپ ﷺ پیٹ بھر کر کھائیں۔ اس سلسلے میں عموماً میزبان تکلفات سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور ضابطہ یہ ہے کہ اگر میزبان مرغ، پلاؤ اور گوشت وغیرہ تکلفات کا انتظام کر کے کھلانے کی خواہش کرے اور مہمان پھر بھی نہ کھائے تو میزبان کو ضرور تکلیف پہنچے گی۔ اس صورت میں مہمان کے زیادہ کھانے سے میزبان کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ بھی ان حضرات کی دلجوئی اور خاطر داری کے لئے ایسا کرتے۔ باقی گھر میں کچھ ہوتا نہ تھا کہ پیٹ بھر کر کھالیں۔

---

(۱) رویٰ عن أنس مات سنة ثلاثین ومائة(مناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/۱۰۰) کان ابوه من سبی سجستان وقیل من کابل رویٰ عن أنس بن مالک وابن سیرین وعطاء بن أبی رباح وعنه أبان بن یزید وصدقة بن موسیٰ ذکره ابن حبان فی الثقات وقال کان یکتب المصاحف بالاجرة ویتقوت باجرته(تهذیب التهذیب ۱۰/۱۴)(مختار)

(۲) بعض نسخوں میں **ولا لحم** کے ساتھ لا ذکر نہیں اس لئے جہاں لا مذکور ہے تو نفی کی تاکید مقصود ہے اور جہاں لا نہیں تو وہ ماقبل پر عطف کی وجہ سے نفی کا معنی پایا گیا (مختار)

لیکن اس کلام کا ایک اور معنیٰ بھی ہے جس پر مذکورہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ساتھیوں کے ساتھ ہی کھانا کھاتے جو کچھ گھر میں ہوتا مہمانوں یا ساتھیوں کے لئے حاضر کردیتے تھے۔ ایسے موقع پر جب تک مہمان پیٹ بھر کر نہ کھاتے۔ آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ تناول فرمایا کرتے تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آپ ﷺ بھی دو تہائی پیٹ بھر کر کھالیا کرتے تھے(۱)۔

---

(۱) راقم الحروف کو بقیۃ السلف حضرت الاستاد سیدی واستاذی حضرت مولانا عبدالحنان جھانگیروی (جو صاحب کتاب زین المحافل کے ماموں ہیں) تلمیذ رشید حضرت مدنیؒ نے فرمایا تھا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی عادت مبارک تھی کہ آخر تک مہمانوں کے ساتھ کھانے میں شریک رہتے تھے۔ اور مہمانوں کے لئے عموماً ایک ہی برتن میں ایک سالن لایا جاتا تھا اور سارے مہمان اسی برتن کے گرد جمع ہو کر اسی برتن میں کھاتے تھے۔ اور اگر کبھی مہمان زیادہ ہوتے تو دو برتنوں میں سالن رکھ کر دیا جاتا تھا۔ اور اپنے ہاتھوں سے مہمانوں میں روٹی تقسیم کرتے تھے اور ساتھ ساتھ تھوڑا تھوڑا خود بھی مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے (مختار)

۱۰۔ باب ماجاء فی خف رسول اللّٰه ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے موزوں کے بیان میں

اس سے قبل لباسوں میں سے بعض کا بیان ہو چکا ہے۔ درمیان میں نبی کریم ﷺ کی عیش کا ذکر آچکا ہے۔ اوراس کی توجیہ بھی ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اب پھر بعض ان اشیاء کا ذکر ہے جولباس کے قبیلے سے ہیں۔ موزے بھی چونکہ پہنے جاتے ہیں۔ اس لئے اس باب میں اس بات کا بیان ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے موزے استعمال کئے ہیں۔ اور یہ کہ آپ ﷺ کے متعدد موزے تھے۔ چار جوڑے موزے تو آپ ﷺ کو خیبر کی غنیمت سے ملے تھے۔

موزے پہننے کے آداب: موزے پہننے کے کچھ آداب ہیں۔ مثلاً یہ کہ دوسرے لباس کی طرح ان میں بھی پہلے دایاں موزہ پہننا چاہیے۔ نیز پہننے سے قبل ان کو جھاڑ دینا چاہیے تاکہ اگر حشرات الارض میں سے کوئی چیز ان میں داخل ہوا ہو وہ نکل جائے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس بات کا حکم دیا ہے۔ طبرانی کی ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ انسانی تقاضے کیلئے ایک موقع پر باہر گئے ہوئے تھے۔ وہاں وضوء کی ضرورت ہوئی آپ ﷺ نے وضوء فرمایا اور جب موزے پہننے لگے۔ تو ابھی ایک موزہ ہی پہنا تھا کہ ایک سبز پرندہ آیا اور دوسرا موزہ اچک کر لے اُڑا۔ اور اوپر جا کر وہاں سے موزہ پھینک دیا۔ موزہ زمین پر آیا تو اس سے ایک سیاہ سانپ نکل آیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو ایک معجزہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے مضر مخلوقات سے پناہ کی دعا مانگی۔

واقعی یہ ایک بڑا معجزہ تھا کہ ہوا کے پرندے بھی آپ ﷺ کو تکلیف سے بچانے کی فکر میں تھے۔ ایک اور روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ اس وقت تک موزہ نہ پہنے جب تک اسے جھاڑ نہ لے۔ یہی کام جوتے اور بوٹ وغیرہ پہننے کے وقت کرنا چاہئے۔

(۱) حدّثنا هنّاد بن السريّ ثنا وكيع عن دلهم بن صالح عن حجير بن عبداللّٰه عن ابن بريدة عن أبيه أنّ النجاشيّ أهدىٰ للنبي ﷺ

خفين أسود ين ساذ جين فلبسهما ثمّ توضّأ و مسح عليهما(١).

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نجاشی نے نبی کریم ﷺ کے پاس سیاہ رنگ کے دوسادہ موزے بطور ہدیہ بھیجے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو پہنا۔ پھر وضوء کیااور دونوں پر مسح فرمایا۔

شاہ حبشہ نجاشی اوراس کی حکومت: **ان النجاشی اهدیٰ** نجاشی نون مفتوحہ یا مکسورہ اور تخفیف جیم کے ساتھ حبشہ کے امراء اور بادشاہوں کا لقب تھا۔ جیسے مصر کے قبطی بادشاہوں کا لقب فرعون تھا، روم کے بادشاہ کو قیصر اور فارس کے حکمران کو کسریٰ کہا جاتا تھا۔ یمن والے اپنے بادشاہ کو تبع اور شام والے ہرقل کہتے تھے اور ابھی قریب ہی مکہ کے گورنر کو شریفِ مکہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ نجاشی کا اصل معنی حکم نافذ کرنے والا ہوتا ہے۔ مؤرخین کے مطابق نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں حبشہ پر دو نجاشی گزرے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ ان میں پہلے نجاشی نے بھی نبی کریم ﷺ کے پیغام کا بہت قدر واحترام کیا تھا۔ اگر چہ اس نے بظاہر اسلام قبول نہیں کیا البتہ ابتداء میں مسلمانوں کو پناہ کی ضرورت ہوئی تو حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ اس زمانہ میں یہی اول نجاشی ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی۔

لیکن یہ تحفے دوسرے نجاشی نے بھیجے تھے۔ ان کا نام اصحمہ بن بحر تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ٦ھ میں اسلام لایا تھا جب حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ نبی کریم ﷺ کا خط آپ کے پاس لائے۔ اور ۹ھ کو نبی کریم ﷺ سے ملاقات کرنے کی غرض سے وہ مدینہ آرہے تھے کہ راستے میں وفات پائی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ان پر غائبانہ نماز جنازہ ادا کی تھی۔ ائمہ کا خیال ہے کہ ان کی لاش نبی کریم ﷺ کو پیش کر کے دکھادی گئی تھی(٢)۔

---

(١)سنن ابی داؤد ١/٣٣ كتاب الطهارة باب المسح على الخفين ١/٤٢، سنن ابن ماجة كتاب الطهارة باب ما جاء فی المسح علی الخفين، جامع ترمذی كتاب الادب باب ماجاء فی الخف الاسود (مختار)

(٢)غائبانہ نماز جنازہ ائمہ مجتہدین کے ہاں اختلافی چلا آرہا ہے۔ علماء احناف اس کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ اور یہی راجح ہے۔ ذیل میں ایک استفتاء کا جواب جو احقر نے دار العلوم حقانیہ کے دار الافتاء سے شائع کیا ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)۔۔۔افادۂ عام کے لئے نظر قارئین ہے۔تا کہ مسئلے کی تفصیلی نوعیت سامنے آسکے۔

<u>غائبانہ جنازہ پڑھانے کی شرعی حیثیت</u>

اسلامی تعلیمات کی رو سے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمانوں پر چند ایسے حقوق ہیں جن کی ادائیگی دوسرے مسلمانوں پر لازم ہے۔ان حقوق میں سے ایک حق کسی مسلمان کے مرجانے کے بعد اس پر نماز جنازہ پڑھنا بھی ہے۔

۔۔۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔کہ مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں۔اس کی عیادت کرنا۔اس کی نماز جنازہ میں شریک ہونا۔اس کی دعوت کو قبول کرنا۔گویا کسی مسلمان پر نماز جنازہ پڑھنا اس کے حقوق ہی میں داخل ہے۔علماء احناف کثر اللہ سوادھم اور علماء مالکیہ کے ہاں نماز جنازہ میں میت کا امام کے سامنے حاضر اور موجود ہونا ضروری ہے۔علامہ حصکفیؒ نے لکھا ہے **وشرطها ايضاً حضوره (ووضعه) وكونه هووا كثره (امام المصلى) وكونه للقبلة فلا تصح على غائب ومحمول على نحو دابة وموضوع خلفه الخ** (الدر المختار علی صدر رد المحتار ۲/۲۰۸)

اور علامہ حسن الشرنبلالی لکھتے ہیں والرابع **(حضوره أو حضور اكثر بدنه أو نصفه مع رأسه** (مراقی الفلاح علی صدر طحطاوی ۲/۲۲۳) عمدۃ الفقہ میں لکھا ہے کہ میت کا وہاں موجود ہونا' پس غائبانہ نماز جنازہ درست نہیں ہے (بحوالہ فتاوی رحیمیہ ۷/۴۷) معلوم ہوا کہ نماز جنازہ کی صحت کیلئے میت کا امام کے سامنے ہونا ضروری ہے۔اس لئے ان حضرات کے ہاں غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا ناجائز ہے۔دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بیسوں صحابہ کرام اور خود آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی سیدہ رقیہؓ کا جب انتقال ہوا تو رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں موجود نہ تھے۔مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان کا غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھایا۔حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ رقیہؓ کی بیماری کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کو غزوہ بدر میں جانے سے روکا تھا۔اور پھر مال غنیمت میں اس کیلئے حصہ بھی مقرر فرمایا تھا۔لیکن جب سیدہ رقیہؓ انتقال کرگئیں تو رسول اللہ ﷺ نے اُن کا غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھا۔حالانکہ ان صحابہ کرامؓ اور سیدہ رقیہؓ کے ساتھ تو آنحضرت ﷺ کی کوئی کدورت نہ تھی جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے ان پر نماز جنازہ غائبانہ نہ پڑھی اور ان کو اپنی رحمت سے محروم کردیا۔یقیناً یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ مشروع و جائز نہیں ہے ورنہ اس وقت ایسا کوئی خاص عذر مانع بھی نہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کو ان پر غائبانہ نماز پڑھنے سے روکے۔رسول اللہ ﷺ کی اپنی امت کیلئے شان یہ ہے کہ **حريص عليكم بالمومنين رؤوف رحيم**(الاية) اور یہ ممکن نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی شان رحمت کے منافی اور خلاف کوئی کام کریں' مگر رسول اللہ ﷺ کا قصداً ارادۃً بلا کسی عذر کے ان سب کی غائبانہ جنازہ نہ پڑھنا اور نماز جنازہ سے احتراز فرمانا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ یہ امر مشروع نہیں۔۔۔۔۔۔۔(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)۔۔۔۔۔مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ نے لکھا ہے کہ جب بیر معونہ کا مشہور حادثہ پیش آیا تو ستر(۷۰) قراء صحابہؓ کو دشمنان اسلام نے دھوکہ سے اپنے ساتھ لے جا کر بڑی بیدردی سے سب کو شہید کر دیا۔حضور ﷺ کو اس سے بہت ہی صدمہ ہوا۔ایک مہینہ تک فجر کی نماز میں قنوتِ نازلہ پڑھی مگر ان کی غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھی۔غزوہ موتہ میں خود حضور ﷺ نے حضرت زید بن حادثہؓ ،جعفر بن ابی طالبؓ ،عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کی خبر دی۔ان کے لئے دعا مغفرت کی۔مگر غائبانہ نماز نہیں پڑھی۔اگر غائبانہ نماز جنازہ کا عام حکم ہوتا تو آپ ﷺ ہر ایک کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھتے۔اور آپ ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے خلفائے راشدین اور دیگر صحابہؓ پڑھتے۔مگر اس کا صحیح طور پر ثبوت نہیں۔لہٰذا اب کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ غائبانہ نماز جنازہ پڑھے۔اگر پڑھے گا تو یہ خلاف سنت ہوگا۔

(فتاویٰ رحیمیہ ۷/۴۶)

اسی طرح عمدہ الفقہ میں ہے۔میت کا وہاں موجود ہونا...... پس غائبانہ نماز جنازہ درست نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے نجاشی اصحمہؓ شاہ حبشہ کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھائی ہے۔یہ حضور ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے سے جنازہ کے درمیان کے پردے اللہ تعالیٰ نے ہٹا دیئے۔اور اس کا جنازہ آپ ﷺ کے سامنے کر دیا۔دوسرے لوگ اس کو نہیں دیکھ رہے تھے۔تو آپ ﷺ کا امام ہو کر اس کی نماز جنازہ حاضر میت پر ہوا اور صحابہؓ کا آپ ﷺ کی اقتداء کرنا اگرچہ وہ میت کو نہ دیکھ رہے ہوں۔جائز ہوا۔اس میں کوئی مانع نہیں۔اگر غیر موجود میت پر نماز جنازہ جائز ہوتی،تو حضور ﷺ ان صحابہ کرامؓ کی نماز جنازہ غائبانہ ضرور پڑھتے۔جو کثیر تعداد میں آپ ﷺ سے دور فوت ہوئے اور دفن ہوئے۔حالانکہ باوجود آپ ﷺ کے نماز جنازہ پر بہت حرص فرمانے کے اور باوجود حکم الٰہی کے ان صلوتک سکن لهم اور آپ ﷺ نے فرمایا لایموتنّ أحدمنکم الاّ اذ نتمونی به فان صلٰوتی علیه رحمة لـه کسی کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہوا۔ پس کسی کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھنا درست نہیں ہے۔ اور جن لوگوں نے حدیث نماز جنازہ بادشاہ حبشہ نجاشی سے سند پکڑ کر اس کا رواج ڈالا ہے یہ غلط اور غیر مشروع ہے۔(عمدۃ الفقہ بحوالہ فتاوی رحیمیہ ۷/۴۷) اور تقریباً یہی بات علامہ زیلعیؒ لکھتے ہیں: ویدلّ علی ذلک أنّ النبیّ ﷺ لم یصل علی غائب غیره وقدمات من الصحابة خلق کثیر وهم غائبون عنه وسمع بهم فلم یصل علیهم إلاّ غائباً واحداً (نصب الرایة ۲/۲۹۱) اور اسی طرح علامہ عینیؒ نے بھی لکھا ہے ملاحظہ ہو (عمدة القاری ۸/۲۷۱) اور شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے لکھا ہے کہ ویدل علی هذا أنّه لم ۔۔۔۔۔۔(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)۔۔۔۔ینقل انه کان یصلّی علی کل الغائبین غیره (اوجز المسالک ۲/۴۴۵)

اور یہی رائے احناف کے علاوہ اکثر علماء کی ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں۔چنانچہ لامع الدراری میں ہے' وقالت الحنفیّة والمالکیّة لاتشرع ونسبه ابن عبدالبر إلی أکثر العلماء وقال ابن رشد أکثر العلماء علی أنّه لایصلّی إلاّعلی الحاضر...... وقال الشیخ ابن القیم لم یکن من هدیه ﷺ الصلوٰة علی کل میت غائب فقد مات خلق کثیر من المسلمین وهم غیب فلم یصل علیهم (لامع الدراری ۱۲۱/۲) امام بخاریؒ کا بھی یہی مذہب ہے اور اسی کو راجح سمجھتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے تو حدیث نجاشی کو ذکر کیا ہے۔ مگر آپؒ نے باب اس حدیث کے مطابق صلوۃ علی الغائب نہیں باندھا۔اور امام بخاریؒ کا اصول یہ ہے کہ جب وہ حدیث شریف میں ذکر شدہ مسئلہ پر ترجمۃ الباب نہیں باندھے،تو وہ اس مسئلہ کے ہاں راجح نہیں ہوتا۔

چنانچہ شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ لکھتے ہیں فالأ وجه عند هذا الضعیف أنّ الأمام البخاری مال فی هذه المسئلة إلیٰ قول الحنفیّة والمالکیّة وأشار بباب الصفوف علی الجنازة إلیٰ توجیهم المشهور إنّ الجنازة کانت مشاهدة ولذالم یبوب بباب الصلوٰة علی الغائب مع وجود الحدیث عنده وقد تقدم فی الاصل الخامس والستین من اصول التراجم أنّ الأمام البخاریّ قد لا یتر جم علی مسئلة فی الحدیث لعدم روية بذلک (لا مع الدراری ۱۲۲/۲)

البتہ شوافع اور حنابلہ کے ہاں غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا جائز بلکہ مسنون ہے۔لیکن ان مذاہب کے بڑے بڑے اہل علم وفتویٰ اور درجہ اجتہاد پر فائز حضرات بھی یہ جواز اطلاقی نہیں بلکہ ضرورت اور مقید بالشروط ہیں۔مثلاً شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ حنبلیؒ فرماتے ہیں کہ الصواب أنّ الغائب ان مات ببلد لم یصل علیه فیه صلّی علیه صلوٰة الغائب کما صلّی النّبیّ ﷺ علی النجاشی لأنّه مات بین الکفار ولم یصل علیه وان صلّی علیه حیث مات لم یصل علیه صلوٰة الغائب لأنّ الفرض قد سقط بصلوٰة المسلمین علیه (بحوالہ اوجز المسالک ۴۴۵/۲)

یعنی یہ غائبانہ نماز جنازہ اس وقت جائز ہے جب کوئی مسلمان دارالشرک میں فوت ہو چکا ہو۔اور وہاں اس پر نماز جنازہ پڑھانے والا کوئی نہ ہو۔ورنہ اگر اس پر نماز جنازہ پڑھا جا چکا ہو تو پھر اس پر غائبانہ نماز جنازہ جائز نہیں۔

شیخ الحدیثؒ نے لکھا ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں امام احمدؒ کے مذہبی اقوال میں مذکورہ بالا قول راجح اور صحیح ہے' والأقوال ثلاثة فی مذهب احمد واصحها هذا التفصیل والمشهور عند(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) اصحابہ الصلوٰۃ علیہ مطلقا (اوجز المسالک ۲/۴۴۵) اسی طرح علامہ خطابیؒ غائبانہ نماز جنازہ کے جواز کی یہ شرط بیان کرتے ہیں کہ غائبانہ نماز جنازہ اس پر جائز ہے کہ جس جگہ میت کا انتقال ہوا ہو۔اور وہاں کوئی اس پر نماز جنازہ پڑھنے والا موجود نہ ہو۔شافعیہ میں سے علامہ رویانیؒ نے بھی اس قول کو پسند کیا ہے۔(درس ترمذی ۳/۲۹۹) اور اسی کو علامہ ابن رشد قرطبیؒ اور امام ابوداؤدؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔لامع میں ہے کہ وأمّا اختارہ شیخ الاسلام ابن تیمیة من التفصیل بہ جزم الخطابی وإلیہ مال ابن رشد فی مقدماتہ وإلیہ میل الامام ابی داؤد اذ ترجم علی حدیث الصلوٰۃ علی النجاشی بباب الصلوٰۃ علی المسلم یموت فی بلاد الشرک (لامع الدراری ۲/۱۲۲)

علامہ خطابیؒ ابن تیمیہؒ وغیرہ حضرات کے مذکورہ قول کی تائید مسند ابی داؤد طیالسی، سنن ابن ماجہ اور مسند احمد کی ذکر کردہ روایت سے ہوتی ہے کہ عن حذیفة بن اسیدؓ أنّ النّبیّ ﷺ قال إنّ أخاکم مات بغیر أرضکم فقوموا فصلوا علیہ اور ابن ماجہ کے الفاظ ہیں۔ عن حذیفة بن اسید أنّ النّبیّ ﷺ خرج لھم فقال صلّوا ھا أخ لکم مات بغیر ارضکم قالوا من ھو؟ قال النجاشی (اعلاء السنن ۲۸۵/) اور بعض حضرات کے ہاں جائز تو ہے مگر اسی دن یا اس کے قریب قریب وقت میں جس دن میت کا انتقال ہو چکا ہو۔ کما قال العینی واجازة بعضھم اذا کان فی یوم الموت او قریب منہ (حاشیہ فیض الباری ۲/۴۷۰)

اور امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ غائبانہ نماز جنازہ کے جواز کی شرط یہ ہے کہ مصلی کی نسبت سے میت جانب قبلہ ہو لہٰذا اگر میت کا علاقہ مصلی کی نسبت سے قبلہ کی جانب مخالف میں ہو تو غائبانہ نماز جائز نہ ہوگا۔(درس ترمذی ۲۹۹/۳) اور شوافع میں علامہ ابن قطانؒ فرماتے ہیں کہ غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا تو جائز ہے مگر اس سے فرض کفایہ ساقط نہیں ہوتا چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں ما حکی عن ابن القطان أحد اصحاب الوجوہ من الشافعیة أنّہ قال یجوز ذلک ولا یسقط الفرض (فتح الباری ۲/۱۴۷) مذہب شافعیؒ و احمدؒ کے ارباب علم کے اقوال سے معلوم ہوا کہ یہ جواز مطلق نہیں بلکہ ضرورت کے تحت ہے۔اور ضرورت کے تحت جو امر ثابت ہو جائے اس کو متعدی نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک ان ایک دو واقعات کا تعلق ہے جن سے غائبانہ نماز جنازہ کا ثبوت بظاہر ملتا ہے۔وہ روایات درحقیقت معلول ہیں۔اس لئے کہ جب سنت مستمرۃ غائبانہ نماز جنازہ نہ پڑھنے کا ہے اور اصول یہ ہے کہ ایک دو جزئی واقعات کی وجہ سے سنت مستمرہ نہیں چھوڑی جا سکتی ہے اور خصوصاً جب ان واقعات کے وجوہ اور اسباب بھی معلوم نہ ہوں۔(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) کماقال العلامة انور شاه الکشمیریؒ و بالجملة لاتترک سنة فاشیة مستمرة لاجل الوقائع الجزئیة التی لم تنکشف وجوهها ولم تدر أسبابها (فیض الباری ۲/ ۴۷۰) لہٰذا جہاں تک ان دلائل کا تعلق ہے جن کو غائبانہ نماز جنازہ کے جواز میں پیش کیا جاتا ہے تو ان کے جوابات درجہ ذیل ہیں۔

مجوزین حضرات کے دلائل: جو حضرات غائبانہ نماز جائز سمجھتے ہیں ان کی بنیادی دلیل یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حبشہ کے بادشاہ عبدالمسیح اصحمہ شاہ نجاشی پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھایا تھا۔ عن أبی هريرة قال نعیٰ النبی ﷺ إلی أصحابه النجاشیّ ثم تقدم فصفوا خلفه فکبّر اربعاً (صحیح بخاری ۱/ ۱۷۶)

عن جابر بن عبداللّٰه أنّ رسول اللّٰه ﷺ صلی علی النجاشیّ فکنت فی الصف الثانی او الثالث (صحیح بخاری ۱/ ۱۷۶)

الجواب: لیکن اس روایت کے بہت سارے جوابات دیئے گئے ہیں۔ اولاً تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حضرت نجاشیؓ کی خصوصیت تھی کہ آنحضرت ﷺ نے ان پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے علاوہ کسی اور پر کبھی بھی غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھائی۔ جیسا کہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے۔

ومن الاعتذرات ایضاً أنّ ذلک خاص بالنجاشی لأنّه لم یثبت أنّه ﷺ صلّی علی غائب غیره. (اعلاء السنن ۸/ ۲۸۳) اور علامہ ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے کہ وقال الحنفية والمالکية لاتشرع وإنّهم قالوا ذلک خصوصیته ودلائل الخصوصية واضحة (اوجز المسالک ۲/ ۴۴۵) اور علامہ خطابیؒ نے لکھا ہے کہ وقد ذهب بعض العلماء إلی کراهة الصلوٰة علی المیت الغائب زعموا أنّ النّبیّ ﷺ کان مخصوصاً بهذا الفعل (عمدة القاری ۷/ ۲۲)

اور شیخ الحدیثؒ نے لکھا ہے واجیب ایضاً بأنّ ذلک خاص بالنجاشیّ لاشاعة أنّه مات مسلماً او ائتلاف قلوب الملوک الذی اسلموا فی حیاته (اوجز المسالک ۲/ ۴۴۵) اور علامہ بدرالدین العینیؒ لکھتے ہیں: وقع فی کلام ابن بطال تخصیص ذلک بالنجاشی فقال بدلیل إطباق الأمة علی ترک العمل بهذا الحدیث قال ولم اجد لأحد من العلماء اجازة الصلاة علی الغائب إلاّ ماذکره ابن زید عن عبدالعزیز بن أبی سلمة فانه قال اذا استوذن أنّه غرق اوقتل اوأکله السباع ولم یوجد منه شئی صلی علیه کما فعله بالنجاشی وبه قال ابن حبیب وقال ابن عبدالبر أکثر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)......... أهل العلم يقولون أنّ ذلك مخصوص به (حاشية فيض الباری ۴۷۰/۲)

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ جنازہ غائبانہ نہ تھا بلکہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے تمام حجابات ہٹائے گئے تھے۔اور پھر آنحضرت ﷺ نے نجاشی پر نماز پڑھائی۔چنانچہ علامہ الواحدیؒ بلا اسناد حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں۔ قال كشف للنبيّ ﷺ سرير النجاشي حتىٰ راه وصلّى عليه اور علامہ ابن حبانؒ عمران بن حصینؓ سے روایت کرتے ہیں عن عمران بن حصين فقاموا وصفوا خلفه وهم لايظنون إلاّ أنّ جنازة بين يديه.

اور ابوعوانہ سے منقول ہے عن عمران بن حصينؓ فصيلنا خلفه ونحن لانرى إلاّ أنّ الجنازة قدامنا اس معلوم ہوا کہ نجاشی پر جنازہ پڑھاتے وقت نجاشی کی نعش آنحضرت ﷺ کے سامنے تھی۔اور جواز نماز کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

<u>اعتراض:</u> البتہ اس جواب پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ مجمع بن جاریہؓ فرماتے ہیں فصفنا خلفه صفين ومانرى شيئاً (فتح الباری ۱۸۹/۳) کہ ہم نے آپ ﷺ کی اقتداء میں دوصف بنائی اور ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔تو عمران بن حصینؓ کیسے کہتے ہیں کہ جنازہ آنحضرت ﷺ کے سامنے تھا۔لیکن اس کا جواب یہ ہے ممکن ہے کہ یہ نجاشیؒ کے جنازے سے یہ حجابات بعض حضرات کے حق میں تو اٹھائے گئے ہوں۔تو ممکن ہے کہ حضرت مجمعؓ ان حضرات میں سے ہوں جن کے حق میں حجابات باقی ہوں۔(کمافی عمدۃ القاری) اور علامہ عثمانیؒ نے بھی یہی لکھا ہے والتوفيق كما افاده الشيخ بأنّها كشفت لبعض دون بعض (اعلاء السنن ۲۸۳/)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ مانری شيئاً کا تعلق مقتدیوں سے ہے کہ ہم مقتدیوں کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔اس میں آنحضرت ﷺ کی نفی نہیں۔اور جواز صلوٰۃ جنازہ کیلئے اتنا بھی کافی ہے کہ میت امام کو نظر آئے۔چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں لكنّ أجاب بعض الحنفية عن ذلك بماتقدم من أنّه يصير كالميت الذى يصلّى عليه الامام وهويرا، ولايراه المأمون فأنّه جائز اتفاقاً(فتح الباری ۱۴۷/۲)

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مجبوراً اور ضرورت کے تحت اس کا جنازہ پڑھایا تھا۔اس لئے کہ آپؓ ایسی جگہ پر تھے کہ وہاں اس پر نماز جنازہ پڑھانے والا موجود نہیں تھا۔دوم اس نے آخر تک اپنا ایمان بھی چھپائے رکھا تھا۔ تو اس مجبوری کی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے اس پر نماز پڑھی ہے تاکہ اس کے ایمان کی اشاعت ہوجائے۔

كما قال العينيؒ و جواب آخر أنّه من باب الضرورة لأنّه مات بأرض لم يقم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)فیھا علیہ فریضۃ الصلوۃ فتعین فرض الصلوۃ لعدم من یصلی علیہ ثم (شرح ابی داؤد ۱۵۲/۶) اورعمدۃ القاری میں مزید لکھتے ہیں وقال الخطابی النجاشی رجل مسلم قد امن برسول اللّٰه ﷺ وصدقه علی نبوته إلاّ أنّه کان یکتم ایمانه الخ (عمدۃ القاری ۱۷۲/۸)

(۴) چوتھا جواب: اورایک جواب یہ بھی ہے نجاشی پر جنازہ سے مراد صلوۃ حقیقی نہیں بلکہ دعاہے کما قال الحصکفی و صلاۃ النبی ﷺ علی النجاشی لغویة قال ابن عابدین قوله لغویة ای الدعا (ردالمحتار ۲۱۹/۲) اورعلامہ عینیؒ نے مصنف کے حوالہ سے حضرت حسنؒ بصری کا قول نقل کیا ہے۔ وفی المصنف عن الحسن إنّما دعاله ولم یصل وعلی هذه فلا اشکال ولا جواب (اوجز المسالک ۴۴۶/۲)

دوسرااستدلال: مجوزین حضرات کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ رسول اللّٰہ ﷺ نے حضرت معاویہ بن معاویہ المزنیؓ پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھایا ہے۔چنانچہ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں۔ روی الطبرانی فی معجمة الاوسط و کتاب (مسند الشامیین) من حدیث أبی أمامة قال کنّا مع رسول اللّٰه ﷺ بتبوک فنزل جبریلؑ فقال یارسول اللّٰه إنّ معاویة بن معاویة المزنیّ بالمدینة أتحبّ ان تصلّی علیه الخ (عمدۃ القاری)

الجواب(۱) مگراس روایت سے استدلال کرنا بھی صحیح نہیں۔اس لئے اس روایت کی سند میں علاء بن زیاد ہے۔اور اس کے بارے میں علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں یہ راوی احادیث وضع کیا کرتا تھا۔شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے لکھا ہے ولکن لایصحّ فإنّ فی الاسناد العلاء بن زیاد ویقال یزید قال علیّ بن المدینی إنّه یضح الحدیث . قال النوویؒ فی الخلاصة والعلاء هذا ابن زید ویقال ابن یزید اتفقوا علی ضعفه قال البخاریّ وابن عدیّ وأبوحاتم هو منکر الحدیث (شرح ابی داؤد للعینی ۵۳/۶) (اوجز المسالک ۴۴۵/۲)

دوسرا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اگرچہ معاویۃ بن معاویۃ المزنی کی نماز جنازہ پڑھائی ہے لیکن حضرت معاویہؓ کا جنازہ آپ ﷺ کے سامنے تھا۔اوروہ تمام حجابات ختم ہوچکے تھے جوآپ ﷺ اورحضرت معاویہؓ کے درمیان تھے۔چنانچہ علامہ عینیؒ نے لکھا روی حدیث الطبرانی فی معجمة الأوسط وکتاب الشامیین من حدیث أبی أمامة قال کنّا مع رسول اللّٰه بتبوک فنزل جبریلؑ فقال یار سول اللّٰه أنّ معاویة بن معاویة المزنیّ.
مات بالمدینة أتحبّ ان تطوی لک الارض فتصلّی علیه ؟ قال نعم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)۔۔۔فضرب بجناحه على الأرض ورفع له سريره فصلّى عليه وخلفه صفان من الملائكة في كل صف سبعون الف ملك ثمّ رجع (عمدة القارى ۸/۱۷۳) اورالاصابہ میں حافظ ابن حجرؒ نے طبرانی، ابن مندہ اور بیہقی وغیرہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

عن أنس بن مالك قال نزل جبرئيل علّى النبىّ ﷺ فقال يا محمد مات معاوية ابن معاوية المزنّى أتحبّ أن تصلى عليه قال نعم فضرب بجناحيه فلم يبقى أكمة ولا شجرة الاتضعضعت فرفع سريره حتى نظر إليه فصلى عليه وخلفه صفان من الملائكة كل صف سبعون الف ملك (الاصابة)

اورایک اورروایت میں ہے فوضع جبرئيل جناحه الايمن على الجبال فتواضعت حتى نظرنا الى المدينة (اعلاء السنن ۲۸۴/) بلکہ ایک اورروایت میں ہےقال جبرئيل فهل لك ان تصلى عليه فأقبض لك الارض قال نعم فصلّى عليه (اعلاء السنن ۲۸۴/)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت معاویۃ بن معاویۃ المزنیؓ کا جنازہ آپﷺ کے سامنے تھا۔اور جنازہ کے جواز کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جنازہ امام کے سامنے ہو۔مقتدی جنازہ دیکھے یا نہ دیکھے' مقتدیوں کا دیکھنا ضروری نہیں۔ کماقال ابن عابدینؒ حتّیٰ صلّى عليه الصلوة والسلام بحضرته فتكون صلوٰة من خلفه على ميت يراه إلامامرو بحضرته دون الما مومنين وهذا غير مانع من الاقتداء (ردالمحتار ۲۰۹/۲) اور شیخ الحدیثؒ نے لکھا ہے فتكون صلوته كصلوٰة الامام على ميت رأه ولم يره المامون ولاخلاف فى جوازها (اوجز المسالك ۴۴۵/۲)

<u>تیسرا جواب</u> یہ ہے کہ یہ حضرت معاویۃؓ المزنی کی خصوصیت ہےاور یہی وجہ ہے کہ حضورﷺ نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا يا جبرائيل بما نال معاوية هذه المنزلة ؟ قال يحب قل هو الله احد وقرأته ايا ها جائيا وذاهبا وقائماً وقاعداً وعلى كل حال (اعلاء السنن ۲۸۴/)

اور یہ روایت جو مجوزین حضرات پیش کرتے ہیں بذات خود حضرت معاویۃؓ کی خصوصیت پر دال ہے۔اس لئے کہ اگر غائبانہ نماز جنازہ مشروع ہوتو پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سوال اتحب أن تصلى عليه ؟ وضربه بجناحيه بعد قول نعم کا کیا مطلب۔اس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت معاویہؓ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) کی خصوصیت ہے۔اس لئے یہ روایت ہمارے لئے حجت ہے۔ہمارے اوپر نہیں۔(اعلاء السنن ۸/۲۸۴)

اب اس پوری تفصیل سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا ہوگا کہ غائبانہ نماز جنازہ جائز نہیں۔جوایک دوواقعات دور نبوی ﷺ میں رونما ہو چکے ہیں۔آنحضرت ﷺ نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی ہے۔اولاً تو چونکہ وہ جزئی واقعات ہیں۔اس لئے وہ کلی حکم کے لئے مستدل نہیں بن سکتے۔اگر ایسا ہوسکتا تو پھر ایک آدمی کی گواہی بھی جائز ہونی چاہیے۔اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت خزیمہؓ کے اکیلے گواہی کو حل مقدمہ میں دلیل اور حجت سمجھ کر قبول فرمایا تھا۔

لیکن ان کے علاوہ مقدمہ میں صرف ایک آدمی کی گواہی مقبول نہیں ہوگی۔اور نہ ایک آدمی کی گواہی پر دعویٰ ثابت ہوسکتا ہے۔تو جس طرح حضرت خزیمہؓ کی ایک فرد کی گواہی دو کے قائم مقام ہے۔اور یہ اس کی خصوصیت ہے۔اور یہ حکم دوسروں کی طرف متعدی نہیں ہوسکتا۔تو اسی طرح غائبانہ جنازہ بھی ان دو حضرات کی خصوصیت ہے۔اس لئے ان واقعات سے کلی حکم کے لئے استدلال درست نہیں۔ثانیاً درحقیقت یہ دونوں نماز جنازہ غائبانہ نہ تھے۔اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ اور میت کے درمیان حائل تمام حجابات ہٹا دیئے تھے۔جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے جب مکہ مکرمہ میں کفار مکہ نے بیت المقدس کے بارے میں دریافت کیا۔تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ اور بیت المقدس کے درمیان تمام حجابات ہٹا دیئے۔اور بیت المقدس کو آپ ﷺ کے سامنے کردیا۔اور آپ اس کو دیکھ کر کفار کے تمام سوالات کے جوابات دیتے رہے۔تو اسی طرح یہاں بھی ہوا کہ میتوں کو آپ ﷺ کے سامنے کردیا گیا۔اور آپ ﷺ نے ان پر نماز جنازہ ادا فرمائی۔جس پر ذکر شدہ روایات دال ہیں۔اور نماز جنازہ کی صحت کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔مقتدیوں کو جنازہ نظر آنا ضروری نہیں۔اس لئے یہ حقیقتاً غائبانہ نماز جنازہ نہیں تھے۔

ثالثاً اگر غائبانہ نماز جنازہ ہو بھی تب بھی آنحضرت ﷺ نے عذر کی وجہ سے ایسا کیا۔اس لئے کہ حبشہ میں اس پر نماز جنازہ پڑھانے والا کوئی نہ تھا۔اس نے اپنا ایمان بھی ظاہر نہیں کیا۔رسول اللہ ﷺ نے اس کے ایمان کی اشاعت اور فرض کفایہ کی تکمیل کے لئے نماز جنازہ پڑھائی۔تو اس ضرورت کے تحت کئے گئے عمل کو کلی حکم کے لئے مستدل نہیں بنایا جاسکتا۔اس لئے کہ الضرورۃ تتقدر بقدر الضرورۃ اور یہاں پر یہ ضرورت بھی نہیں۔اس لئے کہ شہید عامر عبدالرحمٰن چیمہ صاحبؒ کا جنازہ اس کے آبائی گاؤں میں پڑھایا جا چکا ہے۔اور وہ فریضہ ادا ہو چکا ہے اس لئے اب اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔بعض لوگ اس کو ایصال ثواب سمجھتے ہیں۔مگر یہ نظریہ بھی صحیح نہیں۔اس لئے کہ ایصال ثواب کیلئے اور بھی بہت سارے اعمال موجود ہیں۔لہٰذا جو ایصال ثواب (بقیہ اگلے صفحہ پر)

خدمت اسلام کا ثمرہ: علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مذکورہ ہدیہ بھیجتے وقت نجاشی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ نجاشی تھا جو اسلام لانے سے قبل مر گیا تھا۔ لیکن اسلام اور صحابہؓ کا انہوں نے بھی احترام کیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کیلئے بھی دعائیں فرمائی تھیں۔ اور اسی کی برکت تھی کہ ان کی حکومت کو سینکڑوں سال تک دوام حاصل ہوا۔ ہمارے والد ماجد حضرت شیخ الحدیثؒ کے بقول حبشہ کا شاہ ھیل سلامی بھی انہی کے قبیلہ سے تھا۔ جن کا اقتدار ابھی چند سال قبل ایک فوجی انقلاب کے ذریعے ختم ہو گیا تھا۔ یہ لوگ تقریباً تیرہ سو سال سے حضور اکرمؐ کی دعاؤں کی برکت سے حکومت کرتے رہے۔ لیکن جب انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی کو شیوہ بنایا۔ اور سرکشی کو شعار بنایا تو اللہ تعالیٰ نے انکی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اور آج حبشہ میں بہت زیادہ مظالم ہو رہے ہیں۔ کیمونسٹ مما لک کے زیر اثر ہیں۔ یہاں مسلمان اقلیتوں پر ظلم ہوتا ہے۔

غیر مسلموں کے ہدایا سے سلوک: بہر حال نبی کریم ﷺ نے یہ ہدیہ قبول کر کے اس بات کی تعلیم دی کہ اگر روابط اور تعلقات اچھے ہوں تو کفار کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔ یہاں صرف **خفین اسودین** ہے۔ دوسری روایات کے مطابق انہوں نے اور بھی ہدایا بھیجے تھے۔ جن میں قمیص اور شلوار اور کچھ دیگر چیزیں بھی تھیں۔ لیکن یہاں اس حدیث میں صرف موزوں کا ذکر ہے۔

ساذجین دونوں سادہ تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کھال ایسی خشک اور صاف کی جائے کہ بال چمڑے پر رہیں اور صاف نہ ہو تو اس سے بناء ہوا موزہ سادہ کہلاتا ہے۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ

(بقیہ حاشیہ)۔۔۔۔ کتاب وسنت سے ثابت ہے اس کو اختیار کیا جائے۔ غائبانہ نماز جنازہ کتاب وسنت سے ایصال ثواب کیلئے مشروع نہیں ہے۔ بلکہ جو حضرات اس کے جواز کے قائل ہیں ان کیلئے یہ ایک مسنون عمل ہے۔ صرف ایصال ثواب کے لئے نہیں جس کی وضاحت جواب میں مذکور ہوئی ہے۔ اور اگر اس سے سیاسی مقاصد کا حصول یا عوام الناس کی توجہ حاصل کرنا ہو تو اس کیلئے بھی دیگر ذرائع اور اسباب ہیں۔ جن کو اختیار کرتے ہوئے سیاسی مقاصد اور عوام کی توجہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ کسی غیر ثابت شدہ اور غیر مشروع عمل کو لوگوں میں مشہور کر کے شہرت حاصل کرنا اور اختلاف اور بے جا گفتہ وشنید کا دروازہ کھولنا اہل علم کو زیب نہیں دیتا۔ اور یہ بات کسی بھی صاحب علم پر مخفی نہیں کہ بلاضرورت دوسرے مذہب کے قول پر عمل تو کجا اپنے مذہب کے اندر مرجوح قول پر عمل کرنا اس پر فتویٰ دینا ناجائز اور خرق للاجماع ہے۔ اس لئے اس طرح کے اعمال سے پرہیز کیا جائے۔ واللہ علم وعلمہ اتم. مختار اللہ حقانی (مختار)

سادہ سے مراد غیر منقش ہے یا یہ کہ ان میں دوسرا رنگ نہ تھا یعنی خالص سیاہ رنگ کے تھے۔

مسح علیھما: یعنی آپ ﷺ نے موزے ملتے ہی پہن کر اس پر مسح فرمائی(۱)۔اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کفار کی مصنوعات پر کوئی ظاہری نجاست نہ ہو تو اس کے ساتھ طہارت کا معاملہ ہوگا۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ جو شخص جس مقصد کیلئے ہدیہ دے تو اس ہدیہ کو اس مقصد میں جلدی صرف کردینا چاہیے۔اس بات سے ہدیہ دینے والا خوش ہوتا ہے۔

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسح تو تب ہوتا ہے جب موزہ طہارت کاملہ پر پہنا جائے اور پھر وضوٹوٹنے کے بعد وضو کیا جائے لہٰذا یہاں بھی ہم یہی کہیں گے کہ عین اسی وقت مسح نہیں کیا ہوگا۔ بلکہ پہننے کے بعد جو وضوٹوٹا تو بعد میں وضو کرتے ہوئے مسح کیا ہوگا۔اس کے ساتھ ساتھ اس حدیث سے مسح علی الخفین کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے جو کہ تقریباً متواتر ۃ المعنی احادیث سے ثابت ہے۔

(۲)حدّثنا قتیبة بن سعید انا یحییٰ بن زکریا بن أبی زائدة عن الحسن بن عیاش عن أبی إسحاق عن الشعبیّ قال قال المغیرة بن شعبة أهدی دحیة للنبی ﷺ خفین فلبسهما وقال اسرائیل عن جابر عن

---

(۱)احناف کے ہاں مسح الخفین مطلقاً جائز ہے۔چاہے موزے پہننے والا سفر میں ہو یا حضر میں۔امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے **ماقلت بالمسح علی الخفین حتی جاء نی مثل ضوٴ النهار**، علامہ مناویؒ نے فرمایا ہے کہ **وقدروی فی المسح ثمانون صحابیاً واحادیثه متواترة ومن ثمّ قال بعض الحنفیّة أخشیٰ ان یکون انکاره ای من أصله کفراً(مناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/۱۵۶)** شرح عقائد میں حضرت انس بن مالکؓ کا فرمان مذکور ہے کہ آپؓ اھل السنۃ والجماعۃ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؓ نے فرمایا **ان تحبّ الشیخین ولاتطعن فی الختنین وتمسح علی الخفین(شرح العقائدص ۱۱۸)** اس لئے حافظ ابن مندہ اصفہانیؒ نے فرمایا ہے کہ مسح علی الخفین افضل ہے اس لئے کہ اسمیں اہل بدعت کیساتھ اختلاف ہے اور اس کے علاوہ اس میں اثبات حق اور اظہار سنت بھی ہے۔(احکام الاحکام ۱/۲۰)اگرچہ علامہ نوویؒ نے غسل کو ترجیح دی ہے شرح مسلم للنووی ۱/۱۳۲)مگر حافظ ابن قیمؒ کی رائے اعدل الاقوال ہے فرماتے ہیں کہ **ولم یکن علیه السلام یتکلف ضد حالة التی علیهاقدماه بل ان کانت فی الخف مسح علیهما ولم ینزعهماوان کانتا مکشوفتین غسل القدمین ولم یلبس الخف لیمسح علیه وهذااعدل الاقوال فی مسئلة الافضل من المسح والغسل قاله شیخنا(زادالمعاد ۱/۹۲)(مختار)**

عامر وجبة فلبسهما حتى تخرّقا لا يدرى النبی ﷺ أذكیّ هما ام لا

قال أبو عيسىٰ هذا هوا بو اسحق الشيبا نی و اسمه سليمان(۱) .

ترجمہ: مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ دحیہ کلبیؓ نے دوموزے نبی کریم ﷺ کو بطور ہدیہ پیش کئے تو آپ ﷺ نے ان کو پہنا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے موزے اور ایک جبہ پیش کیا۔ تو آپ ﷺ نے انہیں پہنا۔ یہاں تک کہ وہ پھٹ گئے۔ نبی کریم ﷺ کو یہ علم بھی نہ تھا کہ یہ موزے مزبوح جانور کی کھال کے تھے یا غیر مذبوح کے۔

اھدیٰ دحیه الخ حضرت دحیہؓ وہ صحابی ہیں جن کی صورت میں متشکل ہوکر حضرت جبریلؑ نبی کریم ﷺ کے پاس وحی لایا کرتے تھے۔ باب اول کی بارہویں حدیث کے ضمن میں ان کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ **فلبسهما** یہیں سے ترجمۃ الباب کا اثبات ہوتا ہے۔ **وجبة الخ** حضرت عامر شعبیؒ سے روایت کرتے ہوئے اسرائیل نے موزوں کے ساتھ جبہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ شامی جبہ تھا۔ جسے نبی کریم ﷺ نے پہنا بھی تھا۔

---

(۱)جامع ترمذی ۱/ ۳۰۶ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الجبة والخفين (مختار)

۱۱. باب ما جاء فی نعل(۱) رسول اللّٰہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کی جوتی مبارک کے بیان میں

جوتی مبارک کا ذکر: عام طور پر نبی کریم ﷺ کے نعل ایسے ہوتے تھے جیسے کہ پلاسٹک کے بعض چپل ہوتے ہیں۔ اوپر سے دو شراک یعنی پٹیاں ہوتی تھی(۲)۔ حضرت تھانویؒ وغیرہ علماء نے پاپوش مبارک پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ اور ان میں وہ نقش بھی کھینچا ہے۔ علامہ بیجوریؒ لکھتے ہیں کہ وقد کانت نعله ﷺ مخصرة معقبة ملسنة كما رواه ابن سعد فی الطبقات(المواهب الدنية ص ۸۰) یعنی نبی کریم ﷺ کا جوتہ درمیان میں تنگ تھا۔ پچھلی طرف بھی باندھنے کی پٹی تھی اور آگے کی طرف زبان جیسی نوکدار تھی۔ اس کی بہت سی برکتیں ہیں۔ بعض لوگ اسے بطور تعویذ استعمال کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے قدم کی خاک بھی مبارک ہے۔ پاپوش کے متبرک ہونے میں تو بات ہی نہیں۔ بلکہ اس کے نقش میں بھی بڑی برکتیں ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے زاد السعید کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا ہے۔ اور اس میں وہ برکات و فیوضات لکھی ہیں جن کا تجربہ مشائخ کو ہوا ہے۔ عموماً اہل اللہ حضرات اس نقش سے توسّل کرتے ہیں۔ سر پر رکھ کر دعا کرتے ہیں۔ ایک شاعر شیخ محمد بن محمد الجزریؒ نے بہت خوبصورت انداز میں نعل مبارک کے نقش سے متعلق اشعار کہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

يا طالباً تمثال نعل نبيّه	ها قد وجدت الى اللقاء سبيلا
فاجعله فوق الراس واخضعن له	وفتغال فيه واولد التقبيلا

(۱) نعل جوتے، اور پاپوش کو کہا جاتا ہے۔ مواہب الدنیۃ میں لکھا ہے كل ماوقيت به القدم عن الارض (ص ۷۹) یہ لفظ مصدر بھی استعمال ہوتا ہے اور اسم بھی اور یہاں دونوں کا احتمال ہے وهي هنا محتملة الاثنين

(اتحافات ص ۱۲۱)(مختار)

(۲) رسول اللہ ﷺ کے پاپوش کے بارے میں مواہب ۸۰ میں وقد كانت نعله ﷺ مخضرة معقبه ملسنة کہ آپ ﷺ کی پاپوش کی کمر باریک پشت والے عقب والا تھا (جسکے تسمہ سے ایڑی باندھی جاتی تھی) اور اس کا اگلا حصہ زبان کی طرح نکلا ہوا تھا یہ تینوں آنحضرت ﷺ کے نعلین مبارک کے امتیازی صفات تھیں (مختار)

من یدعی الحب الصحیح فانّه یثبت علی ما یدعیه دلیلا(۱)

اس باب میں کل گیارہ احادیث ہیں۔نعل مبارک کا نقشہ اس باب کی تمام احادیث پڑھ کر ذہن میں نقش ہوجائے گا۔

(۱) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا أبو داؤد ثنا همّام عن قتادة قلت لأنس بن مالک کیف کان نعل رسول اللّٰه ﷺ قال لهما قبالان(۲).

ترجمہ: حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا۔کہ نبی کریم ﷺ کے نعل مبارک کیسے تھے؟انہوں نے فرمایا ہر ایک جوتی میں دو دو تسمے تھے۔

نعل مؤنث سماعی ہے۔اس لئے **کیف کانت** کہنا بھی درست تھا۔لیکن تانیث غیر حقیقی ہونے کی بناء پر **کانَ** بھی درست ہے۔جیسے **طلع الشمس** اور **طلعت الشمس** علاوہ ازیں تانیث حقیقی نہ ہونے کی بناء پر اس کی تاویل ملبوس سے ہوسکتی ہے۔اور اس کے ساتھ مذکر کا معاملہ ہوسکتا ہے۔ **لهما قبالان** ہر نعل کے دو دو **قِبال** تھے(۳)۔ **قِبال** قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔اور اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔راجح بات یہ ہے کہ قبال وہ پٹی نما چمڑا ہوتا ہے جو انگلیوں کے درمیان سے گزر کر تلوے کے اگلے حصے کو اوپر کی پٹیوں یعنی شراک سے ملاتی ہے۔اسے شِسْعْ بھی کہا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے پاپوش مبارک میں دو قبال تھے۔جن میں سے ایک انگوٹھے اور ساتھ والی دوسری انگلی کے درمیان سے گزرتا تھا۔دوسرا درمیانی انگلی اور اس کے ساتھ والی چھوٹی انگلی کے

---

(۱) اے طلب کرنیوالے!نقش نعل شریف اپنے نبی ﷺ کے آگاہ ہوجا۔تحقیق پالیا تو نے اس کے ملنے کا راستہ۔
پس رکھ اس کو سر پر اور خضوع کر اس کیلئے اور مبالغہ کر خضوع اور پے در پے اس کو بوسے دے۔
جو شخص دعویٰ کرے سچی محبت کا پس بے شک وہ قائم کرتا ہے اپنے دعوے پر دلیل کو(مختار)

(۲)صحیح بخاری ج۲ص۸۷۱کتاب اللباس باب قبالان فی نعل الخ ، سنن ابی داؤد۲/۷۱۲ کتاب اللباس باب الانتعال، ابن ماجه ص۲۶۷کتاب اللباس باب صفة النعال ، جامع ترمذی ۱/۳۰۶کتاب اللباس بابماجاء فی نعل النبی ﷺ(مختار)

(۳)**لهماقبالان** کا یہ مطلب ہے کہ **لکل واحدمنهما قبالان** یا **تقسیم الاحاد علی الاحاد** ہے کہ ہر ایک نعل کیلئے ایک قبالہ تھا۔تو یہاں لغوی لحاظ سے دونوں مطلب مراد ہوسکتے ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ہر نعل کے دو قبالے تھے(مختار)

درمیان سے گزرتا تھا(۱)۔

(۲) حدّثنا أبو کریب محمّد بن العلاء ثنا وکیع عن سفیان عن خالد الحذّاء عن عبداللّٰہ بن الحارث عن ابن عباس قال کان لنعل رسول اللّٰہ ﷺ قبالان مثنی شراکھما(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے نعلین کے بالائی تسمے دہرے تھے۔

خالدا لحذّاء یہ جلیل القدر تابعی تھا۔حذاء موچی کو کہتے ہیں۔راوی اور روایت میں اتفاقی موافقت ہے کیونکہ روایت جوتی کے بارے میں ہے اور راوی بھی موچی ہے(۳)۔

<u>پیشہ باعث عار نہیں</u>: گزشتہ زمانے میں یہ کوئی شرم کی بات نہیں تھی کہ کوئی شخص اپنے یا اپنے آبائی پیشے کی طرف نسبت کرے۔خواہ وہ کچھ بھی ہو۔بہت سے فقہاء، محدثین اور مفسرین کے ساتھ آپ کو حلوائی، دبّاغ، وراق، حذّ اد، اور حذّ اد وغیرہ کے الفاظ ملیں گے۔جو مذکورہ پیشوں کی طرف ان کی نسبت کو ظاہر کرتے ہیں۔

قبالان مثنیٰ شراکھما پاؤں کے اوپر گزرنے والی پٹی کو شراک کہا جاتا ہے۔پشت پا کا یہ تسمہ مثنی دہرا یعنی دو تہوں والا تھا۔

(۳) حدّثنا احمد بن منیع و یعقوب بن إبراھیم ثنا أبو احمد الزبیریّ ثنا عیسیٰ بن طھمان قال اخرج الینا أنس بن مالک نعلین جرداوین لھما قبالان قال فحدّثنی ثابت بعد عن أنس

---

(۱) شیخ بیجوریؒ نے لکھا ہے وکان ﷺ یصنع احدالقبالین بین الابھام والتی تلیھاوالآخربین الوسطیٰ والتی تلیھا(المواھب اللدنیة ص ۷۰)(مختار)

(۲)سنن ابن ماجة ص ۲۶۷ کتاب اللباس باب صفة النعال، مصنف ابن ابی شیبة ۱۸ / ۳۱ (مختار)

(۳)علامہ مناویؒ نے لکھا ہے کہ آپؒ نے موچیوں میں شادی کی تھی۔شیخ عبدالرؤف نے آپؒ کے بارے میں لکھا ہے ثقة امام حافظ تابعی جلیل القدر کثیر الحدیث واسع العلم مات سنة احدیٰ واربعین ومائة. اور بعض کا کہنا ہے کہ چونکہ آپؒ اکثر و بیشتر موچیوں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے اس لئے آپؒ کو الحذاء کہا جاتا ہے۔(مختار)

أنّهما كانتا نعلي رسول الله ﷺ(١).

ترجمہ: عیسیٰ بن طہمان کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے ہمیں دو جوتے جن پر بال نہیں تھے۔نکال کردکھلائے۔بعد میں مجھے ثابتؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ نبی کریم ﷺ کی جوتیاں تھیں۔

جرداوین یہ جرداکا تثنیہ ہےاس نعل کانام ہے جس پر بال نہ ہوں۔اور بعض کے خیال میں جرداء وہ جوتا ہے جس پر چھوٹے چھوٹے بال ہوں۔نبی کریم ﷺ اس قسم کے نعل اس لئے پسند فرماتے کہ اس میں نفاست زیادہ ہوتی ہے۔گرد اور مٹی سے پاک ہوتے ہیں۔اس کے مقابل میں شعراوین ہوتے ہیں۔یعنی وہ جوتے جن پر ابھی بال باقی ہوں یا جس پر لمبے بال ہوں۔یعنی ان کی چمڑے کی دباغت بالوں کے ساتھ ہوئی ہو۔پرانے زمانے میں لوگ سادگی کے سبب شعراوین کا استعمال کرتے تھے لیکن تہذیب کی قہقری رجعت کی وجہ سے آج یہ فیشن کے طور پر پسند اور استعمال کئے جاتے ہیں(٢)۔

(۴) حدثنا اسحاق بن موسى الانصاري قال معن قال ثنا مالك ثنا سعيد بن ابي سعيد المقبت عن عبيد بن جريح انه قال لا بن عمر رايتك تلبس النعال السبتية قال اني رأيت رسول الله ﷺ يلبس النعال التي ليس فيها شعرو يتوضأ فيها فاني احب ان البسها(٣).

---

(١) صحيح بخاري ١/٤٣٨ كتاب الجهاد باب ماذكر من درع النبي ﷺ الخ(طبقات ابن سعد ١، ٢/١٦٧) (مختار)

(٢) <u>تبرک باثارالصالحین کا مسئلہ</u>: اس روایت سے تبرک با ثارالصالحین بھی ثابت ہے۔الاتحافات میں ہے ویوخذ من الحديث ندب حفظ آثار الصالحين ،حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آنحضرت ﷺ کا ایک جبہ تھا جسے وہ بیمار لوگوں کو پہنایا کرتے تھے اور اس کو دھو کر اس کا پانی لوگوں کو بغرض شفاء پلایا کرتے تھے۔جس سے وہ ٹھیک ہو جاتا۔ہمارے اکابر علماء دیوبند بھی تبرک با ثار الصالحین کے قائل تھے اور ہیں مگر یاد رہے کہ تبرک میں ایسا مبالغہ کرنا صحیح نہیں جو شرک کی حدود کو کراس کرے۔(مختار)

(٣)صحيح بخاري ج ١ ص ١٢٨ كتاب الوضوء باب غسل الرجلين في النعلين الخ و كتاب اللباس ج ٢ ص ٨٧٠ باب النعال السبتية وغيرها، صحيح مسلم ج ٢ ص ٣٨٦ باب بيان ان الافضل ان يحدم الخ ،كتاب الحج ، سنن ابي داؤد ج ١ ص ٢٦٣ كتاب المناسك باب وقت الاحرام، سنن نسائي ١/٣١ كتاب الطهارة باب الوضوء في النعل(مختار)

ترجمہ: عبید بن جریجؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا کہ آپ بغیر بالوں کے جوتے پہنتے تھے۔(اس کی کیا وجہ ہے) تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ایسے جوتے پہنتے ہوئے دیکھا تھا جن پر بال نہیں ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ ان میں وضوء بھی فرماتے تھے اس لئے میں ان کو پہننا پسند کرتا ہوں۔

النعال السبتيّة. سبتيّة سبت سے ہے جس کے معنی کاٹنے کے ہیں۔اور سبت سین کے کسرہ کے ساتھ گائے کی اس کھال کو کہتے ہیں جو خوب پکائی جا چکی ہو کیونکہ اس طرح اس کے بال گر جاتے ہیں۔ ہفتے کے دن کو بھی یوم السبت اس لئے کہتے ہیں کہ اس دن اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات سے فارغ ہو چکے تھے۔ نیز یہ یہود کی تعطیل کا دن تھا۔وہ بھی اس دن ہر کام سے کٹ جاتے تھے۔ بہرحال سبتيّة وہ جوتیاں ہیں جن کے بال چمڑے کی دباغت کے وقت صاف کئے گئے ہوں۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں اس قسم کا چمڑا عام طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا۔ نیز قیمتی ہونے کی وجہ سے ہر کسی کو میسر نہ تھا۔

چنانچہ صحابہ کرامؓ عموماً ایسے جوتے نہیں پہنتے تھے جیسا کہ بخاری شریف کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔اس لئے غالب خیال یہی تھا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی یہ استعمال نہیں کئے ہونگے۔ یہ تو صرف مترفین اور دولتمند لوگوں کو میسر ہو سکتا تھا۔ادھر حضرت ابن عمرؓ ان کا استعمال کرتے تھے حالانکہ حضرت ابن عمرؓ تو اتباعِ سنت میں بہت مشہور تھے۔ بلکہ آپؓ تو اس قدر محو فی السنۃ تھے کہ اسی نسبت سے آپؓ کو تمام صحابہ میں شہرت حاصل تھی۔ نبی کریم ﷺ کے پیچھے جاتے تو جہاں نبی کریم ﷺ کا قدم مبارک پڑتا وہیں آپؓ بھی قدم رکھتے تھے۔ حج کے سفر کے دوران راستے میں پوچھتے رہتے کہ نبی کریم ﷺ سفر حج میں کس راستے پر گئے ہیں۔ جہاں نبی کریم ﷺ اتفاقاً بھی بیٹھے تھے آپؓ بھی وہاں بیٹھتے۔ جہاں آپ ﷺ نے قیام کیا وہاں آپؓ نے بھی قیام کیا۔ جہاں آپ ﷺ نے پیشاب کیا وہاں آپؓ بھی پیشاب کرنے بیٹھے۔ ساری عمر ایسی اتباع اور پیروی کرتے رہے۔

<u>سوال کا منشا:</u> لہٰذا سائل کے سوال کیلئے منشا پیدا ہوا کہ تم نے تو بالوں سے صاف چمڑے کی جوتیاں پہنی ہیں۔اور رسول اللہ ﷺ کو یہ کب میسر تھے۔لہٰذا تمہارا یہ عمل خلافِ سنت تو نہیں۔ نیز اعتراض کا منشا یہ

بھی ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی جوتیاں پہننا عیش پرستوں کا شیوہ ہے۔ جواب میں حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے سنت کی مخالفت نہیں کی۔ نہ عیش پرستی میں مبتلا ہوں بلکہ میرا یہ عمل بھی اتباع سنت میں داخل ہے۔ کیونکہ میں نے خود نبی کریم ﷺ کو وہ جوتے پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ جس پر بال نہیں تھے۔ اور آپ ﷺ اس میں کبھی کبھی وضوء بھی فرماتے تھے۔ جس طرح کبھی چپل سمیت پاؤں دھوئے جاتے ہیں(۱)۔ اور تنجسّ اور تلویث کا اندیشہ نہ ہوتو ایسا جائز بھی ہے۔ جس طرح کہ حدیث مذکور سے اشارہ ملتا ہے۔

(۵) حدّثنا إسحٰق بن منصور ثنا عبدالرزاق عن معمر عن ابن أبی ذئب عن صالح مولیٰ التوأمة عن أبی هريرة قال كان لنعل رسول اللّٰه ﷺ قبالان(۲).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے نعل مبارک کے دو تسمے تھے۔

توأمةؓ: مولی التوأمه تو اُمہ ربیعہ بن امیہ بن خلف کی بہن ہیں صحابیہ ہیں۔ چونکہ ولادت کے وقت دوسری بہن کے ساتھ جڑواں پیدا ہوئی تھی اس لئے ان کوتو اُمہ کہا جانے لگا۔

(۶) حدّثنا أحمد بن منيع ثناأبوأحمد أنا سفيٰن عن السّدّی حدّثنی من سمع عمرو ابن حريث يقول رأيت رسول اللّٰه ﷺ يصلّی فی نعلين مخصوفتين(۳).

---

(۱) علامہ نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس روایت کا معنیٰ یہ بھی ہے کہ أنّه يتوضّأ ويلبسها بعدور جلان رطبان فاناأحبّ ان البسها اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جوتا پہننا چاہئے۔ البتہ مسجد کے احترام اور مقبرہ کے احترام کی وجہ سے احتراماً جوتے باہر اتارنا اصول ہے۔ (مختار)

(۲) جامع ترمذی ۱/۴۴۰ ابواب اللباس باب ماجاء فی نعل النّبیّ ﷺ شرح السنة ۱۲/۴۷ باب النعل، کتاب اللباس (مختار)

(۳) مسنداحمد ۴/۳۰۷ وابوالشیخ ۱۳۵ (مختار)

ترجمہ: عمرو بن حریثؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ایسے جوتوں میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جن میں دوسرا چمڑا اسلا ہوا تھا۔

عن السدی: سدہ گھر کے دروازے کو کہتے ہیں۔ یہاں مسجد کوفہ کے بڑے دروازے کی طرف نسبت کر کے اسماعیل بن عبدالرحمٰن کو سدی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مسجد کے مین گیٹ کے ساتھ بیٹھ کر چہرہ کے آنچل اور سر کے دوپٹے فروخت کیا کرتا تھا۔ یہ شیعہ راوی ہے لیکن محدثین اس کی توثیق کرتے ہیں۔

<u>عمرو بن حریثؓ</u>: **من سمع عمرو بن حریث،** عمرو بن حریثؓ قرشی مخزومی صحابی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو دیکھا سنا۔ اور نبی کریم ﷺ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر ان کے لئے دعا بھی فرمائی۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ بعد میں کوفہ میں رہائش اختیار کی اور ایک زمانہ میں کوفہ کے امیر بھی رہے۔ یہیں ۸۵ھ میں وفات پائی۔ ان سے ان کے بیٹے کے علاوہ کئی دوسرے تابعین نے بھی روایت کی ہے۔ یہاں پر سدی جس شخص سے روایت کرتے ہیں۔ وہ مجہول ہے شراح نے لکھا ہے کہ یہ راوی غالباً عطاء بن السائب ہونگے۔

مخصوفتین، یعنی ایسے جوتوں میں جس کے تلوے دو تہوں کے سلے ہوئے مضبوط تھے۔ خصف کے معنی "**خیاطة الجلد علی الجلد طیاً علی طیٍّ**" کہا جاتا ہے۔ یعنی خصف مضبوطی کے لئے ایک چمڑے کو دوسرے چمڑے پر لگانے اور چپکانے کو کہتے ہیں۔ گویا مراد یہ ہے کہ اس کا تلوا دہرا تھا۔ لیکن چونکہ بعض احادیث میں ایک تلوے کا ذکر ہے۔ اس لئے بعض شراح نے مخصوفتین کا معنی مرقعتین لیا ہے یعنی آپ ﷺ پیوند لگے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ قرآن کریم میں آدمؑ وحواؑ کے بارہ میں ہے **فطفقا یخصفان علیھما من ورق الجنة.(الآیة)**

<u>جوتوں میں نماز</u>: یہاں سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جوتوں کی یقینی طہارت کے صورت میں ان کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے۔ جوتوں کی طہارت ان میں چلنے اور ان کے زمین کے ساتھ رگڑنے کی وجہ سے بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن جوتوں میں نماز ادا کرنا کوئی فرض اور لازم بات بھی نہیں۔ جس طرح کہ بعض

اہل نجد محض ظاہر حدیث کو دیکھ کر اس کا التزام کر لیتے ہیں (۱)۔

(۷) حدّثنا إسحق بن موسی الأنصاری أنا معن أنا مالک عن أبی الزناد عن الأعرج عن أبی هریرة أنّ رسول اللّٰہ ﷺ قال لا یمشینّ احدکم فی نعل واحد لینعلهما جمیعا او لیحفهما جمیعا(۲).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک جوتی پہن کر نہ چلے یا تو دونوں جوتیاں پہنے یا دونوں نکال دے۔

لینعلهما: یہ لفظ یا تو یائے مضمومہ کے ساتھ باب افعال کا امر غائب ہے۔اس صورت میں ہما کی

---

(۱) ۸۳،۸۴ ۱۳۸۴ھ میں مجھے پہلے حج اور زیارت حرمین کی سعادت حاصل ہوئی۔ رمضان شوال ذی قعدہ مدینہ منورہ میں قیام کی سعادت نصیب ہوئی۔ان ایام میں ہمارے کئی اہم پاکستانی دوست جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم تھے۔ان کی رفاقت میں مجھے بھی رحلات علمیہ اور آثار مبارکہ دیکھنے کیلئے سفر کا اتفاق ہوا۔ایک بار خیبر کی طرف رحلۃ تھا۔راستہ میں ایک شب غالباً وادی القریٰ میں پڑاؤ ہوا۔رحلۃ کے مشرف علامہ ناصر الدین البانیؒ (علم الجرح والتعدیل کے معروف عالم ومصنف) طلبہ سے اپنے مسلک پر سختی سے عمل کرانے پر سختی سے کاربند رہے۔ساری جماعت کو صف واحد میں کھڑے ہو کر جوتے پہنے ہوئے نماز کراتے رہے۔اور کسی کو اس کے خلاف کرنے کی اجازت نہ دی۔یہی حال درس کے دوران ان کے تفردات کا رہا۔میں باضابطہ طالب علم نہیں تھا پاکستانی احباب کے تعلق سے مجھے بھی بعض دروس میں اعزازی شرکت کی سعادت ملی۔میری شیخ البانیؒ سے نوک جھونک جاری رہتی۔محترم کاکاخیل منع کرتے رہے مگر میں باضابطہ طالب علم نہ ہونے کی وجہ سے جھجک محسوس نہ کرتا۔یہ پاکستانی طلبہ جو میرے نہایت مخلص دوست اور مہربان بنے رہے۔میرے صدیق صمم مولانا عبداللہ کاکاخیلؒ مولانا محمد حسن جان شیخ الحدیث پشاور، مولانا عبدالرزاق سکندر مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی ان کے علاوہ علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم تھے۔سفر حج کے رفیق خاص محب مکرم حضرت مولانا قاری سعید الرحمٰن کاملپوری راولپنڈی تھے۔(سمیع الحق)

(۲) صحیح بخاری ۲/ ۸۷۰ کتاب اللباس باب لا یمشی فی نعل واحد، صحیح مسلم ۲/ ۲۰۵ کتاب اللباس و الزینة باب استحباب لبس النعال الخ.فی الیمنیٰ الخ، سنن ابی داؤد ۲/ ۲۱۷ باب فی الانتعال کتاب اللباس باب فی الانتعال، مؤطا امام مالک ص ۵۱۰، کتاب الجامع باب ماجاء فی الانتعال (مختار)

ضمیر قد مین کو رجع ہوگی جن کا ذکر دلالۃً موجود ہے۔ اور یا پھر یائے مفتوحہ کے ساتھ ثلاثی مجرد سے امر کا صیغہ ہے اس صورت میں ہما کی ضمیر نعلین کو راجع ہونی چاہیے۔ اگر چہ قدمین کو راجع ہونے کا احتمال بھی ہے۔ نعل اور انعال دونوں پاؤں میں جوتی پہننے کو کہتے ہیں اور احفاء اس کی ضد ہے۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہ یا تو دونوں پاؤں میں جوتیاں ہوں یا ایک بھی نہ ہو۔ ایک پاؤں برہنہ ہونے سے آدمی مسخرہ سا بن جاتا ہے۔

نہی کا راز: نبی کریم ﷺ امت کو بہترین معاشرتی آداب کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ کہ اگر جوتیاں پہنے ہوں تو دونوں پاؤں میں ڈالو ورنہ برہنہ پا ہی بہتر ہے۔ اور یہ تو جہالت اور سفاہت کی نشانی ہے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں برہنہ ہو۔ دونوں پاؤں برہنہ ہوں تو بھی آدمی کم از کم برا تو نہیں لگتا۔ لیکن فقط ایک پاؤں برہنہ ہونے سے آدمی مسخرہ سا بن جاتا ہے۔ جبکہ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں **لیس لنا مثل السوء ان نجلس کالکلب**(۱)۔

علاوہ ازیں اس قسم کے عمل میں طبی لحاظ سے بھی بڑے نقصان ہیں۔ ایک پاؤں اونچا اور دوسرا نیچے ہو تو اس سے جسم کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ جسم تو زنجیر کی طرح کڑیوں کا ایک سلسلہ ہے بڑے باریک اور پیچیدہ پرزے ہیں۔ جو اوپر سے گوشت سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ چلنے اور حرکت کے دوران اعضاء اور اس کے جوڑ توازن کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ اور اگر ایک پاؤں اونچا اور دوسرا نیچے ہو تو چلتے وقت یہ حرکت غیر متوازن ہو جاتی ہے جس سے اعضاء کی فطری وضع کو بہت نقصان پہنچتا ہے(۲)۔ پھر اس صورت میں گرنے کا بھی زیادہ احتمال ہوتا ہے جو کبھی کبھی ہمیشہ کے لئے معذور کر دیتا ہے۔ اطباء کی تحقیق کے مطابق اگر چلتے وقت توازن برقرار نہ ہو تو ریڑھ کی ہڈی اور جسم کے دیگر نظاموں کو نقصان پہنچتا ہے۔ جو

(۱) ایک نسخہ میں لیحفھما کی بجائے لیخلعھما ہے پھر ضمیر صرف نعلین کو راجع ہو سکتی ہے۔ (اصلاح الدین)

(۲) آج کل کے سائنس دان بھی یہی کہتے ہیں کہ ایک جوتا پہن کر چلنا انسانی صحت کیلئے صحیح نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانی جسم ایک اعصابی نظام کے تحت چل رہا ہے۔ جس کا مرکز دماغ اور حرام مغز ہے۔ جب آدمی کا ایک پاؤں ننگا اور دوسرا ڈھکا ہوا ہو تو اعصابی نظام کیلئے بہت نقصان دہ ہے۔ اس سے لنگری کے درد میں (SHYAHTICA) مبتلا ہونے کا خطرہ ہے۔ (مختار)

جسم میں مضر اثرات چھوڑتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اطباء کی اس رائے کو بہت پہلے اپنے مذکورہ ارشاد میں واضح فرمایا ہے۔ **فعلیه الف تحیة و سلام.** لیکن یہ حکم بھی اس وقت کے لئے ہے جب کوئی عذر نہ ہو۔ اور اگر کسی عذر کی وجہ سے چند قدم ایک ہی جوتے میں چلنا پڑے تو مضائقہ نہیں۔ مثلاً ایک جوتا ٹوٹ جائے اور کسی مناسب جگہ تک پہنچنے کے لئے یونہی جانا پڑا تو ناجائز بھی نہیں ہوگا۔ بلکہ خود نبی کریم ﷺ سے بھی اس قسم کا چلنا ایک جوتی میں ثابت ہے(۱)۔ جس کا محمل یہی ہوگا۔

بہرحال اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک جوتی میں نہیں چلتے تھے بلکہ وہ اس عمل سے دوسروں کو بھی منع کرتے تھے اور اس طرح ترجمۃ الباب سے مطابقت حاصل ہوگئی۔

(۸) حدّثنا قتیبة عن مالک عن ابی الزناد نحوه

(۹) حدّثنا إسحٰق ابن موسیٰ أنا معن أنا مالک عن أبی الزبیر عن جابر أنّ النّبیّ ﷺ نهیٰ ان یاکل یعنی الرجل بشماله او یمشی فی نعل واحدة(۲).

ترجمہ: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص بائیں ہاتھ سے کھائے یا ایک جوتہ پہن کر چلے۔

یعنی الرجل حضرت جابرؓ یا ابوالزبیر کی طرف سے یہ زیادۃ دراصل ''یا کل'' کی ضمیر کی تعیین ہے تاکہ یہ توہم نہ ہو کہ ضمیر جابرؓ کو راجع ہوگی۔ اور ''رجل'' سے مراد اس جگہ شخص ہے کیونکہ عورت کے لئے

(۱)**عن عائشةؓ قالت ربما مشی النبی ﷺ فی نعل واحد(جامع ترمذی ۱/ ۳۰۷ باب ماجاء فی الرخصه فی النعل الواحدة)** اور خود حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے ایک جوتے میں چلنا ثابت ہے۔ **عن عائشةؓ أنّها مشت بنعل واحدة(جامع ترمذی ۱/ ۳۰۷)** رسول اللہ ﷺ کا ایسا کرنا ضرورت کے وقت بیان جواز کیلئے تھا۔ ورنہ علماء نے لکھا ہے کہ بلا عذر ایک پاؤں میں جوتا پہن کر اور دوسرے کو خالی رکھ کر چلنا مکروہ تنزیہی ہے۔ (مظاہر حق ۴/ ۲۰۸)(مختار)

(۲)صحیح مسلم ۲/ ۲۰۶ کتاب اللباس و الزینة باب النهی عن اشتعال الصماء الخ، سنن ابی داؤد باب فی الانتعال ۲/ ۲۱۷ مؤطا امام مالک ص ۲۱۷ کتاب اللباس باب النهی من الاکل بالشمال(مختار)

بھی یہی حکم ہے کہ نہ بائیں ہاتھ سے کھائے نہ ایک جوتا پہن کر چلے۔

یہ دونوں امور بلا عذر مکروہ ہیں جس کی وجہ پہلے گزر چکی ہے۔ترجمۃ الباب سے مناسبت ''او یمشی فی نعل واحدۃ''میں ہے کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا کبھی نہیں کیا ہوگا۔

(۱۰) حدّثنا قتیبة عن مالک ح و أنا إسحاق بن موسیٰ أنا معن أنا مالک عن أبی الزناد عن الأعرج عن أبی هریرة أنّ النّبیّ ﷺ قال اذا انتعل احدکم فلیبدأ بالیمین و اذا نزع فلیبدأ بالشمال فلتکن الیمنیٰ اوّ لهما تنعل و آخر هما تنزع(۱).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جب کوئی شخص جوتے پہنے تو پہلے دائیں جانب سے ابتداء کرے اور جب نکالے تو بائیں سے نکالے پس دایاں پاؤں جوتا پہننے میں مقدم اور نکالنے میں مؤخر ہونا چاہیے

<u>دائیں سے ابتداء کیوں؟</u> **فلیبدأ بالیمین الخ** اس حدیث میں جوتے پہنتے وقت تیمن کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا عمل اور سنت نبوی ﷺ کا ضابطہ یہ ہے کہ جو کام تشریف، کرامت اور تزئین کے باب سے ہے اس کو دائیں جانب سے شروع کرنا چاہیے(**کل ما کان من قبل التزین والتکرم والتشریف**) ورنہ بائیں جانب سے ابتداء کرنا مسنون ہوگا۔ کیونکہ دائیں جانب کو عنداللہ بھی شرافت اور محبوبیت ثابت ہے۔ چنانچہ اہل جنت عرش کے دائیں جانب ہونگے۔انہیں اعمالنامے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔کاتب حسنات دائیں طرف ہوتا ہے۔پھر حسنات میزان کے دائیں پلڑے میں رکھ کر تولے جائیں گے(۲)۔

---

(۱)صحیح بخاری ۸۷۰/۲ کتاب اللباس باب ینزع فعل بالیسریٰ، سنن ابی داؤد ۲۱۲/۲ کتاب اللباس باب فی الانتعال، جامع ترمذی ۳۰۷/۱ کتاب اللباس باب ماجاء بأی رجل یبدأ اذاانتعل(مختار)

(۲)صاحب مظاہر حق علامہ قطب الدین محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ دایاں پاؤں بائیں پاؤں کے بنسبت زیادہ دیر تک رہے گا۔گویا یہ دائیں پاؤں کے اعزاز واحترام کا ذریعہ ہے۔اسی پر مسجد وغیرہ میں داخل ہونے اور نکلنے کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔(ظاہر حق ۲۰۷/۴)(مختار)

(۱۱) حدّثنا أبو موسیٰ محمّد بن المثنّیٰ أنا محمّد بن جعفر أنا شعبة ثنا أشعث وهوا بن أبی الشعثاء عن أبیه عن مسروق عن عائشةؓ قالت کان رسول اللّٰه ﷺ یحبّ التیامن ما استطاع فی ترجله و تنعله و طهوره (۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے بال کنگھی کرنے میں، جوتے پہننے میں اور وضوء میں حتی الوسع دائیں جانب سے ابتداء فرماتے تھے۔

فی ترجله و تنعله. اسی میں ترجمۃ الباب بھی ہے۔ کیونکہ اس میں پاپوشی سے متعلق نبی کریم ﷺ کی عادتِ مستمرہ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ جوتے پہنتے وقت بھی دائیں جانب سے ابتداء فرماتے تھے۔ مذکورہ تین چیزوں میں تیمن منحصر نہیں۔ بلکہ لباس، تزیّن، اور دیگر عادات شریفہ میں آپ ﷺ دائیں جانب سے ابتداء فرماتے تھے۔ جس طرح کہ بعض احادیث میں ''وفی شأنه کله'' کا اضافہ بھی مروی ہے(۲)۔

(۱۲) حدّثنا محمّد بن مرزوق أبو عبیداللّٰه ثنا عبدالرحمٰن بن قیس أبومعاویة أنبانا هشام عن محمّدعن أبی هریرة قال کان لنعل رسول اللّٰه ﷺ قبالان و أبی بکروعمرؓ و أوّل من عقد عقد او احداعثمانؓ(۳).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے نعلین کے دو دو تسمے تھے۔ اسی طرح ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے جوتوں میں بھی دو تسمے تھے اور سب سے پہلے حضرت عثمانؓ نے ایک قبال کے جوتے بنوائے۔

---

(۱) مسند احمد ۶/۹۴، ۱۳۰/ طبقات ابن سعد ۱/۲/۱۶۸ (مختار)

(۲) گویا اس حدیث مبارک میں یہ ضابطہ بیان ہوا کہ فضیلت والے کام کو دائیں طرف سے شروع کرنا مندوب ہے مثلاً جوتا پہننا، مسجد میں داخل ہونا، کنگھی کرنا، اور جو عمل ایسا نہ ہو اس کو بائیں طرف سے شروع کیا جائے مثلاً مسجد سے نکلنا، بیت الخلاء میں داخل ہونا، جوتا نکالنا۔ (مختار)

(۳) مجمع الزوائد ۵/۲۴۳ کتاب اللباس باب ماجاء فی الخفاف والنعال، طبرانی فی الصغیر ۱/۹۲ (مختار)

<u>اندازِ پاپوشی بدلنے کی وجہ</u>: أوّل من عقد عقدا و احدا عثمانؓ۔ چونکہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فیشن تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک قبال کی جوتیاں بننے اور استعمال ہونے لگی تھیں۔ اس لئے آپؓ نے بھی اسی طرز کی جوتیاں پہنیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپؓ نے یہ کام بطور بدعت کیا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح لباس اور کپڑوں کی ہیئت اور ڈیزائن بدلتے رہتے ہیں جوتوں کے بھی زمانہ قدیم سے سینکڑوں ڈیزائن بدل چکے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے قبل جوتیاں دو قبالوں کی بنتی تھیں۔ لیکن آپؓ کے زمانہ میں یہ ڈیزائن مقبول ہوا۔ اور ایک قبال کی ایسی جوتیاں استعمال میں آنے لگیں جن کا قبال انگوٹھے اور ساتھ کی دوسری انگلی کے درمیان ہوتا تھا۔ اور چونکہ لباس میں توسع ہے۔ اس لئے آپؓ نے بھی تمام لوگوں کی طرح ایک ہی قبال کے جوتے پہننا شروع کر دیئے۔

علاوہ ازیں آپؓ کے اس عمل سے بیان جواز بھی ہوتا ہے تا کہ یہ تو ہم لوگوں میں پیدا نہ ہو کہ ایک قبال کی جوتیاں پہننا جائز نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کے عمل کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو آج مختلف قسم کے بوٹ اور چپل وغیرہ پہننا نا جائز ہوتے۔

۱۲. باب ما جاء فی ذکر خاتم رسول اللہ ﷺ

نبی کریم ﷺ کے انگوٹھی کے بیان میں

اس باب میں مصنف نے خلاف عادت ''ذکر'' کے لفظ کا اضافہ کردیا ہے۔ اس کے لئے علماء یہ نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ چونکہ اس سے قبل باب خاتم النبوۃ گزر چکا ہے جس میں مہر نبوت کا ذکر تھا۔ اور اس باب سے تمیز کرنا مقصود تھا۔ جس کے لئے یہاں یہ لفظ زیادہ کردیا گیا۔

مہر کیلئے انگوٹھی: خاتم کا لفظ تاء کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ مہر کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اور ما یختم بہ یعنی آلہ مہر کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور چونکہ پرانے زمانے میں انگوٹھی کے ذریعے مہر لگایا جاتا تھا۔ جس میں مہر کے الفاظ کندہ ہوتے تھے۔ اس لئے مطلقاً اس انگوٹھی کو بھی خاتم کہا جانے لگا، جس میں نگینہ لگا ہوتا تھا۔ البتہ صرف حلقہ یعنی چھلے کو عربی میں فتحة کہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے مہر کے لئے انگوٹھی بنوا کر اس کا استعمال فرمایا ہے (۱) جس طرح کہ اس باب کی متعدد حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

---

(۱) **مشاہیر امت کے انگوٹھیوں پر نقش کلمات:** رسول اللہ ﷺ کی انگوٹھی پر محمد رسول اللہ نقش تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی انگوٹھی پر نعم القادر، حضرت عمر فاروقؓ کی انگوٹھی پر کفی بالموت واعظاً، حضرت عثمانؓ کی انگوٹھی پر تبصرن او لتندمن، حضرت علیؓ کی انگوٹھی پر للّٰہ الملک، حضرت خذیفہؒ کی انگوٹھی پر الحمدللّٰہ، امام ابوحنیفہؒ کی انگوٹھی پر قل خیراً والاً فاسکت، امام ابویوسفؒ کی انگوٹھی پر من عمل برائہ فقدندم، امام محمدؒ کی انگوٹھی پر من صبر ظفر، قطب الاقطاب مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی انگوٹھی پر رشید احمد، حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسنؒ کی انگوٹھی پر لکھی عاقبت محمود گرداں کے الفاظ نقش تھے۔ اور شارحین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ کی انگوٹھی پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انگوٹھی پر انا اللہ لا الہ الا انا محمدٌ عبدی ورسولی کے الفاظ کندہ تھے۔ (ماُخوذ المواھب اللدنیۃ ص۷۶،۷۷، شرح مسلم للنووی ۱۹۶/۲، آفتاب نبوت کی کرنیں ص۲۳۶) علامہ بیجوریؒ مذکورہ تفصیل بیان کرتے ہوئے معجم طبرانی کے حوالہ سے لکھتے ہیں وفی معجم الطبرانی مرفوعاً کان فص خاتم سلیمان بن داؤد سماویاً ألقی الیہ من السماء فأخذہ فوضعہ فی خاتمہ فکان نقشہ انا اللّٰہ لااله إلاّانا محمدعبدی ورسولی (المواھب اللدنیة ص ۷۶،۷۷)(مختار)

(۱) حدّثنا قتیبة بن سعید وغیر واحد عن عبداللّٰه بن وهب عن یونس عن ابن شهاب عن أنس بن مالک قال کان خاتم النبی ﷺ من ورق و کان فصه حبشیًّا(۱) .

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی چاندی کی تھی اور اس کا نگینہ حبشی تھا۔

من ورق ورق راء مکسورہ اور راء ساکنہ دونوں کے ساتھ چاندی کو کہتے ہیں۔اس حدیث سے یہ بات معلوم ہورہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انگوٹھی کا استعمال فرمایا ہے۔بعض روایات میں یہ بات مذکور ہے کہ آپ ﷺ انگوٹھی مہر کیلئے استعمال کرتے تھے، پہنتے نہ تھے۔مگر صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ انگوٹھی پہنتے بھی تھے مگر کبھی کبھی پہنتے تھے۔اسی طرح صحابہ کرامؓ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں اسے پہنتے تھے۔اور آپ ﷺ انکار نہیں فرماتے تھے۔پھر بھی بعض علماء نے یہ تفصیل کی ہے کہ بادشاہ، قاضی اور مہر کا استعمال کرنے والے دیگر افراد کے لئے انگوٹھی کا استعمال مندوب ہے۔جبکہ دوسرے لوگوں کے لئے یہ ناجائز ہے۔لیکن اکثر ائمہ احناف کی رائے یہ ہے کہ یہ مطلقاً یعنی مہر کے لئے ہو، یا اس کے بغیر ہو جائز ہے۔ بلکہ بعض کے ہاں مسنون ہے۔البتہ تکبّر کے طور پر یا مردوں کے لئے تزیّن کی نیت سے مکروہ ہے۔ملاعلی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اگر چہ ضرورت کے وقت یہ مباح ہے مگر اس کا ترک کرنا افضل ہے۔کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بوقت ضرورت بنوائی تھی۔جس طرح کہ آگے احادیث میں آتا ہے۔

و کان فصه حبشیًّا اس جملے کی تفسیر میں شراح حدیث سے متعدد اقوال منقول ہیں جو درج ذیل ہیں۔

اول: یہ کہ اس کا نگینہ جزع یعنی گونگے سیپیوں سے یا عقیق سے بنا ہوا تھا۔جس کی کانیں یمن کی طرح حبشہ میں بھی ہوتی ہیں اس وجہ سے اسے حبشی کہا گیا۔

---

(۱)صحیح مسلم ج۲ ص۲۰۵ کتاب اللباس والزینة باب تحریم خاتم الذهب علی الرجل ونسخ ما کان من اباحته فی اول الاسلام ، مشکوٰة المصابیح ص ۳۷۹ باب الخاتم شرح السنة ۱۲/۲۵ باب فص الخاتم، کتاب اللباس (مختار)

وغیر واحدٍ یہ گزشتہ باب کی کہ چھٹی حدیث کا اعادہ ہے وہاں مصنفؒ نے اپنے شیوخ میں تین راویوں کے نام لئے ہیں۔(۱) احمد بن عبدۃ ضبیؒ (۲) علی بن حجرؒ (۳) ابو جعفر محمد بن الحسینؒ اس باب میں اول الذکر دو شیوخ ذکر کرنے کے بعد "وغیر واحد" کہا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذکورہ دو راویوں کے علاوہ متعدد راوی ہیں ایک نہیں۔ جبکہ گزشتہ باب میں صرف ایک کا ذکر ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے۔ اس حدیث میں مصنف کے شیوخ تین سے زیادہ ہوں اور یہاں پر مذکورہ رواۃ کے علاوہ متعدد رواۃ اور بھی ہوں اس باب میں ان کی طرف اشارہ ہے جبکہ گزشتہ باب میں صرف ذکر کرنے سے زیادہ ہونے کی نفی نہیں ہوتی، لہٰذا غیر واحد درست ہے، مولی غفرۃ، غفرۃ حضرت بلالؓ کی بہن ہیں۔ راوی ان کا آزاد کردہ غلام ہے۔ اس کی مزید تشریح گزشتہ باب میں گزر چکی ہے(۱)۔

(۵) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا أبو عاصم أنا عذرة بن ثابت حدثنی علباء ابن أحمر الیشکری قال أبو زید عمر بن أخطب الأنصاری قال قال لی رسول اللّٰہ ﷺ یا أبا زید ادن مِنّی فامسح ظهری فمسحت ظهره فوقعت أصابعی علی الخاتم قلت و ما الخاتم قال شعرات مجتمعات(۲).

ترجمہ: علباء بن احمر کہتے ہیں کہ ابو زید عمرو بن اخطب انصاریؓ نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ قریب ہو جاؤ اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرو میں

---

(۱) یہ روایت گزشتہ باب میں چھٹے نمبر طویل حدیث ذکر ہے یہاں اس روایت کو دوبارہ لانے کی وجہ باب کو ثابت کرنا ہے۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **وقد تقدم الحدیث فی اول الکتاب فی الباب الاول والمقصود من ایراده فی هذا الباب قوله بین کتفیه خاتم النبوة فانّه یدل علی وجود الخاتم وتعیین محله من جسده ﷺ(جمع الوسائل ۱/۶۷)** اور علامہ بیجوریؒ نے بھی یہی لکھا ہے **قوله فذکر الحدیث بطوله أی المقدم فی أول الکتاب وإنّما أورده هنا إجمالا لأجل قوله بین کتفیه خاتم النبوة ولذلک صرح به بقوله وقال بین کتفیه الخ(المواهب اللدنیة ص ۳۳)(مختار)**

(۲) المستدرک للحاکم ۶۰۶/۲، مسند احمد ۷۷/۵ (مختار)

دوم: یہ کہ حبشی سبزی مائل زبرجد کی ایک قسم ہے۔ جو بلاد حبش میں پایا جاتا ہے۔ حکیم بن بیطار نے اس کو اپنے مفردات میں ذکر کیا ہے۔ اور اس کے طبی خواص بھی لکھے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

سوم: یہ کہ اس کے نگینے کا رنگ حبشی یعنی سیاہی مائل سرخ تھا۔

چہارم: یہ کہ اس کے تراشنے والا اور کندہ کرنے والا شخص حبشی تھا۔

پنجم: یہ کہ یہ حبشی طرز پر تراشا گیا تھا۔ جس طرح آپ ﷺ کی تلوار کے بارے میں آتا ہے کہ ''و کان حنفیاً'' یعنی آپ ﷺ کی تلوار بنوحنفیہ کی تلواروں کی طرح تھی۔

ششم: یہ کہ یہ حبشہ سے لایا گیا تھا۔ لہٰذا حبشہ کی طرف منسوب تھا۔

تنبیہ:

چاندی کی انگوٹھی: آگے حضرت انسؓ کی ایک اور روایت میں آتا ہے کہ ''کان خاتم رسول اللہ ﷺ من فضة فصه منه'' جس سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی کا نگینہ بھی انگوٹھی کی طرح چاندی سے تھا۔ ہماری پہلی اور دوسری توجیہ پر یہ کہنا پڑے گا کہ نبی کریم ﷺ کی دو انگوٹھیاں تھیں۔ جبکہ مؤخر الذکر چاروں توجیہات پر سرے سے تعارض ہی نہیں۔

لیکن امام بیہقیؒ کی رائے ہے کہ جس انگوٹھی کا نگینہ حبشی تھا۔ وہ سونے کی بنی ہوئی تھی۔ اور دوسری انگوٹھی چاندی کی بنی ہوئی تھی۔ جس کا نگینہ بھی اسی چاندی سے تھا۔ واللہ اعلم.

(۲) حدّثنا قتيبة أنا أبو عوانة عن أبی بشر عن نافع عن ابن عمر أنّ النّبیّ ﷺ اتخذ خاتما من فضة فكان يختم به و لا يلبسه قال أبو عيسیٰ أبو بشر اسمه جعفر بن أبی وحشيّة (۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی۔ جس سے آپ ﷺ مہر لگوایا کرتے تھے اور پہنتے نہ تھے۔

---

(۱) سنن نسائی ۲/۲۴۷ کتاب الزینة باب نزع الخاتم عند دخول الخلاء مسند احمد ۲/۶۸، ۹۶ (مختار)

<u>پہننے یا نہ پہننے کی تفصیل:</u> فکان یختم بہ ولا یلبسہ یعنی اپنی طرف سے بادشاہوں کے پاس آپ ﷺ جو خطوط بھیجتے تھے۔ان پر اس انگوٹھی سے مہر لگاتے تھے لیکن اسے پہنتے نہ تھے۔ بظاہر اس حدیث کا بعد کی آنے والی حدیث اوران روایات سے تعارض معلوم ہوتا ہے جن میں نبی کریم ﷺ کے انگوٹھی پہننے کا ذکر ہے۔چنانچہ دونوں روایتوں میں تطبیق کے لئے مختلف اقوال منقول ہے۔

اول: یہ کہ لا یلبسہ کا مطلب یہ ہے کہ دائماً نہیں پہنتے تھے۔کبھی کبھار پہنتے تھے۔

دوم: یہ کہ آپ ﷺ کی دو انگوٹھیاں تھیں ایک کو صرف مہر کی غرض سے رکھتے تھے۔ پہنتے نہ تھے۔اور دوسری انگوٹھی پہنتے تھے۔تا کہ دوسرے لوگ دیکھ کر آپ ﷺ کی اقتداء کریں۔

سوم: یہ کہ ابتداء صرف مہر کی نیت سے بنوائی تھی۔ پہنتے نہ تھے۔لیکن بعد میں پہننا بھی شروع کیا۔تو اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے پہننے کی نیت سے انگوٹھی نہیں بنوائی تھی۔ بلکہ مہر کی غرض سے بنوائی۔اس کی تائید اگلی احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

بہر حال روایات اس بات پر ناطق ہیں کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی پہنتے تھے۔اسی طرح صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کی زندگی میں۔اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد انگوٹھیاں پہنتے تھے۔البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ انگوٹھی چاندی کی پہننا چاہیے۔سونے کا استعمال مردوں کے لئے ناجائز ہے۔اس طرح لوہے اور تانبے وغیرہ کی انگوٹھیوں سے بھی ممانعت مروی ہے۔اس لئے علامہ مناویؒ اور ملا علی قاریؒ کے کلام میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ایک روایت میں اگر چہ یہ بات مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ایک انگوٹھی لوہے کی تھی مگر نہیں میں وارد ہونے والی احادیث سے کم از کم کراہت تنزیہی معلوم ہوتی ہے۔

(۳) حدثنا محمود بن غیلان نا حفص بن عمر بن عبید هو الطنافسی أنا زهیر عن حمید عن انس قال کان خاتم رسول اللہ ﷺ من فضة وفصه منه(۱).

---

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۲۲۸ کتاب الخاتم باب ماجاء فی اتخاذ الخاتم، سنن نسائی ۲/۲۵۱ کتاب الزینة باب صفة خاتم النبی ﷺ، جامع ترمذی ۱/۳۰۴ کتاب اللباس باب ماجاء مایستحب فی فص الخاتم، (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی چاندی کی تھی۔
جس کا نگینہ بھی چاندی ہی کا تھا۔

فصّه منه بعض شراح نے لکھا ہے کہ منه کی ضمیر فضه کو راجع ہے۔لیکن پھر تو منه نہیں بلکہ منها ہونا چاہیے تھا۔الا یہ کہ فضة کی تاویل ورق سے کر کے مذکر کی ضمیر راجع کی جائے۔اس لئے اکثر شراح نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ منہ کی ضمیر خاتم کو راجع ہو اور من تبعیضیہ ہو۔

اہل عجم کے نام مکاتیب کیلئے مہر:

(۴) حدثنا إسحاق بن منصور أنا معاذ بن هشام ثنی أبی عن قتادة عن أنس بن مالک قال لمّا اراد النّبیّ ﷺ ان یکتب إلیٰ العجم قیل له أنّ العجم لا یقبلون إلاّ کتاباً علیه خاتم فاصطنع خاتماً فکانیّ أُنظر إلیٰ بیاضه فی کفه(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب اہل عجم کو خطوط لکھنے کا ارادہ فرمایا۔تو ان سے کہا گیا کہ عجم کے لوگ بغیر مہر کے خط قبول نہیں کرتے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے انگوٹھی بنوائی۔جس کی سفیدی گویا اب بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔

ان یکتب إلیٰ العجم الخ ۶ھ کے اواخر میں صلح حدیبیہ کے بعد جب قریش کی جانب سے آپ ﷺ کو اطمینان ہوا۔تو آپ ﷺ نے اشاعت دین کے فریضے کی طرف خوب توجہ دی۔اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ نے زبانی دعوت کے ساتھ ساتھ اسلام کی طرف تحریری دعوت بھی دی تھی۔ مختلف بادشاہوں کے نام آپ ﷺ نے خطوط لکھ کر محرم ۷ھ میں بھیجے۔جن میں دین حق کی طرف آنے

(۱)صحیح مسلم ۲/۲۰۴ کتاب اللباس و الزینةباب تحریم خاتم الذهب علی الرجال ونسخ ما کان من اباحته فی اول الاسلام، جامع ترمذی ۲/۱۰۱ کتاب الاستیذان باب ماجاء فی ختم الکتاب(مختار)

کی دعوت دی گئی تھی۔ **الا کتابا علیه خاتم** مہر کے بغیر خط قبول نہ کرنے کا سبب یا تو یہ تھا کہ اس طرح ان کی تعظیم میں کمی ہو جاتی تھی۔ جو ان کے لئے قابل قبول نہ تھا۔ علاوہ ازیں خط پر اعتماد بھی باقی نہیں رہتا۔ کہ شاید کوئی اپنی طرف سے اس میں کمی یا اضافہ کردے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان بادشاہوں کی یہ بھی خواہش ہوتی تھی کہ کسی پر ان کے راز ظاہر نہ ہوں اور مہر زدہ خط میں راز کا انکشاف نہیں ہوا کرتا۔

فاصطنع خاتماً یعنی آپ ﷺ نے اپنے لئے ایک انگوٹھی بنانے کا حکم دیا۔ علامہ بیجوریؒ اور مناویؒ نے لکھا ہے کہ یہ ذی القعدۃ ٦ھ کا واقعہ ہے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں دشمنوں کی تالیفِ قلب اور لوگوں کے ساتھ ان کی پسند کے مطابق طرز معاشرت اختیار کرنے کا استحباب معلوم ہو رہا ہے۔ واضح رہے کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی حضرت یعلی بن امیہؓ نے آپ ﷺ کے لئے بنائی تھی۔

کأنیّ انظر إلیٰ بیاضه الخ راوی کا اس جملہ سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ انگوٹھی چاندی کی تھی کیونکہ سفیدی چاندی میں ہوتی ہے۔ نیز ممکن ہے راوی کی غرض اپنے اتقان اور کمالِ استحضار کی طرف اشارہ ہو کہ گویا ابھی اس کی آنکھوں میں وہ منظر نمایاں ہے۔

کلمات نقش کی ترتیب:

(۵) حدّثنا محمّد بن یحییٰ أنا محمّد بن عبدالله الأنصاری ثنی أبی عن ثمامة عن أنس بن مالک قال کان نقش خاتم النّبیّ ﷺ محمّد سطر و رسول سطر والله سطر(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی کا نقش یوں تھا کہ محمد ایک سطر، رسول دوسری سطر اور لفظ اللہ تیسری سطر میں تھا۔

محمّد سطر الخ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اوپر سے پہلی سطر پر لفظ محمد، دوسری پر لفظ رسول اور

(۱)صحیح بخاری ۱/ ۴۳۸ کتاب الجهادباب ماذکر من درع النبی ﷺ وعصاه وسیفه وخاتمه، جامع ترمذی ۱/ ۳۰۵ کتاب اللباس باب ماجاء فی نقش الخاتم، صحیح ابن حبان۸/ ۱۰۳ باب من صفته ﷺ واخباره (مختار)

تیسری سطر پر لفظ اللہ کندہ تھا۔ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلی سطر لفظ اللہ، دوسری سطر لفظ رسول اور تیسری سطر لفظ محمد پر مشتمل تھا۔ اور یہ کلمہ نیچے سے پڑھا جاتا تھا۔ اس لئے کہ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم میں فرق پڑتا ہے۔ لیکن علامہ ابن حجرؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ احادیث میں لفظ اللہ کے اوپر لکھنے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس معمول کے مطابق نقش کا تذکرہ موجود ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں لفظ اللہ کی زبانی تاخیر منقوش مقروء ہے۔ اور مضر نہیں ہے تو یہاں پر کیوں مضر ہے۔

اس حدیث میں صرف انہی تین لفظوں کی کتابت کا تذکرہ موجود ہے بعض دوسری روایات میں یہی کلمات **بسم اللہ** اور بعض میں **لاالہ الااللّٰہ** کے اضافے کے ساتھ مروی ہیں مگر ان روایات کی تضعیف کی گئی ہے۔

بہرحال اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی کی ساخت اور نقش کی قدرے تفصیل ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ خاتم مربع، تکون، یا گول تھا۔ اس بارے میں احادیث میں کوئی تصریح نہیں ہے۔ علامہ بیجوریؒ نے زین الدین عراقیؒ سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ یہ تفصیل منقول و مروی نہیں ہے۔

انگوٹھی پر لفظ اللہ کا حکم: علامہ نوویؒ نے ابن سیرینؒ اور بعض دوسرے علماء سے یہ بات نقل کی ہے کہ انگوٹھی پر اللہ تعالیٰ کا نام کندہ کرنا مکروہ ہے۔ لیکن ملاعلی قاریؒ لکھتے ہیں کہ ابن سیرینؒ سے اس کی اباحت بھی مروی ہے۔ البتہ جہاں پر اللہ تعالیٰ کے مبارک اسم کی بے حرمتی کا خطر ہو مثلاً جب آدمی کو یہ انگوٹھی پہننا پڑے یا اسی ہاتھ سے استنجا کرے جس میں انگوٹھی پہنی ہو۔ اس صورت میں یہ مکروہ ہے۔ ورنہ انگوٹھی پر لفظ اللہ کندہ کرنا یا اپنا نام لکھنا جائز ہوگا۔

کسریٰ قیصر اور نجاشی:

(٦) حدّثنا نصر بن علی الجهضمی أبو عمر و أنبانا نوح بن قیس عن خالد بن قیس عن قتادة عن أنس أنّ النّبیّ ﷺ کتب إلیٰ کسریٰ و قیصر و النجاشی فقیل له إنّهم لا یقبلون کتابا إلاّ بخاتم فصاغ رسول اللّٰه ﷺ خاتما حلقته فضّة و نقش فیه

محمّد رسول اللّٰہ ﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسریٰ اور قیصر اور نجاشی کے پاس تبلیغی خطوط لکھنے کا ارادہ فرمایا۔ کسی نے کہا کہ یہ لوگ بغیر مہر کے خط قبول نہیں کرتے۔ تو نبی کریم ﷺ نے ایک مہر بنوائی۔ جس کا حلقہ چاندی کا تھا اور اس میں محمد رسول اللہ منقوش تھا۔

إلیٰ کسریٰ و قیصر و النجاشیّ. کسریٰ فارسی شہنشاہوں کا لقب تھا۔ جو اصل میں خسرو کا معرب ہے۔ اس وقت کے کسریٰ کا نام پرویز تھا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کے ذریعے اس کے پاس یہ خط بھیجا۔ اور جب حضرت عبداللہؓ نے خط اس کے حوالے کیا تو اس نے غصہ میں اسے پھاڑ کر اس کی اہانت کی۔ نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا تو آپ ﷺ نے اس کے حق میں بددعا فرمائی۔ اور اس کی سلطنت بھی اسی طرح پاش پاش ہو کر رہ گئی۔

قیصر رومی بادشاہوں کا لقب تھا۔ اس وقت کے بادشاہ کا نام ہرقل تھا۔ اس کے پاس حضرت دحیہ کلبیؓ نبی کریم ﷺ کا خط لائے تو اس نے خط کی تکریم کی۔ اور اسے اپنے ہاں محفوظ کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سلطنت بھی محفوظ کر لی۔

نجاشی حبشہ کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں دو نجاشی گزرے ہیں۔ ایک کا نام اصحمہ بن بحر تھا۔ جو ۶ھ میں مسلمان ہوئے۔ اور ۹ھ کو وفات پائی۔ یہ ایمان لا چکے تھے۔ اور اس وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ان کی نماز جنازہ بھی غائبانہ طور پر پڑھی تھی۔ اسکے بعد جو نجاشی حبشہ کا بادشاہ بنا۔ اسکے نام مذکورہ خط لکھا گیا تھا۔ جو عمرو بن امیہ ضمریؓ لے کر اس کے پاس لے گئے

---

(۱)صحیح مسلم ۲/۲۰۴ کتاب اللباس و الزینۃ باب تحریم خاتم الذھبۃ علی الرجال و نسخ ما کان من اباحتہ فی اول الاسلام، مشکوٰۃ ۳۷۸ باب الخاتم شرح السنۃ ۲۱/۶۱ باب اباحۃ خاتم الفضۃ، کتاب اللباس (مختار)

تھے۔لیکن اس بادشاہ کا نام اور اسلام دونوں پردۂ خفاء میں ہیں۔

مختلف علاقوں میں بادشاہوں کے مختلف مگر مخصوص القاب ہوتے ہیں۔جس طرح کہ مصر کے بادشاہوں کو فرعون، حمیر کے بادشاہوں کو تبّع اور ترکوں کے بادشاہوں کو خاقان کہا جاتا تھا۔ یہاں پر تین بادشاہوں کے القاب کا تذکرہ ہے(۱)۔

<u>بے ادبی سے احتراز:</u>

(۷) حدّثنا إسحاق بن منصور أنبانا سعيد بن عامر و الحجاج ابن منهال عن همّام عن ابن حريج عن الزهرى عن انس بن مالک أنّ النّبىّ ﷺ كان اذا دخل الخلاء نزع خاتمه(۲).

---

(۱) رسول اللہ ﷺ نے جن بادشاہوں کے نام خطوط بھیجے تھے وہ درج ذیل ہیں:

بادشاہ کا نام اور ملک	بادشاہ کا اصلی نام	بھیجے گئے صحابی کا نام
نجاشی شاہ حبشہ	اصحمہ	عمرو بن امیہ ضمریؓ
مقوقس شاہ مصر	جریج بن متی	حاطب بن ابی بلتعہؓ
کسریٰ شاہ فارس	خسرو پرویز	عبداللہ بن خرافہ سہمیؓ
قیصر شاہ روم	ہرقل	حضرت دحیہ کلبیؓ
حاکم بحرین	منذر بن ساویٰ	حضرت علاء بن الحضرمیؓ
حاکم یمامہ	ہوذہ بن علی	حضرت سلیط بن عمرو عامریؓ
حاکم دمشق	حارث بن ابی شمر غسانی	حضرت شجاع بن وہبؓ
حاکم یمامہ	جیفر اور اسکے بھائی	حضرت عمرو بن العاصؓ

رسول اللہ ﷺ کے ان خطوط کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ آف فرانس نے بہت ہی بہترین تحقیق کی ہے تفصیل کے لئے رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی ۱۲۳ تا ۱۸۷ مطالعہ کریں۔(مختار)

(۲) سنن ابى داؤد ۱/۴ كتاب الطهارة باب الخاتم يكون فيه ذكر الله تعالىٰ يدخل به الخلاء، سنن نسائى ۲/۲۴۶ كتاب الزينة باب نزع الخاتم عنددخول الخلاء، سنن ابن ماجة ص ۲۶ كتاب الطهارة باب ذكر الله عزوجل على الخلاء والخاتم فى الخلاء (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو انگوٹھی نکال لیتے تھے۔

نزع خاتمہ اس جملہ سے ایک تو اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی پہنتے تھے اور بیت الخلاء میں جانے سے پہلے نکال لیتے تھے۔ کیونکہ اس میں محمد اور اللہ کے دو مبارک نام منقوش تھے۔ اوران ناموں کا بیت الخلاء جیسی گندگی کے مقامات پر لے جانا بعض کے نزدیک مکروہ تنزیہی اور بعض کے ہاں مکروہ تحریمی ہے۔

بیر اریس کا واقعہ:

(۸) حدثنا إسحاق بن منصور أنا عبداللّٰه بن نمير أنا عبيداللّٰه ابن عمر عن نافع عن ابن عمر قال اتخذ رسول اللّٰه ﷺ خاتماً من ورق فكان في يده ثم كان في يد أبي بكر ثمّ كان في يد عمر ثمّ كان في يد عثمانؓ حتّٰى وقع في بئر اريس نقشه محمد رسول اللّٰه(۱) .

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جو آپ ﷺ کے ہاتھ میں رہی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور پھر حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں اور پھر حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں رہی۔ یہاں تک کہ (ان کے زمانے میں) بیر اریس میں گر گئی۔ اس انگوٹھی کا نقش محمد رسول اللہ تھا۔

فكان في يده اس جملے سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ انگوٹھی پہنتے تھے۔ **في يد ابي بكرؓ و عمرؓ الخ** شیخین اور حضرت عثمانؓ تینوں اس انگوٹھی کو کبھی کبھی پہنتے تھے۔ لیکن عام طور پر یہ انگوٹھی حضرت معیقیب کے پاس بطور امانت پڑی رہتی تھی۔ بعض شراح نے "**في يد ابي بكرؓ**" کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ انگوٹھی حضرت ابوبکرؓ کے قبضہ اور تصرف میں ہوتی تھی۔ نہ یہ کہ وہ اسے پہنتے تھے۔ لیکن سیاق حدیث

---

(۱) صحيح بخاري ۲/۸۷۳ كتاب اللباس باب نقش الخاتم، صحيح مسلم ۲/۲۰۴ كتاب اللباس والزينة باب تحريم خاتم الذهب على الرجال ونسخ ما كان من اباحته في اول الاسلام، شرح السنة ۱۲/۶۲ باب اباحة خاتم الفضة، كتاب اللباس (مختار)

سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اسے یا تو محض تبرک کے لئے یا اپنے خطوط و دستاویزات پر مہر لگانے کے لئے احیاناً پہنتے تھے۔

اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کی میراث آپ ﷺ کے بعد وارثوں کو نہیں ملی۔ کیونکہ یہ انگوٹھی ورثاء کی بجائے ان خلفاء کے ہاں رہی۔

<u>آثار سلف صالحین کے برکات:</u> **فوقع فی بیر أریس** بیر أریس مسجد قبا کے قریب ہی ایک کنواں تھا۔ بعض شراح نے لکھا ہے کہ اریس اس باغ کا نام تھا جس میں کنواں تھا۔ اور علامہ سمہودیؒ نے تاریخ مدینہ میں لکھا ہے کہ أریس ایک یہودی تھا جس کے نام سے یہ کنواں مشہور تھا۔ حضرت عثمانؓ نے بعد میں اس کنویں میں انگوٹھی کو خوب تلاش کیا۔ تین دن تک اس کا پانی نکالتے رہے مگر انگوٹھی کا پتہ نہ چلا۔ علماء نے لکھا کہ اس انگوٹھی میں یہ برکت تھی کہ اس کے وجود سے فتنے دبے ہوئے تھے۔ اس کے غائب ہوتے ہی فتنوں نے سر ابھارا۔ حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا۔ اور پھر صحابہؓ کی ایک کثیر تعداد فتنوں میں ضائع ہوگئی۔

جس طرح کہ سلیمانؑ کی انگوٹھی میں یہ حکمت تھی کہ جب تک آپؑ کے پاس رہی۔ آپؑ کی حکومت برقرار رہی۔ اور انگوٹھی کے غائب ہونے کے بعد آپؑ کی حکومت ختم ہوگئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس جراب تھا۔ (کھجوروں کا توشہ دان) کبھی ختم نہ ہوا۔ گم گیا تو حضرت ابو ہریرہؓ کو شدید صدمہ ہوا۔ اسی سال حضرت عثمانؓ بھی شہید ہو گئے تھے۔ دونوں حادثوں کا ایک شعر میں اس طرح ذکر کرتے ہے

للناس ہم ولی ہمان بینہم ہم الجراب وہم الشیخ عثماناؓ

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ انگوٹھی کس کے ہاتھ سے کنویں میں گر گئی تھی۔ تو امام مسلمؒ کی ایک روایت کے مطابق حضرت معیقیبؓ سے گری تھی۔ یہی بات اگلی باب کی ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح کی اس حدیث میں ہے اسی طرح بخاری اور مسلمؒ کی دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگوٹھی حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے کنویں میں گری تھی۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ دونوں روایتوں کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت عثمانؓ حضرت معیقیبؓ کے ہاتھ سے انگوٹھی لے رہے ہوں یا

ان کو واپس دے رہے ہوں۔اور درمیان میں یہ انگوٹھی گر گئی ہو۔اب راوی کو یہ شک ہو کہ انگوٹھی کس کے ہاتھ سے گر گئی ہے چنانچہ کبھی حضرت عثمانؓ کو اور کبھی حضرت معیقیبؓ کو اس بات کی نسبت کی جاتی ہے۔نیز یہ بھی لکھا ہے کہ ترجیح کی بات ہو تو اصول حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات راجح نظر آتی ہے کہ انگوٹھی حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے گری تھی(۱)۔واللہ اعلم۔

---

(۱)علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ کنواں مسجد قباء کے پاس تھا۔جب یہ انگوٹھی گم ہوگئی تو تین دن تک مسلسل اسے تلاش کیا گیا۔اور کنویں کا سارا پانی نکالا گیا۔مگر انگوٹھی نہ مل سکی۔علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ انگوٹھی کے برکات تھے کہ جب تک وہ انگوٹھی موجود تھی،تو کوئی فتنہ کھڑا نہ ہوا تھا۔مگر جب انگوٹھی گم ہوگئی،تو اس کے بعد خوارج کا ایسا فتنہ پیدا ہوا،جنہوں نے حضرت عثمان غنیؓ کو شہید کیا۔ (جمع الوسائل ۱/۱۴۶،۱۴۶)(مختار)

۱۳۔ باب ماجاء فی أنّ النّبیّ ﷺ کان یتختم فی یمینه

حضوراقدس ﷺ کی انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہننے کے بیان میں

اس سے قبل انگوٹھی کی بناوٹ اور کیفیت کا تذکرہ تھا۔اب اس باب میں مصنفؒ انگوٹھی پہننے کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے قول وعمل کو بیان کرر ہے ہیں۔لیکن اس جگہ ترجمۃ الباب ہی میں ''فی یمینه'' کہہ کر مصنفؒ نے اس بات پر تنبیہ کردی کہ اس کے نزدیک دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا راجح ہے۔اسی وجہ سے انہوں نے اس باب میں بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے سے متعلق ایک بھی مرفوع حدیث ذکر نہیں کی۔ بلکہ اس بارے میں جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی ایک مرفوع حدیث ذکر کی ہے۔اوراس کی بھی تضعیف کی ہے۔اس باب میں مصنفؒ نواحادیث لا رہے ہیں۔

(۱) حدّثنا محمّد بن سهل بن عسکر البغدادیّ و عبداللّٰه ابن عبدالرحمٰن قالا أخبرنا یحییٰ بن حسان أنا سلیمان بن بلال عن شریک بن عبداللّٰه بن أبی نمر عن أبراهیم بن عبداللّٰه بن حنین عن أبیه عن علیّ بن ابی طالبؓ أنّ النّبیّ ﷺ کان یلبس خاتمه فی یمینه(۱).

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہنتے تھے۔

انگوٹھی کس ہاتھ میں: **یلبس فی یمینه** اس باب کی احادیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ نبی کریم ﷺ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔اس طرح کی دیگر متعدد روایات میں بھی دائیں ہاتھ کا ذکر موجود ہے۔لیکن بعض روایات میں بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کا ذکر بھی موجود ہے۔صحابہ کرامؓ میں سے بھی

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۲۲۹ کتاب الخاتم باب ماجاء فی التختم فی الیمین، سنن نسائی ۲/۲۴۵،۲۴۶ کتاب الزینة باب موضع الخاتم من الید(مختار)

کچھ لوگ دائیں ہاتھ میں اور کچھ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔محدثین حضرات اس بارہ میں دونوں قسم کی روایات کو جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔جمع کی متعدد وجوہ میں سے کچھ یہ ہیں۔

اول: یہ کہ نبی کریم ﷺ پہلے تزین کی نیت سے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔پھر اس نیت سے انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا۔لیکن ضرورت کی وجہ سے جب دوبارہ پہننا پڑا،تو بائیں ہاتھ میں پہننا پسند کیا۔جس طرح اس باب کے آخر میں مذکورہ حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

دوم: یہ کہ دائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہنتے تھے۔پھر اسے اتار پھینکا۔اور چاندی کی انگوٹھی بائیں ہاتھ میں پہنتے تھے۔جو کہ آخر الامرین بھی ہے۔

سوم: یہ کہ اکثر دائیں ہاتھ میں اور کبھی کبھی بائیں ہاتھ میں پہنتے تھے۔مگر بعض حضرات نے دونوں قسم کی روایتوں میں ترجیح کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ امام بخاریؒ،امام ترمذیؒ اور اکثر شوافع حضرات نے دائیں ہاتھ کی روایات کو ترجیح دی ہے۔اور اس کی عقلی وجہ یہ بیان کی ہے۔کہ چونکہ انگوٹھی پہننا تزین کے باب سے ہے۔اس لئے دائیں کو ترجیح ملے گی۔نیز یہ کہ بائیں ہاتھ سے استنجا کیا جاتا ہے۔جس سے انگوٹھی کو نجاست پہنچنے کا احتمال ہے۔رہی یہ بات کہ دائیں ہاتھ میں پہننا روافض یا دیگر باغیوں کا شعار تھا۔تو وہ ایک زمانے میں ہوتا تھا اب نہیں ہے۔لہٰذا اب جائز بلکہ راجح ہوگا۔علاوہ ازیں علامہ بیجوریؒ لکھتے ہیں کہ **وکونه صار شعار الروافض لا اصل له**(۱). یعنی یہ کہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا شیعوں کا شعار تھا۔بے اصل بات ہے(۲)۔

فقہاء کرام میں سے بعض حضرات نے جمع روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں قسم کی روایات کو برابر اور دونوں ہاتھوں میں پہننے کو یکساں قرار دیا ہے۔البتہ زینت کیلئے دائیں ہاتھ اور مہر کے لئے بائیں ہاتھ میں

---

(۱) مگر علامہ حصکفیؒ نے لکھا ہے کہ **وقیل الیمنیٰ إلاّ أنّه من شعار الروافض فیجب التحرز عنه قهستانی وغیره وقال ابن عابدین (قوله فیجب التحرز عنه)عبارة القهستانی عن المحیط جاز أن یجعله فی الیمنیٰ إلاّ إنّه شعار الروافض**((ردالمحتار ودرمختار ۶/ ۳۶۱)(مختار)

(۲)المواهب اللدنیة ص ۹۱

انگوٹھی پہننا زیادہ موزوں ہے(۱)۔لیکن امام مالکؒ سے بائیں ہاتھ میں پہننے کی کراہت بھی مروی ہے۔

احناف کا مسلک: ہمارے احناف میں سے ملاعلی قاریؒ نے دائیں ہاتھ کو ترجیح دی ہے۔لیکن علامہ شامیؒ کی تحقیق کے مطابق علماء احناف کے ہاں راجح مذہب مساوات یا بائیں ہاتھ کی ترجیح ہے۔بائیں ہاتھ میں پہننے کو ترجیح دینے والے اس کی عقلی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس طرح ایک تو بائیں ہاتھ کی محرومیت اور ضعف کا قدرے مداوا ہو جائے گا۔اور اسی وجہ سے شاید اس کے لئے سب سے چھوٹی انگلی کا انتخاب کیا گیا ہے۔دوسری یہ کہ مہر لگانے کے لئے بائیں ہاتھ سے انگوٹھی اتاری جائے گی۔تو سیدھی دائیں ہاتھ میں

---

(۱)اس لئے ملاعلی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے و لاتعارض بینهما لجوازانه فعل الأمرین فکان یتختم فی الیمین مرة وفی الیسریٰ اخری حسبما اتفق ولیس فی شئ منها مایدل صریحاً علی المداومة والإصرار علی واحد منهما قلت قد صرح البیهقیؒ بأن الاول منسوخ وأخرج ابن عدی وغیره أنّه ﷺ تختم فی یمینه ثم حوّله فی یساره فکان من فعل خلافه لم یصل إلیه النسخ وأقله أن یقال التختم فی الیسریٰ أفضل کما هو الصحیح من مذهبنا لأنّه أبعد من الإعجاب والزهو کجعل فصه مما یلی کفه قال النووی وقد أجمعوا علی جواز التختم فی الیمنیٰ وعلی جوازه فی الیسریٰ واختلفوا فی أیهما أفضل والصحیح فی مذهبنا أن الیمین افضل لأنّه زینة والیمین أشرف وأحق بالزینة والاکرام اه(مرقات شرح مشکوة ۱۸۶/۸)

اب مسئلہ یہ ہے کہ انگوٹھی کونسی انگلی میں پہنی جائے۔تو ملاعلی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے وعن علیؓ قال نهانی رسول الله ﷺ أن أتختم ای ألبس الخاتم فی أصبعی هذه أوهذه أولتنویع قال الطیبی أوهذه لیست لتردید الراوی بل للتقسیم ...فأوما بهمزة فی آخره وفی نسخة فأوی أی فأشارإلی الوسطیٰ والتی تلیها أی المسبحة ولم یثبت فی الابهام والبنصر روایة عن النّبیّ ﷺ عن الصحابة والتابعین فیثبت ندبه فی الخنصر وإلیه جنح الشافعیة والحنفیة ذکره میرک وظاهرالقیاس أن لبسه فی الابهام والبنصر منهی بالنسبة إلی الرجال دون النساء وقال النووی یکره للرجل جعل الخاتم فی الوسطیٰ والتی تلیها کراهة تنزیهة وأما المرأة فلها التختم فی الأصابع کلها(مرقات شرح مشکوٰۃ ۱۸۶/۸) گویا مرد حضرات ہاتھ کے دو چھوٹی انگلیوں میں انگوٹھی استعمال کریں اور خواتین ہاتھوں کے پانچوں انگلیوں میں استعمال کرسکتی ہیں۔(مختار)

پڑے گی۔جس کے ذریعے مہر لگائی جاتی ہے۔ بصورت دیگر بائیں ہاتھ میں پڑے گی اور پھر دائیں ہاتھ سے مہر لگانے کے لئے اس کو منتقل کرنا پڑے گا۔ نیز چونکہ روافض اور اہل بغی کا شعار دائیں ہاتھ میں پہننا ہے۔اس لئے ان سے ممانعت بھی بائیں ہاتھ میں پہننے کے لئے وجہ ترجیح ہے۔واللہ اعلم بالصواب۔

(۲) حدّثنا محمّد بن يحيىٰ أنا أحمد بن صالح ثنا عبداللّٰه ابن وهب عن سليمان بن بلال عن شريك بن عبداللّٰه بن أبی نمر نحوه حدّثنا أحمد بن منيع أنا يزيد بن هرون عن حمّاد بن سلمة قال رأيت ابن أبی رافع يتختّم فی يمينه فسالته عن ذلک فقال رأيت عبداللّٰه ابن جعفر يتختّم فی يمينه و قال عبداللّٰه بن جعفر كان النّبیّ ﷺ يتختّم فی يمينه(۱).

ترجمہ: حماد بن سلمہؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابن ابی رافع کو داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے ہوئے دیکھا۔میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی؟ تو انہوں نے کہا کہ میں نے عبداللہ بن جعفرؓ کو دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنے ہوئے دیکھا۔اور عبداللہ بن جعفرؓ نے یہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

عبداللہ بن جعفرؓ: **رأيت عبداللّٰه بن جعفرؓ الخ** حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کم عمر صحابہ میں سے ہیں۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کے بیٹے ہیں۔ہجرت کے پہلے سال حبشہ میں ان کی ولادت ہوئی۔ جہاں حضرت جعفرؓ ہجرت کی زندگی گزار رہے تھے۔۸۰ھ میں اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۳) حدّثنا يحيىٰ بن موسىٰ أنبانا عبداللّٰه بن نمير أنبانا إبراهيم ابن الفضل عن عبداللّٰه بن محمّد بن عقيل عن عبداللّٰه بن جعفر أنّ النبیﷺ كان يتختم فی يمينه (۲).

---

(۱)سنن نسائی ۲/ ۲۸۹ كتاب الزينة باب موضع الخاتم من اليد، جامع ترمذی ۱/ ۳۰۴،۳۰۵ كتاب اللباس باب ما جاء فی لبس الخاتم فی اليمين ، شرح السنة للبغوی ۱۲/ ۶۶،۶۷باب موضع الخاتم، كتاب اللباس (مختار) (۲)تفرد بهذا الحديث الامام الترمذی بهذاالاسناد شرح السنة ۱۲/ ۶۷ باب موضع الخاتم، كتاب اللباس (مختار)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

یحییٰ بن موسیٰ بعض نسخوں میں موسیٰ بن یحییٰ لکھا ہے جو غلط ہے۔

کان یتختم فی یمینه بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ **وقبض ﷺ والخاتم فی یمینه** یعنی وفات کے وقت بھی انگوٹھی آپ ﷺ نے داہنے ہاتھ میں پہنی ہوئی تھی۔اور بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ **الیمین أحق بالزینة من الشمال**۔دایاں ہاتھ زینت کا بائیں سے زیادہ حقدار ہے۔

مصنفؒ نے عبداللہ بن جعفرؓ کی حدیث جامع ترمذی میں بھی ذکر کی ہے۔اور اس کے بارے میں امام بخاریؒ کی یہ رائے بھی لکھ دی ہے کہ **اصح شئی ورد فی هذا الباب** یعنی دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کے سلسلے میں یہ حدیث صحیح ترین حدیث ہے۔

(۴) حدّثنا أبو الخطاب زیاد بن یحییٰ أنا عبداللّٰه بن میمون عن جعفر بن محمّد عن ابیه عن جابر بن عبداللّٰه أنّ النّبیّ ﷺ کان یتختم فی یمینه(۱).

ترجمہ: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔

أخبرنا عبداللّٰه بن میمون الخ. اس روای کے بارے میں ائمۂ حدیث نے **ذاهب الحدیث، واهی الحدیث** اور **منکر الحدیث** وغیرہ تضعیف کے القاب استعمال کئے ہیں۔لیکن چونکہ اس روایت کے لئے دوسرے شواہد موجود ہیں۔لہٰذا اسے منکر نہیں کہا جا سکتا۔

(۵) حدّثنا محمّد بن حمید الرازیّ ثنا جریر عن محمّد ابن إسحاق عن الصلت بن عبداللّٰه قال کان ابن عباس یتختم فی یمینه

---

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۲۲۹ کتاب الخاتم باب ماجاء فی التختم فی الیمین والیسار، جامع ترمذی ۱/۳۰۴ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الخاتم فی الیمین، شرح السنة ۱۲/۶۷ باب موضع الخاتم، کتاب اللباس (مختار)

و لا اخاله إلاّ قال کان رسول اللّٰه ﷺ یتختم فی یمینه(۱).

ترجمہ: صلت بن عبداللہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔اور جہاں تک میرا خیال ہے یہ کہا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ بھی داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

لااخاله ،اخـالـه ہمزہ کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ درست ہے۔لیکن کسرہ سے پڑھنا افصح ہے۔اس کا معنی ہے''**لا اظنه الا قال**''یعنی میرا خیال صرف یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا۔

امام ترمذیؒ نے یہ حدیث اس مقام پر ذرا مختصر ذکر کی۔امام ابوداؤد نے اس کو تھوڑا مفصل کر کے ذکر کیا ہے۔جس میں اس بات کا اضافہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس انگوٹھی کا نگینہ ظاہر الکف یعنی اوپر کی جانب کرر کھا تھا۔

(۶) حـدّثـنـا ابـن عمر أنا سفیان عن ایوب بن موسی عن نافع عن ابن عمر أنّ رسول اللّٰه ﷺ اتخذ خاتماً من فضة و جعل فصه ممایلی کفّه و نقش فیه محمد رسول اللّٰه ونهی ان ینقّش احد علیه و هوالذی سقط من معیقیب فی بیر أریس(۲).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی۔اور اس کا نگینہ ہتھیلی کی جانب میں رہتا تھا۔اس میں محمد رسول اللہ کندہ کروایا تھا۔اور لوگوں کو اس سے منع فرمایا تھا کہ کوئی اس جیسا نقش کندہ کروائے۔یہ وہی انگوٹھی تھی جو حضرت معیقیبؓ سے (حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں) بیر اریس میں گر گئی تھی۔

---

(۱)ابوداؤد ج۲ص ۲۲۹ کتاب الخاتم باب ماجاء فی التختم فی الیمین والیسار شرح السنة۱۲/۶۷ باب موضع الخاتم ، کتاب اللباس (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد۲/۲۲۷.۲۲۸ کتاب الخاتم باب ماجاء فی اتخاذ الخاتم، سنن نسائی ۲/۲۴۷کتاب الزینة باب نزع الخاتم عنددخول الخلاء، ابن ماجة ص۲۶۷ کتاب اللباس باب نقش الخاتم، (مختار)

نگینہ اوپر ہو یا نیچے: و جعل فصّه الخ کف سے باطن الکف مراد ہے۔یعنی نگینہ ہتھیلی کی جانب رکھا تھا۔اس سے قبل جو حدیث گزری ہے۔اس کی تفصیل میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا عمل بلکہ خود نبی کریم ﷺ کا عمل یہ مروی ہے کہ نگینہ اوپر کی جانب کر رکھا تھا۔جبکہ یہاں باطن الکف کا ذکر ہے۔ اس کی تطبیق میں ائمہ کرام نے یہی کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا عمل اس سلسلے میں مختلف تھا۔کبھی نگینہ ہتھیلی کی جانب اور کبھی اوپر کی جانب ہوتا تھا۔جبکہ نبی کریم ﷺ سے قولاً اس سلسلے میں کچھ بھی مروی نہیں ہے۔اس لئے دونوں روایات اپنی جگہ درست ہیں۔البتہ امام نوویؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ مردوں کے لئے راجح بات یہ ہے کہ نگینہ ہتھیلی کی جانب رہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ عجب وخود پسندی اور غرور وتکبر سے دور رہے گا۔

دوسری یہ کہ اس طرح نگینہ ٹوٹنے یا رگڑنے سے محفوظ رہتا ہے۔اور نگینہ کا نقش خراب نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں یہ نقش چھپا رہتا ہے۔لہٰذا اس کی نقل بھی آسانی سے نہیں بنائی جا سکتی۔علماء احنافؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جائز دونوں صورتیں ہیں۔البتہ علامہ شامیؒ کی تحقیق کے مطابق مردوں کیلئے بہتر یہ ہے کہ نگینہ ہتھیلی کی جانب رہے۔لیکن چونکہ عورتیں محض تزین کیلئے انگوٹھی پہنتی ہیں۔اس لئے ان کو اوپر کی جانب نگینہ رکھنا چاہیے۔

نقش کی نقل کی ممنوعیت: ونهیٰ ان ینقّش علیه أحد نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اس طرح کے نقش کی انگوٹھی سے اس لئے منع فرمایا تھا کہ اس طرح آپ ﷺ کی مہر دوسرے صحابہؓ کی مہر سے خلط ہو کر رہ جاتی۔اور خطوط میں التباس کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔خلفاء راشدینؓ نے بھی ظاہری نہی کا اتباع کرتے ہوئے اس جیسی مہر بنوانے سے مکمل اجتناب کیا۔اور نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بھی صرف یہی مہر استعمال کرتے رہے۔لیکن ایک روایت میں یہ تصریح بھی ہے کہ حضرت معاذؓ نے اس نقش کی انگوٹھی بنوائی تھی۔اور نبی کریم ﷺ نے اس پر انکار نہیں فرمایا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو وہ روایت ثابت نہیں ہے۔جس طرح کہ علامہ بیجوریؒ نے اور علامہ مناویؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔اور اگر ثابت ہو تو بھی یہ احتمال ہے کہ حضرت معاذؓ نے یہ کام نہی کے ورود سے قبل ہی اتباع النبی ﷺ کی نیت سے کیا ہو۔یا پھر نہی آپؓ تک نہیں پہنچی ہو۔یا یہ کہ حضرت معاذؓ کی خصوصیت ہو۔مگر بعض علماء نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا

ہے کہ یہ نہی نبی کریم ﷺ کی زندگی تک محدود ہوگی۔ کیونکہ التباس کا خطرہ اس وقت تھا۔لہٰذا اب اگر کوئی اس نقش کی انگوٹھی بنوائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔

معیقیبؓ: وهو الذی سقط من معیقیب الخ معیقیب بن ابی فاطمۃ الدوسیؓ حضرت سعید بن العاصؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور بعض کے ہاں ان کے حلیف تھے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمان ہوئے حبشہ کی طرف ہجرت بھی فرمائی۔ غزوۂ بدر میں بھی شریک رہے۔ نبی کریم ﷺ کے انگوٹھی کے امین تھے۔ جب نبی کریم ﷺ انگوٹھی اتار لیتے تھے۔ تو آپ ؐ کو دے دیتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بیت المال کے متولی تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جذام کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ مگر حضرت عمرؓ نے علاج کروایا جس کے بعد صحتیاب ہو گئے۔

سنہ ۴۰ھ میں اور بعض روایات کے مطابق حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری ایام میں وفات پائی۔
بعض روایات میں آتا ہے کہ انگوٹھی حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے کنویں میں گر گئی تھی۔ اس تعارض کا جواب گزشتہ باب میں گزر چکا ہے۔

(۷) حدّثنا قتیبة بن سعید قال أنا حاتم بن اسمٰعیل عن جعفر ابن محمّد عن أبیه قال کان الحسن و الحسینؓ یتختمان فی یسارهما(۱).

ترجمہ: امام محمد باقرؒ کہتے ہیں کہ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ اپنے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔

سند حدیث اور ترجمۃ الباب سے مطابقت: عن أبیه امام جعفر صادقؒ کے والد محمد باقرؒ کی ملاقات حضرات حسنینؓ سے نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ حدیث منقطع ہے۔ امام بیہقیؒ نے ان دونوں کے علاوہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے بارے میں بھی یہ روایت بیان کی ہے کہ وہ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ لیکن یہاں یہ اشکال ہے کہ یہ اثر ترجمة الباب یعنی تختم بالیمین سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ تختم بالیسار کے سلسلے میں یہ اثر مروی ہے۔ لیکن امام ترمذیؒ اس پر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ قابل استدلال نہیں۔ کیونکہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کے سلسلے میں بہت سی مرفوع روایات مروی ہیں۔ اور اکثر

(۱)جامع ترمذی ۱/ ۳۰۴ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الخاتم فی الیمین (مختار)

مواقع میں آپ ﷺ کا عمل بھی وہی تھا۔ اگر چہ مذکورہ حضرات کا عمل اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ کبھی کبھی آپ ﷺ اسے بائیں ہاتھ میں بھی پہنے ہوئے ہونگے۔ ورنہ پھر یہ حضرات بھی ایسا نہ کرتے۔ بعض شراح نے ترجمۃ الباب سے مطابقت کیلئے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ تختم بالیسار کا یہ اثر مرفوع اور موقوف دونوں طرح سے مروی تھا۔ چنانچہ امام بیہقیؒ نے کتاب الادب میں ان الفاظ سے اسے روایت کیا ہے ''کان رسول اللّٰہ ﷺ وأبوبکر و عمر و علی والحسن والحسین یتختّمون فی الیسار''

لیکن چونکہ مرفوع سند میں امام ترمذیؒ کے نزدیک کلام تھا۔ اس لئے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے یہ اثر ذکر کیا کہ مرفوع کی نسبت موقوف سند راجح ہے۔ جبکہ تختم بالیمین مرفوعا ثابت ہے۔ اور بعض شراح نے اشکال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ ترجمۃ الباب میں ''فی یمینه'' کا قید صرف اس بات پر تنبیہ کرنے کی غرض سے لایا گیا ہے کہ دائیں ہاتھ میں پہننا افضل ہے۔ جبکہ اس اثر کو بیان جواز کے لئے لایا ہے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ترجمة الباب کے آخر میں ''فی یمینه'' کا کلمہ نہیں یا ''ام فی یساره'' کا کلمہ محذوف ہے۔ چنانچہ سرے سے اعتراض ہی نہیں ہوتا۔

مصنفؒ نے اس اثر کے بعد دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کے سلسلے میں دو مرفوع حدیث ذکر کی ہیں۔ اس لئے اکثر شرّاح نے مصنفؒ کے اس اثر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس اثر کو درمیان میں لانے کی کوئی معقول توجیہ نہیں ہوسکتی۔ اگر اسے سب سے آخر میں لاتے تو اچھا ہوتا۔

(۸)حدّثنا عبداللّٰه بن عبدالرحمٰن أنا محمد بن عیسیٰ و هو ابن الطباع ثنا عبد بن العوام عن سعید بن أبی عروبة عن قتادة عن أنس بن مالک أنّ النّبیّ ﷺ تختّم فی یمینه قال أبو عیسیٰ هذاحدیث غریب لانعرفه من حدیث سعید بن أبی عروبة عن قتادة عن أنسؓ عن النّبیّ ﷺ نحو هذا إلاّمن هذا الوجه وروی بعض أصحاب قتادة عن قتادة عن أنس أنّ النبی ﷺ تختّم فی یساره و هو حدیث لایصحّ ایضاً(۱).

---

(۱) سنن نسائی ۲/۲۸۹ کتاب الزینة باب موضع الخاتم شرح السنة ۱۲/۶۸ باب موضع الخاتم کتاب اللباس (مختار)

ترجمہ: حضرت قتادہؒ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنی تھی۔اور حضرت قتادہؒ کے بعض شاگرد اسی سند کے ذریعے حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

امام ترمذیؒ کی کمال دیانت: قال ابو عیسی الخ یہ عبارت شمائل کے صحیح نسخوں میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ دراصل مصنفؒ جامع ترمذی میں اس حدیث کو روایت کرکے اس کے بعد یہ عبارت لائے ہیں۔جمع الوسائل میں ہے کہ علامہ ابن حجرؒ نے جامع ترمذی کی اس عبارت کو شمائل کی عبارت سمجھ لی ہے۔ بہرحال عبارت شمائل کی ہو یا جامع کی۔اس عبارت سے بظاہر مصنفؒ کی غرض اس بات پر تنبیہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت قتادہؒ کے واسطے سے حضرت انسؓ کی اس حدیث میں یمین یا یسار کی تعیین درست نہیں ہے۔ اگرچہ انگوٹھی بنوانے یا چاندی کی انگوٹھی بنوانے کی حد تک اس کی روایت صحیح ہے۔البتہ قتادہؒ کے بغیر دوسرے طرق صحیحہ سے حضرت انسؓ کی روایت مروی ہے۔جہاں بعض طرق میں یمین اور بعض میں یسار کا ذکر ہے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں کہ انگوٹھی کے سلسلے میں یمین و یسار دونوں سے متعلق صحیح احادیث موجود ہیں۔ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے سے متعلق احادیث مسلم اور ابوداؤد میں موجود ہیں۔اور دائیں ہاتھ سے متعلق احادیث تو یہاں گزر گئیں۔لیکن چونکہ روایت حدیث کے قواعد کی رو سے اس خاص (یعنی قتادہؒ) کے واسطے سے یہ روایت درست نہیں تھی۔لہٰذا مصنفؒ نے کمال دیانت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک کو غیر معروف اور دوسرے کو غیر صحیح کہہ دیا۔فجزاہ اللہ

(۹) حدّثنا محمّد بن عبید الحاربی ثنا عبدالعزیز بن أبی حازم عن موسیٰ بن عقبة عن نافع عن ابن عمر قال اتخذ رسول اللّٰہ ﷺ خاتماً من ذھب فکان یلبسه فی یمینه فاتخذا لناس خواتیم من ذھب فطرحه رسول اللّٰہ ﷺ وقال لا ألبسه ابداً فطرح النّاس خواتیمھم(۱).

---

(۱)صحیح مسلم ۲/۲۰۳،۲۰۴ کتاب اللباس والزینة باب تحریم الخاتم الذھب علی الرجال الخ، جامع ترمذی ۱/۳۰۴ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس خاتم فی الیمین، سنن ابی داؤد ۲/۲۲۹ کتاب اللباس(مختار)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سونے کی انگوٹھی بنوائی۔ جس کو آپ ﷺ اپنے داہنے ہاتھ میں پہنتے تھے۔ پس لوگوں نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوائیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے وہ انگوٹھی پھینک دی۔ اور یہ فرمایا کہ میں اسے کبھی بھی نہیں پہنوں گا۔ اس کے بعد لوگوں نے بھی اپنی انگوٹھیاں پھینک دیں۔

سونے کی انگوٹھی ترک کرنے کی وجہ: **فطرح الناس خواتیمهم . خواتم اورخواتیم دونوں خاتم** کی جمع ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے سونے کی انگوٹھی اس لئے اتاری اور اتروائی کہ ایک تو صحابہؓ کی انگوٹھیوں کی وجہ سے التباس کا خطرہ پیدا ہوا۔ اور خصوصاً سونے کی انگوٹھی میں عجب و تکبر کا خدشہ بھی دیکھا۔ یا اس لئے کہ عین اس وقت سونے کے استعمال سے ممانعت نازل ہوئی۔ جبکہ اس سے قبل سونے کا استعمال مردوں کے لئے جائز تھا۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے خود اور دوسرے صحابہؓ نے انگوٹھیاں اتروائیں۔

جہاں تک سونے کی انگوٹھی کی بات ہے تو اس پر فقہائے امت کا تقریباً اجماع ہے کہ مردوں کے لئے اس کا پہننا حرام ہے۔ بعض صحابہؓ سے اس کا استعمال بھی مروی ہے مگر وہ یا تو نہی کے ورود سے قبل یا نہی سے عدم علم پر محمول ہوگا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے نہی کو تنزیہی سمجھ کر یہ عمل کیا ہو۔ مگر تمام ائمہ فقہ نے اس کی تحریم میں شک تک بھی نہیں کیا۔ البتہ عورتوں کے لئے دوسرے زیورات کی طرح سونے کی انگوٹھی کا استعمال بھی جائز ہے۔

اس باب میں اس بات کا بیان نہیں ہے کہ آپ ﷺ کونسی انگلی میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔ لیکن صحیحین کی ایک روایت میں سب سے چھوٹی انگلی کی تعیین کی روایت موجود ہے۔ جیسے کہ علامہ بیجوریؒ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے انگلیوں میں چھوٹی انگلی اس کے لئے بہتر ہوگی۔

۱۴. باب ما جاء في ذكر سيف رسول الله ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے تلوار کے بیان میں

اس سے قبل دو بابوں میں خطوط کا ذکر آیا ہے۔ اسلامی نظام کے نفاذ و اشاعت کا دستور العمل یہ ہے کہ سب سے پہلے دعوت دی جائے، تقریر و تحریر کے ذریعے تبلیغ کی جائے، اگر کفار مان لیں تو بہتر، ورنہ تلوار سے کام لینا پڑتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی زبانی تبلیغ کے ساتھ کافروں کے پاس وفود بھیجے، خطوط لکھے، جب کام نہ بنا تو آپ ﷺ کو تلوار اٹھانا پڑی، بہر حال خطوط کے ضمناً تذکرہ کے بعد تبلیغ اسلام کے دوسرے قدم یعنی جہاد سے متعلق امور کا ذکر ہے۔ اور چونکہ تلوار اس زمانے کا اہم ترین اسلحہ تھا اس لئے اسے مقدم ذکر کیا۔

نبی کریم ﷺ کی تلوار: نبی کریم ﷺ کی متعدد تلواریں تھیں۔ ان کے الگ الگ نام بھی تھے۔ مثلاً اپنے والد سے میراث میں ملنے والی تلوار کا نام مأثور تھا۔ اس طرح آپ ﷺ کی دوسری تلواروں کے نام **قضیب، بتّار، الحتف، ذو الفقار، قلعی، مخذم، رسوب، صمصامه** اور **اللّحیف** منقول ہیں(۱)۔ اس باب میں چار احادیث مذکور ہیں۔

(۱) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا وهب بن جرير أنا أبى عن قتادة عن أنس قال كان قبيعة سيف رسول الله ﷺ من فضّة(۲).

---

(۱) ان تلواروں کے علاوہ آنحضرت ﷺ کے مزید دو تلواریں اور تھی (۱) ان میں سے ایک کا نام العون تھا۔ اس تلوار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ غزوہ بدر کے موقع پر حضرت عکاشہؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری تلوار ٹوٹ گئی ہے۔ تو آپ ﷺ نے اس کو ایک خشک ٹہنی عطاء فرمائی۔ اور فرمایا کہ اضرب به جب آپؓ نے لیا تو **فعاد فی يده سيفاً صارماً طويلاً أبيض شديد المتن فقاتل به ثمّ لم يزل عنده يشهد به المشاهد إلى ان استشهد** (المواهب اللدنية ص ۸۳) (۲) اور دوسری کا نام العرجون تھا۔ جنگ احد کے موقع پر حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی تلوار ٹوٹ گئی تو آپ ﷺ نے اس کو کھجور کی ایک ٹہنی عطاء فرمائی اور وہ بھی آپؓ کے ہاتھ میں تلوار بن گئی۔ (المواہب الدنیۃ ص ۸۳) (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۱/ ۳۵۵ کتاب الجهاد باب فی السيف يحلّى، سنن نسائی ۲/ ۳۰۱ کتاب الزينة باب حليّة السيف، سنن الكبرىٰ لبهيقى ۴/ ۱۴۳، سنن دارمى ۲/ ۱۶۶. شرح السنة ۱۰/ ۳۹۷، كتاب السير و الجهاد باب السيف و حليته (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تلوار کے قبضہ کی ٹوپی چاندی کی تھی۔

کان قبیعة الخ تلوار کے دستے کی آخری سرے پر جو دھات تلوار کو آگے کی طرف پھسلنے سے بچانے کے لئے لگی ہوئی ہوتی ہے۔اسے **قبیعة** کہتے ہیں جبکہ دستہ کے اگلے حصہ کو **شارب** کہتے ہیں۔ یہاں آپ ﷺ کی مشہور تلوار **ذو الفقار** کا ذکر ہے(۱)۔جو فتح مکہ کے روز بھی آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھی۔

(۲) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا معاذ بن هشام ثنی أبی عن قتادة عن سعید بن أبی الحسن قال كانت قبیعة سیف رسول اللّٰه ﷺ من فضّة(۲).

ترجمہ: سعید بن ابی الحسنؒ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی تلوار کے قبضہ کی ٹوپی چاندی کی تھی۔

سعید بن ابی الحسنؒ: سعید بن ابی الحسنؒ یہ حضرت حسن بصریؒ کے بھائی ہیں تابعی ہے۔ان کا نام یسار ہے۔۱۰۰ھ اور ایک روایت کے مطابق ۹۹ھ میں وفات پائی۔لہٰذا یہ حدیث مرسل ہے لیکن چونکہ اس حدیث کے لئے دوسرے شواہد موجود ہیں جس طرح کے حدیث سابق ہے۔اس لئے یہ مقبول ہے۔اس میں بھی تلوار کی قبیعہ کا ذکر ہے۔

(۳) حدّثنا أبو جعفر محمّد بن صدر أنّ البصریّ انا طالب ابن حجیر عن هود و هوا بن عبداللّٰه بن سعید عن جده قال دخل

---

(۱) اس تلوار کے بارے میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں **واخرج ابن سعدعن ابن عباس أنّ النّبیّ ﷺ تنفل سیفاً لنفسه یوم بدریقال له ذوالفقاروهوالذی رای فیه الرؤیاباحد(جمع الوسائل ۱/۱۹۳)** آپ ﷺ نے یہ تلوار حضرت علیؓ کو مرحمت فرمائی تھی۔اس تلوار کے بارے میں الاتحافات میں ہے **ذو الفقار بفتح الفاء و کسرها لان فی ظهره فقرات ای حضر صغار کفقرات الظهر(۱۴۴) (مختار)**

(۲) سنن ابی داؤد ۱/۳۵۵ کتاب الجهاد باب فی السیف یحلّی،شرح السنة ۱۰/۳۹۷ کتاب السیرو الجهاد باب السیف و حلیته، سنن نسائی ۲/۳۰۱ کتاب الزینة باب حلیة السیف(مختار)

رسول اللّٰہ ﷺ مکة یوم الفتح و علی سیفه ذهب و فضة قال طالب فسألت عن الفضّة فقال کانت قبیعة السیف فضّة(۱).

ترجمہ: ہود کے نانا کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے دن جب شہر میں داخل ہوئے تو نبی کریم ﷺ کی تلوار پر سونا چاندی تھا۔ طالبؒ کہتے ہیں میں نے ہود سے پوچھا کہ چاندی کس جگہ تھی۔ تو انہوں نے فرمایا کہ قبضہ کی ٹوپی چاندی کی تھی۔

وهو ابن عبداللّٰه بن سعید الخ ہود کے نانا کا نام اکثر نسخوں میں سعید لکھا ہے۔ لیکن علامہ قسطلانیؒ کے بقول سعد درست ہے۔

مزیدة بن جابرؓ:عن جده ہود کے نانا کا نام **مزیدة بن جابر** ہے۔ بنو عبدالقیس قبیلہ کے صحابی ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر عبدالقیس کے وفد میں تشریف لائے تھے۔ یہ علامہ ابن حجرؒ کا قول ہے جبکہ علامہ جزریؒ نے ان کا نام مزیدہ (بوزن مکرمہ) ذکر کیا ہے۔

<u>کیا تلوار پر سونا لگانا جائز ہے؟</u> **وعلی سیفه ذهب وفضة** یہ بات قابل ذکر ہے کہ مردوں کیلئے سونے کا استعمال ناجائز ہے۔ اور اس حدیث سے پہلے ہی اس کے استعمال کی حرمت کا حکم آیا ہے۔ جمہور کے نزدیک تلوار، بندوق اور دوسرے آلات حرب میں بھی سونا لگانا جائز نہیں۔ اسلام اس قسم کے تکلفات کو ناپسند کرتا ہے۔ اس وجہ سے سونے کے برتن، اوزار اور اسلحہ کا استعمال ناجائز ہے۔ اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ مسلمان جب بھی عیش پرستی میں مبتلا ہوئے ان پر زوال وتباہی آئی۔ جبکہ اس حدیث میں سونے کا استعمال اور تلوار میں اس کی موجودگی مذکور ہے۔ چنانچہ اس حدیث سے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

مثلاً یہ کہ مذکورہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف بلکہ منکر ہے۔ خود امام ترمذیؒ نے یہ سند جامع ترمذی میں ذکر کر کے فرمایا ہے کہ **هذا حدیث غریب حسن** بلکہ ائمہ حدیث میں سے اکثر نے بڑے شد ومد سے اس کی تضعیف کی ہے(۲)۔

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۲۹۸ کتاب الجهاد باب ماجاء فی السیوف وحلیتها(مختار)

(۲) ملاعلی قاریؒ نے علامہ توربشتی کے حوالہ سے لکھا ہے **وقال التوربشتی هذاالحدیث لایقوم به حجّة اذلیس له سند یعتمد به(جمع الوسائل ۱/۱۴۹)** اور علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے **هذاالحدیث ضعیف کماقاله القطان بل منکر فلاتقوم به الحجة علی حل التحلیة بالذهب(المواهب اللدنیة ص۸۴)(مختار)**

اور اگر حدیث کو صحیح تسلیم کیا جائے تو پھر اسے مبالغہ پر محمول کیا جائے گا۔اور مطلب یہ ہوگا کہ ایسی نفیس تلوار تھی گویا اس پر سونا چاندی لگا ہوا ہو۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ راوی نے چاندی دیکھی ہو۔جس کا استعمال جائز ہے۔پھر اس نے سونے کا ذکر تبعاً کیا ہو۔اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ راوی سے چاندی کے متعلق پوچھا گیا ہے کہ یہ کہاں لگا تھا۔اب اگر واقعتاً سونا بھی ہوتا تو اس کے بارے میں بھی ضرور پوچھا جاتا کہ وہ کہاں لگا تھا کیونکہ چاندی کی نسبت سونا زیادہ اہم اور قیمتی ہے۔

بعض لوگوں نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ سونے کا یہ استعمال تحریم سے پہلے تھا۔لیکن یہ قول ضعیف ہے کیونکہ اس حدیث میں تصریح ہے کہ فتح مکہ کا موقع تھا اور تحریم کا حکم فتح مکہ مکرمہ سے یقیناً پہلے تھا۔اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ راوی نے جس پر سونے کا گمان کیا ہے وہ دراصل تمویہ تھا سونا نہ تھا۔یعنی اس دستے پر سنہری رنگ چڑھایا گیا تھا۔اس حدیث سے چاندی کے استعمال کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے۔

(۴) حدّثنا محمّد بن شجاع البغدادیّ أنا أبو عبیدة الحدّاد عن عثمان بن سعد عن ابن سیرین قال صنعت سیفی علی سیف سمرة بن جندب وزعم سمرة أنّه صنع سیفه علی سیف رسول اللّٰهﷺ و کان حنفیاً(۱).

ترجمہ: محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی تلوار حضرت سمرۃ بن جندب کی تلوار کے موافق بنائی۔اور وہ کہتے ہیں کہ ان کی تلوار نبی کریم ﷺ کی تلوار کے موافق بنی ہوئی تھی اور وہ قبیلہ بنوحنفیہ کی تلواروں کی طرح تھی۔

ابن سیرین (۲) یہ مشہور تابعی اور حدیث کے امام ہیں۔حسن بصریؒ کے ہمعصر ہیں۔بصرہ میں رہتے تھے اور ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔

---

(۱) جامع ترمذی ۱/۲۹۷ کتاب الجهاد باب ماجاء فی صفة سیف النبیﷺ شرح السنة للبغوی ۱۰/۳۹۸ کتاب السیر والجهاد باب السیف وحلیته(مختار)

(۲) آپ کا نام محمد ہے۔آپ تعبیر الرویا کے بھی امام تھے۔(مختار)

صنعت سیفی اس سے پتہ چلتا ہے کہ بوقت ضرورت علماء کو بھی مسلح رہنا چاہئے تا کہ شر پسندوں اور فتنہ پردازوں سے نمٹا جا سکے۔

علی سیف سمرۃ یعنی میں نے اسی مقدار اور اسی ڈیزائن کی تلوار بنائی۔ اور حضرت سمرہؓ کا خیال تھا کہ اس کی تلوار نبی کریم ﷺ کی تلوار جیسی تھی۔ تو گویا حضرت ابن سیرینؒ نے بھی نبی کریم ﷺ کی تقلید میں تلوار بنائی تھی۔

و کان حنفیا یعنی نبی کریم ﷺ کی تلوار بنو حنفیہ کی بنی ہوئی تھی یا تو صانع کی طرف نسبت ہے۔ اور یا محض ڈیزائن کا بیان ہے۔ لیکن اس جملے کا مقصد بہر حال یہ نہیں کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے موافق تھی۔ اگر چہ یہ لفظی اتفاق مستحسن ہے لیکن یہ ترجمہ کرنا غلط ہے۔

لطیفہ: لفظی اتفاق کے سلسلے میں ایک لطیفہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شیعہ اور ایک سنی کے درمیان مذہب کی بات چل پڑی۔ شیعہ نے کہا کہ قرآن کہتا ہے کہ ابراھیمؑ بھی شیعہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **وان من شیعته لإبراهیم**. تو سنی نے کہا کہ جھوٹ بولتے ہو۔ شیعہ تو ایک زمانہ بعد فرعون کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس نے مصر والوں کو سب سے پہلے شیعہ بنایا۔ قرآن کہتا ہے۔ **وإنّ فرعون عَلَا فی الأرض و جعل أهلها شیعا.**

(۵) حدّثنا عقبة بن مكرم البصریّ ثنا محمّد بن بكر عن عثمان بن سعد بهذا الاسناد نحوه.

یہ سند پہلی سند کی تائید کے لئے لائے ہیں۔

۱۵. باب ما جاء فی صفة درع النبی ﷺ
نبی کریم ﷺ کا جنگی لباس زرہ کے بیان میں

<u>فولادی صنعت کی اہمیت:</u> ایک اور جنگی لباس زرہ کا بیان ہے جو فولادی کڑیوں سے بنایا جاتا ہے۔ حضرت داؤدؑ نے فولادی صنعت اور سامان جنگ کی تیاری میں بہت ترقی کی تھی۔ وہ اقتدار وغلبہ اور جنگی مہارت میں بہت آگے تھے۔ آج تو جہاز، ٹینک، بندوق اور توپ وغیرہ جنگی آلات بنانے اور فولادی صنعت میں عالم اسلام بہت پیچھے ہے۔ تیس پینتیس سال کے عرصہ میں تقریباً چالیس مسلمان ملک آزاد ہو چکے ہیں لیکن ہم فولادی مصنوعات میں پھر بھی یورپ اور امریکہ کے محتاج ہیں۔ ہماری معدنیات اور خام مال سے فولاد بنا کر وہ لوگ جہاز، ٹینک وغیرہ بناتے ہیں اور پھر ہم درخواستیں دے دے کر مانگتے ہیں۔ حالانکہ فولادی صنعت دفاع، امن اور خوشحالی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت داؤدؑ لوہے کو ہاتھ لگاتے تو معجزانہ طور پر وہ خود بخود نرم ہو جاتا۔ پھر وہ اس سے پتلی پتلی کڑیاں بنا کر اس سے زرے بناتے۔ صاحب جلالین نے لکھا ہے کہ و کانت قبل ذالک صفائح یعنی داؤدؑ کے زمانے سے پہلے لڑائی لڑنے والے لوگ اپنے جسموں کے ساتھ تختیاں باندھتے تھے لیکن ان کے ساتھ نقل وحرکت مشکل ہوتی تھی۔ پھر جب کڑیوں والی زرہیں آئیں تو جنگ کے دوران چلنا پھرنا آسان ہو گیا۔ اس باب میں نبی کریم ﷺ کے دروع یعنی زرہوں کا بیان ہے۔

درع کا لفظ جس طرح جنگ میں پہنی جانے والی فولادی قمیص پر بولا جاتا ہے۔ اس طرح عورتیں جو قمیص پہنتی ہیں اس کو بھی درع کہتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کی ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ جو زرہ جنگ کے دوران مرد پہنتے ہیں اس کیلئے دِرْعٌ کا مستعمل لفظ عموماً مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ اور عورت کی قمیص پر بولا جانے والا لفظ درع مذکر مستعمل ہوتا ہے۔

<u>حضور اقدس ﷺ کے زرہیں:</u> نبی کریم ﷺ کی متعدد زرہیں تھیں۔ آپ ﷺ کی سات زرہوں کے نام منقول ہیں جو یہ ہیں۔

ذات الفضول، ذات الحواشی، فضّة، سغدیة، بتراء، ذات الوشاح اور الخرنق.

(۱) حدّثنا ابو سعید عبداللّٰہ بن سعید الاشجّ أنا یونس بن بکیر عن محمّد بن إسحاق عن یحیٰی بن عبّاد بن عبداللّٰہ بن الزبیر عن أبیہ عن جدہ عبداللّٰہ بن الزبیر عن الزبیر بن العوام قال کان علی النّبیّ ﷺ یوم أحد درعان فنهض الی الصخرة فلم یستطع فاقعد طلحة تحته فصعد النّبیّ ﷺ حتی استوی علی الصخرة قال فسمعت النّبیّ ﷺ یقول اوجب طلحة(۱).

ترجمہ: حضرت زبیر بن العوامؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر احد کے روز دو زرہیں تھیں۔ آپ ﷺ نے ایک چٹان پر چڑھنے کا ارادہ فرمایا۔ مگر چڑھ نہ سکے۔ تو آپ ﷺ نے طلحہؓ کو نیچے بٹھایا اوران کی مدد سے چٹان پر چڑے۔ حتیٰ کہ اس پر ٹھیک طرح سے قیام فرمایا۔ حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ پھر میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ طلحہ نے (جنت یا میری شفاعت کو) واجب کردیا۔

عن الزبیر بن العوام بعض نسخوں میں حضرت زبیرؓ کا ذکر نہیں ہے۔ اور روایت حضرت عبداللہؓ کی طرف منسوب ہے۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ جنگ احد کے موقع پر حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کی عمر بمشکل ایک سال بنتی ہے۔ اس لئے پھر حدیث مرسل ہوجائیگی۔ بلکہ ''سمعت النبی ﷺ'' کی تصحیح مشکل ہوگی۔ علاوہ ازیں مصنفؒ نے جامع میں بھی یہ حدیث حضرت زبیرؓ سے روایت کی ہے۔

زبیر بن العوامؓ: حضرت زبیر بن العوامؓ مشہور صحابی ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ مکہ میں اسلام لائے اور حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ آپؓ پہلے صحابی ہیں جنہوں نے اسلام اور اللہ کی راہ میں تلوار اٹھائی تھی۔ 16 سال کی عمر میں اسلام لائے اور چچا کی طرف سے اذیتیں بھی دی گئیں مگر آپؓ ثابت قدم رہے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔ ۳۶ھ کو سفوان

(۱) جامع ترمذی ۲۹۸/۱ کتاب الجهاد باب ماجاء فی الدرع، المستدرک للحاکم ۲۵/۳ (مختار)

کے مقام پر۶۴ سال کی عمر میں شہید کیے گئے۔ پہلے وادی السباع میں دفن ہوئے۔ بعد میں بصرہ کو منتقل کر دیئے گئے۔

علیه درعان جنگ احد میں آپ ﷺ نے جو زرہیں پہنی تھیں وہ ذات الفضول اور فضہ تھیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں پر بڑا امتحان آیا تھا۔ اور انہیں بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ خود نبی کریم ﷺ اس جنگ میں زخمی ہوئے تھے۔ خود اپنی کڑیاں چہرہ انور میں گھس گئیں۔ دانت مبارک شہید ہوئے اور خون میں لت پت آپ ﷺ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ اس وقت ابلیس لعین نے آواز لگائی کہ رسول اللہ ﷺ نعوذ باللہ قتل کر دیئے گئے۔ جس سے مسلمانوں کی رہی سہی قوت اور حوصلہ جواب دے گیا۔ اس حالت کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کیلئے ایک اونچی جگہ پر چڑھنا چاہا تا کہ صحابہ کرامؓ دیکھ لیں کہ رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں۔ یہ جگہ جہاں آپ ﷺ چڑھنا چاہتے تھے سطح زمین سے بلند پہاڑی میں ایک غار نما جگہ ہے بلندی کے باعث ویسے بھی اس جگہ پر تنہا چڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ اس حالت میں دو زرہیں بھی پہنے ہوئے تھے۔ صحابہ کرامؓ کی حوصلہ افزائی کے علاوہ میدان جنگ کا نقشہ دیکھنے اور تھوڑی دیر ستانے کیلئے بھی اس جگہ پہنچنے کی کوشش کرتے رہے۔

<u>دفاعی صلاحیت کا حصول ضروری ہے</u>: نبی کریم ﷺ کے اس عمل میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ بے مثال قوت کے مالک تھے کیونکہ جہاں ایک زرہ کا سنبھالنا مشکل ہوتا ہے وہاں آپ ﷺ عمر کے آخری دور میں دو زرہیں پہنے ہوئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ اسلحہ اور دفاعی سامان کا استعمال توکل کے منافی نہیں جب نبی کریم ﷺ تحفظ کے لئے ایک کے بجائے دو زرہیں پہنتے ہیں۔ تو امت کے لئے بطریق اولیٰ یہ بات جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان **خذوا حذ رکم** اور **اعدّو الھم ما استطعتم** میں انہی دفاعی اسباب کے استعمال کی طرف توجہ دلائی ہے۔

فلم یستطع ایک تو جگہ اونچی تھی۔ دوسری بات یہ کہ نبی کریم ﷺ کا خون بہہ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ضعف پیدا ہو گیا تھا۔ پھر عمر کے آخری حصہ ہونے کی وجہ سے جسم ویسے بھی بوجھل تھا۔ ساتھ دو زرہیں

اور دیگر اسلحہ بھی ہوگا۔ان اسباب کی وجہ سے آپ ﷺ کے لئے اس جگہ پر چڑھنا مشکل ہوگیا۔

فاقعد طلحة تحته آپ ﷺ نے طلحہ کو بٹھایا اور اس کے سہارے چڑھ گئے۔

قربانی کا صلہ: **او جب طلحة** یعنی **اوجب طلحة الجنة لنفسه** یا **اوجب الشفاعة او المغفرة والرضوان لنفسه۔** مطلب یہ ہے کہ طلحہؓ نے اپنے لئے جنت، یا شفاعت، یا مغفرت، یا رضائے الٰہی واجب کردیا یہ بڑا مرتبہ ہے۔جو آپؓ کو ملا۔اس جنگ میں آپؓ کا صرف یہی کارنامہ نہیں بلکہ ساری جنگِ احد میں آپؓ نے عظیم کردار ادا کیا تھا۔مغازی میں آپؓ کی قربانیوں کا تفصیل سے تذکرہ موجود ہے۔حتیٰ کہ ابوبکر صدیقؓ فرماتے تھے کہ احد طلحہؓ کا ہے۔یعنی وہ اس جنگ کے ہیرو اور مین آف دی وار (Man of the War) ہیں۔کیونکہ انہوں نے اپنے جسم کو نبی کریم ﷺ کے لئے ڈھال بنایا تھا۔تیر آتا تو خود آگے ہوجاتے۔تلوار کا وار ہوتا تو ہاتھوں سے روکتے۔چنانچہ اس طرح آپ کو اسّی (۸۰) سے زیادہ زخم آئے تھے۔بایاں ہاتھ بالکل شل ہوگیا لیکن اس حالت میں بھی نبی کریم ﷺ کو بچاتے رہے۔اس لئے نبی کریم ﷺ آپؓ کو چلتا پھرتا شہید کہا کرتے تھے۔

حضرت طلحہؓ: ابومحمد طلحہ عبیداللہ قرشیؓ مشہور صحابی ہیں۔عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ابتدائے اسلام میں ایمان لائے۔غزوۂ بدر کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے ان کو اور حضرت سعد بن زیدؓ کو قریش کے قافلہ کی خبر گیری کے لئے بھیجا تھا۔چنانچہ آپؓ جنگ کے بعد بدر کے مقام پر پہنچے۔بدر کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے اور جمادی الاخریٰ ۳۶ھ کو جنگ جمل میں چونسٹھ سال کی عمر میں شہید ہوئے۔بصرہ میں دفن ہوئے۔

(۲) حدثنا ابن أبی عمر ثنا سفیان بن عیینة عن یزید بن خصیفة عن السائب بن یزید أنّ رسول اللّٰہ ﷺ کان علیه یوم احد درعان قد ظاهر بینهما(۱).

ترجمہ: حضرت سائب بن یزید کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بدن مبارک پر احد کے روز دو زرہیں تھیں۔جن کو آپ ﷺ نے اوپر نیچے پہن رکھا تھا۔

---

(۱) سنن ابن ماجة ص۲۰۷ کتاب الجهاد باب السلاح، سنن الکبریٰ للبیهقی ۹/۴۶ کتاب السیر باب الاختیار فی التحرز (مختار)

سائب بن یزیدؓ چونکہ حضرت سائبؓ غزوہ احد کے سال ہی پیدا ہوئے تھے۔اس لیے ظاہر ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔اور صحابی کا مرسل بالاتفاق مقبول ہے۔

قدظاهر بينهما اوپر پہنے ہوئے کپڑے کو ظہارہ اور نیچے پہنے ہوئے کپڑے کو بطانہ کہتے ہیں۔اس لئے بعض شراح نے حدیث کا ترجمہ یوں کیا ہے۔کہ ایک زرہ پہن کر اس کے اوپر ظہارہ پہنا تھا اور پھر ظہارہ کے اوپر دوسری زرہ پہنی تھی۔لیکن اکثر شرّاح نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک زرہ کو دوسری کے لئے ظہارہ بنادیا تھا۔یعنی ایک پہن کر اس کے اوپر دوسری زرہ پہنی تھی۔

١٦. باب ما جاء فی صفة مغفر رسول الله ﷺ

نبی کریم ﷺ کے فولادی خود کے بیان میں

اس باب میں ایک اور دفاعی ہتھیار کا ذکر ہے جسے خود کہتے ہیں۔ مغفر غفر سے ہے جس کے لغوی معنی ستر اور چھپانے کے ہیں۔ مغفرة بھی اس سے ہے جس کے معنی گناہ چھپانا اور پردہ ڈالنے کے ہیں۔ مغفر ایک فولادی ٹوپی سی ہوتی ہے جس کا استعمال آج بھی فوجیوں اور مسلح جماعتوں کے لئے معروف ہے۔ اس کے ذریعے تلوار، نیزہ، پتھر وغیرہ سے سر کو بچایا جاتا ہے۔ بعض اہل سیر نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دو مغفر یعنی خود تھے۔ ایک کا نام موشح اور دوسرے کا نام ذو السبوع تھا۔ اس باب میں مصنفؒ دو حدیثیں لاتے ہیں۔

(١) حدثنا قتيبة بن سعيد ثنا مالك بن أنس عن ابن شهاب عن أنس بن مالك أنّ النّبيّ ﷺ دخل مكة و عليه مغفر فقيل له هذا ابن خطل متعلق بأستار الكعبة فقال اقتلوه(١).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے سر پر خود تھا۔ کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ ابن خطل کعبہ کا پردہ پکڑے ہوئے ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے قتل کردو۔

دخل مكة یہ فتح مکہ کا واقعہ ہے۔ اس روز آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر مکہ داخل ہوئے تھے۔ دیگر اسلحہ سے مسلح ہونے کے علاوہ سر پر خود تھا۔ جس کے اوپر سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ اسی دن انجیل کی وہ پیشن گوئی ثابت ہوگئی جس میں بتایا گیا تھا کہ ”خداوند فاران سے آیا۔ سعیر سے طلوع ہوا اور دس ہزار قدوسیوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہوا۔“

---

(١)صحيح بخاری ١/٢٤٩ كتاب جزاء الصيد باب دخول الحرم ومكة بغير احرام ٢/٨٦٤ و كتاب اللباس باب المغفر، صحيح مسلم ١/٤٣٩ كتاب الحج باب جواز دخول مكة بغير احرام، سنن ابی داؤد ٢/٩ كتاب الجهاد باب قتل الاسير الخ.(مختار)

فاتحین کے لئے درس: یہی صحابہؓ وہ قدوسی تھے جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے جن کی بشارت کتب سماویہ میں دی گئی تھی۔ فتح مکہ بجائے خود ایک مکمل درسِ حیات اور فاتحین کے لئے ہدایات کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔ ایک کمانڈر جب کسی ملک کو فتح کرتا ہے تو اس کے لئے مفتوحین کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی عملی تعلیم دی۔ آپ ﷺ نے دشمن کے ساتھ بے مثال رحمت و شفقت کا معاملہ اور احسان اور حسن سلوک کا عظیم مظاہرہ کیا۔ جس میں غرور و تکبر اور تعلّی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اسی تاریخی واقعے کو اللہ تعالیٰ نے فتح مبین کہا ہے۔

مکہ مکرمہ پر حملے کا حکم: یہاں پر یہ اشکال ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مکہ پر حملہ کرنے سے منع فرمایا چنانچہ فرماتے ہیں کہ **لایحلّ لاحدکم ان یحمل بمکة السلاح** (۱)

تم میں سے کسی مسلمان کے لئے مکہ میں مسلح ہو کر چلنا جائز نہیں۔

گویا خود اللہ تعالیٰ نے اس شہر میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کیا ہے۔ شرعی طور پر یہ امن کی جگہ ہے پھر نبی کریم ﷺ یہاں مسلح ہو کر کیوں آئے؟ اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔

اول: یہ کہ یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے اور لوگوں کے لئے یہ پہلے بھی حرام تھا۔ اور اب بھی حرام ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کے لئے یہ حلت اس لئے تھی کہ خانہ کعبہ پر کافروں کا قبضہ تھا۔ اسے کافروں کے چنگل سے چھڑانا ضروری تھا۔ اور حرم شریف اس وقت دارالامن نہیں دارالحرب تھا۔ اسے دارالامن بنانے کے لئے ابتداء میں یہاں اسلحہ اٹھانا پڑا۔ جو جائز ہے۔ اور اب ان شاء اللہ قیامت تک مکہ کے دارالحرب بننے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اسی لئے اب مکہ میں اسلحہ اٹھانا جائز نہیں رہا۔ نیز فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ نعوذ باللہ اگر کعبۃ اللہ اور حرم شریف کی حفاظت خطرے میں ہو تو اب بھی دفاعاً مکہ بلکہ کعبہ میں اسلحہ اٹھانا جائز ہے۔ اور نعوذ باللہ دشمن اس پر قبضہ کرے تو پھر تو یہ ضروری ہوگا۔

دوسرا جواب: یہ کہ دراصل اسلحہ اٹھانے سے ممانعت مطلقاً نہیں بلکہ **محاربة مع المسلمین** کے لئے اسلحہ اٹھانے پر محمول ہے۔ **محاربة مع الکفار** کے لئے جائز ہے۔

تیسرا جواب: یہ کہ یہ حلت نبی کریم ﷺ کے لئے بھی ایک مخصوص وقت کے لئے تھی۔ بعد

---

(۱) صحیح مسلم ۱/ ۴۳۹ کتاب الحج باب النهی عن حمل السلاح بمکة من غیر حاجة (مختار)

میں یہ منسوخ ہوگئی۔اوراس پر بخاری شریف کی وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جس میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ **فانّھما لا تحلّ لاحد کان قبلی إنّھا احلّت لی ساعۃ من النّھا ر وإنھا لن تحلّ لاحد من بعد (الحدیث)**(۱)

وعلیہ مغفر ترجمۃ الباب سے مطابقت اسی جملہ میں ہے یعنی آپ ﷺ خود پہنے ہوئے تھے۔

<u>حضور ﷺ کی دریادلی:</u> **فقیل لہ الخ** حضرت سعید بن حریثؓ نے آپ ﷺ کونشاندہی کی کہ یہ ابن خطل ہے۔**ھذا ابن خطل الخ** نبی کریم ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو تمام کفار جمع تھے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ آج میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا۔انہوں نے کہا کہ جس طرح کہ ایک شریف بھائی اپنے بھائی سے معاملہ کرتا ہے۔ایسی ہی ہماری توقع ہے۔کونسا ظلم ہے جو ان کافروں نے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں پر نہیں کیا تھا۔لیکن نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر فرمایا کہ **لا تثریب علیکم الیوم** یعنی آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

تم سب معاف ہو۔رحمتِ حق کو تو بہانہ چاہیے۔اس روز بڑے سرکش اور متمرد لوگ معاف ہوئے۔اگرچہ لوگوں کا خیال تھا کہ آج مکہ کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہیں گی۔لیکن حضور ﷺ نے تو سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کے گھر کو **دار الامان** بنادیا۔کعبہ میں داخل ہونے والے،اور گھر کا دروازہ بند کرنے والے تو دوران حملہ بھی مامون قرار دیئے گئے۔

لیکن بایں ہمہ بعض جرائم ناقابل معافی ہوتے ہیں۔اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن گیارہ آدمیوں اور چھ عورتوں کے بارے میں اعلان فرمایا کہ ان کے لئے معافی نہیں ہے۔

<u>اشاعت اسلام کا اصل سبب:</u> یہ ہے حقیقت اس جھوٹے پروپیگنڈے کی کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔حالانکہ یہ بات کہنے والے لوگ اگر اپنی تاریخ دیکھیں تو انہیں معلوم ہوجائے گا کہ ایک شہر فتح کرتے ہوئے انہوں نے اتنے قتل کئے کہ نبی کریم ﷺ کی ساری دس سالہ جنگوں میں اتنے قتل نہیں ہوئے۔یہ تو اسلام کی حقانیت اور نبی کریم ﷺ کی رحمت کاملہ ہونے کا کرشمہ تھا کہ اسلام کی طرف لوگ دوڑنے لگے اور تقریباً دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کرکے بھی مسلمانوں کی لڑی ہوئی۔جنگوں میں صرف چند آدمی قتل ہوئے۔

---

(۱)بخاری ۱/۳۲۸ کتاب اللقطہ باب کیف تعرف اللقطۃ اھل مکۃ (مختار)

بہر حال عام معافی کا اعلان ہوا۔لیکن 17 افراد کے جرائم نا قابل معافی تھے۔اس لئے ان کو معافی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ بعد میں سات مردوں اور دو عورتوں کو معافی ملی۔اور چار عورتوں سمیت آٹھ افراد کو قتل کیا۔جبکہ بعض روایات میں چار مرد اور دو عورتوں کو قتل کرنے کا ذکر ہے۔اور وہ بھی دراصل وہی لوگ تھے جن کے جرائم کے ساتھ حقوق العباد وابستہ تھے۔انہوں نے انسانوں پر ظلم کیا تھا۔اور ظالم کو معاف کرنا مظلوم کے ساتھ بے انصافی ہے۔

ابن خطل اور اس کا جرم: انہی لوگوں میں ایک ابن خطل بھی تھا۔یہ شخص اسلام لایا تھا۔جاہلیت میں اس کا نام عبدالعزیٰ بن ہلال بن خطل تھا۔اسلام لانے کے بعد اس کا نام عبداللہ یا غالب رکھا گیا۔خط و کتابت سے واقفیت کے سبب حضور ﷺ نے ان کو بڑا اعزاز دیا تھا۔حتیٰ کہ وحی کی کتابت کی اجازت بھی دے دی۔ بعد میں ایک غلام حوالہ کر کے نبی کریم ﷺ نے ایک قبیلہ کے پاس عامل بنا کر بھیجا۔راستے میں اس نے غلام سے کہا کہ میں سوتا ہوں تم جاگتے رہو اور کھانا وغیرہ تیار کر لو۔پھر مجھے جگا دو۔وہ جاگا تو دیکھا کہ غلام سویا پڑا ہے۔کھانا بھی تیار نہیں تھا۔سخت غصہ میں غلام پر تلوار چلائی اور اسے قتل کر دیا۔پھر سوچا کہ نبی کریم ﷺ اب مجھ سے ضرور قصاص لینگے۔اس خوف کی وجہ سے مرتد ہو کر وہ مکہ آیا۔چونکہ مکہ کے کافر مرتدوں کی بہت عزت افزائی کرتے تھے۔اس لئے اس نے ارتداد پر اکتفاء نہیں کیا۔بلکہ دو لونڈیاں اس غرض سے خریدیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ہجو یہ اشعار کہہ کر لوگوں کو سنائیں۔یہ گستاخانہ اور گندے اشعار ہوتے تھے۔جو جگہ جگہ مجلسوں میں گائے جاتے تھے۔اور چونکہ ادب اور شعر و شاعری کا چرچا تھا۔اس لئے یہ اشعار پھیل کر دوست دشمن سب کی زبانوں سے سنے جانے لگے۔نبی کریم ﷺ کو اس سے بہت اذیت ہوتی تھی۔ بہر حال اس ظالم نے ایک تو قتل کیا تھا۔اور ہجو یہ اشعار کا اہتمام جرم بالائے جرم تھا۔اس لئے آپ ﷺ نے اس کو واجب القتل قرار دیا تھا۔متعلق باستار الكعبة۔یعنی کعبہ کے پردوں کو پکڑ کر ابن خطل معافی چاہتا تھا۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس زمانے میں بھی خانہ کعبہ کا غلاف ہوتا تھا۔ اقتلوه رحم درخواست رد کر دی گئی تو لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔

قاتل کون تھا: قاتلین میں چار آدمیوں کے نام ہیں۔سعید بن زیدؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، زبیر بن

العوامؓ اور ابو برزۃ اسلمیؓ۔ علامہ قسطلانیؒ نے مؤخر الذکر کو ترجیح دی۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ اس کو قتل کرنے کے لئے چاروں نے حملہ کیا ہو۔ اور مؤخر الذکر کے ہاتھوں وہ جہنم رسید ہو چکا ہو۔ واللہ اعلم

حرم میں حدود وقصاص کا حکم: علامہ ابن حجرؒ وغیرہ نے اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مسجد حرام میں حدود وقصاص کا اجراء جائز ہے۔ کیونکہ ابن خطل کو بھی قصاصاً حرم ہی میں قتل کیا گیا تھا۔ احناف کے ہاں مسجد حرم کو نجاست سے بچانے کے لئے اس میں حدود وقصاص کا اجراء نہیں ہوگا۔ بلکہ قاتل یا صاحبِ حد کو بھوکا پیاسا رکھ کر حرم سے باہر نکلنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اور باہر ہی حد یا قصاص کا نفاذ ہوگا۔

مذکورہ استدلال سے ملا علی قاریؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ اس قتل کو حد یا قصاص کہنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ ابن خطل اس وقت حربی تھا۔ جس پر حدود وقصاص نافذ نہیں ہوتے۔ البتہ وہ معافی کے اعلان میں مستثنیٰ ہونے کی بناء پر قتل کیا گیا تھا۔

(۲) حدثنا عیسیٰ بن احمد ثنا عبداللّٰہ بن وھب ثنی مالک ابن انس عن ابن شھاب عن أنس بن مالک أنّ رسول اللّٰہ ﷺ دخل مکة عام الفتح وعلی راسه المغفر قال فلما نزعه جاءہ رجل فقال ابن خطل متعلق بأستار الکعبة فقال أقتلوہ قال ابن شھاب و بلغنی أنّ رسول اللّٰہ ﷺ لم یکن یومئذ محرما(۲).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے وقت جب مکہ میں داخل ہوئے تو نبی کریم ﷺ کے سر مبارک پر خود تھی۔ جب نبی کریم ﷺ نے

(۱) ملا علی قاریؒ نے اس سلسلہ میں بعض روایات کی مدد سے تین اور صحابہ یعنی سعید بن حریثؓ، عمار بن یاسرؓ اور شریک بن عبدہ عجلانیؓ کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن اصل قاتل کے سلسلے میں ترجیح ابو برزہ اسلمیؓ کو دی ہے۔ علامہ بیجوریؒ کہتے ہیں کہ پہلے ابو برزۃ اسلمیؓ قتل کرنے آئے بعد میں سعید بن حریثؓ نے بھی اس میں مدد کی ابن ہشامؒ نے سیرت میں اسی کو ترجیح دی۔ (مختار)

(۲) صحیح بخاری ۱/ ۲۴۹ کتاب جزاء الصید باب دخول الحرم ومکة بغیر احرام ۲/ ۸۶۴ کتاب اللباس باب المغفر، صحیح مسلم ۱/ ۴۳۹ کتاب الحج باب جواز دخول مکة بغیر احرام، سنن ابی داؤد ۲/ ۹ کتاب الجھاد باب قتل الاسیر (مختار)

اسے اتارا۔ تو ایک شخص نے آ کر عرض کیا کہ ابن خطل کعبہ کے پردوں سے لپٹا ہوا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کو قتل کر دو۔ ابن شہاب زہریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس روز محرم نہیں تھے۔

__حرم شریف میں داخلہ اور شرط:__ لم یکن یو مئذ محرما ۔ایک فقہی مسئلہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، اور امام احمدؒ کے ہاں بغیر احرام کے حرم میں داخل ہونا ناجائز ہے۔ شوافع کہتے ہیں کہ بغیر احرام باندھے حرم میں داخل ہونا جائز ہے۔ مذکورہ حدیث بظاہر شوافع کا مستدل ہے کہ نبی کریم ﷺ خود مکہ میں احرام باندھے بغیر داخل ہو چکے ہیں۔ جس طرح امام زہریؒ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جمہور اور امام ابو حنیفہؒ کی طرف سے اس کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں۔

اول: یہ کہ یہ نبی کریم ﷺ اور اس دن کی خصوصیت تھی۔ کہ اس روز مسلح ہو کر داخل ہونا بھی جائز تھا اور مذکورہ فقہی حکم سے بھی یہ دن مستثنیٰ تھا۔ لہٰذا اس روز بغیر احرام کے مکہ میں داخل ہونا جائز تھا۔

دوم: یہ کہ نبی کریم ﷺ کو یہ علم نہ تھا کہ آئندہ کس طرح کے حالات پیش آنے والے ہیں۔ مکہ فتح ہو گا یا نہیں۔ مقابلہ ہو گا یا نہیں۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ نے اس عذر کی بناء پر احرام نہیں باندھا۔ ورنہ بصورت جنگ احرام سے نکلنا پڑتا۔

سوم: یہ کہ ممکن ہے کہ حضور ﷺ نے پہلے مکہ کے مضافات کی نیت کی ہو۔ اور جنگ کے خطرے کے پیش نظر مکہ کی نیت ہی نہ ہو۔ اور اس صورت میں ہمارے ہاں بھی احرام کی ضرورت نہیں۔

چہارم: یہ کہ امام زہریؒ کا یہ قول کہ ''بلغنی الخ'' بلا سند ہے جو اُن مستند احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا جن میں بغیر احرام کے حرم میں داخل ہونے کی ممانعت مروی ہے۔

۱۷. باب ما جاء فی عمامة النبی ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے عمامہ کا بیان

<u>عمامہ کی تعریف اور فضیلت:</u> سر پر بندھی ہوئی پگڑی کو عمامہ کہتے ہیں جو کہ نبی کریم ﷺ کا پسندیدہ لباس تھا۔اور کثرت سے روایات اس بارے میں منقول ہیں۔اسی وجہ سے پگڑی باندھنا فقہاء کے نزدیک سنت ہے۔خواہ ٹوپی کے اوپر باندھی جائے یا اس کے بغیر ہو۔البتہ صرف ٹوپی کے استعمال کو علامہ ابن جوزیؒ وغیرہ نے زی المشرکین یعنی مشرکوں کا فیشن قرار دیا ہے۔بلکہ اس مفہوم میں صریح حدیث بھی موجود ہے۔

اس باب میں عمامہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ سر پر بندھی ہوئی پٹی کا بھی ذکر ہے۔تو گویا عنوان میں سر پر بندھے ہوئے ہر قسم کے کپڑے کو عمامہ کہا گیا ہے۔احادیث میں نبی کریم ﷺ کی متعدد پگڑیوں کا ذکر موجود ہے۔بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ان میں سے ایک پگڑی سات ذراع (ساڑھے دس فٹ) لمبی تھی۔جیسا کہ طبرانیؒ کی ایک روایت میں مذکور ہے۔جبکہ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا طول سات ذراع اور عرض ایک ذراع تھا۔علامہ بیجوریؒ شرح شمائل میں کہتے ہیں کہ "لا اصل لهٗ" یعنی یہ دونوں باتیں بے بنیاد ہیں۔

لیکن علامہ نوویؒ نے عمامہ رسول ﷺ کی مقدار کے بارے میں یہ بات لکھی ہے کہ آپ ﷺ کی دو پگڑیاں تھیں۔ایک چھ اور دوسری بارہ ذراع لمبی تھی(۱)۔بہر حال مقدار میں اختلاف متعدد پگڑیوں کی وجہ

---

(۱)لکن نقل عن النووی انه کان له ﷺ عمامة قصیرة وکانت ستة ازرع وعمامة طویلة کانت اثنی عشر ذراعاً(المواهب اللدینیة ص ۹۹) اور شیخ عبدالحق المحدث الدهلویؒ نے اپنے رسالہ اداب اللباس میں لکھا ہے کانت عمامته ﷺ فی البیت سبعة اوثمانیة أذرع وفی وقت الصلوات الخمس اثنا عشر ذراعاً وفی الجمعة اربعة عشرذراعاً وفی الحروب خمسة عشر ذراعا اه. (آداب اللباس ص۳بحواله شابیب الغمامة ص۴۳)اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے لکھا ہے کانت عمامته علیه السلام فی اکثر الأحیان ثلاثة أذرع شرعیة وفی الصلوات الخمس سبعة اذرع وفی الجمع والأعیاد اثناعشرذراعاً اه.(العرف الشذی علی جامع الترمذی ۱/۳۰۴) گویا رسول اللہ ﷺ سے مختلف اوقات میں مختلف قسم کے عمائم پہننا ثابت ہے۔اس لئے مختلف مقدار کے عمائم پہننا جائز ہے۔(مختار)

سے ہوسکتا ہے۔لیکن یہ بات ثابت ہے کہ پگڑی باندھنا نبی کریم ﷺ کی سنت مستمرہ ہے۔آپ ﷺ خود بھی پگڑی باندھا کرتے تھے اور جگہ جگہ اس کا حکم بھی دیا کرتے تھے۔چنانچہ فعلی احادیث کی طرح قولی احادیث بھی اس سلسلہ میں مروی ہے۔

(۱) حدثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمان بن مهدی عن حمّاد بن سلمة حد ثنا محمود بن غیلان ثنا وکیع عن حمّاد بن سلمة عن أبی الزبیر عن جابر قال دخل النبیّ ﷺ مکة یوم الفتح و علیه عمامة سوداء(۱).

ترجمہ: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب فتح مکہ کے روز شہر میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے سر پر سیاہ پگڑی تھی۔

<u>ایک تعارض اوراس کا جواب:</u> **وعلیه عمامة سوداء الخ** گزشتہ ابواب میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ''**دخل مکة وعلیه مغفر**''یعنی آپ ﷺ خود پہنے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے تھے جبکہ اس حدیث میں خود کی بجائے سیاہ پگڑی کا ذکر ہے۔بظاہر دونوں حدیثوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تعارض نہیں بلکہ نفس الامر میں یہ دونوں جمع ہوسکتے ہیں۔اس طرح کہ آپ ﷺ نے خود سر پر رکھا ہوا اور اوپر سے پگڑی باندھی ہو کیونکہ خود لوہے کا ہوتا ہے جو ظاہری ہیئت کے لحاظ سے بدنما دکھائی دیتا ہے۔لہٰذا نبی کریم ﷺ نے اسے پگڑی سے چھپا دیا ہوگا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ خود بھاری ہوتا ہے۔برہنہ سر پر اسے رکھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔لہٰذا ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے نیچے پگڑی باندھی ہو اور اوپر سے خود رکھا ہو۔بہر حال دونوں حدیثیں اپنی جگہ درست اور صحیح معلوم ہوتی ہیں۔علاوہ ازیں ہوسکتا ہے کہ عین دخولِ مکہ کے وقت تو سر پر خود ہو۔پھر کچھ دیر بعد خود رکھ دیا ہو اور سیاہ پگڑی باندھی ہو۔اور یہ دونوں واقعات تعدد اوقات پر مبنی ہوں۔

---

(۱)سنن ابی داؤد۲/۲۰۹ کتاب اللباس باب فی الغنائم، سنن ابن ماجة ص۲۰۸ کتاب الجهاد باب لبس العمائم فی العرب و کتاب اللباس باب العمامة السوداء، سنن دارمی ۲/۸۴(مختار)

<u>کیاذوالحال اورحال کاایک زمانہ ضروری ہے:</u> اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ذوالحال کے عامل اور حال کے زمانوں میں اتحادشرط ہے۔اس لئے دخولِ مکہ کے موقع پر مغفراورعمامہ دونوں کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔لیکن اس اعتراض کا علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ مذکورہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی خارجی تحقق کے اعتبار سے دونوں زمانے مختلف ہوسکتے ہیں۔علاوہ ازیں دخول شہر کے بعد بھی کچھ وقت مجاورت کے سبب دخول ہی کی حالت شمار کی جائے گی۔الغرض یہاں پر وحدت زمانی نہ ہوتو قرب زمانی موجود ہے۔جوصحت حالیت کے لئے کافی ہے۔جبکہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ عمامہ سے خودمراد ہے جوصحتِ حالیت کے لئے کافی ہے۔لہٰذا تعارض سرے سے موجود نہیں ہے۔

<u>سیاہ پگڑی کاثبوت:</u> اس حدیث میں سیاہ پگڑی کا ثبوت ہے۔بعض شرّاح کا خیال ہے کہ یہ پگڑی دراصل سیاہ نہیں تھی بلکہ زیادہ میلی ہونے کے سبب سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔جس طرح کہ دوسری حدیث میں ''عمامة دسماء '' کے لفظ سے تعبیر کی گئی ہے یاپھر چونکہ اس کے نیچے سیاہ خودسر پر رکھا تھااور پگڑی کے نیچے سے وہ نظر آرہا تھا۔اس لئے یہ عارضی طور پر سیاہ نظر آتی تھی کیونکہ نبی کریم ﷺ سفید لباس پسند فرمایا کرتے تھے۔لیکن علامہ بیجوریؒ وغیرہ شراح نے اس توجیہ کوخلافِ ظاہر بتایا ہے۔

رہی یہ بات کہ آپ ﷺ سے روایت مروی ہے کہ سفید پوشاک بہترین لباس ہے(۱)۔ تواس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سیاہ لباس یا پگڑی ناجائز ہے(۲) یا حضور ﷺ نے اسے استعمال نہیں کیا ہے خصوصاً جب خود نبی کریم ﷺ سے اس کا استعمال مروی ہے۔جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

---

(۱)شمائل ترمذی باب لباس رسول اللہ ﷺ ص ۵ قال رسول ﷺ علیکم بالبیاض من الثیاب الخ

(۲)اس لئے کہ لباس بذاتہ ممنوع نہیں ہوتے تاہم کسی دوسرے قوم یافرقہ سے مشابہت کی بناء پرانہیں مکروہ کہاجاتا ہے۔ مثلاً کالی پگڑی یالباس کاکوئی دوسراسیاہ کپڑاممنوع نہیں ہے مگرمحرم کے دنوں میں چونکہ شیعہ حضرات خصوصیت کے ساتھ ماتم کے اظہار کے لئے سیاہ لباس پہنتے ہیں۔لہٰذاان مخصوص ایام میں سیاہ لباس یا پگڑی پہننے سے گریز کرنا چاہئے۔(شمائل ترمذی ۱/۴۳۳ مولاناصوفی عبدالحمید)علامہ شیخ احمد عبدالجوادالرومیؒ نے لکھا ہے والعمائم البیض ھی التی تناسب زی العلماء فی ھذاالزمان (الاتحافات الربانیة ص ۱۵۷)اورملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے فی الحدیث جواز لبس الاسود فی الخطبة ولبس البیاض افضل (جمع الوسائل ۱/۲۰۵)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) رسول اللہ ﷺ کی مختلف الوان کی پگڑیاں: سیاہ پگڑی کے علاوہ دوسرے الوان کی پگڑیاں بھی آنحضرت ﷺ اور سلف صالحین سے استعمال کرنا ثابت ہے۔ مثلاً (۱) سرخ رنگ کی پگڑی عن أنس بن مالکؓ قال رأیتُ رسول اللّٰہ ﷺ یتوضّأ وعلیه عمامة قطریة فأدخل یده من تحت العمامة فمسح مقدم رأسه ولم ینقض العمامة سنن ابی داؤد کتاب الطهارة باب المسح علی العمامة صاحب عون المعبود نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے استدل به علی التعمیم بالحمرة وهو استدلال صحیح لو کان فی الحدیث ضعف (عون المعبود شرح ابی داؤد ۱/۲۵۱) (۲) زرد رنگ کی پگڑی عن زید بن أسلم أنّ ابن عمرؓ کان یصبغ لحیته بالصفرة حتی تمتلی ثیابه من الصفرة فقیل له لم تصبغ بالصفرة فقال إنیّ رأیت رسول اللّٰہ ﷺ یصبع بها ولم یکن شئ أحبّ إلیه منها وقد کان یصبغ بها ثیابه کلّها حتی عمامته، سنن ابی داؤد کتاب اللباس باب فی المصبوغ بالصفرة، وعن اسماعیل بن عبداللّٰہ بن جعفر عن أبیهؓ قال رأیت رسول اللّٰہ ﷺ وعلیه ثوبان مصبوغان بالزعفران رداءٌ عمامةٌ المستدرک للحاکم ۴/۱۸۹، وقال صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاه. (۳) سفید رنگ کی پگڑی مصنف ابن ابی شیبۃ میں ہے عن ابی صالح قال رأیت علی الشعبی عمامة بیضاء قد أرخی طرفها ولم یرسله وعن إسماعیل بن عبدالمطلب قال رأیت علی سعید بن جبیر عمامة بیضاء وعن سلیمان بن أبی عبداللّٰہ قال ادرکت المهاجرین الأولین یعتمون بعمائم کرابیس سود وبیض لایخرجها من تحت ذقنه (مصنف ابن ابی شیبة ۵/۱۷۹ کتاب اللباس والزینة باب لبس العمائم البیض) (۴) سبز رنگ کی پگڑی جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہؒ کا حوالہ گزر گیا ہے۔ اسی طرح سنن ابی داؤد میں حضرت ابو رمثہؓ سے مروی ہے قال رأیت رسول اللّٰہ ﷺ وعلیه بردان أخضران (ابو داؤد کتاب اللباس باب فی الخضرة) اور اس روایت کو خود امام ترمذیؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ (جامع ترمذی کتاب الادب باب ماجاء فی الث ﷺ ب الاخضر) مگر یاد رہے سبز رنگ کی دوسرے الوان پر کوئی فضیلت نہیں بلکہ اس رنگ کی پگڑی کا استعمال محض اباحت تک ہے۔ اس لئے بہت سارے اہل علم نے اس رنگ کے استعمال سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر الهیثمیؒ فرماتے ہیں والعمامة الخضراء فلااصل لها وانّما حدث سنة ثلاث وسبعین وسبعمائة بأمر الملک شعبان بن حسین (الفتاوی الحدیثیة ۲۲۵) اور علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے الجواب: أنّ هذه العلامة لیس لها أصل (بقیہ اگلے صفحہ پر)

سیاہ پگڑی کے فوائد: پھر سیاہ پگڑی کے استعمال میں کچھ ایسے فوائد بھی ہیں جو سفید میں نہیں۔ مثلاً میل خوراہونے کی وجہ سے جلدی اس پر میل ظاہر نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ سر مبارک پر تیل کا استعمال کثرت سے کیا کرتے تھے۔ اس لئے بھی سیاہ رنگ زیادہ مناسب تھا۔ جس پر تیل آسانی سے ظاہر نہیں ہوتا۔ خصوصاً سفر کی حالت میں جب دھونے دھلانے کے مواقع کم ہوتے ہیں، سفید کی نسبت سیاہ کپڑے کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔ علاوہ ازیں فتح مکہ کے اس تاریخی موقع پر آپ ﷺ نے اس عمل سے دین محمدی ﷺ کے دوام اور عدم تغیر پذیری کی طرف اشارہ بھی فرمایا۔ کیونکہ سیاہ رنگ بھی متبدل اور دوسرے رنگ سے متاثر نہیں ہوتا(۱)۔

(۲) حدّثنا ابن أبی عمر ثنا سفیان عن مساور الورّاق عن جعفر ابن عمرو بن حریث عن أبیه قال رأیت علی رسول اللهﷺ عمامة سوداء(۲).

(بقیہ حاشیہ) فی الشرع ولافی السنة ولاکانت فی الزمن القدیم وإنّما حدثت فی سنة ثلاث وسبعین وسبعمائة بأمر الملک الأشراف یعنی شعبان بن حسین(الحاوی للفتاویٰ ۱/۳۳) اور علامہ محمد کامل نے لکھا ہے سئلت عمّن انتسب إلی آل بیت النبوة ولیس هو منهم ولبس عمامة الخضراء لیقال أنه سیدو شریف ماذایلزمه؟فالجواب:أنه یمنع من لبس العمامة الخضراء ویعزرتعزیراً شدیداً یحبس حتی یظهر صلاحه أفتی بذلک فی البهجة(الفتاویٰ الکاملیة ۲۶۵) گویا سبز پگڑی کا ثبوت صراحتاً نہیں۔ اس لئے اس کو سنت نہ سمجھا جائے۔ البتہ اگر اہل جنت کے لباس سے مشابہت یا گنبد خضراء کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے بوجہ عشق استعمال کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔(مختار)

(۱) خلفائے عباسیہ کے ہاں ایک پگڑی کا ذکر ملتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ ہر نئے خلیفہ کی دستار بندی کرتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ یہ وہی پگڑی ہے جو فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ نے پہنی تھی۔ اور بعد میں اپنے چچا حضرت عباسؓ کو بخش دی تھی۔ اور اس طرح بنو عباس کو ملی (اصلاح الدین)

(۲)صحیح مسلم ۱/۴۳۹ کتاب الحج باب جواز دخول مکة بغیر احرام، ابوداؤد ۲/۲۰۹ کتاب اللباس باب فی العمائم سنن النسائی ۲/۲۵۵ کتاب الزینة باب لبس العمائم السود، ابن ماجة ص ۲۰۸ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة باب ماجاء فی الخطبة یوم الجمعة وکتاب اللباس باالعمامة السوداء(مختار)

ترجمہ: عمرو بن حریثؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ دیکھا۔

(۳) حدّثنا محمود بن غیلان ویوسف بن عیسیٰ قالا ثنا وکیع عن مساور الورّاق عن جعفر بن عمرو بن حریث عن أبیه أنّ النبی ﷺ خطب النّاس و علیه عمامة سوداء.

ترجمہ: عمرو بن حریثؓ سے یہ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ لوگوں کو اس حال میں خطبہ دیا کہ آپ ﷺ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا۔

وعلیه عمامة سوداء اوپر کی دونوں حدیثوں میں یہ تعین نہیں ہے کہ حضرت عمرو بن حریثؓ یہاں کس روز اور کس موقع کی بات کر رہے ہیں۔ لیکن مسلم اور نسائی کی حدیثوں میں انہوں نے کہا ہے کہ وہ منظر گویا میرے سامنے ہے جب نبی کریم ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے سیاہ عمامہ آپ ﷺ کے سر مبارک پر تھا اور اس کا شملہ دونوں شانوں کے درمیان تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جمعہ کا دن تھا نیز یہ خطبہ اس خطبہ کے علاوہ ہے جو آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر دیا تھا۔ کیونکہ وہ خطبہ منبر پر نہ تھا بلکہ کعبہ کے دروازے پر چڑھ کر آپ ﷺ نے دیا تھا۔ صاحب مصابیح نے بھی یہ حدیث باب خطبۃ الجمعہ کے تحت ذکر کی ہے(۱)۔ علامہ نوویؒ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سیاہ لباس پہننا جائز ہے اگر چہ سفید اس سے بہتر ہے۔

---

(۱) لیکن علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ عمرو بن حریثؓ کی حدیث میں جو خطبہ مذکور ہے یہ وہی خطبہ ہے جو کہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے دن باب کعبہ کے پاس دیا۔ تو گویا انہوں نے دروازے کی دہلیز کو مجازاً منبر کہا ہے۔ (عبدالرؤف مناوی) اور اسی رائے کی طرف میرک شاہؒ کے کلام میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ (کما فی جمع الوسائل) نیز علامہ بیجوریؒ فرماتے ہیں کہ ''والمراد بالمنبر فی بعض الروایات عتبة الباب لا نّها منبر بالمعنی اللغوی و هو کل مرتفع ''(المواهب اللدنیه) جبکہ ملا علی قاریؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ خطبہ آپ ﷺ کا مرض وصال والا ہے۔ (اصلاح الدین)

(۴) حدّثنا هارون بن إسحاق الهمد انیّ ثنا یحییٰ بن محمّد المدینّی عن عبد العزیز بن محمّد عن عبداللّٰه بن عمر عن نافع عن ابن عمر قال کان النّبیّ ﷺ اذا اعتمّ سدل عمامته بین کتفیه قال نافع وکان ابن عمر یفعل ذلک قال عبیداللّٰه ورأیت القاسم ابن محمّد و سالما یفعلان ذلک(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب عمامہ باندھتے تھے تو اس کا شملہ اپنے دونوں مونڈھوں کے درمیان لٹکا ہوا چھوڑ دیتے تھے۔نافعؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ ایسا کرتے تھے۔نافعؒ کے شاگرد عبیداللہ بن عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد بن ابی بکر اور سالم بن عبداللہ بن عمرؓ کو ایسا کرتے دیکھا تھا۔

سدل عمامة بین کتفیه الخ یعنی آپ ﷺ نے پگڑی کا شملہ جسے عربی زبان میں **عذبة** یا **علاقة** کہتے ہیں کندھوں کے درمیان پیچھے کی جانب چھوڑ دیا تھا(۲)۔اس حدیث سے شملہ چھوڑنے کا ثبوت ملتا ہے۔اور یہ سنت ہے۔عموماً آپ ﷺ شملہ چھوڑ کر پگڑی باندھا کرتے تھے۔لیکن کبھی کبھی بغیر شملہ کے بھی پگڑی باندھی ہے۔اکثر یہ ثابت ہے لیکن بائیں جانب کو چھوڑنے کا ذکر نہیں۔امام مناویؒ کہتے ہیں کہ کندھوں کے درمیان چھوڑنا افضل ہے۔یہ بھی آیا ہے کہ آپ ﷺ نے پگڑی کے دونوں سرے چھوڑ کر دو شملے لٹکائے ہوں لیکن عموماً آپ ﷺ ایک شملہ چھوڑ کر پگڑی باندھا کرتے تھے۔

اس کی مقدار میں بھی اقوال ہیں۔کم از کم مقدار چار انگلیوں جتنی منقول ہے اور زیادہ سے زیادہ

---

(۱) جامع ترمذی ۱/۳۰۴ باب ماجاء فی العمامة السوداء کتاب اللباس باب سدل العمامة بین الکتفین ، شرح السنة للبغوی ۱۲/۳۷،کتاب اللباس باب العمامة والتقنع، صحیح ابن حبان ۸/۱۰۴ باب وصف تعمیم المصطفیٰ(مختار)

(۲) آگے کی طرف شملہ چھوڑتے ہوئے دائیں جانب چھوڑنا لازمی نہیں ہے۔علامہ مناویؒ حافظ زین الدین عراقیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ **ولم ارمادل علی تعیین الایمن إلاّفی حدیث أبی أمامةؓ عندالطبرانی لکنّه ضعیف** بلکہ صوفیاء تو بائیں جانب چھوڑنے کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ دل کا رابطہ دنیا اور غیر اللہ سے نہ ہو۔(اصلاح الدین)

ایک ذراع کا ذکر ہے جو عموما پیٹھ کی وسط تک پہنچ جاتا ہے۔اس لئے شملہ کو زیادہ لمبا نہیں کرنا چاہیے۔ذراع سے تجاوز کرنے کو بعض علماء نے بدعت میں شمار کیا ہے اور اسبال کے زمرہ میں ہونے کے سبب ناجائز قرار دیا ہے۔علامہ مناویؒ کہتے ہیں کہ تکبر کے طور پر زیادہ لمبا چھوڑنا حرام ہے۔واللہ اعلم

یفعل ذالک ابن عمرؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے شاگرد حضرت نافعؒ کے بقول حضرت ابن عمرؓ ایسا کرتے تھے۔یعنی شملہ چھوڑ کر پگڑی باندھا کرتے تھے۔حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ویسے بھی اتباع سنت میں امتیازی مقام رکھتے تھے۔

قال عبیداللّٰہ یہ حضرت نافع کے شاگرد ہیں۔**و رأیت القاسم بن محمد و سالما یفعلان ذالک** یعنی حضرت قاسمؒ اور حضرت سالمؒ بھی شملہ پیٹھ کی جانب چھوڑا کرتے تھے۔یہ دونوں ممتاز تابعین میں سے ہیں۔اوّل الذّکر حضرت ابوبکرؓ کے پوتے اور دوسرے حضرت عمرؓ کے پوتے ہیں۔ان آثار کے نقل سے امام ترمذیؒ کا مقصد یہ ہے کہ شملہ چھوڑنا سنت ماثورہ ہے۔اور سلف صالحین نے اس کا التزام فرمایا ہے۔

(۵) حدّثنا یوسف بن عیسیٰ ثنا وکیع ثنا أبو سلیمان و هو عبدالرحمٰن بن الغسیل عن عکرمة عن ابن عبّاسؓ أنّ النّبیّ ﷺ خطب النّاس و علیه عصابة دسماء(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ لوگوں کو خطبہ دیا اور آپ ﷺ کے سر مبارک پر تیل سے آلودہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔

عن عبدالرحمان بن غسیل الخ حضرت حنظلہؓ کو غسیل الملائکہ کہتے ہیں۔ان کے بیٹے کے پوتے حضرت عبدالرحمٰن بن سلیمان بن عبداللہ بن حنظلہ مراد ہیں۔

حضرت حنظلہ نے نئی نئی شادی کی تھی۔ادھر آپؓ نے بیوی سے ہمبستری کی۔ادھر جہاد کی منادی ہوئی۔جنابت کی حالت میں میدان جنگ کی طرف دوڑے۔دلہن کا خیال تو کجا، غسل کرنے کے لئے بھی نہیں ٹھہرے۔اس قسم کی قربانی کسی بھی امت میں کوئی پیش نہ کر سکا۔الغرض جہاد کرتے ہوئے جام شہادت

(۱) صحیح بخاری ۱/۱۲۵،۱۲۶ کتاب الجمعة باب من قال فی الخطبة بعد الثناء امابعد،مسنداحمد ۱/۲۳۳(مختار)

نوش فرمایا۔آپ کی لاش مبارک پر حضورﷺ کی نظر پڑی تو دیکھا کہ فرشتے غسل دینے میں مصروف ہیں۔ آپﷺ نے تعجب فرمایا۔بیوی سے پتہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ میرے ساتھ صحبت کی حالت میں منادی کی آواز سنی۔فوراً اٹھ کر میدان جنگ کو آئے۔غسل نہیں کیا۔اگر چہ شہید کو غسل نہیں دیا جاتا مگر جنابت کی وجہ سے فرشتوں نے ان کو غسل دیا۔چنانچہ اس وجہ سے آپ غسیل الملائکہ کہلانے لگے۔

خطب الناس وعليه عصابة دسماء الخ دسماء دسومة سے ہے جو چکناہٹ کو کہتے ہیں اور عموماً تیل لگانے کے سبب ہوتا ہے۔یعنی نبی کریمﷺ کے سر پر تیل سے آلودہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ عصابہ دراصل اس پٹی کو کہتے ہیں جس پر عموماً سردرد کے وقت سر باندھا جاتا ہے۔یہ نبی کریمﷺ کی مرض الوفات کا واقعہ ہے۔آپﷺ نے باہر آکر لوگوں کو خطبہ دیا۔اور امراء کو انصار کی رعایت کا حکم دیا۔یہ آپﷺ کا آخری خطبہ ہے۔اس کے بعد آپﷺ نے لوگوں کو کوئی خطبہ نہیں دیا۔اس دوران آپﷺ کو سردرد کی شکایت بہت ہوتی تھی بلکہ آپﷺ کا اصل مرض ہی یہی تھا۔اس موقع پر آپﷺ کا سر اس پٹی کے ذریعے بندھا ہوا تھا۔چنانچہ اس حدیث سے پٹی کے ذریعے سر کو باندھنے کا ثبوت ملتا ہے۔جبکہ بعض شراحِ حدیث کے نزدیک عصابہ اور عمامہ ہم معنی ہیں۔لہٰذا یہاں عمامہ اور پگڑی ہی مراد ہے۔بلکہ ایک اور روایت میں **عمامة دسماء** مروی ہے۔عمامہ کے باب میں لاتے ہوئے شاید امام ترمذیؒ کا بھی یہی مقصد ہے کہ یہاں عمامہ مراد ہے۔

۱۸. باب ما جاء فی صفة ازار النبی ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے تہہ بند کے بیان میں

نبی کریم ﷺ کا تہہ بند اور اس کی مقدار: شلوار کی جگہ لنگوٹی باندھی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ اسے استعمال کیا کرتے تھے۔ اس باب میں لنگوٹی کا بیان مقصود ہے۔ البتہ ضمنا رداء کا بھی ذکر ہوا۔ ازار کے معنی سختی، شدت اور مضبوطی کے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ "فاشدد به ازری "یعنی میرے بھائی کے ذریعے مجھے تقویت دے۔

چونکہ ازار کو بھی نطاق یعنی کمر بند کے ذریعے مضبوطی سے باندھا جاتا ہے۔ اس لئے اسے ازار کہا جانے لگا۔ اس زمانے میں ازار اور لنگوٹی بطور تہہ بند استعمال کرنے کا عام رواج تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ کی لباس میں ازار کے استعمال کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ آپ ﷺ جو ازار استعمال کرتے تھے روایات کے مطابق اس کا طول چار ہاتھ اور ایک بالشت تھا۔ جبکہ عرض دو ہاتھ تھا۔ جبکہ حضور ﷺ کے رداء کے بارے میں دو قسم کی روایات منقول ہیں۔ اول طول چار ذراع اور عرض ڈھائی ذراع دوم طول چھ ذراع اور عرض تین ذراع ایک بالشت۔

شلوار کا حکم: احادیث میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں شلوار پہننے کا واضح ثبوت نہیں ہے۔ لیکن صاحب زاد المعاد کی تحقیق کے مطابق نبی کریم ﷺ نے شلوار پہنی بھی تھی اور محبت کی نظر سے دیکھ کر یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ استر ہے۔ یعنی خوب پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے شلوار کا خریدنا(۱) ثابت ہے اور یہ قرینہ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے پہنا بھی ہوگا۔ بہر حال شلوار بہتر لباس ہے۔

(۱) حـدثـنـا أحمد بن منيع ثنا اسماعيل بن إبراهيم ثنا أيوب عن حـمـيـد بـن هـلال عـن أبـي بردة قال أخرجت إلينا عائشةؓ كساً ملبّدً

---

(۱)قال ابن القيم والظاهر انهٗ اشتراه ليلبسه قال وروى انّه لبسه و كانوا يلبسونه فى زمانه و باذنه.

(جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۱۶)(اصلاح الدين)

او إزار اً غلیظاً فقالت قبض روح رسول اللّٰہ ﷺ فی ھٰذین(۱).

ترجمہ: حضرت ابو بردہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ہمیں ایک پیوند لگی ہوئی چادر اور ایک لنگوٹی دکھلائی۔اور یہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کا وصال ان دو کپڑوں میں ہوا تھا۔

ابو بردہؒ: عن ابی بردۃؓ الخ یہ مشہور تابعی اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے بیٹے ہیں۔ان کا نام عامر یا حارث تھا۔کوفہ کے قاضی بھی رہ چکے تھے۔اپنے والد کے علاوہ دیگر صحابہؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی روایت ثابت ہے۔بعض نسخوں میں یہاں ''عن ابیہ '' کا اضافہ ہے۔لیکن حضرت عائشہؓ سے ملاقات اور روایت ثابت ہونے کی بناء پر موجودہ نسخہ کی حدیث بھی مرسل نہیں ہوتی۔

<u>زہد نبوی ﷺ یاد دہانی:</u> أخرجت إلینا عائشةؓ الخ حضرت عائشہؓ کبھی کبھی نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بھی صحابہؓ کو آپ ﷺ کے زہد اور فقر کی زندگی یاد دلانے کے لئے آپ ﷺ کے حالات کا ذکرہ کرتی تھیں۔اس سلسلے میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے صحابہؓ کو ایک چادر اور ایک لنگوٹی دکھلائی جو انہوں نے بقصد تبرک حفاظت سے رکھی تھیں(۲)۔چادر میں تہہ بتہہ ٹکڑے سئے گئے تھے۔اور لنگوٹی بھی کھدر جیسے سخت اور موٹے کپڑے کی تھی دونوں دکھلاتے ہوئے فرمایا کہ ان دو کپڑوں میں شاہ کونین ﷺ کی روح مبارک پرواز کر گئی تھی۔کساءً ملبداً بدن کے اوپر کا حصہ چھپانے کیلئے جو موٹا کپڑا یا کمبل استعمال ہوتا ہے کساء کہلاتا ہے جبکہ ملبّد سے مراد اکثر شراح کے نزدیک پیوند لگا کپڑا ہے(۳)۔جبکہ بعض شراح کہتے

---

(۱)صحیح بخاری کتاب اللباس باب الاکیة والخمائص ۲/ ۸۶۵، کتاب فرض الخمس باب ماذکر من درع النبی ﷺ وعصاہ وسیفہ الخ، سنن ابی داؤد ۲/ ۲۰۴ باب لباس الصوب والشعر کتاب اللباس ، جامع ترمذی ۱/ ۳۰۳ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الصرف، ابن ماجة کتاب الباس باب لباس رسول اللّٰہ ﷺ(مختار)

(۲)اس روایت سے بزرگوں کے لباس،عمامہ،عصا وغیرہ اشیاء کو تبرک کے طور پر رکھنا ثابت ہوتا ہے اور ملا علی قاریؒ نے اس روایت سے اس مسئلہ کا اثبات کیا ہے۔شاکر غنی سے صابر فقیر بہتر ہے(جمع الوسائل ۱/۲۱۱)(مختار)

(۳)علماء نے لکھا ہے کہ پیوند لگائے ہوئے کپڑوں کا استعمال معیوب نہیں۔بلکہ مستحسن ہے۔حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب آپؓ بیت المقدس پہنچے تو آپؓ کی قمیص میں سترہ پیوند لگے ہوئے تھے۔تو مسلمان فوج کے جرنیل حضرت ابوعبیدہؓ نے عرض کیا کہ یہاں کے لوگ اس کو حقیر سمجھتے ہیں۔تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ہم نادار اور غریب لوگ تھے۔اللہ نے ہمیں دین اسلام کی وجہ سے عزت بخشی۔اگر ہم دین اسلام کے علاوہ عزت تلاش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں رسوا کریگا۔(مختار)

ہیں کہ وہ کپڑا جو موٹائی کی وجہ سے سخت ہو چکا ہو ملبد کہلاتا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایک وسیع اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اور دور دور تک کے علاقے اس کے زیر نگیں تھے۔ لیکن اس کے سربراہ کے فقر کی یہ حالت تھی۔ بہر حال اس حدیث میں ازار پہننے کا ثبوت ملتا ہے۔

(۲) حدّثنا محمود بن غیلان أنا أبوداؤد عن شعبة عن الأشعث ابن سلم قال سمعت عمتی تحدّث عن عمّها قال بینهما أنا أمشی بالمدینة اذا انسان خلفی یقول ارفع إزارک فأنه اتقیٰ و أبقیٰ فالتفّت فاذا هو رسول اللّٰه ﷺ فقلت یا رسول اللّٰه ﷺ إنّما هی بردة ملحاء قال أمالک فیَّ أسوةٌ فنظرت فاذا إزاره إلیٰ نصف ساقیه(۱).

ترجمہ: عبید بن خالد محاربیؓ کہتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں ایک مرتبہ جارہا تھا کہ اچانک ایک شخص میرے پیچھے سے بولا کہ لنگوٹی کو اوپر اٹھاؤ۔ کہ یہ تقویٰ سے زیادہ قریب اور زیادہ دیر تک رہنے کے لئے مفید ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ نبی کریم ﷺ تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! یہ ایک معمولی سی سیاہ (ناقابل فخر) چادر ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تیرے لئے میرا اتباع کافی نہیں۔ میں نے اس ارشاد پر نبی کریم ﷺ کی لنگوٹی کو دیکھا تو وہ نصف پنڈلی تک تھی۔

سمعت عمّتی تحدّث عن عمّها الخ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اشعث کی پھوپھی کا نام رہم بنت الاسود بن خالد ہے۔ اور وہ اپنے چچا عبید بن خالدؓ سے روایت کرتی ہے لہٰذا "**تحدّث عن عمّها**" درست ہوگا۔ لیکن علامہ مناویؒ اور دیگر شراح نے لکھا ہے کہ اشعث کی پھوپھی کا نام رہم بنت الاسود بن حنظل بن خالد ہے۔ اور ان کے چچا سے مراد عبید بن خالدؓ ہونگے۔ لہٰذا اصح یہ ہے کہ "**تحدث عن عم ابیها**" کیونکہ عبید رہم بنت الاسود کے باپ اسود کے چچا لگتے ہیں۔

بینما أنا امشی الخ حضرت عبیدؓ کہتے ہیں کہ میں مدینہ میں جارہا تھا کہ اچانک ایک انسان

---

(۱) سنن النسائی ۲/۲۹۷ کتاب الزینة باب العمائم السود، مسند احمد ۵/۳۶۵، المستدرک للحاکم ۲/۶۰۸ (مختار)

میرے پیچھے سے آواز لگا رہا تھا کہ تہہ بند کو اونچا کردو۔ فانّہ اتقیٰ و ابقیٰ یعنی اونچا باندھنے سے ایک تو لنگوٹی زیادہ محفوظ ہو جائے گا، نجاست وغیرہ نہیں لگے گی۔ دوسرا یہ کہ یہ زیادہ دیر تک باقی رہے گا۔ جلد بوسیدہ بھی نہیں ہوگا۔ نیز ابقیٰ کے یہ معنی بھی ہوسکتی ہے کہ یہ تکبر اور غرور سے زیادہ حفاظت کرنے والا ہے۔ اور بعض روایات میں اتقیٰ کی جگہ انقیٰ کا لفظ ذکر ہے۔ یعنی صفائی سے زیادہ اقرب ہے۔ بہرحال اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ انسان کو کپڑوں وغیرہ کی بھی رعایت کرنی چاہیے۔ عبیدؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے پیچھے لوٹ کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ ہی ہیں جو مجھے پکار فرمار ہے ہیں۔ إنّما ھی بردة ملحاء ملحاء أملح کی تانیث ہے۔ اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ یہ ایک حسین اور بیش قیمت چادر ہے۔ رنگدار اور خوبصورت کپڑا ہے اور کاٹنے سے تو یہ خراب ہوگا۔ چنانچہ یونہی میں نے پہن لیا۔ تکبر کی وجہ سے یہ لمبا کپڑا میں نے نہیں لیا۔ اور ملحاء اس بکری کو بھی کہتے ہیں جس کے سفید رنگ میں سیاہ دھبے ہوں (اور اس سے مراد وہ سیاہ وسفید ادنی درجے کا کپڑا ہوگا جو کہ اعراب اور مزدور پیشہ لوگ پہنتے ہیں) اس لحاظ سے یہ پرانے اور خراب رنگ سے کنایہ ہوگا۔ لہٰذا اس کا دوسرا معنی یہ ہوگا کہ یہ تو میلا اور مبتذل کپڑا ہے۔ جس طرح کہ عموماً مزدور پیشہ لوگوں کی محنت مزدوری کا لباس گندہ اور بوسیدہ ہوتا ہے۔

تو یہ اسی قسم کی ایک چادر ہوگی۔ اور صحابیؓ کا مقصد اس قول سے یہ ہوگا۔ کہ یہ اگر لمبا بھی ہے تو اس میں تکبر کا شائبہ نہیں کیونکہ پھٹا پرانا اور میلا کچیلا کپڑا ہے۔ شراح حدیث نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے۔ اور پہلے معنی کو درست قرار نہیں دیا(۱)۔ دوسرا معنی سیاق وسباق سے بھی مطابق ہے۔ بہرحال اس صحابیؓ نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مقابلے میں کوئی عذر پیش کیا جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا اما لک فِیّ اسوة. یعنی یہ کیا منطق پڑھائی جاتی ہے۔ کیا میرا طریقہ تیرے لئے قابل اتباع نہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوة حسنة.(الایۃ)

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہتر قابل تقلید نمونہ موجود ہے۔

لہٰذا تم میری پیروی کرو اور باتیں چھوڑ دو۔ گویا نبی کریم ﷺ کا مقصد یہ ہے کہ اگر چہ یہ قیمتی نہیں

---

(۱) ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ وھو خطأ فاحش لفظا و معنی اور پھر تفصیل سے لفظی اور معنوی اعتبار سے اس رائے کو خطا ثابت کردیا ہے۔ (جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۱۳) (اصلاح الدین)

لیکن سدًا للذریعۃ اس میں بھی اسبال ناجائز ہے۔

إلی نصف ساقیه آپ ﷺ کا ازار آدھی پنڈلیوں تک لٹک رہا تھا۔اس حدیث میں بھی ازار کا پہننا ثابت ہورہا ہے۔

(۳) حدثنا سوید بن نصر ثنا عبداللّٰه بن المبارک عن موسیٰ ابن عبیدة عن إیاس بن سلمة بن الأکوع عن أبیه قال کان عثمان یأتزر إلیٰ أنصاف ساقیه وقال هکذا کانت إزرة صاحبی یعنی النّبیّ ﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت سلمۃ بن الاکوعؓ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ تہہ بند آدھی پنڈلی تک باندھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اسی طرح میرے آقا یعنی نبی کریم ﷺ کی لنگوٹی بھی تھی۔

سلمة بن الاکوعؓ: عن ابیه حضرت سلمۃ بن عمرو بن الاکوعؓ مشہور صحابی ہیں۔بہادری کی وجہ سے ممتاز ہیں۔بہترین تیرانداز تھے،اور تیز اتنے تھے کہ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کو پکڑ لیتے تھے۔نبی کریم ﷺ کے ساتھ سات غزوات میں شرکت کی۔بیعت رضوان میں بھی موجود تھے۔

هکذا کانت ازرة صاحبی حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ میرے آقا کا ازار بھی اسی طرح یعنی نصف ساق تک ہوتا تھا۔گویا میں بھی اسی وجہ سے ایسا کرتا ہوں۔اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ساتھ ان کے ایک خلیفہ حضرت عثمانؓ کی سنت بھی مذکور ہے۔

(۴) حدثنا قتیبة انا أبو الأحوص عن أبی إسحاق عن مسلم ابن نذیر عن حذیفة بن الیمان قال اخذ رسول اللّٰه ﷺ بعضلة ساقی اوساقه فقال هذا موضع الازارفان ابیت فاسفل فان ابیت فلا حق للازارفی الکعبین(۲).

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ۲۰۶/۸،۲۰۸ (مختار)

(۲) سنن النسائی ۲۹۸/۲ کتاب الزینة باب موضع الازار، ابن ماجة ۲۶۴/۱ کتاب اللباس باب موضع الازاراین هو شرح السنة للبغوی ۱۰/۱۲ باب موضع الازار کتاب اللباس(مختار)

ترجمہ: حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میری پنڈلی یا اپنی پنڈلی کے گوشت کو پکڑ کر یہ فرمایا کہ یہ حد ہے لنگوٹی باندھنے کی۔ اور اگر تم اس جگہ باندھنے پر قناعت نہ کرسکو۔ تو اس سے کچھ نیچے تک (باندھو) اور اگر اس پر بھی قناعت نہ ہو تو جان لو کہ لنگوٹی کا ٹخنوں پر کوئی حق نہیں۔

حذیفة بن الیمانؓ کا تذکرہ: عن حذیفة بن الیمانؓ ابوعبداللہ حذیفہ بن الیمان عبسی کے والد کا اصل نام حسل بن جابر یا حسیل بن جابر الیمانی تھا۔ حذیفہؓ اور ان کے والد دونوں غزوہ بدر سے کچھ قبل مسلمان ہو چکے تھے۔ ان کے والد غزوہ احد میں غلطی سے مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ حضرت حذیفہؓ کو صاحب سر رسول اللہ ﷺ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ آپؓ منافقین اور فتنوں کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ کے راز دان تھے۔ غزوہ خندق میں آپ ہی کو نبی کریم ﷺ نے معلومات کیلئے کفار کی فوج میں بھیج دیا تھا۔ آپ گئے اور آ کر خبر دی کہ مشرکین واپس ہونا چاہتے ہیں جس سے نبی کریم ﷺ بہت خوش ہوگئے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے چالیس دن بعد ۳۵ھ میں مدائن میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوگئے۔ بعض اہل سیر ۳۶ھ میں وفات کے قائل ہیں۔

عضلة ساقی او ساقه عضلة پنڈلی کے اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں گوشت زیادہ ہوتا ہے۔ راوی مسلم کو شک ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے اپنی پنڈلی کا ذکر کیا تھا یا نبی کریم ﷺ کی پنڈلی کا ذکر کیا۔ **فقال هذا موضع الازار فان ابیت فاسفل الخ.** یعنی اگر طبیعت کو نا گوار ہو تو ذرا نیچے کرلو۔ لیکن اگر اس سے بھی دل کو اچھا نہ لگے اور نیچے باندھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ کعبین میں ازار کا حق نہیں۔ اور اس سے نیچے کرنا اسبال ہوگا۔ جو نا جائز ہے۔

شلوار کا ٹخنوں سے نیچے ہونا: اس حدیث سے اسبال یعنی ازار کا ٹخنوں سے نیچے ہونا نا جائز معلوم ہوتا ہے۔ یہی حکم شلوار اور لمبی قمیص کا بھی ہے۔ اس سلسلے میں علماء کا تقریباً اس بات پر اتفاق ہے کہ مرد کے لئے لنگوٹی اور شلوار کا آدھی پنڈلی تک ہونا مستحب ہے۔ اور اس سے نیچے ٹخنوں تک ہونا بلا کراہت جائز ہے۔ بلکہ اگر کسی عذر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے ہو جائے تب بھی جائز ہے لیکن بغیر عذر کے ٹخنوں سے نیچے ہونا

مکروہ ہے۔اور اگر تکبر کی وجہ سے ہوتو حرام ہے۔دوسری احادیث میں اس پر سخت وعید بھی آئی ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ **ما اسفل من الکعبین من الإزار فی النار**(۱)۔

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اسبال اور جرِّ ثوب سے جو ممانعت آئی ہے اس میں آستینوں اور شملہ کا معتاد طریقے اور حد سے لمبا کرنا بھی آتا ہے۔لہٰذا اگر یہ تجاوز بھی تکبر کی نیت سے ہوتو حرام ورنہ مکروہ ہے۔

البتہ عورتوں کے لئے چونکہ ستر کی تاکید آئی ہے۔لہٰذا ان کے تمام کپڑوں میں مردوں کی نسبت لمبا چوڑا ہونا ہی بہتر ہے تاکہ جسم کے تمام حصوں کو خوب ڈھانپ سکے۔اور جب تک یہ اسراف کی حدود تک نہ پہنچے گا ممنوع نہیں ہوگا۔

یہاں پر یہ بات واضح رہے کہ قاضی عیاضؒ نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ اسبال یعنی کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا مردوں کے لئے ممنوع ہے عورتوں کے لئے نہیں۔ بلکہ ان کے لئے اتنا لمبا کپڑا پہننے کی گنجائش ہے کہ بالشت دو بالشت زمین پر گھسیٹتا رہے۔جیسا کہ ام سلمہؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ ان کے قدم دکھائی نہ دیں۔البتہ اگر پاؤں کو جراب،موزوں وغیرہ سے ڈھانپ لیا جائے تو پھر زمین تک کپڑا لٹکانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

پھر بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کے لئے بھی اسبال کی حرمت تکبر کی علت کی وجہ سے ہے نہ مطلقا۔جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ **لا ینظر اللّٰہ الی من جرّ ثوبہ خیلاء(رواہ البخاری عن ابن عمرؓ)** اسی طرح ابن عمرؓ کی حدیث ہے کہ جب ابوبکرؓ نے اسبال سے نہی کی بات سنی تو نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میری ازار کا ایک پہلو مجھ سے نہیں سنبھلتا بے اختیار لٹک جاتا ہے۔اس لئے بہت تکلف سے کام لیکر ہی اسے اونچا رکھ سکتا ہوں۔تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "**لست ممن یصنعہ خیلاء**" تم تکبر کرنے کی غرض سے ایسا کرنے والوں میں سے نہیں ہو۔تو گویا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اسبال پر آپ ﷺ نے اسلئے انکار نہیں فرمایا کہ وہ تکبر کی نیت سے نہیں تھا۔اسلئے "**ما اسفل من الکعبین فی النار**" اور "**لاحق للازار فی الکعبین**" جیسی احادیث کو بھی تکبراً اسبال پر محمول کیا جائے گا۔

---

(۱)بخاری ۸۶۱/۲ کتاب اللباس باب ما اسفل من الکعبین ففی النار(مختار)

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سداً للذریعة مطلقاً اسبال مکروہ ہے اور احتیاط بھی اسی میں ہے نیز تکبر کے علاوہ اسبال کی کراہت کے دوسرے اسباب بھی تو ہیں۔ مثلاً اس میں اسراف اور کپڑے کا ضیاع بھی ہے۔ باب کی پہلی حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے۔

البتہ فقہائے کرام نے عذر کے وقت اسبال کو بلا کراہت جائز قرار دیا ہے۔ مثلاً کسی شخص کے پاؤں زخمی ہیں۔ اور مکھیوں یا دیگر موذی حشرات سے بچنے کا کوئی دوسرا طریقہ اس کے پاس نہیں سوائے اس کے کہ قمیص یا ازار وغیرہ کو لٹکا کر زخم کو چھپا دے۔ تو اس صورت میں اسبال جائز ہوگا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

١٩. باب ماجاء فی مشیة رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کی رفتار کے بیان میں

مشیة "هیئة المشی" یعنی چال اور چلنے کی عادی کیفیت کو کہا جاتا ہے(۱)۔ امام ترمذیؒ اس باب میں نبی کریم ﷺ کی رفتار مبارک کی کیفیت بیان فرماتے ہیں۔ اگرچہ پہلے باب میں بھی رفتار کا ذکر ضمناً ہو چکا ہے لیکن یہاں اصالۃً بیان کرتے ہیں۔

(١) حدّثنا قتیبة بن سعید أنا ابن لهیعة عن أبی یونس عن أبی هریرة قال ما رأیت شیئاً أحسن من رسول اللّٰہ ﷺ کأنّ الشمس تجری فی وجهه و ما رأیت احداً أسرع فی مشیته من رسول اللّٰہ ﷺ کأنّما الأرض تطوی له انّالنجهد انفسنا وإنّه لغیر مکترث(۲).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں دیکھی۔ (آپ ﷺ کا چہرہ ایسا چمکدار تھا) گویا کہ آفتاب آپ ﷺ کے چہرہ میں چمک رہا ہے۔ میں نے آپ ﷺ سے زیادہ تیز رفتار شخص کوئی نہیں دیکھا۔ (آپ ﷺ کے چلتے ہوئے) ہم اپنے آپ کو تھکا دیتے تھے اور آپ ﷺ کو (معمول سے زیادہ چلنے سے) پرواہ بھی نہیں ہوتی تھی۔

ما رأیت الخ رؤیت علمی مراد ہے یعنی میرے علم میں آپ ﷺ سے زیادہ کوئی حسین نہیں ہے۔ اگرچہ رؤیت بصری کا بھی احتمال ہے۔

کانّ الشمس تجری فی وجهه۔ نبی کریم ﷺ کے حسن اور چہرے کی چمک دمک کو سورج کی روشنی اور حسن سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی گویا کہ آفتاب کا نور آپ ﷺ کے چہرۂ انور میں چمکتا جا رہا ہے۔

---

(۱) المشیة ما یعتاده الشخص من المشی ذکره الجابردی ۱۲ جمع الوسائل ج۱ ص۲۱٦ (اصلاح الدین)

(۲) جامع الترمذی ۲/٢٠٦ کتاب المناقب باب فی صفة النبی ﷺ، مسند احمد ۵/۳۵ (مختار)

أسرع من رسول اللّٰہ فی مشیته یہ لفظ مشیتہٖ ہے جس طرح کہ باب میں ذکر ہے۔یعنی آپ ﷺ سے چال میں کوئی تیز تر نہیں تھا۔یا پھر تاء کے بغیر مشی مصدر ہے۔اور مضاف مقدر ہے یعنی فی کیفیة مشیبه ﷺ. اس قطعہ میں ترجمۃ الباب کے ساتھ مناسبت موجود ہے کیونکہ اس میں تیز رفتاری کا ذکر ہے۔

معجزہ طیّ الارض: کانها الارض تطوی له طی الارض معجزہ اور کرامت کے طور پر بھی ہوتا ہے۔اس طرح کہ بہت طویل سفر آسان اور مختصر بن جائے۔پشتو کے شاعر صوفی عبدالرحمانؒ کہتے ہیں کہ ؎

چی پہ یو قدم تر عرشہ پورے رسی مالیدلے دے رفتار د درویشانو

ترجمہ: میں نے ان درویشوں کی رفتار دیکھی ہے جو ایک قدم اٹھا کر عرش تک پہنچ جاتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ رات کے ایک مختصر حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصٰی تک گئے اور وہاں سے آسمانوں اور جنت وجہنم کا مشاہدہ کر کے واپس آئے۔دروازے کا کواڑ ابھی ویسے ہی ہل رہا تھا۔یہ طی الارض کا معجزہ تھا۔اسی طرح اولیائے کرام کے لئے کبھی لمبا سفر چھوٹا ہو جاتا ہے۔

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کی کرامت: کہتے ہیں کہ سیدالطائفہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ مکہ مکرمہ سے پیدل چلے اور عصر کی نماز کیلئے مدینہ پہنچ گئے۔حالانکہ پیدل جاتے ہوئے یہ پندرہ، سولہ دن کا سفر ہے۔بہرحال یہ ایک اکرام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک بندوں کا ہوتا ہے۔ایک روایت میں نبی کریم ﷺ سے ایک دعا مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللّٰھم از ولنا الارض و ھوّن علینا السفر(۱)

ترجمہ: اے ہمارے رب ہمارے لئے زمین کی دوری سمیٹ لے اور ہم پر سفر آسان فرما دے۔

اس حدیث میں بھی اس بات کے امکان کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ویسے بھی خرق عادت امور کا بزرگوں سے صادر ہونا کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔میں جن دنوں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ہاں رہتا تھا جن کو حضرت شیخ الحدیثؒ سے انتہائی محبت تھی۔اور اسی وجہ سے انہوں نے اس کمرے میں میری رہائش رکھی۔جو کہ آپ کے کمرے کے اندر کی طرف کھلتا تھا۔رمضان شریف کا مہینہ تھا۔وہاں ایک بزرگ حافظ

(۱)جامع ترمذی ۶۵۶/۲ کتاب الدعوات باب ما یقول اذا خرج مسافراً(مختار)

صاحب تشریف لائے انہوں نے کسی بزرگ کا قصہ سنایا اور کہا کہ ایک بار وہ وعظ فرما رہے تھے چھوٹی سی مسجد تھی۔ سامنے ہال اور اس کے بعد برآمدے کی دیوار تھی۔ انہوں نے معراج نبوی ﷺ کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے آسمانوں میں خرق والتیام کے امکان کا مسئلہ چھیڑا اور مناطقہ کے اس قول پر رد کیا کہ آسمانوں میں ٹوٹ پھوٹ ممنوع ہے۔ مسجد کے اندر کچھ فلسفی ذہن کے لوگ بھی بیٹھے تھے۔ جن کو شاید یہ بات مستبعد معلوم ہوئی۔ چنانچہ وہ دلوں میں آپ کی بات کو خلاف حقیقت سمجھنے لگے۔ ولی اللہ نے اپنی فراستِ ایمانی سے محسوس کیا کہ کچھ زائغین بیٹھے ہیں جو اس بات کو نہیں مانتے، چنانچہ وہ جلال میں آئے۔ منبر سے کودے اور کہا ''یوں گئے'' ساتھ ہی دیواروں کو چیرتے ہوئے باہر چلے گئے۔ پھر کہا کہ ''یوں آئے'' اور انہی دیواروں کو چیرتے ہوئے واپس اندر آئے اس طرح سات بار باہر جا کر واپس آئے۔ ہر بار دیوار پھٹ کر اس کو راستہ دیتی اور وہ گزر جاتے اس طرح طی الارض بھی معجزہ اور کرامت کے سامنے کوئی انہونی بات نہیں۔ لیکن یہاں پر طی الارض مراد نہیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ عام طور پر نبی کریم ﷺ کی فطری رفتار اور چال اتنی چست تھی کہ بڑا فاصلہ تھوڑے سے وقت میں طے کر لیتے تھے۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا گویا زمین ان کیلئے سمٹتی جا رہی ہے۔

إنّـا لـنـجهد انفسنـا ۔نجھد جھد سے ثلاثی مجرد کے مضارع کا صیغہ ہے۔ یا پھر مضموم النون یعنی افعال سے مضارع معلوم کا صیغہ ہے۔ اور معنی یہ ہوگا کہ ہم خود کو تھکا دیتے تھے اور بتکلف تیز چلتے ہوئے خود کو مشقت میں مبتلا کر دیتے تھے لیکن آپ ﷺ کو ایسا چلنے کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ یعنی آپ ﷺ کو تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس وجہ سے وقار میں فرق آتا تھا۔ بلکہ اطمینان کے ساتھ چلتے تھے۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ کی صفات میں ''ذریـع المشية''(۱) کا لفظ آیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ جاتے ہوئے آپ ﷺ لمبے لمبے ڈگ بھرتے تھے۔ لیکن وہ بھی کمال قوت کی وجہ سے ہوتا تھا۔ نہ کہ عجلت اور مشقت کی صورت میں۔

(۲) حدّثنا عليّ بن حجرو غيرواحد قالو ا ثنا عيسىٰ بن يونس عن عـمـر بـن عبـدالله مولىٰ غفرة حدّثني إبراهيم بن محمّد من ولد علي

(۱) شمائل باب نمبر ا حدیث نمبر ۷

ابن أبی طالبؓ قال کان علیٌّ اذا وصف النّبیّ ﷺ قال اذا مشیٰ تقلع کأنّما ینحط فی صبب.(۱)

ترجمہ: ابراہیم بن محمدؒ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ جب نبی کریم ﷺ کا ذکر کرتے، تو یوں کہتے کہ نبی کریم ﷺ جب چلتے تو پاؤں کو قوت کے ساتھ اٹھا کر چلتے تھے۔ گویا پستی کی طرف اتر رہے ہوں۔

اس حدیث کی تشریح اس سے پہلے باب خلق النبی ﷺ میں تفصیل سے گزر چکی ہے۔ اس کے مذکورہ حصے میں آپ ﷺ کی رفتار کا ذکر ہے۔ اور اسی مناسبت سے اس حصے کو اس مقام پر دوبارہ لے آئے۔

(۳) حدثنا سفیان بن وکیع قال أنا أبی عن المسعودیّ عن عثمان بن مسلم بن هرمز عن نافع بن جبیربن مطعم عن علیّ بن أبی طالبؓ قال کان رسول اللّٰہ ﷺ اذا مشی تکفا تکفّوا کأنّما ینحطُّ من صبب(۲).

ترجمہ: حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ چلتے تھے تو آگے کی طرف جھک کر قوت کے ساتھ چلتے تھے۔ جیسے کسی اونچی جگہ سے اترائی کی طرف جا رہے ہوں۔

اذامشیٰ تکفا الخ یہ حدیث بھی گزشتہ حدیث کی طرح ہے۔ یہاں حدیث کے مختصر حصے کا ذکر ہے جو کہ پہلے باب میں مکمل تشریح کے ساتھ گزر چکی ہے۔

---

(۱)جامع ترمذی ۶۸۲/۲ ابواب المناقب باب ماجاء فی صفة النّبیّ ﷺ، مسنداحمد۳۵/۵، شرح السنة۲۲۱/۱۳ باب صفة النّبیّ ﷺ کتاب الفضائل . (مختار)

(۲)جامع ترمذی ۶۸۲/۲ ابواب المناقب باب ماجاء فی صفة النّبیّ ﷺ، شرح السنة۲۲۱/۱۳ باب صفة النّبیّ ﷺ کتاب الفضائل، مسنداحمد۳۵/۵ (مختار)

۲۰. باب ما جاء فی تقنع رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے قناع کے بارے میں

قناع کیا ہے؟ قناع کے استعمال کرنے کو تقنع کہتے ہیں۔اور قناع وہ کپڑا یا رومال ہوتا ہے جو سر یا چہرہ چھپانے کے لئے استعمال ہوتا ہے(۱)۔عورت کے اس کپڑے کو بھی قناع کہتے ہیں جو سر یا چہرہ ڈھانپنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔لیکن یہاں وہ کپڑا مراد ہے جو کہ سر پر لگے ہوئے تیل سے کپڑوں کی حفاظت کرنے کے لئے نیز سر کو گرمی یا سردی سے بچانے کے لئے سر پر ڈالتے ہیں۔عرب ممالک میں آج کل بھی سر پر رومال قسم کا کپڑا ڈالنے کا رواج ہے۔اور ان علاقوں میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔کیونکہ وہ ریگستانی علاقہ ہے۔گرم ہوا ریت اڑاتی رہتی ہے۔پھر دھوپ کی وجہ سے بدن پر پسینہ بھی ہوتا ہے۔اس لئے سر اور چہرے کی حفاظت کے لئے رومال سے ڈھانپا جاتا ہے۔اور آج کل تو یہ عربوں کا گویا قومی شعار بن گیا ہے۔وہ ائیر کنڈیشنڈ محلات میں رہتے ہوئے بھی یہ رومال استعمال کرتے ہیں۔اور ان کو یہ بہت زیب بھی دیتا ہے۔لیکن اس کی تاریخ دراصل بہت قدیم ہے اس باب میں صرف ایک حدیث ہے(۲)۔

(۱) حدثنا یوسف بن عیسیٰ أنا وکیع أنا الربیع بن صبیح عن یزید بن أبان عن أنس بن مالک قال کان رسول اللّٰہ ﷺ یکثر القناع کان ثوبه ثوب زیّات.(۳)

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ اپنے سر مبارک پر کپڑا اکثر رکھا کرتے تھے۔گویا کہ ان کا یہ کپڑا چکناہٹ میں تیلی کا کپڑا معلوم ہوتا تھا۔

(۱) ملاعلی قاریؒ تقنع کا معنی لکھتے ہیں هو تغطية الرأس بطرف العمامة اوبرداء اعم من ان يكون فوق العمامة اوتحتها (جمع الوسائل ۲۱۸/۱)(مختار)

(۲) یہ روایت باب الترجل میں بھی گزری ہے یہاں اس کو مستقل باب کے تحت ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا تقنع کا خاص اہتمام فرماتے ہیں۔(مختار)

(۳) شرح السنة ۸۲/۱۲ باب ترجيل الشعر ونرهية كتاب اللباس(مختار)

کان ثوبہ ثوب زیّات خود نبی کریم ﷺ کا نہیں بلکہ قناع کا کپڑا مراد ہے۔ کیونکہ خود آپ ﷺ کہ آپ ﷺ تیل بکثرت استعمال کیا کرتے تھے۔ اور اسی وجہ سے آپ ﷺ کو قناع کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ یعنی عمامہ کے نیچے ایک فاضل کپڑا باندھا کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ کے قناع کے کپڑے پر تیل اتنا زیادہ لگا ہوتا تھا کہ وہ کسی تیلی کا کپڑا معلوم ہوتا تھا۔

خصوصی لباس کا فائدہ: یہ حدیث اس سے قبل باب الترجل میں گزر چکی ہے۔ البتہ قناع پہننے کے فوائد کا کچھ تذکرہ یہاں مناسب ہوگا۔ علامہ بیجوریؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ علماء وخواص کے لئے صالحین اور مخصوص طرز کا لباس پہننا چاہیے۔ تاکہ وہ پہچانے جاسکیں۔ اور لوگ ان سے ضرورت کے وقت مسائل پوچھیں۔ ان کی بات مانیں اور عوام کی طرح انہیں نظر انداز نہ کریں۔ قناع بھی چونکہ خواص اور صالحین کا لباس ہے۔ اس وجہ سے اس کا پھننا بہتر ہوگا۔ علاوہ ازیں سر چھپانا بے یار و مددگار ہونے کی علامت ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کا لباس ہے۔ اس لئے یہ ترکِ معاصی اور خدا سے حیا کی یاددہانی کراتا ہے۔ جس طرح کہ پرانے زمانے میں طیلسان کے بارے میں اہل تصوف کا قول تھا کہ **الطیلسان الخلوۃ الصغریٰ** یعنی طیلسان اہل اللہ کا لباس ہونے کی بنا پر خدا خوفی، یادالٰہی اور مناجات رب کا مورث ہے۔ جس طرح کہ خلوت کا انتظام ان مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ

التقنع من اخلاق الانبیاء. قناع کا استعمال انبیاء کرام کے اخلاق کا جزو ہے۔

۲۱. باب ماجاء فی جلسة رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے نشست کے بارے میں

جلسہ جیم کے کسرہ کے ساتھ بیٹھنے کی ہیئت اور انداز کو کہتے ہیں۔قیام سے بیٹھنے کیلئے عموماً قعود کا لفظ مستعمل ہوتا ہے اور لیٹنے یا تکیہ کے بعد اٹھ بیٹھنے کے لئے عموماً جلوس کا لفظ بولا جاتا ہے۔لیکن یہاں اس فرق کے بغیر صرف اس ہیئت کا ذکر مقصود ہے جس پر نبی کریم ﷺ بیٹھتے ہوئے متصف ہوتے تھے۔

(۱) حدثنا عبداللّٰہ بن حمید أنبانا عفان بن مسلم أنا عبداللّٰہ ابن حسان عن جدتیه عن قیلة بن مخرمة أنّها رات رسول اللّٰہ ﷺ فی المسجد و هو قاعد القرفصاء قالت فلمّا رأیت رسول اللّٰہ ﷺ المتخشع(۱) فی الجلسة ارعدت من الفرق(۲).

ترجمہ: قیلہ بنت مخرمہ ؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ مسجد میں گوٹ مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔میں نے جب ان کو اس عاجزانہ ہیئت میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو میں وحشت کے مارے لرز اٹھی (۳)۔

---

(۱)علامہ مناویؒ نے لکھا ہے کہ المتخشع باب تفعل سے اور تفعل کا باب تکلف کیلئے نہیں بلکہ زیادہ مبالغہ کے لئے آتا ہے(المناوی علی جمع الوسائل ۲۲۰/۱) جیسا کہ تو حد،تکبر تو گویا آنحضرت ﷺ عاجزانہ حالت میں تشریف فرماتے اور ایسا بیٹھنا آپ ﷺ کو پسند تھا۔اور آپ ﷺ متکبرین اور جبابرہ کی طرح بیٹھنے کو نا پسند فرمایا کرتے تھے اجلس کما **یجلس العبد واکل کما یأکل العبد لاعلی هیئة جلوس الجبارین المتکبرین من التربع والتمدد والاتکاء ورفع الرأس وشماخة الانف وعدم الالتفات الی المساکین والاحتجاب عن المحتاجین(جمع الوسائل ۲۲۰/۱)(مختار)**

(۲)الادب المفرد للامام البخاری ص رقم حدیث۱۱۷۸،شرح السنة للبغوی ۳۲۳/۱۲) (مختار)

(۳)ایک دوسری روایت میں ہے کہ میرے اس خوف کو دیکھ کر کسی نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا یہ مسکینہ تو خوفزدہ ہو چکی ہے آپ ؓ(قیلہ ؓ) فرماتی ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کی پشت کی طرف تھی آپ ﷺ میری طرف متوجہ بھی نہ ہوئے اور صرف زبان مبارک سے ارشاد فرمایا یامسکینة علیک السکینة کہ اے سکینہ سکون اختیار کر،چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا تھا کہ اذهب اللّٰہ ماکان دخل قلبی من الرعب مجھ سے وہ ڈر اور خوف ختم ہوا۔(جمع الوسائل ۲۲۰/۱)(مختار)

عن جدتيه. کتاب اللباس میں حدیث نمبر۱۲ میں یہ حدیث کچھ تفصیل سے گزر گئی ہے۔اور وہاں عبداللہ بن حسانؓ کی دادی اور نانی کے بارے میں تفصیل بھی گزر گئی ہے۔ان میں سے ایک کا نام صفیۃ اور دوسری کا نام دحیبۃ ہے جو علیبہ کی بیٹیاں ہیں۔

قرفصاء کی تفسیر: قرفصاء الف مقصورہ وممدودہ دونوں کے ساتھ ایک ہی معنی میں مستعمل ہے لیکن اس کے معنی میں دو قول ہیں۔(۱) آدمی اپنی سرین زمین سے لگا کر اس طرح بیٹھے کہ اس کے ران پیٹ سے لگے ہوں اور ہاتھ دونوں پاؤں کے گرد بندھے ہوئے ہوں اسے احتباء بھی کہتے ہیں۔اور اردو میں گوٹ مارنا(۱)۔(۲) دوزانوں ہوکر بغلوں میں ہاتھ ٹھونس لے اور پھر جھک کر پیٹ کو رانوں سے لگا دے(۲)۔

(۲) حدّثنا سعيد بن عبدالرحمان المخزومی وغير واحد قالوا أنا سفيان عن الزهریّ عن عباد بن تميم عن عمّه أنّه رای النّبیّ ﷺ مستلقيا فی المسجد واضعا احدی رجليه علی الاخری(۳).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو مسجد میں چھت پر لیٹے ہوئے دیکھا اس حال میں کہ آپ ﷺ نے اپنا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھا تھا۔

عبداللّٰه بن زیدؓ: حضرت ابو محمد عبداللہ بن زید بن عاصم المازنی حضرت تمیم داریؓ کا علاتی یا اخیافی بھائی ہے۔مشہور صحابی ہیں۔کہتے ہیں کہ مسیلمہ کذاب کے اصل قاتل عبداللہ بن زیدؓ ہی تھے۔جنہوں نے وحشیؓ کی مدد سے اسے جہنم رسید کیا۔<u>۶۳ھ</u> کو واقعہ حرہ میں شہید ہوئے۔

---

(۱) اس طرح بیٹھنا اس وقت ہوتا ہے جب انسان کسی گہری سوچ میں ہو اور آنحضرت ﷺ کا اس طرح بیٹھنا اور گہری سوچ امت کیلئے کی تھی (مختار)

(۲) تیسرا معنی یہ بھی لکھا گیا ہے کہ کسی چیز کا سہارا لیکر سرین پر بیٹھا جائے اور رانوں کو پیٹ سے لگا کر بغلوں میں ہاتھ ٹھونس لئے جائے۔(اتحافات ۱۶۹)(مختار)

(۳) صحيح بخاری ۱/۶۸ كتاب الصلوٰة باب الاستلقاء فی المسجد ومدالرجل، صحيح مسلم ۲/۲۰۳ كتاب اللباس والزينة باب فی اباحة الاستلقاء الخ، سنن ابی داؤد ۲/۳۱۲ كتاب الادب باب فی الرجل يضع احدی رجليه علی الاخریٰ (مختار)

دواشکال اوران کا جواب: رأیت رسول اللّٰہ مستلقیا. استلقاء پیٹھ لگا کر لیٹنے کو کہتے ہیں۔ یہاں پر دواشکال ہیں۔ پہلا یہ کہ نبی کریم ﷺ نے اس طرح لیٹنے سے منع فرمایا ہے کہ ایک پاؤں اٹھا کر دوسرے پر رکھا جائے۔ مسلم شریف کی حدیث ہیں۔ لایستلقین احد کم ثم یضع احدیٰ رجلیه علی الاخویٰ. تو پھر نبی کریمؐ نے خود یہ عمل کیوں کیا۔ اس اعتراض کے شراح نے متعدد جواب دیتے ہیں۔ مثلاً

اول یہ کہ آپ ﷺ کا یہ عمل نہی سے قبل تھا نہی بعد میں وارد ہوئی۔ لہٰذا یہ حدیث منسوخ ہے۔

دوم یہ کہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت تھی جبکہ دوسروں کیلئے ایسا کرنا منع ہے کیونکہ یہ عمل بے احتیاطی بے ادبی اور غفلت پر دلالت کرتا ہے جو کہ دراصل تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے اور نبی کریم ﷺ میں تکبر مفقود تھا۔

لیکن ان توجیہات کو جو کہ کسی نہ کسی طرح ترجیح پر مبنی ہیں۔ دیگر شراح نے ناپسند فرمایا ہے اور اکثر شراح نے دونوں حدیثوں کو جمع کرنے کی مختلف توجیہات کی ہیں جو یہ ہیں۔

اول نبی کریم ﷺ نے جس استلقاء سے منع کیا ہے وہ ہے کہ جس میں کشف عورت کا خطرہ ہو۔ مثلاً ایک پاؤں کھڑا ہوا اور دوسرا اس کے اوپر اٹھا کر رکھ دیا جائے۔

چونکہ عرب میں عام رواج لنگوٹی باندھنے کا تھا اور اس طرح کے عمل سے کشف عورت کا احتمال زیادہ تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ اب اگر کشف عورت کا احتمال نہ ہو مثلاً لنگوٹی کے جگہ شلوار پہنی ہوئی ہو یا پھر ایک پاؤں بھی پھیلا کر زمین پر پڑا ہوا اور دوسرا اس کے اوپر لمبا پڑا ہو۔ تو لنگوٹی ہوتے ہوئے بھی کشف عورت نہیں ہوگا۔ اس سے نہی نہیں ہوگا اور نبی کریم ﷺ کا عمل بھی اس دوسرے قسم پر محمول ہوگا۔

دوم یہ کہ نہی اپنے ظاہر پر محمول ہے لیکن بلاضرورت لیٹے ہوئے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر رکھنا ممنوع ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایسا کرنا منع نہیں ہوگا۔ مثلاً اگر آدمی تھکا ہوا ہو اور تھکاوٹ دور کرنے کیلئے تھوڑی دیر کیلئے ایسا کرے تو یہ جائز ہوگا۔

سوم یہ کہ نہی اپنے ظاہر پر محمول ہو اور نبی کریم ﷺ کا عمل بیان جواز کیلئے ہو گویا آپ ﷺ نے تنزیھاً نہی کر کے اس بات پر تو تنبیہ کر دی کہ یہ عمل اچھا نہیں۔ اس میں سوء ادب کا احتمال ہے۔ نیز باوقار لوگوں کو

اس سے بچنا چاہیے۔لیکن چونکہ یہ عمل حرام تو تھا نہیں اسلئے بیان جواز کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے عملاً اس کی جواز کی طرف اشارہ کر دیا۔لیکن علامہ بیجوریؒ کہتے ہیں کہ بایں ہمہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے یہ عمل عمومی مجلس کے دوران نہیں کیا تھا بلکہ مسجد میں اس وقت ایسے لوگ نہیں ہونگے۔جس سے نبی کریمؐ تکلف کرتے ہوں کیونکہ عام لوگوں کے درمیان آپ ﷺ کی نشست وبرخاست احتیاط سے ہوتی تھی۔

ملا علی قاریؒ نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ شاید اعتکاف کے دوران مسجد میں اقامت کئے ہوئے آپ اس ہیت سے لیٹے ہوں گے۔

(۲) دوسرا اشکال اس پر یہ ہے کہ یہ حدیث ترجمۃ الباب سے مطابقت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس میں تو جلسہ کا ذکر نہیں بلکہ آپ ﷺ کے لیٹنے کا بیان ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ترجمۃ الباب کے ساتھ مناسبت ہے۔

<u>مسجد میں سونے کا حکم</u>: کیوں کہ اس حدیث سے مسجد میں لیٹنے کا جواز معلوم ہورہا ہے(۱)۔جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ مسجد میں ہر طرح کے بیٹھنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور خود مسجد میں بیٹھے بھی ہونگے۔

بعض شراّح کہتے ہیں۔کہ یہاں پر ترجمۃ الباب میں تعمیم ہے اور صرف بیٹھنے کا بیان مقصود نہیں۔ بلکہ قیام کے علاوہ ھیت وکیفیت کا بیان مقصود ہے اس طرح ترجمۃ الباب لیٹ جانے کی کیفیت کو بھی شامل ہوگا۔لہذا اشکال باقی نہیں رہا۔

(۳) حدّثنا سلمة بن شيب أنبانا عبدالله بن إبراهيم المدنيّ أنا إسحاق بن محمّد الأنصار عن ربيع بن عبدالرحمان بن ابى سعيد عن

---

(۱) یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ فقہاء اور محدثین نے تو مسجد میں سونے کو مکروہ کہا ہے کما فی ردالمختار مگر یہاں تو جواز بلاکراہت معلوم ہوتا ہے۔الجواب: مگر اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے آنحضرت ﷺ نے ایسا اعتکاف کے دوران کیا ہو اور اعتکاف کی نیت سے مسجد میں لیٹنا وغیرہ جائز ہو(۲) یا یہ جواب دینا ممکن ہے کہ کراہت مسجد کو آرام گاہ بنانے میں ہے اگر کوئی عبادت کرتے کرتے تھک جائے تو کمر سیدھی کرنے اور کچھ ستانے کیلئے لیٹ جائے تو کوئی کراہت نہیں اور اسی کے جواز پر مؤطا امام مالک میں حضرت عثمانؓ کا اثر موجود ہے۔(مختار)

أبیـه عن جده أبی سعید الخدری قال کان رسول اللّٰہ ﷺ اذا اجلس فی المسجداحتبی بیدیه (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ جب مسجد میں تشریف رکھتے تو گوٹ مار کر تشریف رکھتے تھے۔

احتباء کسے کہتے ہیں: **احتبیٰ بیدیه:** احتباء گوٹ مارنے کو کہتے ہیں جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آدمی سرین پر بیٹھ جائے دونوں گھٹنے آگے کی طرف اٹھائے۔ اور اپنے ہاتھ پنڈلیوں کے گرد حلقہ بناتے ہوئے پکڑے اس طرح آدمی کو بیٹھنے میں آرام ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کسی چیز کو ٹیک لگا کر بیٹھا ہو لیکن ہاتھوں کی بجائے کبھی کبھی کپڑا کمر اور پنڈلیوں کے گرد باندھ کر مزید آرام حاصل کیا جاتا ہے۔ عموماً عربوں اور خصوصاً دیہاتی خانہ بدوشوں کو اس وضع میں بیٹھنے کی عادت ہوتی تھی (۲)۔ کیونکہ ان کی زندگی میں دیواریں تکیے اور دیگر ایسی چیزوں کا وجود نہ تھا جس کو وہ ٹیک لگا کر ستا ئیں۔

لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ نہ تو ہمیشہ احتباء مستحسن ہے (۳) نہ آپ ﷺ ہمیشہ مسجد میں اس وضع سے بیٹھتے تھے بلکہ کبھی کبھی آپ ﷺ تشہد اور کبھی آلتی پالتی مار کر بھی بیٹھتے ہیں۔ مثلاً ابو داؤدؒ نے حضرت جابر بن

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی جلوس الرجل، السنن الکبری للبیهقی ۳/۲۳۶ شرح السنة للبغوی ۱۲/۳۲۳، ملاعلی قاریؒ نے اس روایت کو ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے **قال کان رسول اللّٰہ ﷺ اذاجلس فی المسجد وفی بعض النسخ فی المجلس احتبی بیدیه زادالبزار ونصب رکبتیه واخرج البزار ایضاً من حدیث أبی هریرۃؓ بلفظ جلس عندالکعبة فضمّ رجلیه واقامهاواحتبیٰ بیدیه وفی بعض النسخ صلوات اللّٰہ علیه وفی بعضها صلوات اللّٰہ وسلامه علیه(جمع الوسائل ۱/۲۲۲)(مختار)**

(۲) کہاجاتا ہے کہ **الاحتباء حیطان العرب** (یعنی گوٹ مارنا عربوں کے لئے دیواروں کے قائم مقام ہے) (مختار)

(۳) ایسے بیٹھنا اولیٰ ہے اس لئے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے لکھا ہے کہ اس طرح بیٹھنا تواضع اور مسکنت کی نشست ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ اس کی اتباع میں اس طرح بیٹھتے تھے اور حضرات صحابہ کرامؓ بھی آنحضرت ﷺ کی اتباع میں ایسا کرتے تھے مگر یہ عمل ہمیشہ نہیں کیا جاتا۔ (مختار)

سمرہؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ **أنّ النبیّ ﷺ کان إذا صلیّ الفجر تربع فی مجلسه حتی تطلع الشمس حسناء**(۱).

اس طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ **نهی النبی ﷺ عن الاحتباء یوم الجمعة والامام یخطب** یعنی امام کا خطبہ دیتے وقت سامعین کو نبی کریم ﷺ نے احتباء سے منع فرمایا ہے اور یہ اس لئے کہ اس طرح نیند جلدی آتی ہے اور خطبہ سننا فوت ہو جاتا ہے بلکہ وضوء ٹوٹنے کی وجہ سے نماز جمعہ فوت ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔

---

(۱) یہی وجہ ہے کہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **فقیل هذا الحدیث مخصص وقال میرک محمول علی اختلاف الاحوال فتارة تربع وتارة احتبیٰ وتارة استلقی وثارة ثنیٰ رجلیه توسعة للامة المرحومة** (جمع الوسائل ۱/۲۲۲) اسی طرح آنحضرت ﷺ نے بیٹھنے کیلئے کوئی خاص اور ممتاز جگہ کا انتخاب نہیں کیا۔ (مختار)

۲۲. باب ما جاء فی تکأة رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے تکیہ کے بیان میں

تکأۃ کا معنی: تکأۃ اصل میں وکاۃ تھا تراث کی طرح اس کے واو کو تاء سے بدل کر تکاۃ بنایا گیا ہے اور یہ ما یتکأ بہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔یعنی وہ چیز جو ٹیک لگانے کے لئے تیار ہو چکی ہو۔اس لئے اگر انسان پر ٹیک لگایا جائے تو اسے تکاۃ نہیں کہیں گے۔اس باب میں صرف انہی اشیاء کا ذکر ہوگا جو کہ اسی مقصد کیلئے بنائی گئی تھیں۔اور نبی کریم ﷺ نے ان پر ٹیک بھی لگایا تھا۔

البتہ اگلے باب میں صرف انسان پر ٹیک لگانے کا ذکر ہے۔اور اس کو علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ آگے آرہی ہے۔

(۱) حدّثنا عباس بن محمّد الدوریّ البغدادیّ أنا إسحاق ابن منصور عن إسرائیل عن سماک بن حرب عن جابر بن سمرة قال رأیت رسول اللّٰہ ﷺ متکئا علی وسادة علی یسارہ(۱).

ترجمہ: جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ بائیں طرف کو رکھے ہوئے ایک وسادہ پر ٹیک لگا کر تشریف فرما ہیں۔

وسادة اسے اِسادہ بھی کہا جاتا ہے اس بڑے سے تکیہ کو کہتے ہیں جو ٹیک کے لئے بنایا جاتا ہے۔کبھی کبھی سرہانے کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ **علی یسارہ الخ** دائیں جانب کو ٹیک لگانا بہتر ہے۔اس حدیث میں بائیں جانب کا ذکر محض اتفاقی ہے۔بلکہ آئندہ امام ترمذیؒ یہ بات لا رہے ہیں کہ

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۲۱۸ کتاب اللباس باب الفرش، جامع ترمذی ۲/۱۰۵ کتاب الادب باب ماجاء فی الاتکاء سنن دارمی ۲/۱۷۶ (مختار)

(۲)اسلئے حافظ ابن قیمؒ نے لکھا ہے وکان ﷺ یتکئ علی الوسادة و ربّما اتکاء علی یسارہ وربّما اتکأ علی یمینہ وکان اذا احتاج فی خروجہ توکأ علی بعض أصحابہ من الضعف(زادالمعاد ۱/۶۰)(مختار)

علی یسارہ کا ذکر عمومی طور پر روایات میں نہیں ہے۔

(۲) حدّثنا حمید بن مسعدة أنا بشر بن المفضّل انا الجریریّ عن عبدالرحمان بن ابی بکرة عن أبیه قال قال رسول اللّٰہ ﷺ ألا احدثکم بأکبر الکبائر قالوا بلیٰ یا رسول اللّٰہ ﷺ قال الاشراک باللّٰہ وعقوق الوالدین قال و جلس رسول اللّٰہ ﷺ و کان متکئا قال و شهادة الزورا و قال الزور قال فما زال رسول اللّٰہ ﷺ یقولها حتّیٰ قلنا لیته سکت(۱).

ترجمہ: حضرت ابو بکرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم لوگوں کو کبیرہ گناہوں میں بڑے بڑے گناہ نہ بتاؤں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ بتا دیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ (بڑے گناہ) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔ اس وقت آپ ﷺ ٹیک لگائے ہوئے تشریف فرما تھے۔ اہتماماً بیٹھ کر فرمایا۔ اور جھوٹی گواہی دینا یا جھوٹی بات کرنا۔ بار بار اس کو اتنا دہرایا کہ ہم لوگوں نے (جذبۂ ترحم سے دلوں میں) یہ کہا کہ کاش اب حضور ﷺ خاموش ہو جائیں۔

ابوبکرہؓ: عن أبیه، عبدالرحمٰن کے والد کا نام حضرت ابوبکرہ نفیع بن الحارث مشہور صحابی ہیں۔ آپ کو ابوبکرہ کی کنیت جنگ طائف کے دوران نبی کریم ﷺ کی طرف سے ملی تھی۔ جب طائف کے لوگ محاصرہ میں تھے۔ تو اس وقت مسلمانوں نے قلعہ والوں کو آواز دی کہ من نزل من الحصار فهو حرٌ جو کوئی قلعہ سے نیچے آئے تو وہ آزاد ہے۔ اس وقت آپؓ سیڑھی لگا کر ایک بڑی بالٹی میں بیٹھ کر قلعہ کی دیوار سے نیچے آئے۔ چونکہ عربی میں بڑی بالٹی کو بکرۃ کہتے ہیں۔ ایک قول میں بکرۃ سیڑھی کو کہتے ہیں۔ ابوبکرۃ بھی اسے دیکھ کر

(۱) صحیح بخاری ۲/۸۸۴ کتاب الادب باب فی عقوق الوالدین، جامع ترمذی ۲/۱۲ کتاب البر و الصلة باب ماجاء فی عقوق والدین.(مختار)

تئیس (۲۳) ساتھیوں کے ساتھ طائف کے قلعہ سے سیڑھی چڑھ کر دیوار کو عبور کر کے اترے تھے۔ اس لئے ابوبکرۃ کہلائے وفات ۵۱ ھ میں بصرہ میں ہوئی نام نفیع بن الحارث اور والدہ کا نام سمیہ تھا جس کا بیٹا زیاد ابن ابی سفیان تھا۔

اس لیے نبی کریم ﷺ نے آپ کو ابوبکرۃ کہا۔ پھر اس کنیت سے آپ مشہور ہوئے بلکہ اگر کوئی آپ سے نسب کے بارے میں پوچھتے تو فرماتے **انا مولیٰ رسول اللّٰہ ﷺ** میں نبی کریم ﷺ کا آزاد شدہ غلام ہوں۔

کبیرہ کیا ہے؟ **الا احدثکم باکبر الکبائر**. کبائر کبیرہ کی جمع ہے جو صغیرہ کی ضد ہے۔ چھوٹے گناہ کو صغیرہ اور بڑے گناہ کو کبیرہ کہا جاتا ہے۔ لیکن کبیرہ کی تعریف میں اختلاف ہے کہ کونسا گناہ کبیرہ بنتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہر وہ گناہ جس پر شریعت میں وعید غضب یا لعنت قسم کے الفاظ سے مواخذہ ہونے کا ذکر ہے۔ وہ کبیرہ ہے بعض نے کہا ہے کہ جس کے بارے میں دنیوی حد شرعی نازل ہو یا اخروی عذاب و دھمکی دی گئی ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ ہر وہ جرم جو دین کے بارے میں لاپرواہی برتنے پر ہو کبیرہ ہے۔ کوئی کہتا ہے جس کو قرآن وحدیث نے گناہ کہا ہو۔ بعض نے گن گن کر لکھے ہیں کہ یہ یہ کبائر اور دیگر گناہ صغائر ہیں۔ پھر تعداد میں اور تعین میں بھی اختلاف واقع ہوا ہے۔ حتیٰ کہ علامہ ذھبیؒ نے ایک مستقل کتاب اس کے بارے میں لکھی ہے۔ جس میں چارسو کبائر کا ذکر ہے۔ بعض شراح نے ان میں سے بعض کا ذکر کیا ہے (۱)۔ بہرحال

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **وقد عدّد الفقهاء منها جملاً مستكثرة كقتل نفس، وزنا ولواطة وشرب خمر وسرقة وقذف وشهادة زور وكتم شهادة ويمين غموس وغصب مايقطع بسرقته وفرار من الكفار بلا عذر وربا واخذ مال يتيم ورشوة وعقوق اصل وقطع رحم وكذب على النبي ﷺ عمداً وافطار رمضان عدواً وبخس كيل اووزن او ذرع وتقديم مكتوبة على وقتها وتاخيرها عنه وترك الزكاة وضرب مسلم اوذمی عدواناً وسب صحابی وغيبة عالم اوحامل قرآن وسعاية عندالظالم** (ظالم سے چغلی کھانا) **و دیاثة** (یعنی بیوی، بیٹی کا ناجائز تعلق گوارہ کرنا) **وقیادة** (اسی طرح کے دوسرے ناجائز تعلقات میں کوشش کرنا) **وترک امر بمعروف ونهی عن منكر من قادر وتعلم سحر اوتعليمه اوعمله ونسيان حرف من القران بعدالبلوغ واحراق حيوان بغيرضرورة ويأس من رحمة الله تعالىٰ وامن من مكره** (عذاب سے نہ ڈرنا) **ونشوز زوجة** (شوہر کی نافرمانی کرنا) **اباء حليلة من خليلها عدواً ونميمة** (جمع الوسائل ۱ / ۲۲۴) اس کے علاوہ بھی کبیرہ گناہ ہیں جو کتابوں میں مذکور ہیں (مختار)

ایسی کوئی جامع تعریف نہیں ہے جو کہ تمام کبائر کو شامل ہو اور جس میں صغائر داخل نہ ہوں (۱)۔

اسی وجہ سے علامہ واحدیؒ اور بعض دیگر ائمہ نے کہا ہے کہ کبیرہ کی تعریف بھی ہمارے لئے مبہم کر دی گئی ہے تا کہ لوگ خوف کی وجہ سے ہر معصیت سے اجتناب کریں۔ جیسے لیلۃ القدر کے ابہام کی بڑی حکمت بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ شب قدر کی لالچ میں لوگ ہر رات کو عبادت کریں۔ کبیرہ کے بارے میں مزید تفصیلات آپ نے صحیحین کی کتاب الایمان میں پڑھی ہیں۔ اس استفسار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معلم اور مزکی کو چاہیے کہ شاگردوں کو جو اہم بات بتانی ہو تو پہلے ان کی توجہ حاصل کرے اس قسم کے سوال کا بڑا مقصد بھی یہی ہے کہ مخاطب ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے خیالات و مشاغل چھوڑ کر کمال توجہ سے بات سننے لگتا ہے۔

الا شراک باللہ الخ شرک بدترین گناہ اور کفر ہے۔ لیکن یہاں پر صرف شرک نہیں بلکہ مطلقاً کفر مراد ہے خواہ شرک ہو یا دہریت ہو تعطیل ہو یا تجسیم وغیرہ۔

<u>والدین کی نافرمانی گناہ کبیرہ ہے:</u> **وعقوق الوالدین.** اللہ تعالیٰ کے بعد انسان کے سب سے بڑے محسن والدین ہیں۔ تو اگر ایک طرح محسن اعظم پر کفر کبیرہ ہے۔ تو دوسری طرف والدین جیسے محسن کا کفران اور ناشکری اور ان کی نافرمانی حرام اور کبیرہ ہے۔ خواہ والدین کافر کیوں نہ ہوں۔ جب تک وہ معصیت الٰہی کا حکم نہ دیں۔ ان کی اطاعت واجب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ **ولا تقل لهما اف ولا تنهرهما. وان جاهداک علی ان تشرک باللہ ما لیس لک به علم فلا تطعهما وصاحبهما فی الدنیا معروفا.** (الآیة) تو اگر چہ ان کی طرف سے معصیت اور شرک کا امر نا قابل اطاعت ہے لیکن ساتھ ساتھ دنیا میں ان سے احسان و نیکی سے پیش آنے کا واضح امر ہے۔ بہر حال والدین سے ایسا رویہ اور سلوک جس سے وہ ناراض اور غصہ ہوں۔ عقوق ہے اور تمام دنیوی امور میں ان کو ایسی اذیت دینا حرام ہے۔

---

(۱) یہی وجہ ہے کہ علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں نسبت اضافی ہے۔ ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں چھوٹا اور دوسرا بڑا۔ (مختار)

<u>شہادۃ زوراور جھوٹ پر تنبیہ میں زیادہ اہتمام کیوں</u>: قال و شهادة الزور او قال الزور الخ کبیرہ گناہوں کے ذکر میں جھوٹ کو خصوصی اہمیت آپ ﷺ نے دی۔ جس کے اظہار کے لئے آپ ﷺ اٹھ بیٹھے۔ نیز اس کا ذکر بھی بار بار کرنے لگے۔ اور اس اہتمام کا سبب یہ ہے کہ جھوٹ آسان ترین گناہ ہے اور کوئی بھی شخص اسے بول سکتا ہے۔ پھر لوگ اسے بے پرواہی سے بول لیتے ہیں۔ نیز اس کے لئے دشمنی، حسد، استہزاء، اور جرم سے گلوخلاصی بلکہ محض مشغلہ وغیرہ بہت سے دیگر اسباب ہیں۔

علاوہ ازیں شرک کو صحیح الفطرت انسان کا عقل بھی قبول نہیں کرتا۔ اور اسی طرح والدین کی نافرمانی بھی انسان کے طبعی تقاضوں کی ضد ہے۔ جبکہ جھوٹ سے نفرت طبعی نہیں ہوتی نہ ہمیشہ عقل اس سے منع کرتا ہے بلکہ اکثر تو عقل اور نفس کا تقاضا ہی ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان جھوٹ بولتا ہے۔

<u>حضور ﷺ کا اصرار اور صحابہ ؓ کی شفقت</u>: لیته سکت الخ یہ اس لئے نہیں تھا کہ آپ ﷺ کی بات صحابہ کو بری لگی۔ بلکہ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے نہایت اہتمام کے اظہار کے لئے جب بار بار جھوٹ کا ذکر کیا۔ تو اس سے ضرور آپ ﷺ کو تھکاوٹ بھی ہو رہی تھی۔ صحابہ ؓ کو آپ ﷺ پر رحم آیا کہ آپ ﷺ کو تکلیف ہو رہی تھی۔ رہا مقصد تو وہ تو ویسے بھی حاصل ہو چکا تھا۔ چنانچہ صحابہ ؓ کی یہ تمنا آپ ﷺ پر شفقت پر مبنی ہے۔

بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ امت کے جھوٹ کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ کو غصہ اور ناراضگی بھی ہو۔ اور صحابہ آپ ﷺ کی ناراضگی کے خوف سے مزید اس کا ذکر نہ کرنے کی تمنا کر رہے ہوں۔ بعض کے خیال میں ہوسکتا ہے کہ یہ خوف ہو کہ مبادا جھوٹوں کے بارے میں آپ ﷺ کوئی ایسے بددعائیہ الفاظ کہہ دیں جو ہمیشہ کے لئے جھوٹوں کے خسران اور بدانجامی کا باعث ہوں۔ بہر حال اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ اہم بات کہتے ہوئے واعظ، خطیب، استاد اور پیر کو تکرار اور اصرار اتنا کر دینا چاہیے کہ سامعین کو اس پر رحم آئے۔

ویسے بھی جھوٹ بہت برا عمل ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں جھوٹ بولنے والے شخص کے منہ سے جو بدبو نکلتی ہے اس کی وجہ سے رحمت کے فرشتے دروغ گو شخص سے ایک میل دور کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جب حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مومن جھوٹا ہوسکتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ پھر خصوصاً جھوٹی گواہی میں تو کبھی معصوم جان کو خطرہ، کبھی دوسرے کے مال پر دست اندازی، کبھی افتراء و بہتان، کبھی حلال کی تحریم اور کبھی حرام کی تحلیل وغیرہ امور کا ارتکاب بھی شامل ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود شرک بھی ایک بہت بڑا جھوٹ ہی تو ہے۔ بہرحال اس حدیث میں کبائر کا ذکر ہے۔ جن کا حکم یہ ہے کہ اگر چہ رحمت خداوندی کے سامنے کبائر کی کوئی حیثیت ہی نہیں وہ سب کو معاف کرسکتا ہے۔ لیکن قانونِ الٰہی یہ ہے کہ کبائر کو توبہ سے معاف کرتے ہیں۔

اشکال اور جواب: یہاں پر یہ ایک اشکال ہے کہ اس حدیث میں کسی بھی تکأۃ کا ذکر نہیں ہے۔ تو اسے یہاں پر کیوں لایا گیا ہے۔ بعض شراح نے تو اس اشکال کو ذکر کر کے اس کا جواب دینے کی تکلیف نہیں کی۔

لیکن بعض حضرات نے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً علامہ ابن حجرؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ حدیث سے اتکاء ثابت ہوتا ہے۔ اور اتکاء کے لئے تکاۃ کا وجود لازم ہے اس لئے دلالت التزامی سے یہ حدیث تکأۃ پر بھی دلالت کرتی ہے۔

لیکن ملا علی قاریؒ وغیرہ شرّاح نے اس جواب کو ناپسند کیا ہے۔ کیونکہ اتکاء تکأۃ کے بغیر بھی ہوسکتا ہے۔ بعض دوسرے شرّاح نے یہ جواب دیا ہے کہ ترجمۃ الباب اس مقام پر عام ہے۔ یعنی اس باب میں تکأۃ اور غیر تکأہ پر ٹیک لگانے کا بیان مقصود ہے۔

(۳) حدّثنا قتيبة بن سعيد ثنا شريک عن عليّ بن الأقمر عن أبي جحيفة قال قال رسول اللّٰه ﷺ أمّا أنا فلا اٰكل متكئاً(۱) .

ترجمہ: ابوجحیفہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تو ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

اس روایت میں ٹیک لگا کر کھانے سے منع کرنا مقصود ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرنا انسانی صحت کے

(۱) صحیح بخاری ۲/۸۱۲ کتاب الأطعمة باب الأكل متكئاً، سنن ابی داؤد ۲/۱۷۳ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی الاکل متکئا، ابن ماجة ۲۴۲ کتاب الاطعمة باب الاکل متکأً. (مختار)

لئے بھی مضر ہے(۱)اور عبدیت کی طرح کھانے کے خلاف ہے۔

امّا انا فلا أكل متكئاً نبی کریم ﷺ خود اپنے آپ کا ذکر تو فرما رہے ہیں۔اپنی امت کے لیے کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے اگر چہ عاقل کے لیے اشارہ کافی ہے۔اور اس کا واضح معنی یہی ہے کہ ''مجھے دوسرے لوگوں کا بھی ٹیک لگا کر کھانا پسند نہیں ہے۔اسی لیے تو خود اس ہیئت پر نہیں کھاتا'' کیونکہ متکبرین کی عادتوں میں سے ہے۔نیز اس طرح ضرورت سے زیادہ کھانا کھایا جاتا ہے۔جو کہ ایک ناپسندیدہ امر ہے۔ نیز کھانے سے استغناء اور اس کی بے قدری پر بھی دلالت کرتا ہے۔علاوہ ازیں چونکہ اس طرح طعام اپنے گلے میں مشقت سے گزرتا ہے اس لیے کبھی کبھی یہ مضر صحت بھی بن جاتا ہے۔ بلکہ امام ابراہیم نخعیؒ سے روایت ہے کہ اکابر پیٹ بڑھنے کے خوف سے ٹیک لگا کر نہیں کھاتے تھے۔پھر اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ لیٹے لیٹے کھانا اور بھی زیادہ شنیع ہے۔

البتہ کھڑے ہو کر کھانے کو علامہ ابن حجرؒ نے مکروہ نہیں کہا ہے۔یہاں پر ٹیک لگانا عام ہے۔تکیہ کو پیٹھ لگا کر ہو یا کوئی پہلو لگا کر ہو یا دیوار یا ہاتھ وغیرہ سے کسی دوسری چیز کو ٹیک لگایا ہو۔یہ سب ایک ہی حکم میں ہے بلکہ بعض لوگوں نے گدیلے وغیرہ پر التی پالتی مار کر کھانے کو بھی ٹیک لگانے میں داخل کر دیا ہے۔بعض روایات میں آتا ہے کہ جبرئیلؑ نے نبی کریم ﷺ کو ٹیک لگا کر کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ کو اس سے منع کیا۔اس کے بعد آپ ﷺ نے کبھی بھی اس حالت میں کھانا نہیں کھایا۔بہر حال ٹیک لگا کر کھانا کھانا

(۱) نئی سائنسی تحقیق نے ٹیک لگا کر کھانا کھانے میں تین قسم کے نقصان بتائے ہیں (الف) کھانا صحیح طور پر نہیں چبایا جائے گا اور اس میں لعاب جتنی ضرورت تھی نہیں ملے گا۔اور پھر معدے میں جا کر نشاستہ دار غذا یہ (Cosbohydstes) کو ہضم کرنا ہو وہ نہیں مل سکے گا۔جس سے نظام انہضام متاثر ہوگا۔(ب) ٹیک لگا کر بیٹھنے سے معدہ پھیل جاتا ہے جس سے غیر ضروری خوراک معدے میں چلی جائے گی۔اور نظام انہضام متاثر ہوگا۔(ج) ٹیک لگا کر کھانے سے آنتوں اور جگر (Liver) کے نظام پر برا اثر پڑتا ہے۔اس لئے امام ابراھیم نخعیؒ ٹیک لگا کر کھانے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔اور فرماتے ہیں کہ پیٹ بڑھ جاتا ہے اور ایسا کھانا متکبرین کی علامت ہے۔شیخ احمد عبد الجواد الرومیؒ نے آنحضرت ﷺ کے کھانے کیلئے بیٹھنے کے بارے میں لکھا ہے **فكانت جلسة رسول اللّٰه ﷺ وقت الاكل كلها ادب واحترام فتارة يجلس على صدور قدميه وتارة يجلس ناصباً رجله اليمنىٰ وجالساً على اليسرىٰ (الاتحافات ١٧٥)(مختار)**

مکروہ ہے یا کم از کم خلاف اولیٰ ضرور ہے۔البتہ اگر کوئی عذر ہو تو پھر ٹیک لگا کر کھانا جائز ہے۔اب یہ بات کہ اگر ٹیک لگا کر کھانا مکروہ ہے تو کس وضع سے کھایا جائے۔

ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ کھانے کے وقت مستحب یہ ہے کہ آدمی دوزانوں بیٹھے۔البتہ قدموں کے پشت زمین پر لگائے(۱)۔یا پھر دایاں پاؤں کھڑا ہو اور بائیں پاؤں پر بیٹھ جائے۔علامہ بیجوریؒ پہلی کیفیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ کیفیت کھانے کے سب سے بہتر کیفیات میں سے ہے۔کیونکہ اس طرح انسان اپنی اس طبعی حالت پر ہوتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ صحت کے اعتبار سے انفع کیفیت ہے۔

(۴) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مهدی أخبرنا سفيان عن علی بن الأقمر قال سمعت أبا جحيفة يقول قال رسول اللّٰه ﷺ لا آکل متكئًا(۲).

ترجمہ: ابو حنیفہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

یہ حدیث دراصل سابقہ حدیث ہی ہے۔متن کے الفاظ میں معمولی مغائرت ہے لیکن سند میں فرق ہے۔اور شاید امام ترمذیؒ نے سند کی تبدیلی کی وجہ سے ہی یہ حدیث دہرائی ہے(۳)۔بعض شراح نے اس کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ دراصل شریک جو علی بن الأقمرؒ کا شاگرد ہے۔سئی الحفظ ہے۔اس لئے سفیان ثوریؒ کے واسطے سے اس حدیث کو روایت کر کے امام ترمذیؒ گزشتہ حدیث کی تقویت فرما رہے ہیں۔ان دونوں حدیثوں پر بھی وہی اشکال ہوتا ہے کہ ان میں تکأۃ کا ذکر تو نہیں ہے اور اس کا جواب بھی وہی ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔

---

(۱) یہی کیفیت نبی کریم ﷺ سے بھی مروی ہے۔(اصلاح الدین)

(۲) صحیح بخاری ۸۱۲/۲ کتاب الاطعمة باب الأكل متكئاً، سنن ابی داؤد ۱۷۳/۲ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی الأكل متكئاً سنن ابن ماجة ۲۴۲/۱ کتاب الأطعمة باب الأكل متكئاً.(مختار)

(۳) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے قال السيد امير الدين يظهر الفرق بين الحدثين باختلاف بعض رجال السند وتغيير يسير فی المتن والغرض تاكيد هذا الامر بالنسبة إلى النبی ﷺ (جمع الوسائل ۲۲۹/۱)(مختار)

(۵) حدّثنا یوسف بن عیسی ثناوکیع ثنااسرائیل عن سماک ابن حرب عن جابر بن سمرة قال رأیتُ النّبیّ ﷺ متکئًا علی وسادة قال أبوعیسیٰ لم یذکر وکیع علی یساره ھکذا رویٰ غیرواحدٍ عن إسرائیل نحوروایة وکیع ولانعلم احداً روی فیه علی یساره إلاّماروی إسحٰق بن منصور عن إسرائیل.

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے تشریف فرما ہیں۔امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ وکیعؒ اس حدیث میں ''علی یسارہ'' کا لفظ ذکر نہیں کرتے۔اسی طرح اسرائیل کے متعدد دیگر شاگرد بھی یہ لفظ ذکر نہیں کرتے سوائے اسحٰق بن منصور کے کسی کے بارے میں ہمیں علم نہیں جو یہ لفظ ذکر کر رہا ہو۔

متکئا علی یساره الخ حضرت جابرؓ کی یہ حدیث باب کی ابتداء میں گزر چکی ہے جہاں پر اسحٰق کی روایت سے **علی یساره** کا اضافہ مذکور تھا۔یہاں پر یہ اضافہ ذکر نہیں ہے۔لہٰذا اگر اس حدیث کو حضرت جابرؓ کی اس حدیث سے متصل لایا جاتا تو بہتر ہوتا۔

قال ابو عیسیٰؒ امام ترمذیؒ کا مقصد اس بیان سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ پہلی سند سے مروی حضرت جابرؓ کی اس حدیث کی غرابت پر تنبیہ ہو جائے کیونکہ ''**علی یساره**'' کا اضافہ جو کہ اسحاق بن منصورؒ کی روایت میں مذکور ہے اسرائیلؒ کے دیگر شاگردوں کے ہاں موجود نہیں۔حتیٰ کہ وکیعؒ جیسے عظیم المرتبہ شاگرد نے بھی اسے ذکر نہیں کیا ہے جس کا مرتبہ اسحٰقؒ سے بڑا ہے۔اور دیگر تمام شاگرد بھی اس روایت کو اس اضافہ کے بغیر روایت کرتے ہیں۔

لہٰذا یہ اضافہ غریب ہوگا۔جامعہ ترمذی میں بھی اس اضافہ پر کلام کیا گیا ہے لیکن اسے یکسر غلط کہنا بھی بیجا ہوگا۔جیسا کہ امام ترمذیؒ نے بھی یہ جرأت نہیں کی ہے۔وجہ یہ ہے کہ یہ قوی احتمال موجود ہے کہ اس واقعہ میں آپ ﷺ بائیں طرف ٹیک لگا کر بیٹھے ہوں۔یہ ناجائز تو نہیں ہے بلکہ اس طرح یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ دایاں ہاتھ فارغ ہو جاتا ہے۔جسے مصافحہ وغیرہ کے کاموں میں لایا جا سکتا ہے۔

۲۳. باب ما جاء فی اتکاء رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے تکیہ کے علاوہ کسی اور شئ پر ٹیک لگانے کے بیان میں

اتکاء ٹیک لگانے کو کہتے ہیں لیکن اس باب کی دونوں حدیثیں چلتے ہوئے کسی آدمی پر ٹیک لگانے سے متعلق ہیں۔اس طرح یہ باب سابقہ باب یعنی باب تکاۃ النبی ﷺ سے ممتاز ہوجاتا ہے۔جس میں مطلق ٹیک کا ذکر ہے۔اور یہ اعتراض دفع ہوجاتا ہے کہ مؤلف کو دونوں باب علیحدہ نہیں لانا چاہیے تھے۔ ایک دوسرا فرق بھی شراح نے دونوں بابوں میں بیان کیا ہے۔کہ تکاۃ اس چیز کو کہتے ہیں جو ٹیک لگانے کی غرض سے تیار کی گئی ہو۔جیسے تکیہ،عصاوغیرہ۔غرض وغایہ کی وجہ سے ٹیک لگانے کے سلسلے میں ان اشیاء کو ایک گونہ مقصودیت حاصل ہوتی ہے۔اور اسی مقصودیت اور اصالت کی وجہ سے ان کیلئے خصوصی باب منعقد کیا۔اس کے برعکس کسی انسان پر ٹیک لگانے میں انسان کے متوکا علیہ ہونے کی حیثیت حقیقی نہیں ہوتی بلکہ عارضی ہوتی ہے۔البتہ اتکاء مقصود ہوتا ہے۔اس لئے دوسرا باب اتکاء کے عنوان سے الگ لا رہے ہیں۔

علاوہ ازیں دوسرے باب کو الگ ذکر کرنا شاید اس لئے بھی مناسب ہے کہ انسان کے علاوہ دوسری اشیاء پر ٹیک لگانا جائز ہے لیکن کیا انسان پر بھی جائز ہوگا؟ اس سوال کا جواب اہم تھا اور وہ اس باب کی احادیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔لہٰذا اس باب کو علیحدہ ذکر کیا۔

(۱) حدّثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمان أنا عمر و بن عاصم أنا حمّاد ابـن سلمة عن حميد عن أنسؓ أنّ النّبیّ ﷺ کان شاکیا فخرج یتو کأ علی أسامة و علیه ثوب قطریّ قد توشّح به فصلّی بهم(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بیمار تھے۔چنانچہ حضرت اسامہؓ پر ٹیک لگائے ہوئے حجرہ سے باہر تشریف لائے۔اس وقت آپ ﷺ ایک قطری چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔باہر آکر آپ ﷺ نے صحابہ کو نماز پڑھائی۔

کان شاکیا الخ یہ حدیث اس سے پہلے "**باب لباس النبی ﷺ**" میں کافی تشریح کے

(۱) تفرد بھذا الحدیث الامام الترمذیؒ ص۹ (مختار)

ساتھ گزر چکی ہے وہیں حضرت اسامہؓ کے بارے میں تفصیل لکھی جا چکی ہے۔ **ثوب قطری** یہ ایک خاص قسم کا منقش کپڑا ہوتا تھا جو قطر میں بنایا جاتا تھا۔

توشح به توشّح کا معنی تزیّن بھی آتا ہے لیکن یہاں پر معنی یہ ہے کہ "**جعله کالوشاح**" یعنی آپ ﷺ وشاح کی طرح اسے پہنے ہوئے تھے۔ اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ محرم کی طرح چادر کا ایک طرف دائیں ہاتھ کے نیچے سے گزار کر بائیں کندھے پر ڈال دیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ چادر اس طرح کندھوں پر ڈالی جائے کہ دونوں پہلو آگے کی طرف لٹک جائیں۔

فصلّی بهم یعنی آپ ﷺ نے امامت کر کے صحابہ کرامؓ کو نماز پڑھائی۔ اور ممکن ہے کہ **بهم** کا معنیٰ "**معهم**" ہو۔ پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے صدیق اکبرؓ کی امامت میں صحابہ کرامؓ کے ساتھ نماز پڑھی۔ خود امامت نہ کر سکے۔ جس کی تفصیل دوسرے مقام پر آرہی ہے۔

(۲) حدّثنا عبدالله بن عبدالرحمان أنا محمّد بن المبارک ثنا عطاء بن مسلم الخفاف الحلبّی أناجعفر بن برقان عن عطاء ابن أبی رباح عن الفضل بن عبّاس قال دخلت علی رسول الله ﷺ فی مرضه الذی توفی فیه و علی راسه عصابة صفراء فسلّمت فقال یا فضل قلت لبیک یا رسول الله ﷺ قال اشدد بهذه العصابة راسی قال ففعلت ثمّ قعد فوضع کفه علی منکبی ثمّ قام و دخل فی المسجد و فی الحدیث قصّة(۱).

ترجمہ: فضل بن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی مرض وفات کے موقع پر میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا آپ ﷺ کے سر مبارک پر پیلی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے سلام کیا (جواب دینے کے بعد) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے فضل! میں نے کہا لبیک یا رسول اللہ، تو آپ ﷺ نے فرمایا ذرا اس پٹی کو مرے سر پر کس کر باندھ دو میں نے تعمیل کی۔ پھر آپ ﷺ اٹھ بیٹھے اور میرے کندھے پر ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس حدیث میں مفصل قصہ ہے۔

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی ۲۸۱/۱۸، دلائل النبوۃ للامام البیهقی ۱۷۹/۷ (مختار)

عن عطاء بن مسلم الخفاف یہ حلب کے باشندے ہیں۔مشہور محدث ہیں۔موزے بنایا کرتے تھے۔۱۹۰ھ میں وفات پائی۔

فضل بن عباسؓ: فضل بن عباس نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے اور صحابہؓ میں انتشار کے وقت آپ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم بھی رہے۔ حجۃ الوداع میں شریک ہوئے اور نبی کریم ﷺ کے ردیف رہے۔پھر جہاد کی غرض سے شام کو نکلے۔اسی سلسلے میں آپ اردن کے قریب ہی کہیں موجود تھے کہ طاعون عمواس آئی اور آپ اکیس(۲۱)سال کی عمر میں وفات پائے جبکہ بعض اقوال کے مطابق جنگ یرموک میں شہادت پائی۔

عصابة صفراء: عصَابة کپڑے کی اس پٹی کو کہتے ہیں جو کہ ٹوٹنے یادرد کی وجہ سے کسی عضو پر باندھی جائے۔ نبی کریم ﷺ کو مرض وفات میں سر درد کی شکایت بہت زیادہ تھی۔اسی وجہ سے آپ نے سر کو باندھ رکھا تھا۔یا ویسے ہی سر پر کپڑا پڑا تھا۔ فقال یا فضل یعنی سلام کا جواب دینے کے بعد مجھ سے فرمایا کہ اے فضل اشدد بهٰذه العصابة راسی ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ پٹی جو ویسے پڑی ہے۔ میرے سر پر باندھ لو۔ فوضع کفه علی منکبی یہی سے ترجمۃ الباب کے ساتھ تعلق ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فضل بن عباسؓ کا سہارا لیا تھا۔

فدخل فی المسجد یہاں حرف جر کا اظہار کیا گیا ہے جو کہ عموماً ذکر نہیں ہوتا۔لیکن دخل کے صلہ میں فی کا استعمال جائز ہے۔اگر چہ عام نہیں ہے۔

وفی الحدیث قصة اس واقعہ کو دوسرے محدثین نے کتابوں میں نقل کیا ہے۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ مسجد آ کر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔صحابہ کرامؓ حاضر ہوئے۔ تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد مسلمانوں سے اس بات کا التماس کیا کہ وہ اپنے تمام حقوق جو نبی کریم ﷺ کے ذمے رہتے ہیں۔ابھی اس دنیا میں طلب کریں۔اور آخرت کے لئے نہ چھوڑیں۔اور جب آپ ﷺ نے مسلمانوں سے اس کا مطالبہ اصرار کے ساتھ کیا تو بعض صحابہ نے اپنے حقوق ظاہر کئے جن کو آپ ﷺ نے فضل بن عباسؓ سے کہہ کر ادا کروایا۔جبکہ بعض صحابہ کرامؓ نے اپنے بعض عوارض کے لئے آپ ﷺ سے دعا بھی کروائی۔کچھ تفصیل آگے باب الوفات میں آرہی ہے۔

۲۴. باب ماجاء فی صفة اکل رسول اللّٰہ ﷺ

نبی کریم ﷺ کے کھانے کا بیان

اس باب میں امام ترمذیؒ نبی کریم ﷺ کے کھانے کے آداب، طرز اور طریقے بیان فرماتے ہیں۔رہی یہ بات کہ آپ ﷺ کیا کیا تناول فرماتے تھے۔اس کا بیان آئندہ مختلف ابواب میں آئے گا۔ روٹی سالن اور پھل وغیرہ کے لیے الگ الگ ابواب آئیں گے۔نیز جامع ترمذی کے ابواب الاطعمہ میں تفصیل سے وہ اشیاء ذکر کی گئی ہیں۔اس باب میں اس بات کا بیان مقصود ہے۔کہ کھانے کے مناسب انداز اور مسنون طریقے کیا ہیں۔

(۱) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مهديّ عن سفيان عن سعد بن إبراهيم عن ابن لكعب بن مالك عن أبيه أنّ النّبيّ ﷺ كان يلعق أصابعه ثلاثاً قال أبو عيسٰى وروى غير محمّد بن بشّار هذا الحديث قال كان يلعق أصابعه الثلاث(۱).

ترجمہ: حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی انگلیاں تین مرتبہ چاٹ لیا کرتے تھے۔

ابن کعبؓ الخ سند میں مذکور اس راوی کا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن ہے۔بڑے تابعی ہیں۔عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت کعب بن مالکؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے فرزند اور ان سے فیض یافتہ ہیں۔بلکہ عبداللہ بن کعبؓ کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا تھا۔

<u>کعب بن مالکؓ کا ذکر:</u> عن أبيه حضرت کعب کے بیٹے اپنے والد کعب بن مالک بن ابی مالک سلمی مدنیؓ سے روایت کرتے ہیں۔حضرت کعبؓ مشہور صحابی ہیں۔بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ میں شریک رہے۔ غزوۂ تبوک میں حاضر نہ ہو سکے۔بلکہ ان تین معتوب صحابہؓ میں سے ایک آپؓ بھی ہیں جن کی توبہ کی قبولیت

(۱)صحیح مسلم ۱۸۳/۲،سنن ابی داؤد ۱۸۱/۲ ، شرح السنة ۳۱۵/۱۱ رقم الحدیث ۲۸۷۴، ابواب الاطعمة لعق الاصابع(مختار)

کو مؤخر کر دیا گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے شاعروں میں آپؓ کا شمار ہوتا ہے۔ ستتر (۷۷) سال کی عمر میں ۵۰ھ کو وفات پائی (۱)۔

تین انگلیاں یا تین بار: یلعق اصابعه ثلاثا. یعنی آپ ﷺ کھانا کھانے کے بعد تین بار انگلیاں چاٹتے تھے۔ محمد بن بشارؒ کی روایت میں یہی مذکور ہے۔ لیکن ان کے علاوہ دیگر رواۃ حضرت کعب بن مالکؓ کی یہ حدیث یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ آپ ﷺ تین انگلیاں چاٹتے تھے۔ مذکورہ حدیث کے الفاظ میں دونوں صورتوں کا احتمال موجود ہے۔ لیکن مؤخر الذکر صورت کو بعض شراح نے اس لیے ترجیح دی ہے کہ آگے امام ترمذیؒ خود حضرت کعب بن مالکؓ کی وہ حدیث لاتے ہیں۔ جس میں تصریح ہے کہ ''یاکل باصابعه الثلٰث'' اور مؤخر الذکر تشریح پر دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے۔ لیکن علامہ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ بظاہر یہاں تین بار چاٹنے کا ذکر ہے۔ اور دوسری روایات میں تین انگلیوں کا ذکر ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ تین انگلیوں کا تین بار چاٹنا مراد لیا جائے۔

انگلیوں سے کھانا انسان کا اعزاز: اس مقام پر انگلیوں سے کھانا ثابت ہو رہا ہے۔ اور یہ فعل قبیح نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ اسی طرح انگلیوں کا چاٹنا بھی مستحسن امر ہے۔ نئی تہذیب کے نام نہاد روشن خیال حلال وحرام اور پلید و ناپاک ہر قسم کی چیزیں کھا کر انگلیوں کے چاٹنے کو بدتہذیبی اور قبیح فعل سمجھتے ہیں۔ بلکہ انگلیوں کے ذریعے کھانا بھی پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ غلاظتوں کا یہ حال ہے کہ نہ وضوء نہ غسل۔ لیکن انگلیوں پر ان کو جراثیم نظر آتے ہیں۔ چھری، کانٹے اور چمچوں کے ساتھ کھانا ان کے ہاں قابل فخر تہذیب خیال کیا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہمارے استعمال میں آنے والی چھری، کانٹے اور چمچے تو ہر آدمی کے منہ میں جاتے ہیں۔ خواہ وہ بیمار ہو یا تندرست۔ مغرب کی اندھی تقلید میں ان کو ان آلات میں بھی کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا۔ جبکہ ہوٹل میں میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ چمچہ اگر گندہ ہو تو بے تمیز بیرے تھوک کر اپنی گندہ قمیص کے ساتھ ان کو صاف کر کے چمکدار بنا دیتے ہیں۔ اور یہ بیوقوف اس پر اتراتا ہے کہ میں نے چمچہ کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس غلاظت کے بجائے دھلی ہوئی پاک انگلیوں کے ساتھ کھانا اسے گوارا نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے تو کھانے سے قبل ہاتھ دھو کر کھانے کا حکم دیا ہے۔ اور فارغ ہو کر انگلیاں چاٹنے اور پھر

(۱) ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں آپؓ کا انتقال ہوا تھا۔ (اصلاح الدین)

دھونے کی ترغیب دی ہے۔اور اسی میں برکت کی خبر دی ہے۔

تکریم بنی آدم کی ایک صورت: ہارون الرشیدؒ کے لیے ایک بار کھانا لایا گیا۔اس نے کھانے کے لیے چمچہ لانے کا حکم دیا۔امام ابو یوسفؒ بھی موجود تھے۔انھوں نے فرمایا کہ دیکھو خود تیرے پردادا حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے تو اللہ تعالیٰ کے اس قول ''ولقد کرّمنا بنی آدم'' کی تفسیر میں یہ فرمایا ہے کہ ''جعلنالھم اصابع یا کلون بھا ''یعنی یہ کہ ہم نے انسان کے اکرام کے لیے اسے انگلیاں بخشی ہیں تاکہ ان کے ذریعے وہ کھانا کھائے۔ اور تم چمچہ کے ساتھ کھانا کھانا چاہتے ہو۔یہ سن کر بادشاہ نے چمچہ واپس کیا اور انگلیوں کے ساتھ کھانا کھایا۔

خود نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ کھانے والے کو یہ پتہ نہیں کہ کھانے کے کونسے جزء میں برکت ہوتی ہے(۱)۔یہی وجہ ہے کہ برتن میں جو تھوڑا سا کھانا رہ جاتا ہے۔نبی کریم ﷺ نے اسے کھانے کا حکم دیا ہے اور فارغ ہونے کے بعد انگلیاں چاٹنا بھی آپ ﷺ کا مسنون عمل ہے۔

تین انگلیوں کے ساتھ کھانے کی حکمت: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روایت کے وہ الفاظ جو محمد بن بشارؒ کے سوا دوسرے حضرات نقل کرتے ہیں، میں اس راز کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کھانے میں تمام انگلیوں کا استعمال نہیں کرتے تھے۔بلکہ صرف تین انگلیوں کے ذریعے کھانا کھاتے تھے۔ اس طرح لقمہ چھوٹا زود ہضم اور بے ضرر ہوتا ہے۔نیز پانچ انگلیوں سے کھانا حرص و شرہ کی علامت بھی

(۱) عن جابرؓ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ اذا وقعت لقمة أحد کم فلیا خذ ھا فلیمط ما کان بھا من اذی و لیا کلھاو إلاّیدعھا للشیطان و لا یمسح یدہ بالمندیل حتّیٰ یلعق أصابعه فإنّه لایدری فی أیّ طعامه البرکة (مسلم باب استحباب لعق الأصابع و القصعه ج۲ ص۱۷۵)

اور یہی وہ اصل علت ہے جس کے لیے انگلیاں چاٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔جبکہ بعض حضرات نے یہ علت بتائی ہے کہ نہ چاٹنے سے زیادہ تلوث کا اندیشہ ہوتا ہے۔یعنی دوسری انگلیوں اور ہاتھ پر طعام لگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔قاضی عیاضؒ نے یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ انگلیاں چاٹنے سے اس تھوڑے طعام کی قدردانی ہوتی ہے جو انگلیوں پر لگا ہوتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت استخفاف سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

بعض ماہرین طب کا خیال ہے کہ کھانا کھانے کے بعد انگلیوں کے پوروں پر وٹامن کے(vit k) جمع ہوجاتا ہے اور انگلیاں چاٹنے سے وہ ضائع ہونے کی بجائے جزو بدن جاتا ہے۔(مختار)

ہے(۱)۔ بہر حال تین انگلیوں کے ساتھ کھانا اور کھانے سے فراغت کے بعد ان کو چاٹنا سنت ہے۔ اور اس کا اتباع ہر مسلمان کے لیے قابل فخر بات ہونی چاہیے۔

حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ آپؓ جن دنوں فارس کے گورنر بنے۔ تو ایک دعوت میں حاضر ہوئے جس میں عجم کے بھی بڑے بڑے کمانڈر اور جرنیل آئے ہوئے تھے۔ کھانے کا وقت ہوا اور حضرت سلمانؓ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ تو کھانا کھاتے ہوئے ایک نوالہ نیچے گر گیا۔ ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے صحابی کو خیال آیا کہ پیروئ سنت میں حضرت سلمانؓ یہ نوالہ اٹھا کر کھائیں گے۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت اسے رہنے دیں۔ یہ لوگ دیکھ کر ہنسیں گے کہ یہ کیسے حریص لوگ ہیں۔ یہ دیکھ کر آپؓ نے وہ نوالہ اور بھی اہتمام کے ساتھ اٹھایا۔ اور زور سے بولے کہ عجم کے ان کتوں کی خاطر میں اپنے حبیب ﷺ کی سنت نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ میرے رسول ﷺ کی سنت ہے۔ اس کے بعد نوالہ اٹھایا۔ جو گرد وغیرہ لگا تھا اسے ہٹانے کے بعد تناول فرمایا۔

استخفافِ سنت ایک جرم: بہر حال نبی کریم ﷺ کی سنت کو مکروہ سمجھنا کسی مسلمان کا شیوہ نہیں۔ نہ کفار سے مرعوب ہو کر ترک سنت کی جرأت کرنی چاہئے (۲)۔ اب تو بے قدری کا دور آیا ہے حتیٰ کہ عربوں کو

(۱) البتہ اگر ضرورت ہو اور تین انگلیوں سے کھانا مشکل ہو تو پھر پانچ انگلیوں کے استعمال میں بھی کوئی حرج نہیں۔ استحباب الأكل بثلاث أصابع من الأبهام والمسبّحة والوسطىٰ ولايضمّ إليها الرابعة والخامسة إلاّ لعذر بان يكون مرقا وغيره مالايمكن بثلاث وغيرذلک من الأعذار(انوارالمحمود ۲/۲۱۵) شیخ احمد عبدالجواد الرومیؒ نے لکھا ہے قال الشافعیؒ الأكل بإصبع واحدة مقت وباثنين تكبر وبالثلاثة سنة وبأزيدشر(الاتحافات ص ۱۹۹)(مختار)

(۲) قال ابن حجرؒ واعلم ان الكلام فيمن استقذر ذالک (لعق الاصابع)من حيث هو لا مع نسبته النبی ﷺ وإلاّ خشی عليه الكفر. اذ من استقذر شيأمن احواله مع نسبته اليه ﷺ كفر(جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۳۴) اور علامہ عینیؒ نے یہ شکایت کی ہے کہ ہمارے زمانے کے لوگ کھانے کے برتن کو صاف نہیں کرتے۔ اور ساتھ اس میں کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ ایک خلاف سنت اور قبیح عمل ہے۔ اور غیر مسلموں سے مسلمانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ انگلیاں چاٹنا یا برتن صاف کرنا حرص کی علامت ہے۔ مگر یہ غلط ہے بلکہ انگلیاں چاٹنا اللہ تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ کی قدردانی ہے۔ اور انگلیاں چاٹنا یا برتن کا انگلیوں سے صاف کرنا تکبر کا علاج بھی ہے۔ اور باعث برکت بھی ہے۔ (مختار)

اللہ تعالیٰ نے دولت دی۔ تو ان کی حالت اس قدر خراب ہوگئی کہ برتن یا انگلیاں چاٹنا تو کجا اب تو وہ میز پر پڑے ہوئے صرف ایک بار استعمال ہونے والے برتن یکجا کر کے بوری میں ڈال دیتے ہیں۔ اور گندگی کے ڈرم میں پھینک دیتے ہیں۔ روزانہ کھانوں کی ایک بڑی مقدار انہیں ہاتھ لگائے بغیر ضائع کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق تو طعام کا ایک چھوٹا ذرہ بھی ضائع نہیں ہونا چاہئے۔

قال أبو عيسىٰ إلىٰ قوله أصابعه الثلٰث ملا علی قاریؒ نے اس روایت کو ترجیح دی ہے(۱)۔ اور اس کی وجہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ علماء نے انگلیاں چاٹنے میں ایک ترتیب بھی لکھی ہے وہ یہ کہ پہلے درمیانی انگلی، پھر سبابہ یعنی شہادت کی انگلی اور بعد میں انگوٹھا چاٹ لینا چاہئے (۲)۔

(۲) حدّثنا الحسن بن عليّ الخلّال ثنا عفّان ثنا حمّاد بن سلمة عن ثابت عن أنس قال كان النبيّ ﷺ اذا أكل طعام لعق اصابعه الثلاث(۳).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ جب کھانا کھا لیتے تھے۔ تو اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیا کرتے تھے۔

---

(۱) جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۳۲

(۲) اس ترتیب میں طبرانی نے حضرت کعب بن عجرہؓ کی ایک حدیث بھی ذکر کی ہے۔ کما فی جمع الوسائل اور اس میں عقلی حکمت یہ ہے کہ اس طرح دوسری انگلیاں تلوث سے محفوظ رہتی ہیں۔ شیخ زکریاؒ نے اس ترتیب کے ساتھ انگلیاں چاٹنے کے بارے میں فرمایا ہے کہ بیچ کی انگلی لمبی ہونے کی وجہ سے زیادہ ملوث ہوتی ہے۔ اس لئے بھی اس سے ابتداء مناسب ہے۔ اور علامہ مناویؒ نے بھی لکھا ہے **لخبر الطبراني في الاوسط انّه ياكل بأصابعه الثلاث بالإبهام والتي تليها والوسطىٰ ثم يلعق أصابعه الثلاث قبل ان يمسحها الوسطىٰ ثمّ تليها ثمّ الإبهام وفي رواية الحكيم عن كعب بن عجرة قال رأيت رسول الله ﷺ لعق أصابعه الثلاث حين ارادان يمسحها يلعق الوسطىٰ ثمّ التي تليها ثمّ الابهام قال الزين العراقي في شرح الترمذي وبدأ بالوسطىٰ لكونها أكثرها تلوّثاً اذهي أوّل ماينزل الطعام لطولها وهي اقرب إلىٰ الفم حتّى ترتفع.(المناوي على هامش جمع الوسائل ۱/ ۲۳۲)(مختار)**

(۳) صحيح مسلم ۲/ ۱۸۳، ابو داؤد ۲/ ۱۸۱، كتاب الاطعمة باب اللقمة تسقط(مختار)

لعق أصابعه الثلاث. یہاں بھی اس پر تنبیہ ہے کہ نبی کریم ﷺ انگلیوں کے ذریعے کھانا کھایا کرتے تھے۔اب اگر کوئی شخص ضرورت کی بناء پر چمچوں کے ذریعے کھائے۔مثلاً کھانا نرم ہو جو چمچ کے بغیر کھایا نہ جاسکے۔جیسے کھیر، دہی وغیرہ ہو یا کھانے والا انگلیوں کے ذریعے کھانے سے معذور ہو۔تو چمچ کے استعمال میں حرج نہیں ہے۔اس طرح گوشت کے لیے چھری کے استعمال میں بھی حرج نہیں ہے۔لیکن اگر وہ کافروں کا شعار ہو۔تو پھر مشابہت سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا ضروری ہے۔

(۳) حدّثنا الحسین بن علیّ بن یزید الصدائیّ البغدادیّ ثنا یعقوب بن اسحاق الحضرمیّ أنا شعبة عن سفیان الثوری عن علی ابن الأقمر عن أبی حجیفة قال قال النبی ﷺ أمّا أنا فلا آکل متکئا(۱).

حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمان بن مهدی ثنا سفیان عن علیّ ابن الأقمر نحوه.

ترجمہ: حضرت ابوجحیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ میں تو ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

أمّا أنا فلا آکل متکئاً بغیر ضرورت کے ٹیک لگا کر کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ایک طرف تو یہ تواضع کے خلاف ہے۔دوسری طرف یہ کثرت اکل کا سبب بھی ہے(۲)۔اور یہ دونوں اسلام میں ناپسندیدہ امور ہیں۔حدیث کی تفصیل **باب ما جاء فی تکأة النبی ﷺ** میں گزر چکی ہے۔

دانا را اشارہ کافی است: یہاں نبی کریم ﷺ نے یہ تو نہیں کہا کہ تم ٹیک لگا کر نہ کھاؤ۔لیکن عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔اور پھر عاشق کو تو محبوب کی ہر ادا پر مرنا چاہیے۔لہٰذا صریح نہی کی نسبت اس اشارہ میں زیادہ تاکید ہے۔تو گویا نبی کریم ﷺ نے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ تم بھی میرا اتباع کرتے ہوئے ٹیک لگا کر نہ کھانا۔اور جہاں جہاں نبی کریم ﷺ سے ٹیک لگا کر کھانا مروی ہے۔وہ یا تو عذر کی وجہ سے

---

(۱)صحیح بخاری ۸۱۲/۲ کتاب الاطعمة باب الاکل متّکئاً، سنن ابی داؤد ۱۷۳/۲ کتاب الاطعمة باب ماجاء فی الاکل متکئاً دارمی ۱۰۶/۲ (مختار)

(۲)نیز اس میں پیٹ بڑھنے کا اندیشہ بھی ہے۔جیسا کہ امام نخعیؒ سے مروی ہے۔(اصلاح الدین)

ہے۔یا نہی کے ورود سے قبل کی بات ہے۔یا محض بیان جواز پر حمل کیا جائے گا۔

(۴) حدّثنا هارون بن اسحاق الهمدانیّ ثنا عبدة بن سلیمان عن هشام بن عروة عن ابن لکعب بن مالک عن أبیه قال کان رسول اللّٰه ﷺ یاکل باصابعه الثلاث و یلعقهنّ(۱).

ترجمہ: حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین انگلیوں سے کھانا کھایا کرتے تھے۔اور (فراغت کے بعد) ان کو چاٹ لیا کرتے تھے۔

تین انگلیوں سے کھانا سنت ہے۔ **یاکل بأصابعه الثلاث الخ** اس سے قبل ضمناً یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ نبی کریم ﷺ تین انگلیوں سے کھانا کھاتے تھے۔اس حدیث میں اس ادب کی تصریح ہے(۲) اور یہ دراصل وہی حدیث ہے جو دوسری تعبیر سے باب کی ابتداء میں گزر چکی ہے۔لیکن سعید بن منصورؒ کی ایک مرسل روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ پانچ انگلیوں سے کھانا کھاتے تھے۔اور اگر وہ حدیث صحیح ہو تو دونوں روایتوں میں جمع کیلئے توجیہ یہ ہوگی کہ آپ ﷺ نے بعض اوقات میں ضرورت کے موقع پر پانچ انگلیوں کے ذریعے بھی کھایا ہوگا۔اور یہ اس وقت ہوگا جب کھانا انتہائی نرم ہو اور تین انگلیوں سے نہ کھایا جاسکتے۔

(۵) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا الفضل بن دکین ثنا مصعب بن سلیم قال سمعت أنس بن مالک یقول أتی رسول اللّٰه ﷺ بتمر فرأیته یاکل و هو مقع من الجوع(۳).

ترجمہ: حضرت انسؓ بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس کھجوریں لائی گئیں۔میں نے آپ کو وہ کھجور تناول فرماتے ہوئے دیکھا۔اس طرح کہ آپ ﷺ

---

(۱) صحیح مسلم ۱۸۳/۲ باب استحباب لعق الاصابع کتاب الاشربة ،شرح السنة ۱۱/۳۱۵ ابواب الاطعمة باب لعق الاصابع(مختار)

(۲) امام شافعیؒ کا قول ہے"الأکل باصبع واحد لقت و باثنین تکبر و بالثلاثة سنة و بازید شرہ(اصلاح الدین)

(۳) صحیح مسلم ۱۸۳/۲ کتاب الاشربة باب استحباب تواضع الاکل وصفة قعود، سنن ابی داؤد ۱۸۱/۲ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی الأکل متکئاً،(مختار)

بھوک کی وجہ سے اکڑوں بیٹھ کر کسی چیز پر ٹیک لگائے ہوئے تھے۔

وھو مقع من الجوع: اقعاء ضعف کی بنا پر پیٹھ کی جانب ٹیک لگانے کو کہتے ہیں۔اور یہاں پر یہی معنی مراد ہے۔اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے بھوک کی شدت کی وجہ سے عارض ہونے والے ضعف کی بنا پر اقعاء کیا تھا(۱)۔ورنہ بلاضرورت ٹیک لگا کر کھانا۔آدابِ طعام کے خلاف اور ناپسندیدہ عمل ہے۔اقعاء اکڑوں بیٹھنے کو کہتے ہیں۔اس کی دو اور تفسیریں بھی ہیں۔اول یہ کہ سرین زمین کے ساتھ لگے ہوئے ہوں اور گھٹنے اوپر کو اٹھے ہوئے ہوں۔نیز ہاتھ زمین پر ہوں۔نماز میں اقعاء کی یہ صورت مکروہ ہے۔دوم یہ کہ سرین ایڑیوں پر رکھ کر بیٹھا جائے اور پاؤں پھیلے ہوئے ہوں۔یہاں پر یہ دونوں صورتیں مراد نہیں۔

---

(۱)علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے ولیس فی ھذا مایدل علی ان الاستناد من أداب الاکل لأنّه إنّما فعله لضرورة الضعف(المواھب اللدنیة ص ۱۱۴)(مختار)

۲۵. باب ما جاء فی صفة خبز النبیؐ ﷺ

نبی کریم ﷺ کی روٹی کا بیان

خبز کا لفظ خاء کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے۔روٹی پکانے کو کہتے ہیں۔اور خاء کے ضمہ کے ساتھ "شئی مخبوز" یعنی خود روٹی کو کہا جاتا ہے۔اور یہی معنی مراد ہے۔گویا یہاں نبی کریم ﷺ کے طرز زندگی کے سلسلے کا ایک باب بیان کیا جائے گا۔وہ یہ کہ آپ ﷺ کی روٹی کس نوعیت کی ہوتی تھی۔اور باب میں یہ بات بھی بخوبی ظاہر ہو جائے گی کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی عمومی طور پر فقر و فاقہ اور زہد و سادگی میں بسر ہوئی۔عیش و عشرت اور مرغن و مرغوب غذاؤں سے کوئی سروکار نہ تھا۔نیز فقر بھی اختیاری تھی۔نہیں تو آپ کے لیے ساری زمین سونے چاندی کی بنائی جا سکتی تھی اور جنتوں سے کھانوں کے تیار خوان بھی آ سکتے تھے۔لیکن آپ ﷺ نے فقراء کی حوصلہ افزائی اور دلجوئی کرتے ہوئے اس بات پر تنبیہ کر دی کہ دنیاداری میری امت کا اہم مقصد نہ ہو۔اور عملاً مظاہرہ فرمایا کہ سیر شکمی خلاصۂ حیات نہیں ہے۔

کھانا پینا مقصد حیات نہیں: اس کے برعکس آج کی دنیا کا بڑا مقصد روٹی اور اعلیٰ قسم کے کھانے ہوتے ہیں۔سارا زور پیٹ بھرنے اور اس کے وسائل پر دیا جاتا ہے۔آج نظام ہائے دنیا کا خلاصہ مادہ پرستی اور معدہ پرستی ہے۔سوشلزم ہو یا کیپٹلزم، کیمونزم ہو یا مارکسزم سب کے سب پیٹ کی فکر اور پیٹ کی بات کرتے ہیں۔اور بقول قرآن "یاکلون کماتاکل الانعام(الآیۃ)" کی عملی تفسیر بنے ہوئے ہیں۔یہی ان کا مذہب ہے یہی ان کے اخلاق ہیں اور یہی تہذیب جدید کا محور ہے۔ایک بالشت بھر پیٹ نے ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔عقل، روح، تن بدن، علم، یونیورسٹیاں، کالج، اکیڈمیاں اور تمام ادارے اسی پر قربان ہو رہے ہیں۔

اسیر مالٹا مولانا عزیر گلؒ کی حکیمانہ تنبیہ: ملت کے عظیم مجاہد حضرت مولانا عزیر گلؒ کاکا خیل نے ایک بار مجھ سے فرمایا کہ دوران اسارت ایک انگریز سے ایک دفعہ میری ان بن ہوئی۔تو میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کہا کہ تم کون ہو؟ تم تو کھاد کی مشین ہو کھا پی کر تھوڑا سا کھاد نکال دیتے ہو۔تمہاری ساری انگریزیت، تہذیب و تمدن اور مذہب کا خلاصہ بس پیٹ ہی تو ہے۔

اکبرالہ آبادی مرحوم نے بڑے خوبصورت انداز میں شکم پرستوں پرطنز کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

چند دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

بہرحال نبی کریم ﷺ نے فقر وفاقہ کی زندگی گزار کر یہ تعلیم عملاً ہمیں دیدی کہ کھانا توقـــوت لایموت کی حد تک ہونا چاہئے۔ یہ اہم ترین مقصد حیات نہیں۔ کسی نعمت کا استعمال اس دنیا میں بطور مقصد نہیں بلکہ بطور ضرورت کرنا چاہئے۔ اب تو مسلمانوں پر بھی فراخی کا دور آیا ہے۔ یہ بڑا امتحان ہے۔ مسلمانوں کو تعیّشات میں گم نہیں ہونا چاہیے۔

حضوروا ہل بیت کی فاقہ کشی

(۱) حـدّثنا محمّد بن المثنیٰ و محمّد بن بشّار قالا ثنا محمّد ابن جعفر ثنا شعبة عن أبی إسحاق قال سمعت عبد الرحمٰن بن یزید یحدّث عن الأسود بن یزید عن عائشةؓ أنّها قالت ما شبع آل محمّد ﷺ من خبز الشعیر یومین متتابعین حتّیٰ قبض رسول اللّٰه ﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اہل وعیال نے جو کی روٹی بھی مسلسل دودن پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ وفات پائے۔

ماشبع آل محمد؛ نبی کریم ﷺ کے گھر میں گھر کے افراد مسلسل دودن بھی جو کی روٹی سے سیر نہیں ہوئے۔ **حتی قبض رسول الله ﷺ الخ** وفات سے قبل آپ ﷺ کو جزیرۃ العرب کی فرمانروائی ملی تھی۔ اسلامی حکومت کا رعب قیصر وکسریٰ کے درباروں تک چھا گیا۔ پھر بھی فقر کی یہ حالت رہی۔

حدیث کی ترجمۃ الباب سے مطابقت: یہاں پر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ حدیث میں ''آل محمؐد'' کی فاقہ کشی کا ذکر ہے۔ اور باب نبی کریم ﷺ کے فقر سے متعلق ہے۔ لہٰذا مطابقت مفقود ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ عموماً معاش کے سلسلے میں اپنے آپ کی نسبت اہل وعیال مقدم ہوتے ہیں۔ جو ملتا ہے پہلے

---

(۱)صحیح مسلم ۲/۷۱۴ کتاب الزهد والرقائق، سنن ابن ماجة ۱/۲۴۸، کتاب الأطعمة باب خبز خبز الشعیر (مختار)

ان کو دیتے ہیں۔لہٰذا ظاہر ہے کہ جب آل کو کچھ نہ ملا تو آپ ﷺ کو کیا ملتا۔اور بعض حضرات نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ یہاں ''آل'' کا لفظ زائد ہے۔لہٰذا معنی یہ ہوا کہ ''ما شبع محمّد ﷺ ''یعنی خود نبی کریم ﷺ نے مسلسل دو دن جو سے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا۔اور آئندہ ایک اور روایت سے اس توجیہہ کی تائید بھی ہوتی ہے۔

<u>ازواج مطہرات کا فقر</u>: دوسرا شبہ اس مقام پر یہ کیا جاتا ہے۔کہ نبی کریم ﷺ کے ذمہ ازواج مطہرات کا نفقہ واجب تھا۔تو آپ ﷺ نے ان کو ان کا حق نہ دے کر بھوکا کیوں رکھا۔اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تقلید میں ازواج مطہرات نے بھی اختیاری طور پر فقر و فاقہ کو پسند فرمایا تھا۔اور جب پیغمبر خدا کو فقر و فاقہ پسند تھا تو آپ ﷺ کی پاک بیبیوں کو کیونکر پسند نہ ہوتا۔ان کو دنیا کی رنگینیوں سے کیا واسطہ؟ بلکہ خود نبی کریم ﷺ نے ان کو اللہ تعالیٰ کے کہنے پر اختیار بھی دیا تھا کہ اگر وہ چاہیں طلاق لے لیں۔قرآن مجید نے خود اس کا اعلان فرمایا۔ارشاد ہے کہ **یـا ایّهـا الـنبـیّ قل لأزواجک ان کنتنّ تردن الحیوة الدنیا وزینتها فتعالین امتّعکنّ واسرّحکنّ سراحاً جمیلاً**(احزاب ص۲۸)

ترجمہ: اے نبی ﷺ کہہ دے اپنی بیویوں کو اگر تم چاہتی ہو دنیا کی زندگی اور اس کی رونق۔تو آؤ تمہیں کچھ فائدہ پہنچاؤں اور رخصت کر دوں تم کو خوبصورتی کے ساتھ۔

لیکن انہوں نے دنیوی آسائشوں کو خیر باد کہہ کر نبی کریم ﷺ کے ساتھ فاقے گزارنے کو ترجیح دی۔تو گویا خود انہوں نے اپنی مرضی سے نبی کریم ﷺ کو اپنا یہ حق معاف کر دیا تھا۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ان پاک بیبیوں کو اپنا حق کامل دے دیا کرتے تھے۔جو آپ ﷺ کو ملتا تھا بیبیوں کو ان کا نفقہ اس میں سے دیدیتے تھے۔لیکن وہ بھی ایسی کشادہ دل واقع ہوئی تھیں۔کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں صدقہ کر دیتی تھیں۔اور ضرورت کی چیز بھی ذخیرہ نہیں کرتی تھیں۔اس لئے وہ ان فاقوں میں آپ ﷺ کی شریک رہیں۔اگر حضرت عائشہؓ اور دیگر ازواج مطہرات کی سخاوت، کشادہ دستی اور قناعت پر نظر ڈالی جائے۔تو حیرت ہو جاتی ہے۔

تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نفقہ میں نبی کریم ﷺ ایک چیز نہیں دیتے تھے۔بلکہ کھجور، جو، گندم

وغیرہ جو بھی میسر آتا دے دیتے تھے۔اوران میں سے کسی چیز کی مقدار اتنی نہیں ہوتی تھی کہ مسلسل دودن تک اسے پیٹ بھر کر کھایا جاسکے۔لیکن ان توجیہات کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔اصل بات وہی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے اہل خانہ نے اپنی مرضی سے لذات وخواہشات کو ترک فرمایا تھا۔اور فقر وفاقہ اور قناعت کی زندگی بسر کرنے کو پسند کیا تھا(۱)۔

ضیاع رزق سے احتراز

(۲) حدّثنا عبّاس بن محمّد الدوریّ ثنا یحییٰ بن أبی بکیر ثنا حریز بن عثمان عن سلیم بن عامر قال سمعت أبا أمامة الباھلیّ یقول ما کان یفضل عن أھل بیت رسول اللّٰہ ﷺ خبز الشعیر(۲).

ترجمہ: حضرت ابوامامہ باہلیؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے گھر والوں سے (کھانا کھانے کے بعد) جو کی روٹی نہیں بچتی تھی۔

سمعت أبا أمامةؓ الخ: حضرت ابوامامہ باھلیؓ مشہور صحابی ہیں۔مکثرین فی الحدیث میں سے ہیں۔پہلے مصر اور پھر حمص میں اقامت اختیار کی۔اور وہیں ۸۶ھ میں اکانوے سال کی عمر میں وفات پائی۔

اشکال اور اس کا جواب: (۱) ایک اشکال یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض روایات میں تو تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے اہل خانہ کو سال بھر کا نفقہ عنایت فرمایا کرتے تھے۔تو پھر یہ فاقہ کشی کیسے ممکن تھی۔بظاہر ان دونوں روایات میں تعارض ہے؟

ازالہ: تو اس اشکال اور تعارض کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) پہلا جواب یہ ہے کہ بعض اہل علم نے اس حدیث لفظ ال کو زائد کو مانا ہے۔مطلب یہ کہ یہ فاقہ کشی آنحضرت ﷺ کیا کرتے تھے۔اور یہ روایت آپ ﷺ کی ذات اقدس کی ترجمان ہے۔(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ تو اپنی طرف سے ازواج مطہرات کو ایک سال کا نفقہ دیا کرتے تھے۔مگر ازواج مطہرات شوق ثواب سے اس کو صدقہ کرتی تھیں۔ اس لئے علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے **ولا ینافی ذالک أنّہ کان یدخر فی آخر حیاتہ قوت سنة لعیالہ لأنّہ کان یعرض لہ حاجة المحتاج فیخرج فیھا ماکان یدّخرہ(المواھب اللدنیة۱۱۵)** (۳) شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے اس کی دو توجیہات کی ہیں (۱) یہ کہ سال بھر کا نفقہ اس حساب سے ہو کہ مسلسل دودن کی روٹی کا حساب نہ بیٹھتا ہو بلکہ کبھی روٹی، کبھی کھجور اور کبھی فاقہ (۲) دوسری توجیہ یہ ہے کہ وہ نفقہ کیا عجب ہے کہ کھجوریں ہی ہوں اس حدیث میں اس کی نفی نہیں بلکہ یہاں تو صرف روٹی کی نفی ہے۔(مختار)

(۲) جامع ترمذی ۲/۶۱ کتاب الزھد باب ماجاء فی معیشة النبی ﷺ، مسنداحمد ۵/۲۵۳(مختار)

مـا کان یفضل الخ جو کی روٹی بھی گھر میں فاضل نہ بچتی۔ بلکہ جب ملتی تو صرف گزارے کی حد تک میسر ہوتی تھی۔اورقـوت لایـموت میں بچ جانے کی توقع ہی کب کی جاسکتی ہے۔آج کل تو ہمارے ہاں آدھا کھانا بچ کر گل سڑ جاتا ہے۔ جو کہ اسلام میں ناپسندیدہ بات ہے۔زیادہ کھانے کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے آپ کے ہاں تھوڑا کھانا پکتا تھا۔ یا پھر اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی آپ کے ہاں کچھ زیادہ اوراضافی کھانا پکتا تو بھی وہ گھر میں بچا کر نہیں رکھا جاتا۔لیکن اول الذکر توجیہ بہتر ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریمﷺ کے دسترخوان سے آپﷺ کی وفات تک روٹی کا کوئی ٹکڑا نہ اٹھایا جاسکا۔ومارفع عن مائدته کسرة قط.(مسنداحمد ۶/ ۱۵۶)

(۳) حدّثنا عبداللّٰہ بن معاویة الجمحیّ ثنا ثابت بن یزید عن هلال بـن خبـاب عـن عکرمة عن ابن عباسؓ قال کان رسول اللّٰہﷺ یبیت الـلیـالـیّ المتتابعة طاویاً هو وأهله لا یجدون عشاء و کان أکثر خبزهم خبز الشعیر(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمﷺ اوران کے گھر والے متعدد راتیں مسلسل بھوکے گزار دیتے تھے۔کہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔اور(جوملتا) تو اکثر جو کی روٹی ہوتی تھی۔

طاویاً الخ طـوی الـرّجـل کے معنی ہیں وہ شخص بھوکا رہا۔اس طرح طاویا کے معنی ہوتے ہیں بھوکا۔یا پھر تقدیر عبارت یوں ہے''طـاویـاً کشـحه' علی الجوع ''یعنی پیٹ میں بھوک کو سمیٹ لیا کرتے تھے۔

اپنی بھی یہی حالت ہوتی تھی۔اور گھر والوں کی بھی کہ شام کو کھانے کی کوئی بھی چیز نہیں ملی۔اور بھوکے سو گئے۔ پھر بھی استغناء وقناعت کا یہ حال تھا کہ سوال تو کجا، آپﷺ کی طرف سے یا اہل بیت کی طرف سے کسی پر یہ ظاہر بھی نہیں ہوتا تھا۔ورنہ ظاہر ہے کہ آپﷺ کی یہ حالت اغنیاء تو درکنار فقراء صحابہ

---

(۱)جـامـع تـرمـذی ۲/ ۶۱ کتـاب الـزهدباب ماجاء فی معیشة النبیﷺ،سنن ابن ماجة ۱/ ۲۴۸ کتاب الاطعمة باب خبز الشعیر، (مختار)

کے لئے بھی قابل برداشت نہ ہوتی۔ لایجدون عشاء عشاء عین کے فتحہ کے ساتھ شام کے کھانے کو کہا جاتا ہے۔ اکثر خبزهم الخ مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات گندم کی روٹی بھی مل جاتی لیکن اکثر جو کی روٹی ہوتی تھی۔ اوراس میں آپ ﷺ اور ازواج مطہرات ؓ کی قناعت کا کمال ہے۔

<u>چھانے بغیر روٹی</u>

(۴) حدثنا عبدالله بن عبدالرحمٰن ثنا عبید الله بن عبدالمجید الحنفی ثنا عبدالرحمٰن و هو ابن عبدالله بن دینار ثنا أبو حازم عن سهل بن سعد انّه قیل له أكل رسول الله ﷺ النقیّ یعنی الحواریّ فقال سهل مارأی رسول الله ﷺ النقیّ حتی لقی الله تعالیٰ فقیل له هل كانت لكم مناخل علی عهد رسول الله ﷺ قال ما كانت لنا مناخل فقیل كیف كنتم تصنعون بالشعیر قال كنّا ننفخه فیطیر منه ما طارثمّ نعجنه(۱).

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے کسی نے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی خالص آٹے یعنی سفید میدے کی روٹی کھائی ہے؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے زندگی بھر وفات تک سفید میدہ دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا حضور ﷺ کے زمانہ میں آپ کے ہاں چھلنیاں ہوتی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس چھلنیاں نہیں تھیں۔ سائل نے پھر پوچھا کہ (چھلنیوں کے بغیر) تم لوگ جو کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے تھے؟ تو حضرت سہلؓ نے جواب دیا کہ جو میں ہم پھونک مار دیتے تھے۔ تو اس کے موٹے موٹے تنکے بھوسہ اڑ جاتا تھا۔ باقی آٹا گوندکر پکا لیتے تھے۔

---

(۱) جامع ترمذی ۲/ ۶۱ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة النبیّ ﷺ، صحیح بخاری کتاب الاطعمة باب النفخ فی الشعیر ۲/ ۸۱۴، ۸۱۵، سنن ابن ماجة کتاب الاطعمه باب خبز الشعیر ۱/ ۲۴۷ (مختار)

سهل بن سعدؓ: ابو العباس سہل بن سعد بن مالکؓ بن خالد ساعدی انصاری خزرجی صحابی ہیں۔ان کے والد بھی صحابی ہیں۔اصلی نام حزن تھا۔نبی کریمﷺ نے تبدیل کر کے سہل نام رکھا۔وفاتِ نبوی کے وقت ان کی عمر پندرہ برس تھی۔۸۸ھ یا ۹۱ھ میں وفات پائی۔مدینہ میں وفات پانے والے صحابہ میں آپ آخری صحابی ہیں۔

یعنی الحوّاری یعنی سائل کی مرادنقی سے حوّاری ہے۔جو واو مشددہ اور الف مقصورہ کے ساتھ میدہ اور خوب چھنے ہوئے آٹے کو کہتے ہیں۔حور سے بنا ہے جس کے معنی سفیدی ہیں۔اور چھاننے کے بعد آٹا بالکل سفید ہو جاتا ہے۔

ما رأیٰ کھانا تو کجا آپﷺ نے چھنا ہوا آٹا دیکھا بھی نہ تھا۔بعض شرّاح نے لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ شام کے اسفار میں آپﷺ نے میدے کی روٹی دیکھی اور کھائی ہو۔خصوصاً بحیرا راہب کی ضیافت کے دوران۔کیونکہ شام میں آٹا چھاننے کا رواج زمانہ قدیم سے تھا۔لہٰذا یہاں پر بعد النبوۃ کی قید ضروری ہے۔اور اسی وجہ سے بخاری شریف کی روایت میں یہ قید موجود ہے کہ **ما رأیٰ رسول اللہﷺ منخلا من حین بعثة اللّٰه حتی قبضه**(۱)۔ یعنی بعثت کے بعد آپﷺ نے چھلنی نہیں دیکھی تھی۔

لیکن چونکہ یہ محض احتمال کی بنیاد پر کہا جاتا ہے۔حقیقی رؤیۃ کی کوئی دلیل نہیں۔نیز حضرت سہلؓ کی یہ نفی خود حضرت سہلؓ کے علم کی بنیاد پر وارد ہے۔اور ان کے علم کے مطابق یہ نفی کلی ہے۔لہٰذا اشکال وارد ہی نہیں ہوتا(۲)۔

هل كانت لكم مناخل الخ مناخل منخل کی جمع ہے۔جو کہ میم کے ضمہ کے ساتھ چھلنی کو کہتے ہیں۔حضرت سہلؓ سے جب سوال کیا گیا کہ کیا عام روزمرہ کے استعمال میں آپ لوگوں کے ہاں چھلنی موجود تھی؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ ہمارے ہاں چھلنیاں زیر استعمال نہیں تھیں۔اسی وجہ سے بعض اکابر کا مقولہ ہے ''**اوّل بدعة فی الاسلام المناخل**'' یعنی اسلام میں پہلی بدعت چھلنی کا استعمال تھا۔جو صحابہؓ کے

---

(۱) بخاری جلد۲ ص ۸۱۵ (کتاب الاطعمة باب علی ما کان النبی ﷺ و أصحابه یأ کلون) (مختار)

(۲) اس لئے شیخ الجواد الرومیؒ نے فرمایا ہے کہ ولکنّ سهلاً لم ینف الأکل فقط بل نفی الرؤیة کذالک (الاتحافات ۲۰۵) (مختار)

دور میں رائج ہوا تھا۔لیکن یہاں بدعت کے معنی بدعت سیئہ نہیں جو نا جائز ہے۔ بلکہ مطلقاً جدت کے معنی میں مستعمل ہے۔

کیف کنتم تصنعون بالشعیر یعنی گندم کا آٹا تو چھانے بغیر بھی کھایا جا سکتا ہے۔لیکن چھلنی نہ ہوتے ہوئے جو کا آٹا کیسے کھاتے تھے۔**کنّا ننفخه الخ** یعنی جو (کوکوٹ کر) پہلے اس میں پھونک مار دیتے تھے۔جو بھوسہ تنکے ہوتے اڑ جاتے۔اور جو باقی بچتا اسے گوندھ کر کھا لیتے تھے۔

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ آٹا چھان کر کھانا جائز نہیں ہے۔یہ تو فقط نبی کریم ﷺ کے فقر کا بیان ہے۔اور ترجمۃ الباب سے مطابقت بھی واضح ہے۔

<u>میز نما خوانوں اور پر تکلف برتنوں سے پرہیز</u>

(۵) حدّثنا محمّد بن بشّار أنا معاذ بن هشام قال ثنی أبی عن یونس عن قتادة عن انس بن مالکؓ قال ما اکل النّبیّ اللّٰه ﷺ علی خوان ولا فی سکرّجة ولا خبزله مرقّق قال فقلت لقتادة فعلی ما کانوا یاکلون قال علی هذه السفر قال محمّد بن بشّار یونس هذا الذی روی عن قتادة هو یونس الأسکاف(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی میز نما خوان پر یا چھوٹی پلیٹوں میں کھانا نہیں کھایا۔نہ کبھی آپ ﷺ کی خاطر نرم چپاتی پکائی جاتی تھی۔ یونسؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت قتادہؒ سے پوچھا کہ پھر صحابہ کس چیز پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے۔تو انہوں نے کہا کہ انہی چمڑے کے دستر خوان پر (امام ترمذی کے شیخ) محمد بن بشارؒ کہتے ہیں کہ یونسؒ جو قتادہؒ سے روایت کرتے ہیں وہ یونس اسکاف ہیں۔

ما أکل علی خوان عجم کے عیاش امراء میز نما خوانوں پر رکھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔تا کہ کھانے کے وقت بھی سرنگوں نہ ہونا پڑے۔آپ ﷺ نے اس طرز سے اجتناب کرتے ہوئے عملاً ایسا نہ

---

(۱)صحیح بخاری ۲/۸۱۱ کتاب الاطعمة باب الخبز المرقق والاکل علی الخوان، سنن ابن ماجة ۱/۲۴۴ کتاب الاطعمة باب الاکل علی الخوان والسفرة، (مختار)

کرنے کی تعلیم دی۔ کیونکہ اس میں تکبر کے ساتھ ساتھ تشبہ بالکفار کی علت بھی تھی۔

ولا فی سکرجة الخ سکرجہ اس چھوٹے برتن یا پلیٹ کو کہتے ہیں جس میں عموماً مشہی اور مرغوب غذا ڈال کر کھائی جاتی ہے(۱)۔ جس طرح کہ آج کل بھی یہ رواج ہے کہ درمیان میں کھانے کا ڈونگا یا بڑا برتن رکھا ہوتا ہے۔ اور ارد گرد چھوٹی پلیٹیں ہوتی ہیں۔ جن میں کھانا ڈال کر لوگ کھاتے ہیں یا پھر اگر نفیس اور عمدہ قسم کے کھانے مثلاً اچار، چٹنی اور فرنی وغیرہ ہو تو چھوٹی پلیٹوں میں ڈال کر کھانے والوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ نبی کریم ﷺ پُر تکلف کھانوں سے دور رہتے تھے۔ اس لیے پلیٹوں کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ مزید یہ کہ عموماً عربوں کے ہاں اور پھر بالخصوص نبی کریم ﷺ کے ہاں ایک برتن میں شریک ہو کر اکٹھا کھانا کھاتے تھے جو چھوٹی رکابیوں میں ممکن نہیں ہوتا۔

<u>چھوٹی موٹی روٹی:</u> **ولا خبزله مرقق** نہ آپ ﷺ کے لیے نرم چپاتیاں پکائی گئیں۔ مرقق چھوٹی اور پتلی روٹیوں کو کہتے ہیں۔ جیسے ہندوستانیوں کے ہاں پکانے کا رواج ہے۔ اسے رقاق بھی کہا جاتا ہے۔ اگر گندم کا آٹا خوب نرم اور چھنا ہوا ہو تو اس سے چپاتی پکائی جاسکتی ہے۔ جبکہ مکئی وغیرہ کے آٹے سے مرقق یعنی پتلی چپاتیاں نہیں پک سکتیں۔ اسی طرح اگر گندم کے آٹے میں بھوسی ہو تو پتلی روٹی نہیں پکائی جا سکتی۔ بہر حال نبی کریم ﷺ کی روٹی موٹی ہوتی تھی۔ اور وہ بھی دوسرے شرکاء کے ساتھ اکٹھے اور نیچے بیٹھ کر کھاتے تھے۔ میز کرسی کے تکلفات آپ ﷺ کے ہاں نہیں تھے۔ جیسے کہ حضرت یونسؒ کے استفسار پر حضرت قتادہؒ کہتے ہیں کہ "**علی هذه السُفر**" سُفر سفرة کی جمع (۲) ہے۔ اور حقیقت میں یہ چمڑے کا

---

(۱)قال ابن العربیؒ: اناءٌ صغیر یوضع فیه الشئی القلیل المشهی للطعام الهاضم له کا لسلطة والمخلل. (المواهب الدنیة ص۱۷۷)(مختار)

(۱)جمع سفرة وفی النهایة هی فی الاصل طعام یتخذه المسافر والغالب انّه یحمله فی جلد مستدیر فنقل اسمه الی ذالک الجلد(جمع الوسائل) جبکہ علامہ بیجوریؒ اور علامہ مناویؒ نے چمڑے کے گول دستر خوان کا نام سفرہ رکھنے کی وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ "**تضم وتنفرج فتسفر عمّافیها**" یعنی اس کے کھلتے ہی یہ اپنے اندر کی چیزوں کا استفار اور اظہار کر دیتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے سُفرہ کہا گیا۔ جس طرح کہ سفر کو اسی لئے سفر کہا گیا کہ اس میں مسافر کے اخلاق کا کامل مظاہرہ ہو جاتا ہے۔ نیز نامعلوم مقامات اور احوال سے واسطہ پڑ کر ان کا علم ہو جاتا ہے

(اصلاح الدین)

دسترخوان ہوتا ہے جس پر لوگ کھایا کرتے تھے۔جیسا شاعر نے کہا کہ ؎ سفرۂ زمین خوان اوست ایسی سادگی کی زندگی میں برکتیں ہوتی ہیں۔ہم اور ہمارے طلبہ نے جب سے سادگی اور جفاکشی کی زندگی ترک کردی ہے۔برکتیں بھی ساتھ چھوڑ گئی ہیں۔**یونس الاسکاف** امام ترمذیؒ ایک راوی کا تعارف کرا رہے ہیں۔اسکاف موچی کو کہتے ہیں۔گویا پیشہ کے لحاظ سے وہ موچی تھے۔اور چونکہ مصنف نے اس راوی کی صرف یہی ایک حدیث روایت کی ہے۔اس لئے تعین وتعارف کی ضرورت پیش آئی۔

(۲) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا عبّاد بن عبّاد المهلبی عن مجالد عن الشعبیّ عن مسروق قال دخلت علی عائشة فدعت لی بطعام و قالت ما أشبع من طعام فاشاء ان أبکی إلاّبکیت قال قلت لم قالت اذکر الحال التی فارق علیها رسول اللّٰه ﷺ الدنیا و اللّٰه ما شبع من خبزو لحم مرّتین فی یوم واحد(۱) .

ترجمہ: حضرت مسروقؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس گیا۔انہوں نے میرے لئے کھانا منگایا۔اور فرمایا میں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھائی۔مگر میرا دل رونے کو چاہتا ہے تب میں رولیتی ہوں۔مسروقؒ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ یہ کیوں؟ آپؓ نے فرمایا کہ مجھے نبی کریم ﷺ کی وہ حالت یاد آجاتی ہے جس پر وہ دنیا سے تشریف لے گئے۔(وہ یہ کہ) خدا کی قسم آپ ﷺ نے کبھی بھی ایک دن میں دو بار روٹی اور گوشت سے پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔

مسروق یہ مشہور صحابی ہیں۔حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بھانجے لگتے ہیں۔کہتے ہیں کہ بچپن میں اسے چرایا گیا تھا۔اور بعد میں پائے گئے۔وفات نبوی ﷺ سے قبل اسلام لائے۔اور صدرِاول کے صحابہ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔۶۲ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔

حضرت عائشہ کا ضبط سے بندھن ٹوٹ جانا: **فاشاء ان ابکی الخ** علامہ مناویؒ لکھتے ہیں کہ یہ دراصل حضرت عائشہؓ کی طرف سے گویا اعتذار سا ہے۔کہ مہمان نوازی کے اصول کے مطابق میں

(۱) جامع ترمذی ۲/۶۱ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة النبی ﷺ (مختار)

بھی کھانے میں شریک ہوتی تا کہ مہمان بے تکلفی کے ساتھ کھائے۔لیکن میں یہ اہتمام نہیں کرسکتی۔اس لئے کہ میں جب کوئی اچھا کھانا پیٹ بھر کر کھاؤں۔تو دل بھر جاتا ہے اور رونا چاہوں تو رو لیتی ہوں۔اور جب حضرت مسروقؒ نے اس کا سبب پوچھا۔تو آپؓ نے فرمایا **اذکر الحال التی الخ** یعنی پیٹ بھر کر کھانے کے بعد وہ فقر و فاقہ اور بھوک یاد آجاتی ہے جس میں نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے چلے تھے۔پھر یہ حزن و ملال اور افسوس مجھے اپنی گرفت میں لے کر یہ احساس دلاتا ہے۔کہ ہم فقر و فاقے کی اس محمود و محبوب روایت کو کیوں برقرار نہ رکھ سکے۔اور آج اس مرتبہ عالیہ سے ہم کیوں محروم رہے۔لہٰذا رونا آجاتا ہے۔

ما شبع الخ یعنی اگر شاذ و نادر ایک وقت پیٹ بھر کر کھانے کو مل بھی جاتا تو دوسرے وقت کھانا نہیں ملتا تھا۔اور سردار دو جہاں ﷺ کی یہ تکلیف اور فقر و فاقہ یاد کر کے حضرت عائشہؓ کا رونا بے محل نہیں تھا۔کیونکہ انہوں نے اس تکلیف کا مشاہدہ کیا تھا۔اس کا تصور کر کے تو بہت دور کے لوگوں کا بھی دل بھر جاتا ہے۔یوں اس آخری جملے میں رونے کی ایک اور وجہ کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔

(۷) حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داود قال ثنا شعبة عن أبی إسحاق قال سمعت عبدالرحمٰن بن یزید یحدّث عن الأسود بن یزید عن عائشةؓ قال ما شبع رسول اللهﷺ من خبز شعیر یومین متتابعین حتّٰی قبض(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی جو کی روٹی دو دن مسلسل پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔

یومین متتابعین حتی قبض الخ یہاں پر ایام کے ساتھ لیالی بھی مراد ہیں۔یعنی دو دن رات مسلسل پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔بخاری شریف کی ایک حدیث میں تین دنوں کا بھی ذکر موجود ہے۔لیکن وہاں **خبز الشعیر** کی بجائے **خبز البُر** کا ذکر ہے۔حدیث کی تشریح باب کی پہلی حدیث کے ضمن میں گزر چکی

---

(۱)صحیح مسلم کتاب الزهد والرقائق ۲/۴۱۷، جامع ترمذی ابواب الزهد باب ماجاء فی معیشة النبیّ ﷺ واهله ۲/۶۱ (مختار)

ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں آل محمد ﷺ کا ذکر تھا۔اور یہاں خود نبی کریم ﷺ کی بات ہو رہی ہے۔

(۸) حدّثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن ثنا عبداللّٰہ بن عمرو أبو معمر ثنا عبدالوارث عن سعید بن أبی عروبة عن قتادة عن أنس قال ما اکل رسول اللّٰہ ﷺ علی خوان و لا اکل خبزا مرقّقا حتّیٰ مات(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی بھی خوان پر کھانا تناول نہیں فرمایا۔اور نہ نرم چپاتی کھائی یہاں تک کہ آپ ﷺ وفات پائے۔

و لا اکل خبزا مرققا الخ مرقق کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔اس حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ آپ ﷺ نے مرقق (نرم) چپاتی نہیں کھائی ہے۔خواہ وہ آپ ﷺ کے سوا کسی اور کے لیے کیوں نہ پکی ہو۔جبکہ اس سے پہلے آپ ﷺ کے لیے پکانے کی نفی کی گئی تھی۔آپ ﷺ کے کھانے کی نفی نہیں تھی۔ (صلی اللہ علی نبیہ محمد والہ واصحابہ اجمعین)

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کی روٹی اور کھانے میں سادگی کا بیان ہے۔نبی کریم ﷺ کی زندگی فقر اختیاری کا بہترین نمونہ تھی۔عموماً فاقہ کشی رہتی تھی۔روٹی ملتی تو عموماً گندم کی نہیں ہوتی تھی۔جو کی ہوتی تھی وہ بھی بغیر چھنے ہوئے آٹے سے پکتی تھی۔بلکہ چھنا ہوا آٹا تو آپ ﷺ نے دیکھا بھی نہ تھا۔پھر جو روٹی ملتی وہ بھی قوت لایموت کی حد تک۔دستر خوان پر کچھ بھی نہ بچتا تھا۔

پھر کھانے کے لیے تکلفات بالکل نہیں ہوتے تھے۔میز نہ کرسی،پلیٹیں نہ چمچ۔سادہ دستر خوان بچھا کر اکٹھے کھانا کھانے کا رواج تھا۔حتیٰ کہ حضور ﷺ کی اس سلسلے میں سادگی بلکہ جفا کشی کو یاد کر کے فاقہ کشی میں شریک عائشہ صدیقہؓ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے تھے۔اور آنسو بے قابو ہو جاتے تھے۔

---

(۱)صحیح بخاری ۲/ ۹۵۵ کتاب الرقاق باب فضل الفقراء، جامع ترمذی ۲/ ۱ ۶ کتاب الزھد باب ماجاء فی معیشة النبیﷺ،(مختار)

۲۶. باب ما جاء فی إدام رسول اللهﷺ

حضور اقدسﷺ کے سالنوں کا بیان

إدام کے مفہوم کی تحقیق: اس باب میں سالنوں کا بیان ہے جو نبی کریمﷺ استعمال کر چکے ہیں(۱)۔ ادام کے مفہوم کے بارے میں شیخینؒ اور امام محمدؒ کے درمیان اختلاف فقہ کی کتابوں میں قسم کے ابواب میں مذکور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ادام وہ چیز ہے جس میں صباغۃ اور اصطباغ کا معنی ہو۔ اور روٹی کے ساتھ تبعاً کھائی جا سکے۔ یوں کہ روٹی کے ساتھ گھل مل جائے۔ جیسے شوربہ، سرکہ وغیرہ یا وہ چیز جو اصالۃً نہ کھائی جائے جیسے نمک وغیرہ۔ بالاستقلال کھائی جانے والی چیزیں ادام نہیں ہیں۔ جیسے گوشت، پنیر اور انڈا وغیرہ۔ جبکہ امام محمدؒ اور ایک قول کے مطابق امام ابو یوسفؒ بھی کہتے ہیں کہ إدام مؤادمة بمعنی موافقة سے مأخوذ ہے۔ لہٰذا روٹی کے ساتھ جو چیز بھی کھانے میں موافق ہو۔ وہ سب ادام ہے۔ تو گوشت، پیاز اور گڑ وغیرہ ادام میں داخل ہو جائیں گے۔ بہر حال اس قول کا دارومدار عرف پر ہوگا۔ کہیں کوئی چیز روٹی کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ وہاں وہ ادام ہوگی۔ دوسری جگہ وہی چیز ادام نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ صفت اس میں نہیں ہوگی۔

امام ترمذیؒ کا میلان بھی اس قول کی طرف معلوم ہو رہا ہے۔ کیونکہ اس باب میں وہ تمام چیزیں ذکر ہوں گی جن کو آپﷺ نے روٹی کی متابعت میں تناول فرمایا ہے۔ مثلاً گوشت، پنیر، روغن زیتون وغیرہ۔ بلکہ کھجور اور ککڑی کا بھی ذکر موجود ہے۔ گویا امام ترمذیؒ کے ہاں جس چیز میں بھی توافق اور تبعیۃ کا معنی موجود ہو۔ وہ ادام ہے۔ اس باب میں امام ترمذیؒ تینتیس (۳۳) احادیث لا رہے ہیں۔

---

(۱) اس لئے کہ رسول اللہﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جو بھی غذا میسر ہوتی تناول فرماتے تھے۔ حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کان هديه ﷺ وسيرته فى الطعام لايرّد موجوداً ولايتكلف مفقوداً فماقرب اليه شئ من الطيّبات إلاّ أكله إلاّن تعافه نفسه فيتركه من تحريم وماعاب طعاماً قط ان اشتهاه اكله وإلاّتركه(زادالمعاد ۱/۵۳)(مختار)

(۱) حدثنا محمّد بن سهل بن عسكرو عبدالله بن عبدالرحمٰن قالا ثنا يحيى بن حسّان ثنا سليمان بن بلال عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشةؓ أنّ رسول اللهﷺ قال نعم الإ دام الخلّ قال عبدالله بن عبدالرحمٰن فی حديثه نعم الادم او الإدام الخلّ(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ سرکہ اچھا سالن ہے۔(ترمذیؒ کے شیخ) عبداللہ بن عبدالرحمٰنؒ نے اپنی روایت میں "**نعم الادام او نعم الادم**" کہا ہے۔

نعم الادام الخل یعنی سرکہ بھی بطور ادام استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ دوسرے سالنوں کی طرح یہ بھی ایک پسندیدہ سالن ہے۔ لہٰذا جس گھر میں یہ موجود ہے۔ اس گھر والے یہ نہ کہیں کہ گھر میں سالن نہیں۔ بلکہ سرکہ کو بطور سالن استعمال کریں۔ اور روزانہ مرغن اور تکلفات بھرے سالنوں کی بجائے سرکہ پر قناعت کریں۔

سرکہ اچھا یا سب سے اچھا: اس تشریح کے مطابق یہاں سرکہ کی افضلیت کا بیان مقصود نہیں۔ بلکہ صرف اس کی مدح مقصود ہے۔ اور اس مدح سے غرض یا تو ان نادار قسم کے لوگوں کو قناعت کی تعلیم دینا ہے۔ جن کو صرف سرکہ ہی بطور سالن میسر ہے۔ یا پھر ان لوگوں کی تطییب خاطر کے لیے حضورﷺ نے یہ کلمات کہے ہیں۔ جو کبھی سرکہ بطور ہدیہ پیش کر چکے ہیں۔ تا کہ ان کو ہدیہ کی بے قدری کا احساس نہ ہو۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ آپﷺ نے جب اپنے گھر میں ادام کی فرمائش کی تو گھر والوں نے صرف سرکہ کی موجودگی کی خبر دیدی۔ اس پر آپﷺ نے گھر والوں کی تسلی اور خاطر داری کیلئے اس پر اکتفاء کی تلقین فرمائی ہو۔ اس توضیح کے مطابق اب اس اعتراض کا محل باقی نہیں رہتا کہ احادیث مبارکہ میں آتا ہے کہ آپﷺ طعام کی مدح سرائی نہیں کرتے تھے(۲)۔ تو یہاں سرکہ کی مدح کیوں فرمائی ہے۔ جواب یہ

(۱) صحیح مسلم ۲/۱۸۲ کتاب الاشربة باب فضيلة الخل، جامع الترمذی ۲/۶ كتاب الاطعمة باب ماجاء فی الخل، سنن ابن ماجة ص ۲۴۶ ابواب الاطعمة باب الايتدام بالخل(مختار)

(۲) غير أنّه لم يكن يذمّ ذواقا ولا يمدحه(شمائل ترمذی باب كيف كان كلام رسول اللهﷺ.(اصلاح الدين)

ہے کہ طعام کی مدح اشراف اور لالچ کے خوف سے نہیں فرماتے تھے اور اگر کوئی اور مدعا مقصود نظر ہو تو طعام کی مدح کوئی معصیت نہیں ہے۔ جبکہ بعض دیگر شرّاح کے بقول آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سرکہ کی دوسرے سالنوں سے افضلیت کو واضح کر رہا ہے۔ اور یہی مقصود ہے کہ سرکہ دیگر اداموں کی نسبت بہتر سالن ہے۔

سرکہ میں اچھائی کا پہلو یہ ہے کہ دوسری قسم کے سالنوں میں گھی، مصالحہ وغیرہ لوازمات کے ساتھ ساتھ ایک معتد بہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ آگ، برتنوں اور آلات کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ سرکہ تیار سالن ہے۔ بنانے میں محنت نہیں کرنی پڑتی۔ وقت اور پیسہ بھی کم صرف ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں علمائے طب نے سرکہ کے کچھ ایسے فوائد کا ذکر کیا ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلا پیٹ کے کیڑوں کے لیے مفید ہے، زہریلے مواد کو ختم کر دیتا ہے، تیزابیت کو مٹاتا ہے، نیز گرم ہوا اور لو کے مضر اثرات کا ازالہ کرتا ہے۔ اس طرح کے بعض دیگر خواص کی وجہ سے مختلف زمانوں میں مختلف انداز سے ڈاکٹروں نے آپ ﷺ کے اس قول کی تائید و تصویب کی ہے۔

علامہ ابن حجرؒ نے اس بات کو رد کیا ہے کہ حدیث شریف سرکہ کی دوسری سالنوں کی نسبت افضلیت پر محمول ہے۔ لیکن ملا علی قاریؒ نے ان پر رد کر کے اس قول کا دفاع کیا ہے(۱)۔ کیونکہ بعض دیگر احادیث بھی سرکہ کی افضلیت کی غماض ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں ہے۔ **نعم الادام الخلّ اللّھمّ بارک فی الخلّ**(۲). سرکہ بہترین سالن ہے۔ اے اللہ اس میں برکت عطا فرما۔ دوسری روایت میں آتا ہے **فإنّہ کان ادام الانبیاء من قبلی**(۳)۔ سرکہ مجھ سے قبل دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کا بھی سالن تھا۔

---

(۱)**قال النوویؒ والصوّاب الذی ینبغی أن یجزم بہ أنّہ مدح للخل نفسہ(عون المعبود۱۰/۲۱۵)(مختار)**

(۲)**قال الخطابیّ معنی ھذاالکلام مدح الاقتصادفی المأکل ومنع النفس عن ملاذالاطعمۃ کأنّہ یقول ائتدموابالخل وماکان فی معناہ مماتخف مؤونتہ ولایعزّوجودہ ولاتتأنقوافی الشھوات فإنّھا مفسدللدین مسقمۃ للبدن(عون المعبود۱۰/۲۱۵)** فقہاء کرام نے یہاں سے ایک مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ وہ سالن نہیں کھائے گا۔ پھر اس نے سرکہ کے ساتھ روٹی کھالی۔ تو اب یہ شخص حانث ہوگا۔ کیونکہ حدیث پاک میں سرکہ کو سالن کہا گیا ہے۔(مختار)

(۳)جمع الوسائل ص ۲۴۶

نعم الادام او الادم. اُدُم بضم الدال ادام کی جمع ہے۔تو اس روایت میں اس لفظ کو مفرد اور جمع دونوں طرح روایت کیا گیا ہے۔جبکہ اُدْم سکون دال کے ساتھ مفرد اور ادام کا ہم معنی لفظ ہے۔لیکن اِدام صرف مفرد ہے(۱)۔

(۲) حدثنا قتیبة ثنا أبو الأحوص عن سماک بن حرب قال سمعت النعمان بن بشیر یقول ألستم فی طعام و شراب ما شئتم لقد رأیت نبیکم و ما یجد من الدقل ما یملأ بطنه(۲).

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ کیا تم طعام وشراب کی خاطر خواہ نعمتوں میں نہیں ہو۔حالانکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا تھا۔کہ ان کے پاس ردی قسم کی کھجوریں بھی اتنی مقدار میں نہیں ہوتی تھیں جس سے آپ ﷺ اپنا پیٹ بھر سکیں۔

نعمان بن بشیرؓ انصاری خزرجی صحابی ہیں۔والدین بھی صحابیت کا شرف پا چکے ہیں۔ابو عبداللہ کنیت تھی۔یزید کے زمانہ میں حمص کے والی تھے۔شعر وشاعری کا ذوق بھی تھا۔۶۴ھ کے آخر میں جب مروان نے حکومت کے حصول کے لئے ضحاک فہری سے جنگ لڑی۔تو آپؓ ضحاک کی امداد کے لیے حمص سے نکلے۔اور ضحاک فہری کی طرح آپؓ کو بھی مروان کے ساتھیوں نے قتل کیا۔

ألستم فی طعام و شراب الخ (۳) یعنی کیا آج تم مزوں میں نہیں ہو کہ جو دل چاہے وہی کھانے کو ملے۔تمہارے پیغمبر ﷺ کو پیٹ بھر کر کھانے کیلئے رڈی کھجور بھی نہیں ملتی تھی۔یہ بات شاید آپ نے اپنی ولایت کے زمانہ میں اپنے مصاحب صحابہ یا تابعین کو تحدیث بالنعمۃ اور تذکیر بآلاء اللہ کے طور پر کہی ہوگی۔

---

(۱)الادام کل موافق و ملائم جمعه آدامٌ اُدُمٌ و الأُدم مایؤتدم به(منجد)(اصلاح الدین)

(۲)صحیح مسلم ۲/ ۴۰۱ کتاب الزهد والرقاق، جامع الترمذی ۲/ ۶۲ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة اصحاب النبیّ ﷺ ، سنن ابن ماجة ص ۳۰۶ باب معیشة آل محمد ﷺ(مختار)

(۳)علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے أی الستم متنعمین فی طعام و شراب بالمقدار الذی شئتم من السعة والافراط والخطاب للتابعین أو للصحابة بعده ﷺ والاستفهام للانکار و التوبیخ و القصد به الحثّ علی الاقتصار فی الطعام و الشراب علی أقل مایکفی کما کان ذلک شعار المصطفیٰ(المواهب اللدنیة ص ۱۰۵)(مختار)

دقل ردی قسم کی کھجور کو کہتے ہیں جب کھجوروں کے ڈھیر سے اوپر کی اچھی کھجوریں چن کر اٹھالی جائیں اور اخیر میں سوکھی، چھوٹی، اور بیکار قسم کی کھجوریں رہ جائیں۔ ان کو دقل کہا جاتا ہے۔

ترجمۃ الباب کے ساتھ اس حدیث کی مطابقت یہ ہے کہ ہر وقت یہ لازم نہیں کہ سالن اور دیگر تکلفات تک رسائی ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کچھ دیا ہو تو روٹی کے ساتھ کھالو، نہیں تو سوکھی روٹی پر گزارہ کر لینا۔ جیسا کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے عمل کو بیان کر کے شکر وقناعت کی تلقین کی گئی ہے۔ ہر وقت سالن وغیرہ کا تقاضا حضور ﷺ کی سنت کے خلاف ہے۔

(۳) حدّثنا عبدة بن عبداللّٰه الخزاعیّ ثنا معاویة بن هشام عن سفیٰن عن محارب بن دثار عن جابر بن عبداللّٰه قال قال رسول اللّٰه ﷺ نعم الإدام الخلّ(۱) .

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ سرکہ اچھا سالن ہے۔

نعم الادام الخل طبی خواص، آسانی کے ساتھ تیار، وقت اور اخراجات کی بچت کے اعتبار سے سرکہ کو اچھا سالن شمار کیا گیا ہے۔ حدیث کی مزید تشریح گزر چکی ہے۔

(۴) حدّثنا هنّاد ثنا وکیع عن سفیٰن عن ایّوب عن أبی قلابة عن زهدم الجرمیّ قال کنّا عند أبی موسٰی فاتی بلحم دجاج فتنحیّ رجل من القوم فقال ما لک قال انّی رأیتها تاکل شیئا نتنا فحلفت ان لا اٰکلها قال ادن فانّی رأیت رسول اللّٰه ﷺ یاکل لحم دجاج(۲).

---

(۱) جامع الترمذی ۲/۶ کتاب الاطعمة باب ماجاء فی الخل، سنن ابن ماجة ص ۲۳۸ کتاب الاطعمة باب الائتدام بالخل، سنن ابی داؤد ۲/۱۷۹ کتاب الاطعمة باب فی الخل،(مختار) قال البیجوریّ وهذا حدیث مشهور کادان یکون متواتراً(المواهب اللدنیة ص ۱۰۵)هکذافی جمع الوسائل ۱/۲۴۷ (مختار)

(۲) صحیح مسلم ۲/۴۶ کتاب الایمان باب ندب من حلف یمینا الخ، جامع ترمذی ۲/۴۴۶ کتاب الاطعمة باب ماجاء فی اکل الدجاج،

ترجمہ: حضرت زہدم کہتے ہیں کہ ہم حضرت موسیٰ اشعریؓ کے پاس تھے کہ (کھانے میں) مرغی کا گوشت لایا گیا۔ حاضر لوگوں میں سے ایک شخص کھانا چھوڑ کر ہٹ گیا۔ حضرت موسیٰؓ نے فرمایا کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے (کھانا چھوڑ دیا)۔ اس شخص نے عرض کیا کہ میں نے مرغی کو کوئی (گندی) چیز کھاتے دیکھا تھا۔ پس میں نے قسم کھائی ہے کہ مرغی کا گوشت نہیں کھاؤں گا۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے فرمایا۔ قریب آؤ (اور کھاؤ) کیونکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو مرغی کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

ابو موسیٰؓ اور زہدمؒ: ابو موسیٰ زہدم بن منصور کا تعلق جرم قبیلہ سے ہے۔ زہدم اکرم کے وزن پر اور جرم کا جیم مفتوح اور راء ساکن ہے۔ بصری ثقہ تابعی ہیں۔

ابو موسیٰ أشعریؓ بڑے صحابہ میں سے ہے۔ نام عبداللہ بن قیس ہے۔ یمن کے اشعر قبیلہ سے تعلق ہے۔ جو حسن صورت میں مشہور ہے۔ مکہ میں اسلام کے بعد حبشہ کو ہجرت کی۔ اور فتح خیبر کے موقعہ پر اصحاب السفینہ کے ساتھ واپس تشریف لائے ۲۱ھ میں بصرہ کے گورنر مقرر ہوئے۔ اور اہواز کا علاقہ آپ کی ولایت کے دوران فتح ہوا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بصرہ کی ولایت سے معزول کئے گئے۔ اور کوفہ کے والی مقرر ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حکومت سے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور مکہ آکر مستقل رہائش اختیار کی۔ ذی الحجہ ۴۴ھ میں وفات پائی (**شذرات الذهب**) جبکہ ملا علی قاریؒ نے تاریخ وفات ۵۲ھ لکھی ہے (مرقات ج ۱ ص ۷۸)

كنّا عند أبي موسىٰ الأشعريؓ الخ یہ واقعہ بظاہر حکمرانی کے زمانہ کا ہے۔ جب آپؓ کے پاس عموماً مہمان آیا کرتے تھے۔ **فاتى بلحم دجاج** دجاج کے دال پر تینوں حرکات پڑھنا جائز ہے۔ لیکن فتحہ افصح ہے۔ دجاجۃ کی جمع ہے یعنی دستر خوان پر مرغی کا گوشت بھی رکھا گیا۔ جسے دیکھ کر بنو تیم اللہ کے آدمی (۲) نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور حضرت ابو موسیٰؓ کے استفسار پر یہ عذر پیش کیا کہ میں نے ایک بار

---

(۱) علامہ مناویؒ نے لکھا ہے **وفيه مشروعية اجتماع القوم عند صديقهم (المناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/۲۴۸) (مختار)**

(۲) بعض شراح نے یہاں ذکر ہونے والے شخص کو زہدم ہی قرار دیا ہے۔ لیکن اکثر شراح نے اس پر رد کیا ہے۔ کیونکہ آنے والی دوسری روایت میں زہدم نے اس شخص کا نسب اور حلیہ بیان کیا ہے۔ اگر وہ زہدم ہوتا تو اس بیان کی گنجائش نہیں بنتی۔ لیکن اس کے باوجود علامہ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ نے بوجوہ اس پر اصرار کیا ہے۔ یہ کہ زہدم جرمی ہی ہیں۔ (اصلاح الدین)

مرغ کو دیکھا تھا کہ وہ گندی وناپاک چیزیں کھا رہا تھا۔اس روز سے قسم کھا چکا ہوں۔کہ مرغ کا گوشت نہیں کھاؤں گا۔گویا کہ طبعی کراہت (۱) کا عذر پیش کیا۔اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ میزبان اگر دیکھے کہ مہمان کھانا نہیں کھاتا تو اس کا سبب دریافت کرے تا کہ کوئی ظاہری سبب ہو۔تو اس کا ازالہ کرے۔**فقال ادن ا لخ** حضرت ابوموسیٰؓ نے نبی کریم ﷺ کے عمل کا حوالہ دیتے ہوئے گوشت کھانے کی دوبارہ دعوت دیدی کہ جب نبی کریم ﷺ نے تناول فرمایا ہے تو تم نے اپنے آپ پر اسے کیوں حرام کیا ہے۔قرآن مجید میں ایسے ہی موقع کے لیے تنبیہاً ارشاد ہے **لم تحرّم ما احلّ اللّٰہ لک (الایۃ)** یعنی وہ چیزیں خود پر تم کیوں حرام کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے حلال کر دی ہیں۔

مباح شرعی کو ضروری نہیں کہ تم استعمال کرو۔لیکن اس کے ساتھ تحریم کا معاملہ کرنا خلاف شرع ہے۔ بلکہ حلال چیزوں سے قسم کھانے کے بعد شرعی حکم یہی ہے کہ قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دینا چاہیے (۲)۔یہاں بھی صحابی نے اپنے ساتھی کو قسم توڑنے کا مشورہ دیا ہے۔اور اس کا کفارہ بھی وہ یقیناً دے چکے ہونگے۔

اس حدیث میں ترجمۃ الباب سے تعلق اس بات میں ہے کہ راوی کے قول کے مطابق نبی کریم ﷺ نے مرغی کا سالن اور گوشت بھی تناول فرمایا ہے۔مرغی کا گوشت اور سالن بہت مفید ہے۔علماء طب نے بھی اس کے متعدد فوائد لکھے ہیں۔اس میں رطوبت کے ساتھ حرارت بھی ہے۔زود ہضم ہے۔ تازہ خون کی افزائش کرتا ہے۔اخلاط کی اصلاح کرتا ہے۔دماغ کو فائدہ دیتا ہے۔اعضاء رئیسہ اور عقل کو بھی تقویت دیتا ہے۔نیز قوت باہ کے لیے بھی مفید ہے۔آواز کو صاف اور رنگ کو حسن وجلا بخشتا ہے۔

لیکن نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ مرغ نہیں کھایا۔بلکہ یہ تو کسی خاص موقع کا ذکر ہے۔محض اتفاق

---

(۱) بعض شرّاح نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذکور شخص نے شرعی عذر یعنی جلالہ سمجھ کر مرغی کھانے سے قسم کھائی تھی لیکن ملاعلی قاری وغیرہ نے اس پر رد کیا ہے (راجع جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۴۸) (اصلاح الدین)

(۲) **عن عبدالرحمان بن سمرہ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ اذا حلفت علی یمین فرایت غیر ھا خیرا منھا فکفر عن یمینک و آت الذی ھو خیر (مشکوٰۃ ۲/ ۲۹۶)(مختار)**

سے یا کسی دعوت میں پیش کیا گیا تھا۔اور آپ ﷺ نے بطور سالن استعمال فرمایا تھا(۱)۔

(۵) حدثنا الفضل بن سهل الأعرج البغدادیّ ثنا إبراهیم ابن عبدالرحمٰن بن مهدی عن إبراهیم بن عمر بن سفینة عن أبیه عن جدّه قال اکلت مع رسول اللّٰه ﷺ لحم حباری(۲).

ترجمہ: حضرت سفینہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حباریٰ کا گوشت کھایا ہے۔

حضرت سفینہؓ: عن جدّه ابراہیمؒ کے دادا کا نام حضرت سفینہ ہے جو حدیث کے راوی اور جلیل القدر صحابی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔اصل نام مہران یا کچھ اور تھا۔ابوعبدالرحمٰن کنیت تھی۔ایک سفر میں بہت سے لوگوں کا سامان اٹھا کر لے جارہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کی نظر پڑ گئی۔اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''أنت سفینه'' تم تو کشتی بنے ہو۔اس کے بعد یہ لقب پڑ گیا۔۰ ۷ھ کے بعد وفات پائی۔

لحم حباریٰ. حباری کے بہت سے مصداق بتائے جاتے ہیں۔اس کا اطلاق تیتر، چکور وغیرہ کے اقسام اور نوع پر ہوتا ہے۔جیسے فاختہ،قمری اور کبوتر وغیرہ قسم کے پرندوں پر حمامہ کا اطلاق ہوتا ہے۔اس وجہ سے حباری کی مصداق کی تعیین میں اختلاف واقع ہوا ہے۔اس کے مختلف معنی لئے گئے ہیں۔

---

(۱) البتہ وہ مرغی جو جلالہ ہو یعنی نجاست کھانے کی عادی ہو اس کے گوشت کے بارے میں علامہ خطابیؒ نے لکھا ہے واختلف الناس فی أکل لحوم الجلالة والبانها فکره ذلک اصحاب الرأی والشافعی واحمدابن حنبل وقالوا لایؤکل حتی تحبس أیاماً وتعلف علفاً غیرهافأذاطاب لحمها فلابأس بأکله وقدروی فی حدیث أن البقرتعلف أربعین یوماً ثم یؤکل لحمها وکان ابن عمریقول نجس الدجاجة ثلاثة أیام ثم تذبح وقال إسحٰق بن راهویة لابأس أن یؤکل لحمها بعد أن یغسل غسلاجیداً وکان الحسن البصری لایری بأسابأکل لحوم الجلالة وکذلک قال مالک بن أنس انتهی وقال ابن رسلان فی شرح السنن ولیس للحبس مدة مقدرة وعن بعضهم فی الإبل والبقرأربعین یوماً وفی الغنم سبعة أیام وفی الدجاجة ثلاثة اه.(عون المعبودشرح ابی داؤد ۱۰/ ۱۸۵)(مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۲/ ۱۷۶ کتاب الأطعمة باب أکل لحم الحباری، جامع ترمذی ۲/ ۴ کتاب الاطعمة باب ماجاء فی أکل الحباری وشرح السنة للبغوی ۱۱/ ۲۵۱،کتاب الصید باب اکل الدجاج والحباریٰ(مختار)

چکور، تیتر، سرخاب، تغذری اور تلور وغیرہ اس میں داخل ہیں۔لغت والوں میں صاحب منجد کہتے ہیں۔کہ ''حباری پالتو مرغی سے قدرے بڑے لمبی گردن والا پرندہ ہے۔حماقت کی وجہ سے مشہور ہے۔ایک جگہ انڈے دے کر جب وہاں سے چلا جاتا ہے۔تو واپسی میں اپنا گھونسلا بھول جاتا ہے اور کسی دوسرے حباری کے انڈوں پر بیٹھ کر اسے سینے سے لگاتا ہے۔اس کی متعدد قسمیں ہیں''

بعض لوگوں کے بقول یہ ایک خاکی رنگ کا صحرائی پرندہ ہے۔تیز رفتاری سے اڑتا ہے۔اور بہت تیز دوڑتا ہے۔خوراک کے حصول کے لیے بہت دور دور کا سفر بھی روزانہ کرتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اگر اس کے پر نکال لیے جائیں تو یہ شدتِ غم سے مرجاتا ہے اس کے پوٹے یا معدے میں ایک قسم کا پتھر کبھی کبھی ملتا ہے۔اگر وہ پتھر اس شخص کے گلے یا ہاتھ پر باندھ دیا جائے جسے کثرتِ احتلام کا عارضہ ہو تو احتلام نہیں ہوگا۔اور اگر اسہال کی شکایت ہو تو دست بند ہو جاتے ہیں۔اس کا گوشت گرم اور دیر سے ہضم ہونے والا ہے۔محنت کش لوگوں کے لیے اس کا کھانا مناسب ہے۔علامہ دمیریؒ نے **حیوۃ الحیوان** میں اس پر مزید بحث کی ہے آج کل کے عرف میں اس کا غالب استعمال تلور(۱) پر ہوتا ہے۔

(۲) حدّثنا علیّ بن حجر ثنا إسماعیل بن إبراهیم عن أیوب عن القاسم التیمی عن زهدم الجرمی قال کنّا عند أبی موسٰی قال فقدم طعامه وقدم فی طعامه لحم دجاج و فی القوم رجل من بنی تیم اللّٰه أحمر کانّه مولیٰ قال فلم یدن فقال له ابوموسٰی ادن فانّی قد رأیت رسول اللّٰه ﷺ اکل منه قال انّی رأیته یاکل شیئاً فقذرته فحلفت ان لاأطعمه ابداً(۲).

ترجمہ: حضرت زہدم جرمیؒ کہتے ہیں کہ ہم حضرت ابوموسیٰؓ کے پاس تھے کہ ان کا کھانا حاضر کیا گیا۔کھانے میں مرغی کا گوشت بھی پیش کیا گیا۔حاضرین میں بنوتیم

---

(۱) تلور کو پشتو زبان میں ''چاڑئے'' کہتے ہیں۔راقم الحروف نے اسے شکار بھی کیا ہے اور اسکا گوشت بھی کھایا ہے۔ (اصلاح الدین)

(۲) صحیح مسلم ۲/۴۷ کتاب الایمان باب ندب من حلف یمیناً الخ، جامع ترمذی ۲/ ۴۴۱ ابواب الاطعمة باب ماجاء فی أکل الدجاج(مختار)

اللہ کا ایک شخص بھی تھا۔ جس کا رنگ سرخ تھا۔ گویا وہ کوئی عجمی غلام ہو۔ وہ کھانے کے قریب نہ آیا۔ تو ابوموسیٰؓ نے اسے کہا کہ قریب آؤ۔ میں نے خود نبی کریم ﷺ کو اس کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس شخص نے کہا کہ میں نے تو مرغی کو ایک گندی چیز کھاتے دیکھا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے اس سے گھن آنے لگی۔ پس میں نے قسم کھائی کہ میں کبھی بھی اس کا گوشت نہیں چکھوں گا۔

وفی القوم رجل من بنی تیم الخ وہ شخص جس کا مبہم ذکر پچھلی حدیث میں ہو چکا ہے۔ یہاں پر اس عنوان سے مذکور ہے کہ وہ بنی تیم اللہ سے تھا۔ بنو تیم جو بنو بکر کا ایک بڑا قبیلہ ہے۔ مطلق مذکور ہے۔ لیکن یہاں بنو تیم اللہ مراد ہے۔ جو بنو تیم کی ایک شاخ ہے۔ **أحمر کانّہ مولی** گویا کہ وہ موالی میں سے تھا۔ اس کی رنگت رومی غلاموں جیسی سرخ تھی۔ باقی یہ وہی حدیث ہے جس میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی مجلس کا واقعہ بیان ہوا تھا۔ **قذرتہ** یعنی مجھے اس سے گھن اور کراہت آنے لگی۔

(۷) حدثنا محمود بن غیلان ثنا ابو أحمد الزبیریّ وأبو نعیم قال ثنا سفیان عن عبداللّٰہ بن عیسٰی عن رجل من أھل الشام یقال لہ عطاء عن أبی أسید قال قال رسول اللّٰہ ﷺ کلوا الزیت وادّھنوا بہ فانّہ من شجرۃ مبارکۃ(۱).

ترجمہ: حضرت ابواسیدؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ روغن زیتون کھایا کرو۔ اور اس سے مالش بھی کیا کرو۔ کیونکہ یہ مبارک درخت سے نکلا ہوا تیل ہے۔

أبی أسیدؓ عبداللہ بن ثابتؓ کی کنیت ہے۔ جو انصاری صحابی ہیں۔ مدینہ میں رہے ہیں۔ صرف یہی ایک حدیث ان سے مروی ہے۔ واضح رہے کہ ابی اسید الساعدیؓ ایک اور صحابی ہیں جو ان کی نسبت قدرے مشہور ہیں۔

---

(۱) جامع ترمذی ۲/۶ کتاب الأطعمۃ باب ماجاء فی أکل الزیت، السنن الکبریٰ للنسائی ۴/۱۶۳ کتاب الولیمۃ ابواب الأطعمۃ باب الزیت، دارمی ۲/۱۰۲ (مختار)

<u>زیتون کے فضائل:</u> **کلوا الزیت الخ** روغن زیتون کھایا کرو۔چونکہ روغن زیتون مائع چیز ہے۔کھایا نہیں جاتا۔لہٰذا یہاں پر مراد یہ ہے کہ اسے روٹی کے ساتھ ادام بنا کر کھاؤ۔اس طرح حدیث کی ترجمۃ الباب کے ساتھ مطابقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔اور ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے خود بھی روغن زیتون کا اسی طرح استعمال کیا ہوگا۔

فانّه من شجرة مباركة الخ ایک اور روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ **فانّه شفاء من سبعين داء منها الجزام** گویا یہ طبی فوائد کے لحاظ سے مفید ہے۔نیز وہ زمین بھی ارض انبیاء اور مبارک زمین ہے جہاں زیتون زیادہ ہوتا ہے۔قرآن مجید نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ **تخرج من طور سيناء تنبت بالدهن** زیتون کا درخت سینا کے کوہ طور میں اگتا ہے۔اور تیل دیتا ہے۔

بلکہ اس درخت کے مبارک ہونے کی تصریح کی ہے۔**من شجرة مباركة لا شرقيّة ولا غربيّة** کہ وہ تیل ایک بابرکت درخت کا ہے۔جو نہ مشرق کی جانب ہے اور نہ مغرب کی جانب (۱)۔

بہر حال اس درخت میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی برکتیں ڈالی ہیں۔تمام قدیم و جدید اطباء بھی اس کی افادیت پر متفق ہیں۔یورپی ممالک میں بھی بڑے اہتمام سے زیتون کا تیل تیار ہوتا ہے اور ڈبوں میں بند کیا جاتا ہے۔بہت سی بیماریوں میں بھی مفید ہے۔مغرب کے لوگ صبح کے وقت اسے بطور ناشتہ کھاتے ہیں جو وہاں بند ڈبوں میں ملتا ہے۔الغرض یہ کھانے کے کام بھی آتا ہے۔بطور علاج بھی مستعمل ہے۔اس کی لکڑی سے دباغت کا کام بھی لیا جاتا ہے۔علاوہ ازیں اس سے حاصل شدہ راکھ ریشم صاف کرنے کے کام آتا ہے۔اس کے ساتھ کچا ریشم دھویا جاتا ہے۔اس کے بعض درختوں کی عمر ہزار برس تک ہوتی ہے۔ابتداء چالیس سال کے بعد اس میں پھل لگتا ہے۔شاہ عبدالعزیزؒ نے تفسیر فتح العزیز میں "تین و زیتون" کے عجیب و غریب خصائص بیان فرمائے ہیں۔انہی کثیر منافع کی وجہ سے اسے شجرۃ مبارکہ کہا جاتا ہے۔علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سمیت ستر (۷۰) انبیاء کرام علیہم السلام نے اس درخت کیلئے برکت کی دعا فرمائی ہے۔

---

(۱) زیتون کے بارہ میں زیادہ تفصیل حضرت مولانا مدظلہ کے کتاب "اسلام کا نظام اکل وشرب" شرح ترمذی **ابواب الاطعمة والاشربة** میں دیکھیں۔(مختار)

کہا جاتا ہے کہ سانپ عموماً سردی کے موسم میں اندھا ہو جاتا ہے۔ سردی کا موسم گزرنے کے بعد وہ نکلتا ہے تو انجیر یا زیتون کے کسی درخت کے ساتھ آنکھیں مل لیتا ہے۔ جس سے اسکی بینائی عود کر آتی ہے۔ شراح کے بقول زمین پر ابتدائے وجود سے اور پھر طوفانِ نوح کے بعد پہلے اگنے والا درخت بھی زیتون کا تھا۔

(۸) حدّثنا یحییٰ بن موسیٰ ثنا عبدالرزاق ثنا معمر عن زید ابن أسلم عن أبیه عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ کلوا الزیت و ادّھنوا به فانّه من شجرة مبارکة(۱) قال ابو عیسیٰ و کان عبدالرزاق یضطرب فی ھذا الحدیث فربما اسنده و ربما ارسله.

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ روغن زیتون کھاؤ۔ اور اس سے مالش بھی کرو کیونکہ یہ مبارک درخت سے نکلتا ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ عبدالرزاقؒ اس حدیث کو اضطراب کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ وہ یہ کہ کبھی (حضرت عمرؓ کا ذکر کرکے) اسے مسند بیان کرتے اور کبھی (ان کے ذکر کے بغیر) اسے مرسل لاتے تھے۔

<u>حضرت عمر فاروق اعظمؓ کی شان:</u> **عن عمر** امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کے والد کا نام خطاب اور لقب فاروق تھا۔ عدوی قریشی صحابی ہیں۔ ابوحفص کنیت تھی۔ حضور ﷺ نے دعا کی تھی کہ عمرو بن ہشام (ابوجہل) اور عمر بن الخطابؓ میں سے کسی ایک کو اسلام نصیب ہو۔ یہ دعا آپؓ کے حق میں قبول ہوئی۔ اور ۵ نبوی اور ایک روایت کے مطابق نبوت کے چھٹے سال آپؓ اسلام لائے۔ آپؓ سے قبل ۳۳ مرد اور چھ عورتیں اسلام لا چکی تھیں۔ آپ چالیسویں مسلمان ٹھہرے اور پھر یہ آیت نازل ہوئی یا ایّھا النّبیّ حسبک اللّٰہ و من اتبعک من المؤمنین (الایة) بعض مؤرخین نے آپؓ سے قبل اسلام لانے والوں کی تعداد زیادہ ذکر کی ہے۔ حضرت حمزہؓ بھی آپؓ سے تین دن قبل اسلام لا چکے تھے۔ وہ بھی

---

(۱) جامع ترمذی ۲/۶ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی اکل الزیت، سنن ابن ماجة ص ۲۳۸ کتاب الاطعمة باب الزیت (مختار)

حضرت عمرؓ کی طرح شجاعت میں مشہور تھے۔ اور جب آپؓ بھی اسلام سے مشرف ہوئے تو نبی کریم ﷺ بہت خوش ہوئے۔ ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بے پناہ قوت اور حوصلہ ملا۔ اسی روز نبی کریم ﷺ حضرت عمرؓ کے مطالبہ پران کے اور حضرت حمزہؓ کی معیت میں مسجد حرام تشریف لے گئے۔ قریش نے دونوں کی مصاحبت دیکھی تو ان کو بہت دکھ ہوا۔ اور نبی کریم ﷺ نے اسی روز آپؓ کو فاروق کے لقب سے نوازا۔ آپؓ کے اسلام لانے کا واقعہ عجیب لیکن مشہور ہے۔ اسلام لانے کے بعد ہر موقع پر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش پیش رہے۔ مدینہ طیبہ کو ہجرت کرتے وقت اعلانیہ نکلے اور قریش کو للکار کر ہجرت کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات سے پہلے آپؓ کا نام لکھوا کر حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں لوگوں سے ان کے لیے بیعت لی۔ اور اس طرح صدیق اکبرؓ کے بعد آپ بالاتفاق خلیفہ مقرر ہوئے۔ سب سے پہلے امیر المؤمنین کا لقب بھی آپؓ کو ملا۔ تقریباً ساڑھے دس سال تک یہ خدمت انجام دی۔ اور اپنے رعب، تدبر، سیاسی بصیرت اور اصابۃ رائے سے اسلام کی اشاعت اور اسلامی حکومت کی توسیع میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپؓ کے مناقب کے احاطہ کے لیے کتابیں چاہئیں۔ کل ۹۳۵ اور ایک قول کے مطابق ۵۳۷ احادیث کی روایت آپؓ کے واسطہ سے ہوئی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے مجوسی غلام ابولولؤ نے آپؓ کو اس خراج میں تخفیف کی فرمائش کی جو وہ حضرت مغیرہؓ کو ادا کیا کرتا تھا۔ آپؓ نے اس کے مطالبہ کو نامعقول کہہ کر بھی حضرت مغیرہؓ سے اس کی سفارش کر دی۔ مگر ابولؤلوہ مطمئن نہ ہوا اور ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ کو اس کمبخت نے صبح کی نماز میں آپؓ پر خنجر سے حملہ کر دیا جس سے آپؓ شدید زخمی ہوئے اور انہی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے بعد میں آپؓ نے شہادت پائی۔

کلوا الزیت وادّھنوا بہ اس کی تفصیل گزشتہ حدیث میں گزر چکی ہے۔ **یضطرب فیہ عبدالرزاق الخ** یعنی عبدالرزاق سے اس روایت میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ جو یہ ہے کہ "**ربما اسندہ و ربما ارسلہ**" یعنی سند میں کبھی حضرت عمرؓ کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیتے ہیں۔

حدّثنا السِّنجی الخ پہلے جس اضطراب کا بیان ہوا۔ اسی کی وضاحت ہے کہ ایک سند کے ساتھ عبدالرزاق نے اس حدیث کو حضرت عمرؓ کے ذکر کے بغیر روایت کیا ہے۔

کدو کی محبوبیت

(۹) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا محمّد بن جعفر و عبدالرحمٰن ابن مهدی قال ثنا شعبة عن قتادة عن أنس بن مالک قال کان النبیّ ﷺ یعجبه الدباء فاتی بطعام او دعی له فجعلت اتتبعّه فاضعه بین یدیه لمّا اعلم أنّه یحبه(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو کدو بہت پسند تھا۔ایک دفعہ آپ ﷺ کے سامنے کھانا پیش کیا گیا یا (راوی نے یہ کہا کہ) آپ ﷺ کسی دعوت پر بلائے گئے۔ (کھانے میں کدو بھی تھا) میں کدو کے قتلے ڈھونڈ کر نبی کریم ﷺ کے سامنے رکھنے لگا۔کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ آپ ﷺ کدو پسند کرتے ہیں۔

یعجبه الدبآء دبآء دال کے ضمہ اور بآء مشددہ کے بعد الف ممدودہ کے ساتھ کدو کو کہتے ہیں۔ اسے عربی زبان میں قرع اور یقطین بھی کہا جاتا ہے۔آخر کا ہمزہ بعض لوگوں کے نزدیک اصلی، بعض کے ہاں زائدہ اور بعض کے خیال میں واو سے بدل کر آیا ہے۔

فجعلت اتتبعه یعنی آپ ﷺ کی پسند کا لحاظ کرتے ہوئے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر کدو کے ٹکڑے نکالتا۔اور خدمت اقدس میں پیش کرتا رہا۔

اس حدیث سے چند اہم باتیں مستنبط ہو رہی ہیں۔اول: یہ کہ کدو کا سالن شوربے کی قسم کا تھا۔اور اسلامی تعلیمات کے مطابق سالن میں پانی زیادہ ڈالنا مستحب ہے۔تاکہ پڑوسیوں اور دیگر اصحابِ ضرورت کا حصہ بھی ہو سکے۔دوم: یہ کہ کھانا اکٹھا کھانا مستحب ہے۔جس طرح کہ یہاں معلوم رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ کھانے میں متعدد افراد شریک تھے۔سوم: یہ کہ شیخ و مرشد اور استاد و بزرگ کی عزت و اکرام کے لئے ایثار کر کے اس کی پسندیدہ چیز اسے کھانے دی جائے۔اور اس کے ساتھ عقیدت و محبت کا

---

(۱)دارمی ۲/۱۰۱، شرح السنة للبغوی ۱۱/۳۰۵ کتاب الاطعمة، جامع الترمذی ۲/۶ ابواب الاطعمة باب المرق و الدباء (مختار)

مظاہرہ کرنا چاہیے۔ چہارم: یہ کہ نبی کریم ﷺ کو کدو بہت پسند تھا۔ اور یہ بات بہت اہم ہے جو اس حدیث سے بخوبی ظاہر ہو رہی ہے۔

کدو سے آپ ﷺ کی محبت کی ایک وجہ تو اس میں موجود بہت سے طبی فوائد ہیں۔ چنانچہ بقول اطباء اس میں برودت ہے اور عقل اور دماغی قوتوں میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ علاوہ ازیں کدو کا پودا وہی پودا ہے جس نے حضرت یونس علیہ السلام کو اس وقت گرمی اور سردی سے بچانے کے لیے اپنی آغوش میں جگہ دی۔ جب پہلے پہل مچھلی کے پیٹ سے آپ نکلے۔ گویا کہ وہ حضرت یونسؑ کی ماں کے مرتبہ میں ہے۔ اور یونسؑ اور آپ ﷺ میں اخوت کا رشتہ ہے۔ انہی وجوہ کی بناء پر نبی کریم ﷺ نے کدو کو بنظر محبت دیکھا تھا۔

<u>محبوب کی ہر اداء سے محبت</u>: پھر جن لوگوں کا نبی کریم ﷺ سے عشق کا تعلق ہے وہ لوگ بھی ہر دور میں کدو سے ایک محبوب جیسا معاملہ کرتے ہیں۔ خود حضرت انسؓ جب بصرہ میں مقیم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی جائیداد باغات اور زمینیں دی تھیں۔ آپ کدو بڑے اہتمام کے ساتھ کاشت کرتے تھے۔ اور پھر کدو کے پودے کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کیا کرتے تھے۔

یالک من شجرة ما احبّک إلیّ لحبّ رسول اللہ ﷺ ایّاکِ(۱).

ترجمہ: اے پودے تو نبی کریم ﷺ کی محبوبیت کی وجہ سے مجھے کتنا عزیز ہے۔

یہ اتباعِ سنت، عشق نبوی ﷺ اور حقیقی محبت کی دنیا ہے۔ عقل و خرد کے دعویدار تو علامات، یادگاروں اور نسبتوں کے قائل نہیں۔ لیکن یہ خشک مزاج اور قشر پرست فلسفی کیا جانیں کہ عشق کیا ہوتا ہے۔ اور محبوب کی طرف منسوب حقیر ترین چیز بھی عاشق کو کیوں عزیز ہوتی ہے۔ مجنون لیلیٰ کی گلی میں کتے کے پاؤں کو چومتا ہے اور فرہاد کو دودھ کی نہر نکالنے کی کیوں سوجھی۔ ع

عاشقاں را مذہب و ملت جدا است

<u>کدو کی تحقیر کی سزا</u>: ہارون الرشید بڑے جاہ وجلال کے بادشاہ تھے۔ کسی نے دربار میں ایک حدیث پیش کی کہ نبی کریم ﷺ کو کدو بہت پسند تھا۔ درباریوں میں سے ایک بدماغ نے تیوری چڑھائی

(۱) جامع ترمذی ۲/۶ ابواب الاطعمة باب ماجاء فی اکل الدبّآء (مختار)

بولا کہ کدو بھی کوئی چیز ہے یہ تو بالکل بے مزہ چیز ہے۔حدیث کے مقابلے میں اس بد بخت کا یہ قول سنتے ہی حضرت امام ابو یوسفؒ نے جو دربار میں موجود تھے۔فرمایا ’’النطع و السیف ‘‘یعنی تلوار اور وہ کھال جسے بچھا کر دربار میں قتل کیا جاتا ہے لے آؤ۔

آزادئ عدلیہ کی ایک مثال: عدالت اور عدلیہ کی آزادی اسی کا نام ہے۔جس کی مثال اسلامی حکومتیں صدیوں تک پیش کر چکی ہیں۔اور وہی حقیقی چیف جسٹس ہوتا ہے جس کے سامنے ساری انتظامیہ ہیچ تھی۔ خلیفہ وقت بھی عدالت کے سامنے جواب دہ ہوتا تھا۔حضرت علیؓ، قاضی شریحؒ کی عدالت میں ایک مقدمہ کے سلسلے میں حاضر ہوئے۔قاضی صاحبؒ کو اسے اپنے پاس بٹھانا چاہئے تھا۔لیکن وہ تو کجا جب قاضی شریحؒ نے اکراماً کنیت سے خطاب کرتے ہوئے یا ابا الحسن کہا۔تو آپؓ کا رنگ فق ہو گیا۔اور اگرچہ مقدمہ اقلیت کے ایک فرد اور ایک یہودی کے ساتھ تھا۔لیکن عدالت کی نظر میں جب وہ اسلامی حکومت کا شہری ہے تو اس میں اور دوسرے مسلمان میں کوئی تمیز نہیں۔خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب اور کسی بھی قوم سے ہو۔

بہر حال عدالت نے فیصلہ یہودی کے حق میں دیا۔لیکن عدالت برخاست ہونے کے بعد ہی قاضی شریحؒ نے حضرت علیؓ کو اپنے پاس بٹھایا۔عزت و اکرام سے نوازا۔اور پوچھا کہ جب عدالت میں میں نے آپؓ مخاطب کیا تو آپ کا رنگ کیوں متغیر ہوا۔شاید اس لئے کہ ایک یہودی کے ساتھ آپ عدالت کے کٹھرے میں کھڑے تھے۔انہوں نے فرمایا کہ نہیں۔بلکہ جب تم نے مجھے کنیت سے پکارا تو مجھے یہ خوف ہوا کہ یہودی کو اس سے تکلیف ہوئی ہوگی۔اس کے دل میں یہ بات آ گئی ہوگی کہ اسلام کے نظام عدل میں یہ عیب ہے کہ اپنوں کو معزز نام سے پکارا جاتا ہے۔میں چاہتا تھا کہ تم مجھے علی کہہ کر پکارتے۔

بہر حال حضرت امام ابو یوسفؒ نے فیصلہ دیا کہ اس شخص کو بھرے دربار میں قتل کیا جائے کیونکہ اس نے حضور ﷺ کی حدیث کے مقابلے میں ناک بھوں چڑھائی ہے۔جس کی وجہ سے وہ کفر کی حد میں پہنچ گیا ہے۔مگر بعد میں توبہ سے اس کی جان بخشی ہوئی۔

(۱۰) حدّثنا قتيبة بن سعيد ثنا حفص بن غياث عن إسماعيل بن أبي خالد عن حكيم بن جابر عن أبيه قال دخلت على النبيّ ﷺ فرأيت

عنده دباء یقطع فقلت ماهذا قال نکثر به طعامنا (۱) قال ابو عیسیٰ و جابر هذا هو جابر بن طارق و یقال ابن أبی طارق وهو رجل من أصحاب رسول اللهﷺ ولا یعرف له إلاّ هذا الحدیث الواحد و أبو خالد اسمه سعد.

ترجمہ: جابر بن الطارقؓ سے روایت ہے کہ میں نبی کریمﷺ کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کدو کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کئے جارہے تھے۔ میں نے عرض کیا۔ یہ کیا ہے؟ فرمایا اس طرح ہم اپنے سالن میں اضافہ کرتے ہیں۔

امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ جابر جو یہاں مذکور ہے۔ وہ جابر بن الطارقؓ ہیں۔ اور کبھی جابر بن ابی الطارق بھی بولا جاتا ہے۔ وہ صحابہ میں سے ہیں۔ اور صرف یہی ایک حدیث ہی ان کی معروف ہے۔ نیز (اسماعیل کے والد) ابوخالد کا نام سعدؓ ہے۔

حکیم بن جابر الخ جابر بن الطارق صحابی ہیں۔ کبھی دادا کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ تو جابر بن ابی الطارق بھی کہا جاتا ہے۔ ابی الطارق کا نام نافق ہے۔ جابرؓ احمسی صحابی ہیں۔ ان کا کچھ تعارف امام ترمذیؒ اسلئے کرتے ہیں کہ عموماً جابر کا ذکر ہو تو مشہور صحابی حضرت جابر بن عبداللہؓ مراد لئے جاتے ہیں۔ جو یہاں مراد نہیں۔ جابر بن الطارقؓ کے بیٹے حکیم تابعی ہیں جو ۸۶ھ میں اور ایک قول کے مطابق ۹۲ھ میں وفات پائے۔

فرأیت عنده الدباء یقطع یعنی میں نے دیکھا کہ سالن کی تیاری ہورہی ہے۔ لیکن خلاف معمول کدو کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا جاتا ہے۔ اور جب میں نے عرض کیا کہ کدو کو اتنا چھوٹا کیوں کاٹا جارہا ہے۔ تو جواب ملا۔ **نکثر به طعامنا** یعنی سالن میں زیادتی کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اور سالن مقدار سے قدرے زیادہ ہو تو بہتر ہے۔ کیونکہ اگر کبھی اچانک مسافر، مہمان یا فقیر مسکین آجائے تو ان کا کام بھی چل جاتا ہے۔ نیز پڑوسیوں کو بھی اس میں سے حصہ دیا جاسکتا ہے۔ **الحدیث** اس لفظ کو مرفوع اور

(۱) السنن الکبریٰ للنسائی ۴/۱۵۶ کتاب الولیمة ابواب الاطعمة باب تکثیر الطعام بالقرع، سنن ابن ماجة ص۲۳۷ کتاب الاطعمة باب الدباء، شرح السنة للبغوی ۱۱/۳۰۵ کتاب الاطعمة، باب المرق والدباء (مختار)

منصوب دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ کیونکہ یُعرَفُ مجہول کا صیغہ اور نَعرِفُ اور نَعْرِف معروف کے صیغے تینوں میں جائز ہیں۔ مؤخر الذکر صورت میں فاعل کا ضمیر راوی کی طرف راجح ہوگا اور الحدیث مفعول بہ منصوب ہوگا۔

(۱۱) حدثنا قتیبة بن سعید عن مالک ابن انس عن اسحاق بن عبداللّٰہ بن أبی طلحة انه سمع أنس بن مالک یقول إنّ خیّاطاً دعا رسول اللّٰہ ﷺ لطعام صنعه فقال أنس فذهبت مع رسول اللّٰہ ﷺ إلیٰ ذلک الطعام فقرب إلیٰ رسول اللّٰہ ﷺ خبزا من شعیر و مرقافیه دباء و قدید قال انس فرأیت النّبیّ ﷺ یتتبع الدباء حوالی الصحفة فلم ازل أحبّ الدباء من یومئذ(۱).

غریبوں اور پیشہ وروں کی عزت

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک درزی نے نبی کریم ﷺ کو کھانے پر بلایا۔ جو اس نے (آپ ﷺ کے لیے) تیار کیا تھا۔ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں بھی نبی کریم ﷺ کے ہمراہ اس کھانے کے لیے گیا۔ نبی کریم ﷺ کے لیے جو کی روٹی اور شوربہ پیش کیا گیا۔ جس میں کدو اور گوشت کے ٹکڑے تھے۔ تب میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا۔ کہ شوربہ کے برتن کے ہر طرف سے کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے کھا رہے ہیں۔ اس دن سے لے کر ہمیشہ مجھے کدو محبوب رہا۔

انّ خیّاطا الخ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ شخص نبی کریم ﷺ کے غلام تھے۔ اس سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ پیشوں اور دنیوی امتیازات کا لحاظ کئے بغیر ہر چاہنے والے کی دعوت قبول فرماتے تھے۔ کیونکہ اسلام میں جائز پیشوں میں سے کسی پیشے کی وجہ سے تحقیر جائز نہیں۔ نیز اس پر بھی تنبیہ ہے کہ امیروں کی دعوت قبول کرنے کے ساتھ ساتھ غریبوں کا لحاظ بھی ہونا چاہئے۔ اور موچیوں اور درزیوں

(۱) صحیح بخاری ۱/۲۸۱ کتاب البیوع باب الخیاط، صحیح مسلم ۱/۱۸۰ کتاب الأشربة باب جواز الأکل السرق الخ سنن ابی داؤد ۲/۱۷۴ کتاب الأطعمة باب فی أکل الدباء، جامع ترمذی ۲/۶ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی أکل الدباء (مختار)

وغیرہ کی دعوت سے احتراز کرنا ٹھیک نہیں۔ذھبت معه چونکہ حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ کے خاص خادم تھے۔اس لئے ساتھ تشریف لے گئے۔اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ خادم خاص اتباع میں شمار ہوتا ہے جیسے آج کل بھی کوئی معزز شخص اپنے سیکرٹری یا کسی خاص شاگرد کو اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے۔اگر چہ اس کو دعوت نہ بھی دی ہو کیونکہ عرفاً اس کی اجازت ہوتی ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ دعوت دینے والے نے حضرت انسؓ کو بھی دعوت دی ہو۔کیونکہ ان کو پتہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کی خصوصی خدمت کے لیے حضرت انسؓ ہی زیادہ مناسب ہیں۔مرقافیه دباء و قدید یعنی اس سالن میں کدو اور گوشت کے تراشے پکائے گئے تھے۔قد کے معنی طولاً کاٹنے کے ہیں۔اس لئے قدید کے معنی مقدد یعنی طولاً کٹے ہوئے گوشت کے ٹکڑے ہونگے۔جو کہ عموماً نمک لگا کر دھوپ میں سکھانے کے لیے رکھ دیئے جاتے ہیں۔حدیث کے اسی حصے میں ترجمۃ الباب سے مطابقت واضح ہے۔تتبع الدباء یعنی نبی کریم ﷺ برتن کے مختلف اطراف سے کدو کے ٹکڑے تلاش کرتے رہے۔

<u>ایک اشکال اور جواب:</u> اب ایک اشکال یہ ہے کہ کھانے کے آداب کے سلسلے میں خود نبی کریم ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ کل مما یلیک یعنی اپنے سامنے سے کھاؤ۔جبکہ یہاں خود نبی کریم ﷺ کا عمل اس کے خلاف ہے۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام پر نبی کریم ﷺ مہمانِ خصوصی ہیں۔یہ سارا کاسۂ طعام انہی کے لیے تو رکھا گیا ہے۔نیز آپ کے اس طرح بلا تکلف کھانے سے میزبان کو مزید مسرت اور اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ مہمان کی بے تکلفی عرف میں میزبان پر احسان ہوتا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ اپنے سامنے سے کھانے کے حکم میں راز یہ ہے کہ کبھی دوسروں کے کھائے ہوئے کھانے سے طبعی طور پر کراہت ہوتی ہے۔اس لیے دوسروں کے آگے سے کھانے سے منع کیا گیا ہے۔لیکن یہ علت نبی کریم ﷺ کے جھوٹے (سور) میں بالکل مفقود ہے۔بلکہ اسے ہمیشہ محبوب اور باعث برکت وشفا تصور کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں کبھی کبھی دوسروں کے آگے سے کھانے میں دوسرے شرکائے طعام یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شخص زیادہ کیوں کھاتا ہے جو کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر چیزیں کھاتا ہے۔لیکن استاد، مرشد اور پیغمبر کے اس قسم کے عمل سے عموماً ہر شریک طعام کو مسرت ہوتی ہے۔لہٰذا ہمارے لئے تو اس طرح کی تلاش ٹھیک

نہیں جبکہ نبی کریم ﷺ کے اس عمل میں کوئی حرج نہیں۔

صحفۃ: صحفۃ اس برتن کو کہتے ہیں جس میں پانچ آدمیوں کا کھانا رکھا جا سکے۔ بعض نسخوں میں قصعہ کا لفظ آیا ہے جس میں دس آدمیوں کے لیے پیٹ بھر کر کھانے کے لیے کوئی چیز رکھی جا سکتی ہے۔

فلم ازل أحبّ الدباء من يومئذ. محبوب کی ہر ادا پسند ہوتی ہے۔ یہی محبت کا تقاضا اور حقیقی محبت کی دلیل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ نے مصلحتوں، معاشرتی اقدار اور رواجی پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر حضور ﷺ کی سنتوں کو محبوب رکھا۔ کاش ہمیں بھی حقیقی محبت کی لذت آشنائی نصیب ہوتی۔

حضور ﷺ کی میٹھی چیز سے محبت:

(۱۲) حدثنا أحمد بن إبراهيم الدورقيّ و سلمة بن شبيب و محمود بن غيلان قالوا أنا أبو أسامة عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة قالت كان النبيّ ﷺ يحبّ الحلواء و العسل(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو میٹھی چیز اور شہد پسند تھا۔

حلوا سے کیا مراد ہے:

يحبّ الحلواء و العسل حلوا سے مراد ہمارے ہاں کا معروف حلوا نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ کھانا ہے جس کو میٹھا بنانے میں انسانی صنعت اور کاریگری کا دخل ہو۔ اس تشریح کے مطابق شہد حلوا نہیں ہے اور عطف بلاشبہ درست ہوگا۔

جبکہ بہت سے شراح نے حلوا کی تشریح ''كل مافيه حلاوة'' سے کی ہے یعنی ہر وہ چیز جو میٹھی ہو۔ حلوا ہے۔

---

(۱) صحيح بخاری ۲/۸۱۶ كتاب الأطعمة باب الحلواء والعسل، صحيح مسلم ۱/۴۷۸ كتاب الطلاق باب وجوب الكفارة على من حرّم إمرته، سنن ابی داؤد ۲/۱۶۶ كتاب الأشربة باب فی شرب العسل، جامع ترمذی ۲/۵ كتاب الأطعمة باب ماجاء فی حب النبیّ ﷺ الحلواء والعسل، ابن ماجة ۲/۵ كتاب الأطعمة باب الحلواء(مختار)

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص تندرست، معتدل القویٰ اور توانا ہو۔ فطری طور پر اس کا دل عام کھانے کے بعد میٹھی چیز کو چاہتا ہے۔ لہٰذا یہ نبی کریم ﷺ کے حسنِ صحت، اعتدال قویٰ اور صحیح المزاج ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ کھٹی اور کڑوی چیزیں فاسد اخلاط کے لوگوں کو مرغوب ہوتی ہیں۔

نبی کریم ﷺ شیرین اشیاء کو پسند فرماتے تھے۔ لیکن یہ رغبت کثرت تشہی کی وجہ سے نہ تھی۔ نہ ہر وقت میٹھی چیزوں کی خواہش ستاتی رہتی۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ فطرت سلیمہ میٹھی چیزوں کی طرف راغب تھی۔ اور یہ بات زہد و تقویٰ کے منافی بھی نہیں ہے کہ کسی کا دل میٹھی چیزوں یا دوسرے اعلیٰ کھانوں کو پسند کرے۔ وہ بزرگ ولی اور پیغمبر بھی ہو سکتا ہے۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ مذکورہ معنی کو لے کر شہد بھی حلواء کے ضمن میں آتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ خصوصی اور بہت اہم میٹھی چیز ہے بلکہ تمام شیرینیوں کا سرچشمہ ہے۔ ان حلاوتوں کے برعکس جن میں انسان کی صنعت کو دخل ہوتا ہے۔ یہ اعلیٰ قسم کی مٹھاس خود اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرتِ کاملہ کی صنعت کا مظہر ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید نے ''فيه شفاء للناس (الاية)'' کا عظیم مرتبہ اسی حلاوت کو دیا ہے۔ اس لئے راوی نے اسے بطور خاص ذکر کیا۔ اور یہ عطف الخاص على العام للاهتمام کے قبیلہ سے ہوگا۔

(۱۳) حدّثنا الحسن بن محمّد الزعفرانی أنا حجّاج بن محمّد قال قال ابن جريج أخبرنی محمّد بن يوسف أنّ عطاء بن يسار أخبره أنّ امّ سلمة أخبرته أنّها قربت إلىٰ رسول اللّٰه ﷺ جنبا مشويّاً فاكل منه ثمّ قام إلىٰ الصلٰوة و ما توضّأ(۱).

ترجمہ: ام المومنین حضرت ام سلمہ کہتی ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو بھنا ہوا پہلو کا گوشت پیش کیا۔ آپ ﷺ نے تناول فرمایا پھر آپ ﷺ نماز پڑھنے کے لیے اٹھے۔ اور وضوء کی تجدید نہیں کی۔

---

(۱) جامع ترمذی ۵/۲ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی اكل الشواء، السنن الكبرىٰ للبيهقی ۱/۱۵۴ کتاب الطهارة، شرح السنة للبغوی ۱۱/۲۹۲ کتاب الأطعمة باب اكل الشواء (مختار)

فطرت انسانی اور گوشت خوری: جنبا مشویاً بغل سے نیچے پہلو کو جنب کہتے ہیں۔ یہاں پر پسلیاں اور اس کا گوشت مراد ہے۔ جسے بھون کر حضرت ام سلمہؓ نے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اور آپ ﷺ نے کھایا تھا۔ امام ترمذیؒ اس پر تنبیہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے گوشت کو بطور ادام تناول فرمایا تھا۔ اور گوشت کھانا فطرت انسانی کی صحت وسلامت کی دلیل ہے۔ کم فہم اور کج فطرت لوگ ہی اس سے انکار کر سکتے ہیں۔ ایک حدیث میں گوشت کو "سیّد طعام اهل الجنة" اور ایک اور روایت میں "سیّد طعام اهل الدنیا و الآخرة" کہا گیا ہے(۱)۔ اور اس کے کھانے میں بہت سے طبی فوائد اور حکمتیں ہیں۔ جس پر ہم ان شاء اللہ آگے بحث کریں گے۔ البتہ گوشت کا بہت زیادہ استعمال کبھی کبھی امراض کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ اس لیے حکیم بقراط کا قول ہے کہ "لا تجعلوا بطونكم مقابر للحيوان (۲)" یعنی پیٹ کو حیوانات کا مقبرہ نہ بناؤ۔

وضوء مماست النار: ماتوضآ یعنی آگ پر پکی ہوئی چیز کھا کر بھی آپ ﷺ نے وضو کی تجدید نہیں کی(۳)۔ جس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ "مامسته النار" کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اور یہی خلفائے راشدین، ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کا مسلک ہے(۴)۔ اور وہ احادیث جن سے آگ پر پختہ چیزیں

(۱) وقد روی ابن ماجة وغيره بسند ضعيف اللحم سيد الطعام لاهل الدنيا والاخرة وله شواهد على سيد طعام اهل الدنيا اللحم والارز (جمع الوسائل ومناوی ج ۱ ص ۲۵۷) (مختار)

(۲) المواهب لدنيه ص ۱۲۵

(۳) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے قال المصنف حديث صحيح فيكون ناسخاً لحديث توضؤا مماسته النار (جمع الوسائل ۱/۲۵۸) (مختار)

(۴) قال العلامه البنوریؒ ذهب جمهور الصحابة والتابعين والائمة الاربعة إلى عدم وجوب الوضوء مماسته النار وروى مالک فی مؤطانه ذلک عن الخلفاء الاربعة الراشدين وكان فيه خلاف فى الصدر الاول ثم استقر الإجماع على عدم الوضوء منه حكاه فى فتح البارى عن النووى. ويقول الشاه ولى الله فى شرحه على المؤطا المسوىٰ والمصفىٰ (۱/۳۷) عامة اهل العلم على أن الوضؤ مماسته النار منسوخ (معارف السنن ۱/۲۸۷) قال ايضاً الخطابى فى معالم السنن (۱/۶۹) أحاديث الأمر محمول على الاستحباب لا الوجوب وحكاه الحافظ فى الفتح ايضا والأولىٰ أن يقال إنّه مستحب لخواص (معارف السنن ۱/۲۸۷) (مختار)

کھانے کے بعد وضوء ثابت ہورہا ہے یا تو منسوخ ہیں کیونکہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا وضوء نہ کرنا آخرالامرین ہے۔اوریا وہاں وضوء لغوی یعنی ہاتھ منہ دھونا مراد ہے۔

(۱۴) حدثنا قتیبة ثنا ابن لهیعة عن سلیمان بن زیاد عن عبداللّٰہ ابن الحارث قال اکلنا مع رسول اللّٰہ ﷺ شواء فی المسجد (۱).

ترجمہ: عبداللہ بن الحارثؓ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھنا ہوا گوشت مسجد میں کھایا۔

<u>عبداللّٰہ بن الحارثؓ</u>: بظاہر حضرت عبداللہ بن الحارث بن الجزء الزبیدیؓ مراد ہے جو <u>۸۶</u>ھ میں وفات پائے۔اور مصر میں وفات پانے والے صحابہ میں آخری صحابی ہیں۔

اکلنا مع رسول اللّٰہ ﷺ شواء شواء آگ کے ذریعے بھنے ہوئے گوشت کو کہتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہاں پر گوشت کے ساتھ روٹی بھی حاضر تھی۔لہٰذا اس سے گوشت کا ادام ہونا ثابت کیا جارہا ہے۔

<u>مسجد میں کھانے کا مسئلہ</u>: فی المسجد حتی الوسع بلاضرورت مسجد میں کھانا کھانے سے احتراز کرنا چاہیے۔کیونکہ اس سے مسجد کے تلوث کے ساتھ ساتھ عبادت میں خلل کا خطرہ ہوتا ہے۔ہاں اگر ضرورت ہو تو جائز ہے۔لیکن چونکہ نبی کریم ﷺ کیلئے تو مسجد ہی مہمان خانہ، دربار، پارلیمنٹ، عدالت اور عبادت خانہ سب کچھ تھا۔اس لئے آپ ﷺ نے مسجد میں مہمانوں کو کھانا کھلایا ہوگا۔اور ایسی صورت میں بلاشبہ مسجد میں کھانا جائز ہے۔البتہ مسجد کو بچانے کیلئے دسترخوان وغیرہ کا بندوبست ہونا چاہیے۔اور چونکہ یہاں صرف گوشت کھلایا گیا ہے۔اس لئے مسجد کے خراب ہونے کا اندیشہ ویسے بھی نہیں ہے۔دوسری بات یہ کہ ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ اعتکاف میں ہوں۔پھر تو مسجد ہی میں کھانا پڑتا ہے۔جبکہ بعض علماء کا خیال ہے کہ

---

(۱)سنن ابن ماجة ص۲۳۸ابواب الاطعمة باب الشواء، شرح السنة للبغوی ۱۱/۲۹۳ کتاب الاطعمة (مختار)

نبی کریمﷺ نے یہاں صرف بیان جواز کیلئے ایسا کیا ہوگا(۱)۔

(۱۵) حدّثنا محمود بن غیلان أنبا نا وکیع ثنا مشعر عن أبی صخرة جامع بن شدّاد عن المغیرة بن عبدالله عن المغیرة بن شعبة قال ضِفتُ مع رسول اللهﷺ ذات لیلة فاتی بجنب مشویٍّ ثمّ اخذ الشفرة فجعل یحزّلی بها منه قال فجاء بلال یؤذنه بالصلٰوة فالقیٰ الشفرة فقال ما له تربت یداه قال و کان شاربه قدوفیٰ فقال له اقصّه لک علی سواک او قصّه علی سواک(۲).

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کہتے ہیں۔ کہ ایک رات میں نبی کریمﷺ کے ساتھ مہمان ہوا۔ تو کھانے کیلئے بھنا ہوا پہلو کا گوشت لایا گیا۔ جس کے بعد نبی کریمﷺ نے چھری اٹھائی۔ اور مجھے دینے کیلئے اس میں سے (گوشت) کاٹنا شروع کیا۔ اسی دوران بلالؓ نے آ کر نماز کی تیاری کی اطلاع دی۔ آپﷺ نے (نماز پڑھنے کے لیے) چھری رکھ دی۔ اور فرمایا کہ بلال کو کیا ہو گیا؟ اس کے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں (حضرت مغیرہؓ نے) فرمایا اور ایسا ہوا کہ اس کے مونچھوں کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ تو نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ لاؤ مسواک پر رکھ کر میں اسے کتر دوں۔ یا یہ کہا کہ مسواک پر رکھ کر خود اسے کتر دو۔

---

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے **فیه دلیل الجواز اکل الطعام فی المسجد جماعةً وفرادیٰ ومحله ان لم یحصل مایقذر المسجدو إلاّفیکره، اویحرم ویمکن اکلهم علی زمن الاعتکاف فلایردأنّ الاکل فی المسجد خلاف الاولیٰ(جمع الوسائل ۱/۲۵۸)** اور علامہ مناویؒ نے لکھا ہے **فیه دلیل لجواز الأكل فی المسجد جماعة وفرادیٰ بشرط امن التقذیرو الاحرام(المناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/۲۵۸)** مطلب یہ ہے کہ مسجد میں کھانا بلاضرورت کراہت سے خالی نہیں **کماقال الشامی ویکره..أكل ونوم إلاّللمتعكف وغریب(شامی ۱/)** مگر اس میں بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ مسجد میں کھانے کے ریزے گر کر مسجد خراب نہ ہو جائے۔ بہتر یہ ہے کہ دستر خوان بچھا کر کھایا جائے۔ اس سے مسجد کا فرش خراب اور گندہ ہونے سے بچ جائے گا (مختار) **(۲)سنن ابی داؤد ۱/۲۸ کتاب الطهارة باب فی ترک الوضؤ مما مست النار ، شرح السنة للبغوی ۱۱/۲۸۴۸ کتاب الأطعمة باب أكل الشواء(مختار)**

ضِفتُ مع رسول اللّٰہ ﷺ بعض علماء کے نزدیک یہاں پر ''مع'' کا لفظ زائد یا ''عند'' کے معنی پر ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ میں آپ ﷺ کے ہاں مہمان ٹہرا۔علامہ ابن حجر عسقلانیؒ کہتے ہیں کہ ام المومنین حضرت میمونہؓ کے حجرے میں حضرت مغیرہؓ مہمان بن کر آپ ﷺ کے پاس آئے تھے۔اور بعض لوگ یہ مطلب لیتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اپنے ہاں مہمان بنایا۔لیکن اس توجیہ کو ملا علی قاریؒ، علامہ مناویؒ اور علامہ بیجوریؒ نے رد کردیا ہے۔تیسرا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ میں اور نبی کریم ﷺ دونوں کسی اور کے ہاں مہمان بنے۔محدث قاضی اسماعیل نے اس توجیہ کو ترجیح دی ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک صحابیہ حضرت ضباعۃ بنت الزبیر نے یہ دعوت کی تھی۔یہ زبیر بن الحارث بن عبدالمطلب کی بیٹی اور نبی کریم ﷺ کی چچا زاد بہن لگتی تھیں۔

<u>گوشت چھری سے کاٹ کر کھانے کا مسئلہ روایات میں تطبیق</u>: **فجعل یجزّ** معلوم ہوتا ہے کہ سالم جانور کو بھون کر اس دعوت میں پیش کیا گیا تھا۔بعض علاقوں میں میزبان لوگ مہمان کے آگے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھ دیتے ہیں۔عرب کے بعض علاقوں میں آج کل بھی اس قسم کا رواج پایا جاتا ہے۔کہ سالم جانور کو پکا کر کھانے کیلئے رکھ دیتے ہیں۔اور اس کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھایا جاتا ہے۔بہر حال اس موقع پر بھی آپ ﷺ کی خدمت میں گوشت کا کوئی بڑا ٹکڑا پیش کیا گیا جو سالم اٹھانے کا نہ تھا۔اس لئے آپ ﷺ اس کو چھری سے کاٹ کر کھانے لگے۔اور صحابہ کرام کو دینے لگے۔لیکن یہاں ایک اشکال ہے۔وہ یہ کہ حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث ہے کہ **لاتقطعوا اللحم بالسکین فانّه من صنیع الاعاجم. وانهشوه فانّه أهنا و امرا**(۱)۔

ترجمہ: چھری کے ذریعے گوشت کاٹ کر نہ کھاؤ۔کیونکہ ایسا کرنا عجمیوں کا کام ہے۔بلکہ دانتوں کے ساتھ کاٹ کر کھاؤ یہ میٹھا اور لذیذ ہوتا ہے۔

چنانچہ چھری کے ذریعے کاٹنے کو خود نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔تو آپ ﷺ کا عمل اس کے متضاد کیوں ہے۔اس اشکال کے متعدد جواب دیئے جاتے ہیں۔

---

(۱)ابوداؤد ج ۲ ص ۱۷۸

(۱) اولاً تو یہ حدیث ضعیف ہے۔ابو معشر راوی کی وجہ سے امام بیہقیؒ نے اس کی تضعیف کی ہے۔اس لئے حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث قطع بالسکین والی حدیث کا معارضہ نہیں کر سکتی۔ جسے امام ترمذیؒ کے علاوہ صحیحین میں بھی روایت کیا گیا ہے۔

(۲) بعض کے خیال میں مذکورہ حدیث حضرت عائشہؓ کی حدیث کیلئے ناسخ ہے۔چنانچہ اب ممانعت نہ ہوگی۔لیکن یہ توجیہ قوی نہیں۔ کیونکہ نسخ کیلئے تاریخ کا علم اور منسوخ کا مقدم ہونا ضروری ہے۔دوسری یہ کہ **لاتقطعوا اللحم** قولی حدیث ہے۔اور مذکورہ حدیث فعلی ہے۔قولی حدیث قوی اور راجح ہوتی ہے۔اس لئے یہ فعلی سے منسوخ نہیں ہوسکتی۔

(۳) بعض کے خیال میں یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے کہ ان کے لیے جائز ہے۔اور نہی امت کے لیے ہے۔لہٰذا امت کے لیے ناجائز ہے۔کیونکہ نبی کریم ﷺ میں تشبہ کا سرے سے احتمال نہیں ہے۔

(۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ عمل بیان جواز کے لیے کیا ہے۔اور تفصیل یوں ہوگی کہ بلاضرورت چھری کاٹنے سے کھانا ممنوع ہے۔اور اگر ضرورت ہو۔مثلاً ٹکڑا بڑا ہو، جیسے جانور کا سالم پاؤں ہو، جو اٹھایا نہ جاسکے۔یا مثلاً ٹکڑا ایک ہو جس کو ہاتھ میں اٹھانے سے دوسروں کو ضرر ہو۔تو اس میں چھری سے کاٹنے کی اجازت ہوگی۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ چھری کے ساتھ کاٹنے اور اس کے ساتھ کھانے میں فرق ہے منہ تک چھری کی مدد سے لے جانا چھری کے ساتھ کھانا ہوگا۔ جو ممنوع ہے۔اور حضرت عائشہؓ کی حدیث میں بھی وہی مراد ہوگا۔اعاجم کے ساتھ اسی میں تشبیہ ہے۔اور وہی ممنوع ہے جبکہ یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ چھری کے ساتھ کاٹ کر ہاتھ سے کھاتے رہے ہوں جو ممنوع نہیں۔

(۶) علامہ زمخشریؒ نے کشاف میں یصنعون اور یعملون کے درمیان میں فرق کا ذکر کیا ہے۔کہتے ہیں کہ یصنعون کا معنی یہ ہے کہ کوئی کسی کام کو عادت بنا کر ہمیشہ کرے۔اور یعملون کا اطلاق کبھی کبھار کرنے پر ہوتا ہے۔اس فرق کو مدنظر رکھ کر یہاں ایک اور جواب کا احتمال بھی ہے۔اور وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ نے ''**من عمل الاعاجم**'' نہیں کہا بلکہ ''**من صنیع الاعاجم**'' کہا۔جس کا مطلب یہ ہے کہ اعاجم کا

یہ شعار ہے۔اور وہ ہمیشہ ایسا کرتے ہیں۔ان کا شعار اپنانا اور ہمیشہ ایسا کرنا بری بات ہے۔جیسے آج کل انگریزیت پذیر طبقہ لازماً کھڑے ہوکر اور چھری کانٹے سے کھانے کو تہذیب کہتے ہیں۔اور یہی ان کی صنع، معمول اور عادتِ مستمرہ ہے۔مسلمانوں کے لیے اس کو عادت بنا کر ان کا اتباع ممنوع ہے۔اور اگر کبھی کبھی بر بنائے ضرورت اس بات کی نوبت آجائے تو یہ عمل جائز ہوگا۔

یحز لی بھا منھا حز کا معنی ہے قطع یعنی کاٹا اس نے۔بعض نسخوں میں یحزُ (بالحاء) ہے اور جز کیطرح حزّ بھی کاٹنے کے معنی میں آتا ہے۔دونوں نصر کے باب سے ہیں۔نبی کریم ﷺ کا یہ عمل ایک طرف آپ ﷺ کی تواضع پر دلالت کرتا ہے۔دوسری طرف حضرت مغیرہؓ کی تالیفِ قلب اور تانیس بھی مدنظر ہوگی۔

حضرت بلال حبشیؓ: **فجاء بلال** ابوعبدالرحمٰن بلال بن رباح حبشی غلاموں میں سے پہلے اسلام لانے والے صحابی ہیں۔اسلام سے قبل مشرک مالک کے ہاتھوں سخت اذیتیں برداشت کیں۔بعد میں ابوبکر صدیقؓ نے خرید کر آزاد کردیا۔غزوہ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔اذان کی خدمت آپؓ کے سپرد تھی۔ ۱۸ھ کو تریسٹھ (۶۳) سال کی عمر میں دمشق میں اور ایک قول کے مطابق داریا شام میں وفات پائی۔اور باب الصغیر دمشق میں دفن ہوئے۔

یؤذنہ یہاں افعال کے باب سے مستعمل ہے۔جو اعلام اور اخبار کے معنی میں آتا ہے۔اور اگر **یؤذّنہ** ہوتا تو پھر **اعلام الصلوٰۃ** کے معنی میں ہوتا۔اور **بالصلوٰۃ** ذکر ہونے کے بعد فعل میں تجرید ماننے۔**تربت یداہ** یہ جملہ بظاہر ایک قسم بددعا ہے۔جس کا معنی یہ ہے کہ اس کا ہاتھ غبار آلود ہو۔یعنی وہ مسکین وفقیر ہوجائے۔کیونکہ فقراء ومساکین کے ہاتھ کام کرنے کے سبب اور بالخصوص زمینوں اور مٹی میں کام کرنے کی وجہ سے غبار آلود رہتے ہیں۔لیکن اکثر ترحّم اور شفقت ومحبت کے لیے بھی یہ جملہ مستعمل ہوتا ہے۔جس طرح کہ دوسری زبانوں میں بھی بددعا کے بعض جملے ترحم اور شفقت کے مواقع پر بولے جاتے ہیں۔بعض اوقات محض ملامت کے طور پر بھی یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے(۱)۔

---

(۱) اسلئے علامہ جوادرومیؒ نے لکھا ہے **جری علی السنۃ العرب لمجرد اللوم لا للدعوۃ علیہ(الاتحافات ۲۱۹)(مختار)**

بلال کی دعوت نماز پر ناراضگی کے توجیہات: اب یہ اشکال پیدا ہوگا کہ حضرت بلالؓ نے تو نماز کی طرف بلایا ہے۔تو نبی کریم ﷺ کو اس پر اعتراض کیوں ہے۔اور ان کو کیوں ملامت فرما رہے ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے پہلے گزر چکا ہے کہ یہ جملہ بددعا، زجر و توبیخ اور محبت و ترحم تینوں مقاصد کے لیے بولا جاتا ہے۔لہٰذا اگر اس کلام کو محبت و ترحم کی بجائے زجر و توبیخ پر حمل کریں گے۔تو توجیہ یہ ہوگی کہ ابھی نماز کے لیے وقت باقی تھا۔لیکن بلالؓ نے نماز کی طرف بلایا۔جس طرح کہ ہمارے ہاں کی مساجد میں بعض اوقات کچھ مقتدی اس قسم کے بھی ہوتے ہیں۔جنہیں بہت جلدی ہوتی ہے۔اور ابھی وقت باقی ہوتا ہے کہ وہ امام کو جماعت کھڑی کرنے پر مجبور کرنا شروع کردیتے ہیں۔یا اس کی تاخیر اور سستی کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔حالانکہ بعض اوقات امام کا کوئی ضروری کام ہوتا ہے۔مثلاً وہ درس دینے میں مصروف ہے یا مہمانوں کے ساتھ بات کر رہا ہوتا ہے۔بہر حال ایسے موقعوں پر مقتدیوں کو قدرے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔دو چار منٹ کی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔تو شاید یہاں بھی ایسا ہی ہو کہ نبی کریم ﷺ کا خیال ہے کہ ادھر میزبان نے کتنی محبت اور محنت سے دعوت کا انتظام کیا ہے۔مہمان ابھی کھا رہے ہیں۔اور میزبان ابھی مزید تسلی سے کھلانا چاہتا ہے۔جماعت میں ابھی وقت باقی ہے کہ حضرت بلالؓ آئے کہ جماعت کا وقت ہوگیا ہے۔اور یہ بات یقیناً نامناسب ہے۔اس لئے آپ ﷺ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے یہ کلمات کہے۔لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے یہ کلمات زجر کے لیے استعمال نہ کئے ہوں۔بلکہ آپ ﷺ نے بطور محبت و مدح یہ قول کیا ہو کہ خدا بلال کا بھلا کرے کہ انہوں نے نماز کی طرف توجہ دلائی۔ورنہ ہم شاید غفلت میں رہ جاتے۔اور کھانے اور باتیں کرنے میں محو ہو کر نماز کو مؤخر کر دیتے۔تو گویا آپ ﷺ نے اس کے اس عمل کی تحسین فرمائی۔

قص شوارب میں توجیہات: قال یعنی مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا و کان شاربه قد وفی : قال کی ضمیر مغیرہ بن شعبہؓ کو راجح ہو تو شاربہ کی ضمیر میں تین احتمال ہیں۔اول: یہ کہ خود حضرت مغیرہؓ اپنے آپ بیان کر رہے ہیں اور اصل میں شاربی قد وفی (۱) تھا۔لیکن متکلم سے غائب کو التفات ہوا ہے۔دوم: یہ کہ ضمیر

(۱)وقع فی روایة ابی داؤد"وکان شاربی قد وفی فقصه لی علی سواک"(ابوداؤد ۱/ ۲۷ کتاب الطهارة باب ۷۴)(اصلاح الدین)

نبی کریم ﷺ کو راجح ہو یعنی نبی کریم ﷺ کی مونچھیں قدرے لمبی ہو گئی تھیں۔ کبھی کبھی آپ ﷺ کو بھی موقع نہیں ملتا تھا۔ ورنہ نبی کریم ﷺ عموماً مونچھیں کاٹا کرتے تھے۔ آپ ﷺ مونچھیں قینچی سے کترواتے تھے۔ مونڈھتے نہ تھے۔ سوم: یہ کہ ضمیر حضرت بلالؓ کو راجع ہو۔ یعنی بلالؓ کی مونچھیں بڑھی ہوئی تھی۔ اور نبی کریم ﷺ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا کہ اقصّہ لک اب احتمال اول میں اشکال نہیں ہے۔ کیونکہ لک میں لام منفعت کے لیے ہیں۔ تو اقصّہ لک کا معنیٰ یہ ہوگا کہ لاؤ میں ٹھیک کردوں تیری نفع کے لیے۔ اور اگر بلالؓ کو ضمیر راجع ہو تو بھی ترجمہ اسی طرح ہوگا اور اشکال نہیں ہوگا۔ لیکن خود نبی کریم ﷺ کو ضمیر راجع ہو تو یہ اشکال ہے کہ اقصّہ لک کا کیا معنیٰ ہوگا۔ تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا خیال تھا بلکہ یہ ایک حقیقت تھی کہ چونکہ صحابہؓ کو نبی کریم ﷺ کے بال محفوظ رکھنے کا شوق تھا جیسا کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے حلق کیا تو صحابہ نے بالوں کو آپس میں بانٹ دیا۔ تو گویا آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ تو میرے بال نہیں چھوڑتے۔ آؤ تیرے لیے بال کاٹ دوں۔ تم اسے اپنے پاس بطور تبرک محفوظ رکھ لو۔ تو اس صورت میں لام منفعت کیلئے درست ہے۔

<u>ایک اشکال اور اس کا جواب:</u> ایک اور اشکال یہاں یہ ہے کہ جب نماز کے لیے دعوت ہوئی اور نبی کریم ﷺ نے چھری رکھ کر کھانا بھی چھوڑ دیا۔ تو اس کے بعد فوراً نماز کے لیے جانا چاہیے تھا۔ مونچھیں کاٹنے یا دوسرے کاموں کی وجہ سے نماز میں تاخیر ہو جاتی ہے تو یہ ناجائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضروری تو نہیں کہ یہ عین اسی موقع کی بات ہو بلکہ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اس وقت نماز پڑھنے گئے ہوں۔ پھر نماز کے بعد یہ واقعہ ہوا ہو۔ گویا یہ محض ایک ضمنی بات تھی جو کہ صحابی نے درمیان میں بتلا دی نہ یہ کہ عین اسی موقع پر نماز کے وقت میں یا اذان کے بعد نبی کریم ﷺ نے میرے، دوسرے صحابی یا اپنے بال کاٹنے کا کام بھی کیا۔

<u>مونچھیں کتروانا چاہیے یا مونڈھنا:</u> اس حدیث سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اس قسم کے لوگ پسند نہ تھے جو مونچھے بڑھا کر رکھتے تھے۔ مونچوں کو لینا تو آپ ﷺ نے

خصالِ فطرت اور سنن الانبیاء میں سے شمار کیا ہے(۱)۔ آپ ﷺ خود بھی نظافت کا بہت اہتمام فرماتے تھے اور صحابہ کو بھی میلا کچیلا رہنے سے منع فرماتے تھے۔

علی سواک یعنی کنگھی وغیرہ نہیں ہے۔ لاؤ مسواک کے ساتھ ٹھیک کردو۔ مطلب یہ ہے کہ مونچوں کا بال کاٹتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے اس بات کا لحاظ کیا کہ کہیں بال کم یا زیادہ نہ لئے جائیں۔ اس لیے مسواک رکھ کران میں توازن قائم کرنے کیلئے مدد لی۔ جس طرح کہ کنگھی سے مدد لی جاتی ہے۔ مونچوں کو قینچی کے ساتھ کترنا مسنون ہے۔ اور اتنا کترنا چاہیے کہ حلق کے قریب ہو۔ لیکن خود حلق یعنی مونچیں مونڈھنا مسنون نہیں۔ بعض علماء حلق یعنی مونڈھنے کی مسنونیت کے بھی قائل ہیں۔ لیکن اکثر علماء اس کی تصویب نہیں کرتے۔ امام مالکؒ نے تو مونڈھنے والے کی تادیب کا حکم دیا ہے۔ بلکہ اسے مثلہ قرار دیا ہے۔

یہاں ایک اور احتمال بھی ہے کہ قال کا ضمیر مغیرہ بن عبداللہؓ کو راجع ہو۔ اور وہ اپنے استاد مغیرہ ابن شعبہؓ کا بیان کرتے ہوں کہ میری مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔ تو حضرت مغیرہؓ نے کہا کہ لاؤ میں ٹھیک کردوں۔ لیکن عموماً پہلی توجیہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔

(۱۶) حدثنا واصل بن عبدالاعلیٰ ثنا محمّد بن فضیل عن أبی حیان التیمیّ عن أبی زرعة عن أبی هریرة قال اتی النبیُّ ﷺ بلحم فرفع الیه الذراع و کانت تعجبه فنهس منها(۲).

---

(۱)أخرجه الصحاح کلّها. وروی ابن حبان "ذکر لرسول اللّٰه ﷺ المجوس فقال إنّهم قوم یوفرون سبالهم ویحلقون لحاهم فخالفوهم....وفی خبر عند أحمد قصّوا سبا لکم ووفّر والحاکم لکن رای الغزالی وغیره أنّه لا باس بترک اسبال اتباعا لعمر وغیره. (بیجوری ص ۱۲۷) وفی الدرالمختار عن المجتبیٰ حلق الشارب سنة و قیل بدعة وفی الشامیة و القص منه سنة بالاجماع.(ج ۵ ص ۲۸۸) (اصلاح الدین)

(۲)صحیح بخاری ۱/ ۴۷۰ کتاب الانبیاء باب قول اللّٰه عزوجلّ ولقدارسلنا نوحاً إلی قومه ، جامع ترمذی ۵/۲ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی أیّ اللحم کان احبّ إلی رسول اللّٰه ﷺ، ابن ماجة ص ۲۴۵ کتاب الأطعمه باب احبّ اللحم(مختار)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں گوشت لایا گیا۔ پھر ان کو اگلے پاؤں کی پنڈلی کا گوشت پیش کیا گیا۔ جو ان کو پسند تھا۔ تو آپ ﷺ نے اسے دانتوں سے کاٹ کر تناول فرمایا۔

فرفع الیہ الذراع جانور کی اگلی ٹانگ میں گھٹنے سے نیچے کے حصہ کو کہتے ہیں۔

<u>دانتوں سے گوشت کاٹ کر کھانا:</u> و کانت تعجبہ نبی کریم ﷺ کو ذراع اس لئے پسند تھا کہ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔ نیز یہ جلدی پک جاتا ہے۔ جیسے کہ آگے ایک اور حدیث میں بھی آتا ہے۔ بعض نسخوں میں یہاں یعجبہ تذکیر کے صیغے سے مذکور ہے اور دونوں صحیح ہیں۔ اس لیے کہ اعضاء میں سے جو اعضاء بدن میں دو دو یعنی مکرر ہیں وہ سب مؤنث سماعی ہیں۔ لیکن ذراع اس ضابطے سے مستثنیٰ ہے(۱) اور مذکر بھی استعمال ہوتا ہے۔ فنھش منھا یعنی چھری سے نہیں بلکہ منہ لگا کر دانتوں سے گوشت کاٹ کر کھانے لگے۔ نہش سین اور شین دونوں کے ساتھ " اخذ باطراف الاسنان" یعنی دانتوں سے کاٹ کر کھانے کو کہتے ہیں گوشت میں یہ مسنون ہے(۲)۔

(۱۷) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا أبو داوٗد عن زھیر یعنی ابن محمّد عن أبی إسحاق عن سعد بن عیاض عن ابن مسعود قال کان النّبیّ ﷺ یعجبہ الذراع قال وسم فی الذراع و کان یری أنّ الیھود سمّوہ(۳)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو ذراع کا گوشت پسند تھا۔ اور ذراع ہی میں آپ ﷺ کو زہر دیا گیا تھا۔ اور خیال یہ تھا کہ یہود نے آپ ﷺ کو زہر دیا تھا۔

---

(۱) اسی طرح ثدی بھی مذکر استعمال ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مؤنث استعمال ہوتا ہے (کما صرح بہ النووی ۱/۴۵، ۳/۷۴) (مختار)

(۲) آج کل کے جدید سائنس نے بھی اس حکمت کی تائید کی ہے۔ اور کہا ہے کہ اس طرح کرنے سے معدہ کو تقویت ملتی ہے اور انسان بے شمار بیماریوں سے بچ جاتا ہے۔ (مختار)

(۳) سنن ابی داؤد ۲/۱۷۴ کتاب الاطعمة باب اکل اللحم، ابو داؤد الطیاسی ۳۸۸، البتہ مسند احمد میں کان النّبیّ ﷺ کی جگہ کان احب العراق آیا ہے۔ مسند عبداللہ ابن مسعود ۱/۶۵۰ (مختار)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہذلی صحابی ہیں۔ان کے والد بنوزہرہ کے حلیف تھے۔والدہ مسلمان ہوکر صحابیت کا شرف پا چکی ہیں۔آپ بھی سابقین اولین صحابہ میں سے ہیں۔آپ ہی کی ایک روایت کے مطابق آپ چھٹے مسلمان تھے۔آپؓ سے قبل صرف پانچ آدمی ایمان لائے تھے۔پہلے حبشہ اور پھر مدینہ کو ہجرت فرمائی۔بدر اور پھر اس کے بعد تمام غزوات میں بھی شرکت کی۔بدر میں ابوجہل زخمی ہو چکا تھا۔آپؓ نے جا کر اس کا سرتن سے جدا کردیا۔اور نبی کریم ﷺ کو خبر دی جس سے نبی کریم ﷺ انتہائی خوش ہوئے۔نبی کریم ﷺ کی ذاتی خدمت میں بھی پیش پیش تھے۔لہٰذا آپ کو صاحب السواک والنعلین والوسادۃ بھی کہا جاتا ہے۔حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ میں اور میرا بھائی جب یمن سے آئے تو عبداللہ ابن مسعودؓ اوران کی والدہ کا بھی نبی کریم ﷺ کے ہاں کثرت سے آنا جانا دیکھ کر ایک طویل مدت تک یہی خیال رہا کہ یہ دونوں نبی کریم ﷺ کے گھر کے افراد ہیں۔ہجرت سے پہلے حضرت زبیرؓ اور ہجرت کے بعد حضرت سعد بن معاذؓ سے مواخات کا رشتہ نبی کریم ﷺ نے قائم کیا تھا۔

شام کی فتوحات میں بھی شریک رہے۔بعد میں حضرت عمرؓ نے آپؓ کو کوفہ میں معلم بنا کر بھیجا۔ اور حضرت عثمانؓ نے آپ کو کوفہ کا امیر مقرر کردیا۔پھر کچھ مدت کے بعد آپ کو معزول کر کے مدینہ طلب کیا۔ کوفہ کے لوگوں نے ٹھہرنے کو کہا لیکن آپ نے اطاعت کا حق ادا کرتے ہوئے ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ ۳۲ھ میں مدینہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔خلفائے راشدین کے بعد آپؓ افقہ الصحابہؓ تھے۔اور احناف کے مذہب کا مدار زیادہ تر آپ ہی کے فقہ پر ہے۔کہتے ہیں کہ آپؓ نے غلاموں اور مویشیوں کے علاوہ نوے ہزار (90,000) دینار نقد ترکہ میں چھوڑے تھے۔آپ کے مناقب کے لیے کئی دفتر ناکافی ہیں۔رضی اللہ عنہ وعن الصحابة اجمعین۔

وسّم فی الذراع سُم مجہول کا صیغہ ہے اور نائب فاعل کا ضمیر نبی کریم ﷺ کو راجع ہے، معنی یہ کہ نبی کریم ﷺ کو ذراع میں زہر دیا گیا تھا۔اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا نائب فاعل محذوف ہو۔اور تقدیر یوں ہو کہ **وسُمّ فی الذراع** یعنی **اوقع السم فی الذراع** معنی یہ ہوگا کہ زہر کو ذراع میں ملایا گیا تھا۔

زہر دینے والا کون؟ **وکان یری انّ الیهود سمّوه** یُریٰ مجہول اور یَریٰ معلوم دونوں طرح

پڑھنا جائز ہے۔ اور دونوں صورتوں میں یہ یظنّ معلوم کے معنی میں ہے۔ ضمیر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو راجع ہے۔ معنی یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا خیال تھا کہ یہ زہر یہود نے آپ ﷺ کو دیا تھا۔ اور یہ محض خیال نہ تھا بلکہ یہ درحقیقت یہود کی سازش کا نتیجہ تھا کیونکہ زینب بنت الحارث جو سلام بن مشکم کی بیوی تھی نے دیگر یہود کے مشورے سے نبی کریم ﷺ کو زہر دیا تھا۔ اس لئے جس روایت میں یہودی عورت کا ذکر ہے وہ اس روایت سے متعارض نہیں ہے۔

فتح خیبر کے موقع پر یہود نے شکست کھائی لیکن یہ خبیث قوم ڈنگ مارنے سے کبھی نہیں چوکتی۔ چنانچہ فتح خیبر کے بعد آپ ﷺ نے وہیں قیام فرمایا تو اس سازش کا شکار ہوئے۔ یہود کو معلوم تھا کہ آپ ﷺ اپنے کریمانہ اخلاق کی بدولت امیر غریب، دوست دشمن، اور مرد وعورت سب کی دلداری کرتے ہیں اور دعوت قبول کرتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اس عورت کو تیار کروایا کہ وہ آپ ﷺ کو کھانے کی دعوت دے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہودی عورت کی دعوت کو قبول کرلیا۔ اور جب کھانے بیٹھے تو فطری رغبت کے مطابق ذراع کو اٹھایا۔ اس میں اتنا خطرناک اور زوراثر زہر ڈالا گیا تھا کہ آپ نے منہ لگایا ہی تھا کہ وحی آئی(۱) اور آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ اس میں زہر ہے۔ لیکن صرف منہ لگانے کی وجہ سے آپ ﷺ کو مستقبل میں بھی سخت تکلیف رہی۔ وفات تک ہر سال اس کے اثرات ظاہر ہوتے تھے۔ گرمی کے موسم میں آپ ﷺ پر خاص کر اثر ظاہر ہوتا جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو پچھنے لگوا کر خون نکالنا پڑتا۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت اسی زہر کے اثر سے آپ ﷺ کی رگیں پھٹ پڑیں۔

<u>معنوی شہادت:</u> اور یہ ایک گونہ شہادت بھی تھی جس کے لئے آپ ﷺ کے دل میں ہمیشہ سے ایک تڑپ اور جذبہ عشق موجود تھا۔ اور اگرچہ آپ ﷺ حکمت الٰہی کے تحت آخر دم تک لوگوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہے لیکن منصب نبوت کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس تمنا کو بھی پورا کرکے شہادت سے سرفراز فرمایا۔ **لو ددت ان اقتل فی سبیل اللّٰہ ثمّ احییٰ ثم اقتل (الحدیث) الخ**

---

(۱) بعض روایات میں آتا ہے کہ اس ذراع نے آپ ﷺ سے کلام کرکے زہر کے وجود کی خبر دی۔ ممکن ہے کہ ذراع کے اخبار کے بعد اس کی تصدیق کی خاطر جبرئیلؑ نے بھی آکر خبر دی ہو۔ اکثر شراح نے یہی تطبیق کی ہے۔ (اصلاح الدین)

بعض صحابہ نے بھی یہ زہریلا گوشت کھالیا تھا جن میں سے ایک شخص شہید ہوئے۔جن کا نام بشر بن براءؓ یا بشیر بن براءؓ تھا۔بعد میں جب اس عورت سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے زہر ملانے کا اعتراف کیا(۱)۔اب بعض روایات میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس عورت کو معاف کردیا۔جبکہ بعض میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو قصاصاً قتل کروایا۔

سوائے ورثاء کے قاتل کو عفو کا کسی کو اختیار نہیں: بظاہر یہ تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت دونوں روایتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔کیونکہ آپ ﷺ نے اسے اپنے حق میں معاف کردیا۔اور اگرچہ اس عورت نے اقدام قتل کیا تھا۔لیکن جس طرح آپ ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ آپ ﷺ کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیتے تھے۔اس لئے اس کو معاف فرمایا لیکن بعد میں جب پتہ چلا کہ ایک صحابی اس عورت کی وجہ سے شہید ہوگئے تو پھر چونکہ قصاص لازم ہوگیا۔لہٰذا قصاصاً قتل کروایا۔آپ ﷺ دوسروں کے قصاص معاف کرنے کے مجاز تو نہ تھے۔کیونکہ اسلام میں گورنر،صدر یا قاضی وغیرہ کو قاتل کے معاف کرنے کا حق نہیں۔بلکہ قاتل ضرور قتل کیا جائے گا جب تک مقتول کے ورثہ معاف نہ کریں۔

ہمارے ہاں تو الٹی گنگا بہتی ہے۔قتل کو فوجداری جرم قرار دے کر مقتول کے ورثہ کو تو اس حق سے محروم کردیا گیا ہے لیکن غیروں کو اس کا مجاز ٹھہرایا گیا ہے یہ یہود و نصاریٰ کے وہ کالے قوانین ہیں جو آج تک ہم پر مسلط ہیں۔

قتل عمد اور آلہ جارحۃ: یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اگر اسے زہر دے کر قتل کرنے کے سبب قتل کروایا تو اس سے امام شافعیؒ کا مسلک ثابت ہوتا ہے کہ قصاص کے لیے قتل عمد میں آلہ جارحہ شرط نہیں ہے۔امام ابوحنیفہؒ تو قتل عمد میں آلہ جارحہ کو شرط مانتے ہیں۔اور زہر دینا آلہ جارحہ کا استعمال نہیں ہے۔تو اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اسے قصاصاً نہیں بلکہ تعزیراً قتل کروایا ہوگا۔اور قاضی کے لیے سنگین جرائم میں سیاسۃً و تعزیراً قتل کروانے کا اختیار ہے۔

---

(۱)اس پوچھ گچھ کے بعد مسلمان ہوگئی۔علامہ جوادالرومی نے لکھا ہے ولقد اسلمت زینب فترکھا رسول اللہ ﷺ لاسلامھا ولانّہ کان لاینتقم لنفسہ(الاتحافات ص ۲۲۱) (مختار)

(۱۸) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا مسلم بن ابراهیم ثنا أبان بن یزید عن قتادة عن شهر بن حوشب عن أبی عبید قال طبخت للنبیّ ﷺ قدراً وکان یعجبه الذراع فناولته الذراع ثمّ قال ناولنی الذراع فناولته ثمّ قال ناولنی الذراع فقلت یا رسول اللہ ﷺ و کم للشاة من ذراع فقال والذی نفسی بیده لو سکتّ لنا و لتنی الذراع ما دعوت(۱).

ترجمہ: حضرت ابوعبیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے لیے ہانڈی پکائی۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کو ذراع کا گوشت زیادہ پسند تھا۔ لہٰذا میں نے اُنہیں ایک ذراع پیش کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے (دوسری) ذراع (بھی) دیدو۔ میں نے دے دی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ایک اور ذراع دے دو۔ میں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ بکری کی کتنی ذراع ہوتی ہیں؟ (یعنی صرف دو ہی تو ہوتی ہیں) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تو خاموش رہتا تو جب تک میں مانگتا رہتا (ہانڈی سے نکال نکال کر) تو مجھے ذراعیں دیتا رہتا۔

أبو عبیدؓ یہ صحابی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ آپ ﷺ کی خدمت کیا کرتے تھے۔ یہی ان کا نام اور یہی کنیت مروی ہے۔ اور صرف اسی ایک کتاب میں صرف یہی ایک روایت ان کی موجود ہے۔ بعض حضرات نے ان کا نام ابوعبیدۃ یعنی تاء کے ساتھ نقل کیا ہے لیکن صحیح بغیر تاء کے ہے۔

ثمّ قال ناولنی الذراع اس فرمائش سے ذراع کے گوشت میں آپ کی زیادہ رغبت ظاہر ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ طلب کرنے کے بعد آپ ﷺ اسے اکیلے تو نہیں کھاتے تھے بلکہ دیگر دوستوں کو بھی کھلاتے تھے۔ **و کم للشاة الذراع** گویا حضرت ابوعبیدؓ کو اس بات پر تعجب ہوا کہ یہ نبی کریم ﷺ کیسی بات کررہے ہیں کہ بکری کے تو صرف دو ذراع ہوتے ہیں۔ اور آپ ﷺ دو ذراع لینے کے بعد تیسرا بھی مانگ رہے ہیں۔ لہٰذا بطور تعجب پوچھا کہ شاۃ کے کتنے ذراع ہوتے ہیں۔ دو تو میں دے چکا ہوں۔

(۱) دارمی ۱/۲۲، مسند احمد ۳/۴۸۴، معجم الکبیر للطبرانی ۲۲/۳۳۵ (مختار)

نبی کریم ﷺ کے حکم کے مقابلے میں عقل پرستی: لیکن دراصل اس تعجب اور استبعاد میں ان سے چوک ہوئی۔ کہ مقام تعمیل ارشاد کا تھا۔ یہ سوچنا ہی بے جا تھا کہ نبی کریم ﷺ کا یہ مطالبہ خلاف عقل ہے جب نبی کریم ﷺ کسی بات کا حکم دیتے تھے تو عقل، فلسفہ، اور سائنس کو درمیان میں لانا اور ممکن ناممکن کی گھتیاں سلجھانا ہی غلط ہے۔ وہ پہاڑ اٹھانے کا حکم دیں تو مامور کو کوشش کرنی چاہیے۔ اور اس بات کی تعلیم دینے کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا **والذی نفسی بیدی لو سکتّ الخ** یعنی اگر تم اعتراض نہ کرتے اور خاموشی سے تعمیل ارشاد کرتے۔ تو تم اور ذراع بھی نکال کر دیتے رہتے۔ اور بچشم مشاہدہ دیکھ لیتے کہ ایک جانور کے متعدد ذراع بھی ہو سکتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی زندگی تکثیر طعام کے اس قسم کے معجزات سے بھری پڑی ہے تھوڑا سا کھانا زیادہ بن گیا۔ اور چھوٹے سے برتن میں انگلیاں ڈبودی ہیں۔ تو اس سے پانی چشموں کی طرح بہنے لگا ہے۔ اور اگر موسیٰ علیہ السلام نے بطور معجزہ ایک پتھر سے چشمے جاری کئے ہیں تو آپ ﷺ نے انگلیوں سے اسی طرح کے چشمے جاری کئے ہیں۔ اور ساری کی ساری فوج اور اس کے جانور اس سے سیر بھی ہو چکے ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں متعدد روایات تکثیر طعام کے سلسلے میں موجود ہیں۔ اسی طرح قاضی عیاضؒ نے بھی شفا نامی کتاب میں اس قسم کی متعدد روایات ذکر کی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے معجزے کا اثر ہی تھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کھجوروں کے ایک تھیلے سے طویل زمانہ تک کھجوریں کھاتے رہے۔ لیکن اس تھیلے کی کھجوریں ختم نہ ہوئی۔ اور ایسا بھی ہوا کہ کسی صحابی نے آپ ﷺ کو کھانے پر بلایا اس نے صرف آپ ﷺ کے لیے کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ لیکن آپ ﷺ نے اپنے ساتھ لشکر روانہ فرمایا۔ اور وہی تھوڑا سا کھانا سارے لشکر کے لیے کافی ہوا بلکہ ان سے باقی بھی بچا۔ جیسا کہ غزوۂ خندق میں ہوا۔

چوں و چرا کرنا برکات سے محرومی کا سبب بنتا ہے: بہر حال اگر صحابی سوال نہ کرتے تو بطور معجزہ اللہ تعالیٰ یہاں بھی کئی ذراع پیدا فرماتے لیکن یہ بات کہ ایسا کیوں نہ ہوا۔ اور یہ معجزہ کیوں منقطع ہو گیا۔ تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ صحابی کی طرف سے نبی کریم ﷺ کا انقیادِ تام نہ ہوا۔ اور اس کا اثر نبی کریم ﷺ کے معجزات کے برکات پر بھی پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ جب شاگرد بگڑا ہو تو اس کے استاد کی

روحانیت کو بھی ٹھیس پہنچتی ہے۔ بیٹا خراب ہو تو اس کی برائی باپ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ملا علی قاریؒ کا قول ہے کہ اکرام تام کیلئے انقیادِ تام کی ضرورت ہوتی ہے۔ تکثیر طعام یا اس قسم کا دوسرا معجزہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کا اکرام ہوتا ہے۔ اور امتی میں انقیاد تام نہ ہو تو ماحول سارا مکدر ہو جاتا ہے۔ اور معجزے کے ظہور کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ کی کامل توجہات بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی برکتیں اور ظاہری یا معنوی فیوضات تب ظہور پذیر ہوتی ہیں جب نبی کی پوری توجہ اور انہماک ہو۔ صحابی نے جب درمیان میں چون و چرا کی تو اس سے توجہ کا وہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جس طرح کہ بعض اوقات کوئی مقرر عجیب و غریب بیان کرتا ہے۔ پوری تقریر علوم و معارف کا سلسہ ہوتا ہے لیکن درمیان میں کوئی شخص گڑ بڑ کرے تو وہ سلسلہ کٹ جاتا ہے۔

<u>توجہ تام کے حصول کیلئے انقیاد تام</u>: ہمارے بزرگ مولانا عبداللہ درخواستی صاحبؒ جسے لوگوں نے سیاست کی نذر کر کے بڑا نقصان کیا۔ عظیم شخصیت، سلف کا نمونہ اور سادگی و مجذوبیت کے پیکر تھے۔ عموماً وہ یہاں آتے رہتے تو جلسے میں تقریر کرتے ہوئے یہ کیفیت کبھی کبھی طاری ہو جاتی اور فرماتے "تار کٹ جاتی ہے" تقریر کے دوران کوئی اٹھتا تو فوراً بیٹھ جانے کو کہتے اور فرماتے کہ میرا تار کٹ جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص جب پوری توجہ اور انہماک سے اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی مدد ہوتی ہے۔ مقرر اور مدرس کا شرح صدر ہوتا ہے۔ لیکن درمیان میں گڑ بڑ اور آداب مجلس کے خلاف کوئی کام ہو جائے تو یہ سلسلہ کٹ جاتا ہے۔ اس لئے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب اس شخص نے بات کی۔ تو نبی کریم ﷺ کی اس کیفیت اور توجہ و استغراق میں فرق آ گیا۔ جس کی وجہ سے اس معجزہ سے محروم ہونا پڑا۔ ملا علی قاریؒ کہتے ہیں۔ کہ انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام کے ہاتھ پر خرق عادت امور کا ظہور حالت فناء میں ہوتا ہے۔ ان کو اس حالت میں اور تو اور خود اپنے آپ کا احساس تک نہیں ہوتا ہے۔ اور جب یہ احساس ختم ہونے لگے۔ توجہ تبدیل ہو جاتی ہے تو خرق عادت امور بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی خادم سے مکالمہ اور رب سے انقطاع ربط معجزہ کی انتہا کا سبب بنا۔ و اللہ اعلم

(۱۹) حدّثنا بن محمّد الزعفرانیّ ثنا یحییٰ بن عبّاد بن فلیح ابن سلیمان قال حدّثنی رجل من عبّاد یقال له عبدالوهاب بن یحییٰ بن عبّاد عن عبداللّٰه بن الزبیر عن عائشة قالت ماکان الذراع أحبّ اللحم إلیٰ رسول اللّٰه و لکنّه کان لا یجد اللحم الاغبًّا و کان یعجل الیها لأنّها أعجلها نضجا(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ذراع کا گوشت (لذت کی وجہ سے) حضور کو زیادہ پسند نہ تھا لیکن چونکہ آپ ﷺ کی رسائی گوشت تک کبھی کبھی ہوتی تھی۔اور آپ کو گوشت کھانے کی جلدی ہوتی تھی (تا کہ دیگر مشاغل کے لیے جلدی فارغ ہوں) اور گوشت میں ذراع سب سے جلدی پکنے والی ہوتی ہے(اس لیے آپ ﷺ اسے پسند فرماتے تھے)

<u>ذراع کے گوشت سے محبت کا سبب</u>: ماکانت الذراع الخ اس حدیث میں حضرت عائشہؓ اس بات کی نفی نہیں کرتیں کہ آپ ﷺ کو ذراع کا گوشت پسند نہ تھا۔ بلکہ دراصل اس پسندیدگی کی سب سے اہم وجہ بیان فرمارہی ہیں۔جس کی تفصیل یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی شخص لذیذ اور مرغن کھانوں کا ہر وقت شوقین ہوتا ہے۔اور یہی اس کی زندگی کا اہم مقصد ہوتا ہے۔لیکن نبی کریم ﷺ ایسے نہ تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جو بھی میسر ہوتیں۔ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرماتے۔اس کے باوجود ذراع کی مرغوبیت کی متعدد وجوہ میں سے حقیقی وجہ اور سبب یہ ہے۔کہ آپ ﷺ کو روز روز گوشت نہیں ملتا تھا۔کبھی تو دو دو مہینے گھر میں آگ بھی نہ جلتی بلکہ اسودین یعنی کھجور اور پانی پر گزارہ ہوتا تھا۔شاذ و نادر کبھی گوشت میسر ہوتا جو گھر پکتا۔یا کہیں دعوت میں واسطہ پڑتا۔اور انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ جو چیز مدت کے بعد میسر ہو انسان اسے جلد ہی کھانے کو پسند کرتا ہے۔ایسے موقع پر انتظار کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

(۱)جامع ترمذی ۵/۲ کتاب الاطعمة باب ماجاء فی ای اللحم کان احبّ الی رسول اللّٰه ﷺ (مختار)

آج بھی جبکہ گوشت لوگوں کو بکثرت ملتا ہے۔ جب لوگ قربانی کرتے ہیں۔تو جلدی پکنے والا گوشت الگ کرکے جلدی جلدی پکا لیتے ہیں۔باقی گوشت کے پکنے کا انتظار کرنے کی بجائے یہ گوشت پہلے کھا جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ بھی ایسی ہی طبعی تقاضے کی بناء پر جلدی پکنے والے گوشت کو کھانے میں مقدم فرماتے تھے۔اور پکنے میں ذراع کا گوشت کم وقت لیتا ہے۔اس لیے آپ ﷺ اس کو پسند فرماتے تھے۔

گوشت خوری فطرۃ انسانی: نبی کریم ﷺ بشری تقاضوں سے عاری نہ تھے۔ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکرگزاری میں سب سے پیش پیش تھے۔اور شکر سے پہلے طبعی تقاضوں کی پاسداری کرنی پڑتی ہے۔رہبانیت سے کنارہ کش ہونا پڑتا ہے۔اور گوشت کی طرف دل کی رغبت انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ نہ یہ زہد وقناعت سے متصادم ہے نہ مذہب سے اس کا ٹکراو ہے۔کسی آسمانی مذہب نے کبھی اس سے منع نہیں کیا۔اگرچہ انسانی دماغ کے ایجاد شدہ مذاہب آج بھی گوشت کھانا ناجائز اور مکروہ خیال کرتے ہیں۔ ہمارے قریب ہندوستان ہی میں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان اس قسم کے افکار وعقائد رکھتے ہیں۔گوتم بدھ کی تو ساری تعلیمات کا محور یہی تھا۔کہ گوشت کھانا ظلم اور حیوانات کے ساتھ زیادتی ہے۔

یہ بھی عجیب فلسفہ ہے جس پر ان مذاہب کی بنیاد ہے۔ بلکہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی بعض جاہل توہمات کی دنیا آباد کئے ہوئے ہیں۔پچھلے دنوں جرمنی میں ایک بڑی پارٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ گوشت کو چھوڑ کر سبزیاں اور ترکاریاں کھائیں گے۔کیونکہ گوشت خوری ظلم ہے۔ہم کہتے ہیں کہ اگر تمہارے خیال میں یہ جانوروں پر ظلم ہے تو حیوانات کی طرح نباتات بھی تو آخر شعور رکھتی ہیں اور جدید تحقیقات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت کی جاتی ہے کہ نباتات میں ایک قسم کی حیات اور حس موجود ہے۔ بلکہ وہ آوازوں کو سنتے ہیں اور یہ تو مشاہدہ ہے کہ بعض پھول ہاتھ لگتے ہی مرجھا جاتے ہیں یا بند ہو جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں ان میں باقاعدہ تلقیح کا عمل ہوتا ہے۔ان میں ایک گونہ جماع، حمل اور بیج اور تخم کا استقرار تو مسلّم باتیں ہیں۔یورپ میں اس بات پر بھی تحقیق کی گئی ہے کہ بعض پودے موسیقی اور گانوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔اور یہ ان کی نشو ونما اور وجد ومستی کا سبب بنتی ہیں۔ بہرحال نباتات میں شعور کا وجود اب ایک مسلمہ حقیقت ہے۔لہٰذا ان میں اور جانوروں میں فرق نہیں ہوگا۔ بلکہ زمین میں بھی آخر ایک قسم کا

شعور ہے۔تو اس پر کودنا، چلنا پھرنا اور اسے چیرنا پھاڑنا کیا ظلم نہ ہوگا۔اسی طرح دودھ دہی اور تمام ماکولات اور مشروبات یہاں تک کہ پانی بھی جراثیم، بیکٹیریا اور جنین سے بھری ہوئی ہیں جو ذی حیات چیزیں ہیں۔ ایک گلاس دودھ کو خوردبین سے دیکھیں تو کروڑوں اربوں زندہ اشیاء تیرتی نظر آتی ہیں۔

حاصل یہ کہ دوسری مخلوقات سے استفادہ گناہ سمجھا جائے تو پھر تو خدا کی خدائی سے نکلنا پڑے گا کیونکہ ہر مخلوق ایک حد تک باشعور ہے۔

آریہ سماج نے جب گوشت خوری کے خلاف تحریک چلائی اور مسلمانوں کو اس بنا پر ظالم سمجھنے لگے۔تو جواب میں ہمارے اکابر حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ اور اس کے ساتھیوں کو میدان میں آنا پڑا۔ حضرت نانوتویؒ نے اس سلسلے میں ''تحفہ لحمیہ'' نامی کتاب لکھی۔جس میں گوشت کھانے کے جواز کے دلائل اور فوائد لکھے۔امام غزالیؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ گوشت بدن کو صاف رکھتا ہے اور اخلاق میں حسن پیدا کرتا ہے۔اور جس شخص نے چالیس روز تک مسلسل گوشت نہیں کھایا اس کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں (مواہب لدنیہ ص ۱۲۵، (جمع الوسائل ج ا ص ۲۵۸)

بہر حال گوشت کھانا انسانی فطرت، آسمانی مذاہب اور اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے(۱)۔

اور اسی وجہ سے آپ ﷺ کو گوشت پسند ہوتا تھا۔پھر خصوصاً مذکورہ وجہ کی بنا پر جلدی پکنے والا گوشت زیادہ مرغوب ہوتا تھا۔علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہت مصروف ہوتی تھی۔وقت کی پابندی کا بہت خیال رکھتے تھے۔**لکل شیئ عندہ عتاد**۔کیونکہ آپ ﷺ کے اعمال میں بیک وقت عبادت، جہاد، تعلیم، تبلیغ اسلام اور مملکت وغیرہ کے امور ہوتے تھے۔چنانچہ جس حصہ کے پکنے میں وقت کم لگتا تھا۔وہ اس وجہ سے بھی زیادہ پسند ہوتا تھا۔کہ اس میں وقت کی بچت ہوتی تھی۔

یہاں پر امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے بقول حضور ﷺ کے انتخاب کا سبب سرعۃ نضج یعنی جلدی پکنا ہے۔مگر حضور ﷺ کی محبت کا سبب اس کے ساتھ ساتھ استلذاذ یا دیگر اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔گویا اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔کہ ذراع کی محبوبیت کی یہ وجہ حضرت عائشہؓ کی ذاتی رائے ہے۔

(۱) مرغی، بھیڑ، بکری، اونٹ، خرگوش اور حباریٰ (تلور) اور تیتر کا گوشت تناول فرمانا آپ ﷺ سے ثابت ہے۔

(اصلاح الدین)

علامہ ابن حجرؒ نے بھی تصریح کی ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ کی ذاتی رائے ہے۔ورنہ سابقہ احادیث سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ گوشت ملے یا نہ ملے۔ذراع سے آپ ﷺ کی طبعی محبت تھی۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ بظاہر حضرت عائشہؓ کا مقصد یہی بیان کرنا ہے کہ نبی کریم ﷺ لذتوں کے پیچھے پڑنے والے نہ تھے۔اور محبوبیت کا مدار استلذاذ نہیں بلکہ سرعۃ نضج تھا۔لیکن حق یہ ہے کہ لذیذ چیز کو لذت کی بنا پر پسند کرنا بھی کوئی عیب نہیں بلکہ بشریت کا تقاضا ہے۔البتہ محض لذت کو سبب ترجیح بنا کر ضروریات پر مقدم کرنا بری بات ہے۔

بایں ہمہ حضرت عائشہؓ کی دقیقہ سنجی اور رفیق حیات کی مزاج شناسی پر اعتماد کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سابقہ احادیث سے پسندیدگی ثابت ہوتی ہے۔جس کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں۔لیکن اس سے یہ لازم نہیں کہ یہ قطعہ لحم باقی تمام اعضاء کی نسبت محبوب تر بھی ہوسکتا ہے کہ محبت واستلذاذ کسی اور قطعہ لحم سے ہو جیسے کہ بعد کی حدیث میں آتا ہے کہ **اطیب اللحم لحم الظھر**۔وہاں اطیب کا لفظ ریڑھ کی ہڈی کے گوشت کو ذراع پر ترجیح دینے میں مصرح ہے۔چنانچہ حضرت عائشہؓ کا تجزیہ معقول ومقبول ہے۔**واللّٰہ اعلم**

(۲۰) حدثنا محمود بن غیلان ثنا ابو احمد ثنا مسعرؒ قال سمعت شیخا من فھم قال سمعت عبداللّٰہ بن جعفر یقول سمعت رسول اللّٰہ ﷺ ان أطیب اللحم لحم الظھر(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ گوشت میں بہتر گوشت پیٹھ کا گوشت ہے۔

شیخا من فھم بنوفہم کے قبیلے کے اس شخص کا نام مجہول ہے۔اس کی تعیین میں محدثین نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی ہے۔بعض کہتے ہیں کہ اس کا نام محمد بن عبداللہ ابورافع فہمی ہے جبکہ بعض کے خیال میں اس کا نام محمد بن عبدالرحمٰن ہے۔

---

(۱)السنن الکبریٰ للنسائی ۱۵۴/۴ کتاب الولیمة ابواب الأطعمة باب لحم الظھر، سنن ابن ماجة ص۲۳۷ باب اطانب اللّحم کتاب الأطعمة باب أطیب اللحم، شرح السنة للبغوی ص ۲۹۹ ج ۱۱ کتاب الأطعمة(مختار)

(۲) تطبیق روایات لحم ذراع ولحم ظہر: **ان اطیب اللحم لحم الظہر الخ** اس روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ کے نزدیک جانور میں سب سے اچھا گوشت پیٹھ کا گوشت ہے۔ پچھلی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ذراع کے گوشت کو پسند فرماتے تھے۔ یہاں پیٹھ کے گوشت کو بہترین قرار دیا ہے۔ بظاہر اس تعارض کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ حیثیات اور وجوہ ترجیح مختلف ہوتی ہیں۔ ذراع کا گوشت جلدی پکتا ہے تو پیٹھ کا گوشت عموماً زمین سے دور رہنے کے سبب نرم ہوتا ہے۔ ماہرین کے قول کے مطابق جو گوشت زمین پر نہیں لگتا وہ نرم ہوتا ہے جبکہ پاؤں اور اطراف کا گوشت زمین کے ساتھ لگتا اور رگڑتا ہے۔ اس لئے اس میں قدرے سختی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں پیٹھ کا گوشت میٹھا اور ریشوں سے پاک ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہڈیوں کا گوشت دوسرے قسم کے گوشت کی نسبت بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ ہڈی کی لذت، حلاوت اور قوت بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ نیز اسے دانتوں سے نوچ کر کھایا جاتا ہے جس سے لذت دوبالا ہو جاتی ہے۔

اس حدیث میں ریڑھ کی ہڈی کے گوشت کو اطیب کہا گیا ہے۔ جس کے معنی لذیذ ترین، بہترین کئے گئے ہیں۔ بعض شرّاح اطہر اور بعض نے احل کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ تمام معانی اس حصے کے گوشت کی ترجیح پر دلالت کرتے ہیں۔

اس طرح بعض احادیث میں آپ ﷺ سے **لحم الرقبۃ** یعنی گردن کی ہڈی کے گوشت کی تعریف بھی منقول ہے۔ مختلف مواقع پر مختلف حیثیتوں سے آپ ﷺ نے مختلف اعضاء کو پسند فرمایا ہے۔ لہٰذا اسے تعارض نہیں کہا جا سکتا۔

بعض اعضاء کو آپ ﷺ نے مکروہ کہا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت ہے کہ **کان المصطفیٰ یکرہ من الشاۃ سبعا المرارۃ والمثانۃ والحیاء والذکر والانثیین والغدۃ والدم**(۱) نبی کریم ﷺ دنبے میں سات اعضاء تلی، مثانہ، فرج، ذکر، فوطے، غدود اور خون کو مکروہ سمجھتے تھے اسی طرح ایک حدیث میں گردوں کی کراہت کا ذکر بھی آیا ہے۔

---

(۱) جمع الوسائل ومناوی ج ۱ ص ۲۶۶ (اصلاح الدین)

(۲۱) حدّثنا سفیان بن وکیع ثنا زید بن الحباب عن عبداللّٰہ بن المؤمل عن ابن ابی ملیکۃ عن عائشۃ أنّ النبیّ ﷺ قال نعم الإدام الخل(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سرکہ بہترین سالن ہے۔

__خل (سرکہ):__ **نعم الادام الخل** یعنی سرکہ بہت اچھا سالن ہے۔ ترمذی میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں آیا ہے کہ آپ ﷺ اچھے کھانوں کی تعریف اور مدح میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی میزبان کی دلداری یا مہمان کی خاطر مدارت کے لیے تحسین بھی فرمایا کرتے تھے، لیکن اس مقام پر سرکہ کی مدح کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرکہ کو شاید لوگ سالن ہی نہ سمجھیں۔ اور سرکہ ملنے کے وقت ناشکری کے مرتکب ہوں۔ تو دراصل آپ ﷺ مخاطبین کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ سرکہ اگرچہ بظاہر حقیر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں بلکہ یہ تو ایک نعمت ہے۔ اور بہت اچھا سالن ہے۔

حدیث کی مزید تفصیل ابتدائی باب میں گزرچکی ہے۔

(۲۲) حدّثنا ابو کریب ثنا ابو بکر بن عیاش عن ثابت أبی حمزۃ الثمالیّ عن امّ ھانی قالت دخل علی النبیّ ﷺ فقال اعندک شئی فقلت لا الا خبز یابس و خل فقال ھاتی ماافقر بیت من ادم فیه خلٌّ(۲).

ترجمہ: حضرت ام ہانیؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ (فتح مکہ کے موقع پر) میرے پاس تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ تیرے پاس کوئی (کھانے کی) چیز ہے میں نے عرض کیا سوکھی روٹی اور سرکہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ فرمایا وہ لے آؤ۔ وہ گھر جس میں سرکہ ہو سالن سے خالی نہیں ہے۔

---

(۱) تفرد به الإمام الترمذی جامع ترمذی ۲/۶ ابواب الأطعمة باب ماجاء فی الخل (مختار)

(۲) جامع ترمذی ۲/۶ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی الخل، شرح السنة للبغوی ۱۱/۳۱۰ رقم حدیث ۲۸۶۷ ابواب الأطعمة باب الخل، المستدرک للحاکم ۴/۵۴ (مختار)

أمّ هانی حضور ﷺ کی چچازاد بہن اور حضرت علیؓ کی بہن ہیں۔ پانچویں باب میں ان کے حالات بیان ہو چکے ہیں۔

دخل علی النبی ﷺ یہ فتح مکہ کے روز کا واقعہ ہے۔ جب نبی کریم ﷺ تھک کر مسجد حرام کے قریب واقع حضرت ام ہانیؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ یہ گھر مسجد حرم میں توسیع کے سبب اب مسجد کا حصہ بن چکا ہے۔ وہاں جا کر آپ ﷺ نے سر سے خود اور پگڑی اتار دی۔ طہارت کے بعد اشراق کی نماز بھی پڑھی کھانے کا تقاضا ہوا تو حضرت ام ہانیؓ کے گھر میں موجود سوکھی روٹی کو پانی میں تر کر کے نمک اور سرکہ ملا دیا اور تناول فرمایا۔ اور ساتھ ساتھ حضرت ام ہانیؓ کی خاطر داری کے لیے سرکہ کی تعریف بھی کر دی۔ دوسری روایات میں اس واقعہ کی مزید تفصیل مذکور ہے۔

<u>بے تکلفی سوال نہیں ہے:</u> **أعندک شئی؟** یہ سوال نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ نے بے تکلفی اور قرب رشتہ کی بنا پر التماس کیا۔ جو اسلام میں ممنوع سوال کے زمرے میں نہیں آتا۔ بلکہ رشتہ داروں اور بے تکلف دوستوں کے گھروں میں قرآن مجید نے صراحتہ بغیر اجازت کے کھانے کی بھی اجازت دی ہے کیونکہ ایسے مواقع پر التماس کرنے والا ذلیل نہیں بلکہ اور بھی زیادہ محبوب لگتا ہے۔ اور جس شخص پر بے تکلفانہ اپنی طلب ظاہر کرتا ہے وہ شخص اور بھی زیادہ خوش ہو جاتا ہے۔

لا الاّ خبز یابس حضرت ام ہانیؓ کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ کی شایان شان تو کوئی چیز نہیں۔ ہاں سوکھی روٹی کے کچھ ٹکڑے اور سرکہ موجود ہے۔ **فقال هاتی الخ** لفظ هاتی بعض کے ہاں ایتی به کے معنی میں اسم فعل ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ امر کا صیغہ ہے۔ اصل میں ایتی تھا ہمزہ ہاء سے بدل گیا ہے۔ جیسے هراق کی ہاء همزہ سے بدل کر آئی ہے(۱)۔

فقال ما اقفر بیت الخ یعنی جس گھر میں سرکہ ہو۔ اس کو غیر آباد اور سالن سے خالی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اقفار کے معنی خالی ہونے کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ قفر ہے۔ قاف کی تقدیم کے ساتھ اور اس

---

(۱) منجد میں ہے کہ ہاتی دراصل هاتیٰ یهاتی مهاتاة سے امر حاضر کا صیغہ اعطی کے معنی میں ہے۔ اور مهاتاة کا مادہ هتا یهتو هتوا ہے۔ ملا علی قاریؒ نے بھی اسے امر حاضر کا صیغہ بتایا ہے اور ''هاتو برهانکم'' سے استشہاد کیا ہے۔ (اصلاح الدین)

کے معنی ہے خالی ہونا۔ جبکہ بعض فاء کی تقدیم کے ساتھ فقر کو اس کا مادہ کہتے ہیں(۱)۔ اور **افقر الرجل** جس طرح کہ مال سے خالی ہونے کو کہتے ہیں۔ اس طرح **افقر الدار** کا بھی یہی معنی ہوگا کہ وہ گھر غیر آباد اور خالی ہوگیا۔ **فیہ خل** یہ بیت کی صفت ہے۔ اور صفۃ وموصوف کے درمیان فصل بالاجنبی بشرطیکہ وہ اجنبی ایسا ظرف ہو جو موصوف کے عامل کا معمول اور اس سے متعلق ہو جائز ہے۔ اور یہاں بھی "**من ادم**" اقفر سے متعلق ہوگا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ **من ادم** بھی بیت کی صفت ہے۔ کیونکہ ادم چمڑے کو کہتے ہیں اور بیت من ادم سے مراد چمڑے کا بنا ہوا خیمہ مراد ہوگا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا۔ کہ چمڑے کا بنا ہوا گھر جس میں سر کہ ہو خالی شمار نہ ہوگا۔ لیکن اکثر شراح نے پہلی توجیہ کو ترجیح دی ہے۔

(۲۳) حدثنا محمد بن المثنی قال حدثنا محمد بن جعفر ثنا شعبة عن عمرو بن مرة عن مرة الهمدانیّ عن ابی موسی عن النبی ﷺ قال فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام(۲).

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کی دوسری عورتوں پر ایسی فضیلت ہے جیسے ثرید کی فضیلت (دوسرے تمام) کھانوں پر۔

(۲۴) حدثنا علی بن حجر ثنا اسماعیل بن جعفر ثنا عبداللّٰه بن عبدالرحمٰن بن معمر الانصاری ابو طوالة انّه سمع انس بن مالک یقول قال رسول اللّٰه ﷺ فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام(۳).

---

(۱) لیکن شراح نے روایۃ اور درایۃ اسے غلط کہا ہے۔ والتفصیل فی جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۶۸ (اصلاح الدین)

(۲) صحیح بخاری کتاب احادیث الأنبیاء باب قول اللّٰه تعالیٰ وضرب الله مثلاً للذین، السنن الکبریٰ ۲۸۳/۵ کتاب عشرة النساء باب حب الرجل بعض نسائه، جامع الترمذی ۵/۲ کتاب الأطعمه باب ماجاء فی فضل الثرید علی الطعام(مختار)

(۳) صحیح بخاری ۵۳۲/۱ کتاب الفضائل الصحابة باب فضل العائشة، صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة باب فضل عائشة، جامع ترمذی ۲۲۱/۲ کتاب المناقب باب فضل عائشة، سنن إبن ماجه ص ۲۳۶ کتاب الاطعمه باب فضل الثریدعلی الطعام(مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت عائشہؓ کی دوسری عورتوں پر ایسی فضیلت ہے جیسے ثرید کی فضیلت (دوسرے تمام) کھانوں پر۔

کفضل الثرید علی سائر الطعام اوپر کی دونوں حدیثوں کی سیاق سے ثرید کی فضیلت معلوم ہوتی ہے کیونکہ آپ ﷺ نے افضل النساء حضرت عائشہؓ کو ثرید سے تشبیہ دی ہے۔ گویا ثرید کی فضیلت تو معلوم و مشاہد ہے اور اس سے یہ بات ضمناً ثابت ہو رہی ہے کہ آپ ﷺ نے ثرید کھایا ہوگا۔ ورنہ پھر تشبیہ کیسے دیدی۔ اور اسی میں ترجمۃ الباب سے مطابقت ہے۔ لہٰذا امام مناویؒ کا یہ قول کہ **وھذا الحدیث بعید المناسبة بالباب** مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

ثرید اس کھانے کو کہا جاتا ہے جس میں گوشت اور روٹی کو خوب ریزہ ریزہ کر کے سالن میں ڈال دیا جائے۔ یہ کھانا مقوی لذیذ زود ہضم اور معدے کے لیے غیر مضر ہوتا ہے۔ نیز اس کے کھانے میں سہولت ہوتی ہے اور کھانے والا تھوڑے وقت میں بقدر کفایت کھا کر فارغ ہو جاتا ہے۔ اور انہی اوصاف کی بنا پر ثرید کو فضیلت بھی حاصل ہے۔

<u>فضیلت ام المومنین عائشہؓ</u>: دراصل اس حدیث میں تمام عورتوں پر حضرت عائشہؓ کی فضیلت کا بیان ہے۔ ازواج مطہراتؓ بلکہ تمام عورتوں میں ان کو بڑا مقام حاصل تھا۔ اور بہت حیثیتوں سے ان کو دوسری عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمہ الکبریٰؓ کے فضائل کتب میں مذکور ہیں۔ لیکن آپ کو بھی بے شمار فضائل حاصل ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ مرتبہ میں حضرت عائشہؓ سے مقدم تھیں۔ لہٰذا یہاں پر نساء سے مراد "نساء زمانها" ہے۔ یعنی اپنے زمانہ کی عورتوں پر حضرت عائشہؓ کو فضیلت حاصل ہے۔ اس طرح حضرت خدیجۃ الکبریٰ مفضول عورتوں سے نکل جاتی ہیں کیونکہ وہ تو پہلے وفات پا چکی تھیں اور اپنے زمانہ کے ازواج مطہرات نیز دیگر عورتوں میں آپ کو شرف و فضیلت اور بلند مرتبہ حاصل تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کو امت کی سہولت کی خاطر علم و فضل کی بڑی دولت سے مالا مال کیا۔ اور امت کو آپ سے بڑا فیض پہنچا۔ حضرت فاطمہ بھی نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بہت جلد یعنی صرف

چھ ماہ بعد وفات پا گئیں۔لیکن حضرت عائشہؓ خلافت راشدہ کے تمام ادوار میں زندہ رہیں۔اور لوگوں کی علمی تشنگی بجھاتی رہی۔اس لیے اگر چہ حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمہؓ بھی بجائے خود عظیم عورتیں تھیں۔لیکن حضرت عائشہؓ کو علمی تبحر کی وجہ سے اپنے زمانہ کی تمام عورتوں پر برتری حاصل ہوئی۔دوسری بات یہ ہے کہ فضیلت کی بہت سی حیثیتیں ہوتی ہیں۔مثلاً حضرت فاطمہؓ کو اس حیثیت سے فضیلت حاصل ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کا جزو ہیں۔اور بضعیۃ کے واسطہ سے جو فضل آپ کو حاصل ہے وہ دوسری عورتوں کو حاصل نہیں۔ اور حضرت خدیجہؓ کو اس حیثیت سے فضیلت حاصل ہے کہ ایسے حالات میں جب نبی کریم ﷺ کا کوئی سہارا نہ تھا تہی دستی کے ان دنوں میں حضرت خدیجہؓ نے اپنا سب کچھ لٹا کر اسلام اور نبی کریم ﷺ کی خدمت کی۔اللہ تعالیٰ نے **ووجدک عائلاً فاغنیٰ**۔میں آپؓ کے مال ہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔اسلام لانے میں عورتوں میں تو کوئی بھی آپؓ سے سبقت نہ لے سکی۔جبکہ بعض کا قول ہے کہ مردوں اور عورتوں سب میں پہلی مسلمان حضرت خدیجہؓ ہیں۔

وجوہ ترجیح فضیلتِ عائشہؓ: دوسری طرف حضرت عائشہؓ کو متعدد حیثیتوں سے فضیلت حاصل ہے۔جن میں چند اہم درج ہیں۔

(۱) انتہائی درجہ کی فقاہت اور علمی دسترس کی حامل تھیں۔تبحر علمی اور حافظہ و ذکاوت میں آپؓ اپنی نظیر آپ تھیں۔

(۲) نوعمری ہی میں آپ کو معاملہ فہمی اور دیگر مزایا و کمالات حاصل تھے۔نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ میرے ساتھ بستر میں ہوں۔تب بھی جبرئیلؑ میرے پاس وحی لاتے ہیں۔ازواج مطہرات میں آپؓ کی باری ہوتی تو وحی کثرت سے آتی۔جس کا سبب یہ تھا کہ وحی سے بنی نوع انسان کو علم و فیض پہنچانا ہی مقصود تھا۔اور نبی کریم ﷺ کے پاس کی یہ طالبعلم زیادہ اخاذ اور ذہین تھی۔

(۳) نصف امت یعنی صنف نازک کی تو آپ ہی ترجمان تھیں۔اور ان کے مسائل تو آپ ہی کے طفیل انہیں پہنچے۔بلکہ مردوں کے بہت سے مسائل بھی آپؓ کے توسط سے مردوں کو پہنچے۔چنانچہ وہ ماں ہونے کے علاوہ ہماری شیخ اور استاد بھی ہیں۔

(۴) وہ مکثرین فی الحدیث میں سے ہیں۔ یہ مرتبہ صحابہ میں سے بہت کم صحابہ کو حاصل ہے۔

(۵) ان کی براءت میں تقریباً دو رکوع قرآن مجید نازل ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے براءت کا یہ اعزاز فقط آپ ہی کا حصہ ہے۔ ان رکوعوں میں مذکورہ فضائل کی تفصیل تفاسیر میں مذکور ہے۔

(۶) ان کا نکاح آسمانوں میں طے ہوا۔

(۷) نکاح سے قبل ہی نبی کریم ﷺ کو ان کی تصویر دکھادی گئی۔ جو کہ اس زمانہ کی خرق عادت ٹیلی وژن کی مثال تھی۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جرائیلؑ نے آ کر میرے سامنے ایک رومال کھولا جس میں حضرت عائشہؓ کی تصویر بنی ہوئی تھی (۱)۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت جبرئیلؑ نے ہتھیلی دکھلائی جس پر حضرت عائشہؓ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ساتھ ساتھ جبرئیلؑ نے یہ بھی کہا کہ یہ آپ کی دنیا اور آخرت میں بیوی ہے۔ اور پھر آپ ﷺ سے حضرت عائشہؓ کا نکاح ہوا۔ حالانکہ اس سے قبل جبیر بن مطعم بن عدی (۲) نامی ایک شخص سے حضرت عائشہؓ کے نکاح کی بات ہوئی تھی۔ بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس رشتہ کو جلدی طے کرنے کے لیے مطعم بن عدی سے رابطہ کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن چونکہ وہ کافر تھا۔ اس لئے وہ اس بات کو ٹالتا رہا۔ ادھر حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضرت خولہؓ جو حضرت عثمان بن مظعونؓ کی بیوی تھی۔ کی مدد سے نبی کریم ﷺ نے آپؓ کا رشتہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے طلب فرمایا۔ اور اس طرح آپ کو ام المؤمنین ہونے کا شرف حاصل ہوا (۳)۔

بہر حال دیگر صحابیاتؓ اور ازواج مطہراتؓ پر بعض وجوہ کی بنا پر آپؓ کی افضلیت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ البتہ ان سیّدات میں سے مطلقاً افضلیت کا شرف کس کو حاصل ہے۔ دلائل کے تعارض کی بنا پر توقف اور تفویض الی اللہ تعالیٰ سب سے مناسب ترین مسلک ہے (۴)۔

---

(۱) عن عائشہ أنّ جبرئیل جاء بصورتها فی خرقة حریر خضراء إلیٰ النّبیّ ﷺ فقال إنّ هذه زوجتک فی الدنیا والآخرة ۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۲۸ (اصلاح الدین)

(۲) حضرت جبیر بن مطعمؓ حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے قبل اسلام لائے۔ (اصلاح الدین)

(۳) ابن حجرؒ نے الاصابہ میں حضرت عائشہؓ کے کچھ دیگر امتیازات وفضائل کا بھی ذکر کیا ہے۔ (اصلاح الدین)

(۴) کما قال الملا علی قاریؒ والحاصل أنّ الحیثیات مختلفة الروایات متعارضة والمسألة ظنیة والتوقف لاضرر فیه قطعاً فالتسلیم اسلم واللّٰه اعلم (جمع الوسائل ۱ / ۲۷۰) (اصلاح الدین)

(۲۵) حدّثنا قتیبة بن سعید انا عبدالعزیز بن محمّد عن سهیل ابن ابی صالح عن ابیه عن ابی هریرة انّه رای رسول اللّٰه ﷺ توضامن ثور اقط ثمّ رآه اکل من کتف شاة ثم صلی و لم یتوضّأ(۱).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے پنیر کا ایک بڑا ٹکڑا کھانے کی وجہ سے وضوء فرمایا۔ پھر اس کے بعد اس نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ دنبے کے شانے کے گوشت سے کچھ تناول فرمایا۔ پھر نماز ادا کی اور وضوء کی تجدید نہیں کی۔

من ثور اقط (۲) ثور پنیر کے ٹکڑے یا پنیر کے بڑے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ اور اقط قاف کے ضمہ، کسرہ اور سکون تینوں صورتوں میں پنیر کو کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پنیر کا ٹکڑا کھا لینے کے بعد آپ ﷺ نے وضوء کیا۔

<u>وضوء ممّا مست النار کا فقہی مسئلہ</u>: **ثم صلی اللّٰه علیه وسلم صلّی ولم یتؤضا** یعنی گوشت کھانے کے بعد آپ ﷺ نے وضوء کئے بغیر نماز ادا کی۔ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضوء لازم ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ فقہی مسئلہ ہے۔ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ **مامسته النار** کھانے سے وضوء لازم نہیں ہوتا۔ اس حدیث میں جمہور کیلئے دلیل موجود ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے آخری بار وضوء نہیں کیا گویا یہ حکم کبھی تھا۔ لیکن بعد میں منسوخ ہو گیا تھا۔ بلکہ یہ ممکن ہے کہ ابتداء پنیر سے وضوء کرنے کا کوئی اور سبب ہو۔ مثلاً آپ پہلے سے وضوء سے نہیں تھے یا آپ ﷺ نے استحباباً وضوء کیا ہوگا یا پھر یہاں پر وضوء لغوی مراد ہوگا۔ یعنی آپ ﷺ نے ہاتھ منہ دھویا ہو۔ لیکن نماز کے جواز کیلئے یہ بھی ضروری نہیں بلکہ استحباب کے درجہ میں

---

(۱) شرح معانی الاثار ۱/۶۷، ابن ماجة ص۳۷ کتاب الطهارة باب الرخصة فی ذلک، سنن نسائی ۱/۱۰۵، ۱۰۶، مسنداحمد ۳۶۶ (مختار)

(۲) ثور الخ کے بارے میں علامہ مناویؒ نے لکھا ہے الثور هو قطعة من الشئ لأنّ الشئ اذاقطع من الشئ ثارعنه وازال وفی القاموس الثور القطعة من الاقط فالاضافة لاغیة وهولبن یجمدبنار(المناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/۲۷۱ (مختار)

ہوگا۔ان سب توجیہات میں سے سب سے اچھی توجیہ پہلی توجیہ ہے۔یعنی یہ کہ ابتداء آپ ﷺ نے وضوء واجب کہا تھا لیکن بعد میں مامسته النار سے وضوء کا وجوب منسوخ ہوگیا۔اور ثم کا کلمہ اس پر بہترین دلیل ہے۔

(۲۶) حدثنا ابن أبی عمر ثنا سفیان بن عیینة عن وائل بن داود عن أبیه و هو بکر بن وائل عن الزهری عن أنس ابن مالک قال أولم رسول اللّٰہ ﷺ علی صفیة بتمرو سویق(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے کھجور اور ستو سے حضرت صفیہؓ کا ولیمہ کیا تھا۔

اولم رسول اللّٰہ ﷺ اولم ولم سے ہے جس کا معنی ''جمع ہونا'' اور ''یکجا کرنا'' ہے۔نکاح کے بعد بیوی کے پاس جانا بھی ولم ہے۔زندگی بھر کی وابستگی اور بندھن کی خوشی میں جو دعوت ہوتی ہے۔جمع ہونے کی مناسبت سے اسے بھی ولیمہ کہتے ہیں۔تو حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت صفیہؓ کے ساتھ نکاح کے بعد نبی کریم ﷺ نے دعوت کا اہتمام فرمایا۔

<u>ام المؤمنین صفیہؓ اور اس کا ولیمہ:</u> **اولم علی صفیة** ام المؤمنین حضرت صفیہؓ حیی بن اخطب کی صاحب زادی تھیں۔جو بنی نظیر کے سردار تھے۔نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آنے سے قبل حضرت صفیہ یہود میں سلام بن مشکم اور اس کے بعد کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں تھی۔دونوں سے کوئی اولاد نہ تھی۔وہ حضرت ہارونؑ کی اولاد میں تھی۔ ۷ھ میں فتح خیبر کے بعد آپ کو قیدیوں میں لایا گیا۔ان کا خاوند کنانہ بن ربیع خیبر کی جنگ میں مارا گیا۔نبی کریم ﷺ نے مال غنیمت سے ان کو منتخب فرمایا۔اور پھر آزاد کر کے ان سے نکاح فرمایا۔

استیعاب میں علامہ ابن عبدالبرؒ نے حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جب خیبر میں غنائم جمع

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۱۷۰ کتاب الاطعمة باب فی استحباب الولیمة عندالنکاح، جامع ترمذی کتاب النکاح باب ماجاء فی الولیمة، سنن ابن ماجة ص۱۳۷ کتاب النکاح باب الولیمة(مختار)

کی گئیں۔تو حضرت دحیہ کلبیؓ نے نبی کریم ﷺ سے ایک باندی دینے کی درخواست کی آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ ایک باندی لے لو۔ چنانچہ وہ گئے اور حضرت صفیہؓ پر نظر انتخاب پڑی۔ادھر نبی کریم ﷺ کو بتایا گیا کہ صفیہؓ بنی قریظہ اور بنونظیر کی سردار زادی ہے۔اور آپ ﷺ کے لائق ہے۔تب نبی کریم ﷺ نے حضرت دحیہؓ کو حکم دیا کہ وہ حضرت صفیہؓ کی جگہ کوئی اور باندی لے لے۔ بلکہ ملا علی قاریؒ اور علامہ بیجوریؒ لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت دحیہؓ کو بدلہ میں سات باندیاں دیدیں۔ پھر اس کو آزاد کر کے نکاح کیا اور آزادی ہی کو مہر بنا دیا۔

علامہ ابن حجرؒ الاصابہ میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ نے خیبر میں خواب دیکھا کہ چاند اتر کر میری جھولی میں آ گرا ہے۔ یہ خواب انہوں نے اپنی ماں (۱) سے بیان کیا۔تو ماں نے ایک زوردار تھپڑ منہ پر مارتے ہوئے کہا کہ تو چاہتی ہے کہ عرب کے بادشاہ سے بیاہی جائے۔اس تھپڑ کا اثر نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آنے تک ان کے چہرے پر موجود تھا۔اس وقت آپؓ کی عمر تقریباً سترہ برس تھی۔اللہ تعالیٰ نے حسن سے بھی نوازا تھا۔ پہلی دفعہ مدینہ آنے کے بعد مدینہ کی عورتیں بکثرت دیکھنے کے لیے آپؓ کے ہاں آتی رہیں۔حضرت عائشہؓ بھی نقاب اوڑھ کر اور دیگر عورتوں میں چھپ چھپا کر حارثہ بن نعمانؓ کے گھر دیدار کے لیے گئیں۔ جہاں پر قدومِ مدینہ کے دنوں حضرت صفیہؓ کو رکھا گیا تھا۔

بتمر و سویق نکاح کے موقع پر آپ ﷺ نے راستہ ہی میں صحابہؓ کی دعوت ولیمہ کی۔اور سفر کے دوران ہی ایک جگہ قیام کر کے کھجور اور ستو جو کچھ حاضر تھا حاضرین کو کھلایا۔ بخاری کی روایت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے حیس کا ولیمہ کھلایا۔حیس ایک قسم کا حلوا ہوتا ہے جو کھجور، ستو، گھی اور پنیر وغیرہ سے بنایا جاتا ہے۔بعض روایات میں پنیر کا ذکر بھی ہے۔لیکن ان روایات میں تطبیق آسان ہے۔ کیونکہ یہ دراصل ایک اجتماعی قسم کی دعوت تھی۔آپ ﷺ نے دسترخوان بچھا کر سب کو دعوت دیدی۔اور آنے والے صحابہؓ اپنے ساتھ کئی چیزیں لائیں۔کوئی کھجور لایا تو کوئی ستو۔کسی نے پنیر کا حصہ شامل کر دیا تو کسی کے پاس حیس ہوگی جو پیش کر چکا ہوگا اور پھر اجتماعی طور پر کھالیا۔اسی لئے روایات میں مختلف اشیاء کا ذکر ہے۔

---

(۱) علامہ بیجوریؒ نے ماں کی جگہ باپ کا ذکر کیا ہے۔لیکن الاصابہ میں ماں کا ذکر ہے۔ (اصلاح الدین)

(۲۷) حدّثنا الحسن بن محمّد البصری ثنا الفضیل بن سلیمان حدّثنی فائد مولیٰ عبیدالله بن علی بن أبی رافع مولیٰ رسول اللهﷺ قال حدّثنا عبیدالله بن علی عن جدته سلمیٰ أنّ الحسن بن علی و ابن عباس و ابن جعفر أتوها فقالوا لها اصنعی لنا طعاما ممّا کان یعجب رسول اللهﷺ ویحسن اکله فقالت یا بُنّی لا تشتهیه الیوم قال بلیٰ اصنعیه لنا قال فقامت فاخذت شیئا من الشعیر فطحنته ثمّ جعلته فی قدرٍ و صبت علیه شیئا من زیت و دقّت الفلفل و التوابل فقرّبته الیهم فقالت هذا ممّا کان یعجب النبیّﷺ و یحسن اکله(۱).

حضور اقدسﷺ کے ساتھ کھانے کا عملی نمونہ:

ترجمہ: سلمیٰؓ کہتی ہیں کہ حسن بن علیؓ، حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن جعفرؓ ان کے پاس آئے۔اور کہا کہ ہمارے لئے وہ کھانا تیار کرلو جو حضورﷺ کو پسند تھا۔اور آپﷺ اسے رغبت سے کھاتے تھے۔سلمیٰؓ نے کہا کہ بیٹے! آج تم وہ کھانا پسند نہیں کروگے۔انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں۔تم ہمارے لیے پکاؤ(تو) وہ اٹھیں اور کچھ جو لے کر اسے پیسا۔پھر اسے ہانڈی میں ڈالا اور اوپر سے زیتون کا تیل تھوڑا ڈال دیا۔ اور کچھ مرچ مصالحہ بھی پیس کر ملا دیا پھر ان کے سامنے پیش کیا۔اور کہا کہ یہ کھانا ہے جو نبی کریمﷺ کو پسند ہوتا تھا اور آپﷺ اسے رغبت سے تناول فرماتے تھے۔

حضرت سلمیٰؓ سلمیٰ حضرت صفیہ بنت عبدالمطلبؓ کی آزاد کردہ اور ایک قول کے مطابق خود نبی کریمﷺ کی آزاد کردہ باندی تھیں۔اور نبی کریمﷺ کے آزادہ کردہ غلام حضرت ابورافعؓ کی بیوی تھی۔ نبی کریمﷺ کی خدمت کیا کرتی تھی۔بالخصوص کھانا پکانے میں ازواج مطہرات کا ہاتھ بٹاتی تھی۔علاوہ ازیں اہل بیت کے بچوں کی خدمت بھی آپؓ کے سپرد تھی۔حضرت ابراہیم بن النبیﷺ اور حسنینؓ کی بچپن میں خدمت کی۔حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد غسل بھی آپؓ نے دیا۔

---

(۱)المعجم الکبیر للامام الطبرانی ۲۲/ ۲۹۹(مختار)

یابُنیّ بعض شرّاح کہتے ہیں کہ یہ باء کے فتحہ اور نون کے کسرہ کے ساتھ جمع کا صیغہ ہے۔ جو یاء متکلم کی طرف مضاف ہے۔ اصل میں بنین تھا۔ لیکن اکثر شرّاح نے اسے مفرد مصغر مضاف الی یاءالمتکلم قرار دیا ہے اور یہی راجح بھی ہے۔ کیونکہ بعد میں تشتہیہ کا صیغہ بھی مفرد مخاطب کا ہے۔ گویا حضرت سلمیٰؓ نے تینوں میں سے کسی ایک کو مخاطب کیا جو کہ درخواست پیش کرنے والے تھے۔ یا ان میں سے سے بڑے یعنی حضرت حسن بن علیؓ کو مخاطب کیا تھا۔

لا تشتھیہ الیوم مطلب یہ ہے کہ تم یہ مطالبہ چھوڑ دو۔ تم اُس زمانے کے نہیں ہو۔ وہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتے جو کہ نبی کریم ﷺ برداشت کیا کرتے تھے۔ آج تم وہ کھانا کھانا پسند نہیں کرو گے۔ کیونکہ زمانہ بدل گیا ہے۔ وسعت اور فراخی آچکی ہے۔ اس لئے وہ فقر کا کھانا کون پسند کرے گا۔ ہمارے یہاں بھی یہی حالت ہے۔

ہمارے حضرت شیخ الحدیثؒ (والد ماجدؒ) فرماتے تھے کہ چھچھ کے علاقے میں ہم نے طالب علمی کے دوران جوار اور باجرے کی روٹی اور لسی سے روزے رکھے ہیں۔ چارے کا ساگ پکایا کرتے تھے۔ حضرت نانوتویؒ اور حضرت علامہ گنگوہیؒ دہلی میں بھوک کی شدت کی وجہ سے رات کو شہر سے باہر نکلتے اور سبزی فروش جو خراب سبزی باہر پھینک دیتے تھے۔ اس سے قابل استعمال سبزی جمع کر کے پکاتے اور کھا لیتے۔ جبکہ آج ہم نہایت تنعم کی زندگی گزار رہے ہیں۔

بہر حال حضرت سلمیٰؓ نے بھی یہ فرمایا کہ آج تمہارا دل اس کھانے کو نہیں چاہے گا۔ اب تنعم کا زمانہ ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کے تمام مسلمان اہل بیت پر جان چھڑکتے تھے۔ نبی ﷺ کے ساتھ نسبت کے سبب تمام صحابہ بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ تو چونکہ یہ حضرات لذیذ اور اچھے کھانے دیکھ چکے تھے اس لئے حضرت سلمیٰؓ نے کہہ دیا کہ تم وہ پسند نہیں کرو گے۔ **بلی اصنعیه لنا الخ** تینوں حضرات نے اپنی فرمائش دہرائی کہ نہیں بلکہ ہمارے لیے وہ کھانا تیار کرو ہم ضرور کھائیں گے۔ جس پر حضرت سلمیٰؓ نے اٹھ کر جو لیا۔ اسے پیسا۔ پھر اسے ہانڈی میں ڈال کر تیل زیتون تھوڑی مقدار میں ملا دیا۔ پھر سیاہ مرچ اور مصالحہ ملا کر اسے ابالا (۱)۔ اس سے جو کھانا تیار ہوا حضرت سلمیٰؓ کے قول کے مطابق یہی نبی کریم ﷺ کی محبوب غذا تھی۔

---

(۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرچ مصالحہ اور لذیذ کھانا خلاف سنت نہیں۔ (مختار)

(۲۸) حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبوأحمد ثنا سفیان عن الأسود بن قیس عن نبیح العنزی عن جابر بن عبداللّٰہ قال اتانا النبیّ ﷺ فی منزلنا فذبحنا له شاةفقال کانهم علموا انا نحب اللحم و فی الحدیث قصة(۱).

ترجمہ: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس ہمارے گھر تشریف لائے ہم نے ایک دنبہ ذبح کردیا۔ نبی کریم ﷺ نے (تفرّحاً) فرمایا کہ گویا ان لوگوں کو پتہ تھا کہ ہمیں گوشت پسند ہے (امام ترمذی کہتے ہیں کہ) اس حدیث میں قصہ ہے (جو اختصاراً متروک ہے)

فذبحناله شاة اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے آنے کے بعد حضرت جابرؓ نے دنبہ ذبح کردیا جبکہ غزوۂ خندق کے قصہ میں تصریح ہے کہ وہاں نبی کریم ﷺ کے آنے سے قبل ہی کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس لیے بعض شراح جیسے علامہ مناویؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ کوئی اورواقعہ ہے۔ لیکن ملا علی قاریؒ نے اس کا تین طرح سے جواب دیا ہے۔ اول یہ کہ یہاں **اتانا** سے مراد ''**اراد ان یاتینا**'' ہوگا۔ دوم: یہ کہ ہوسکتا ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر جب حضرت جابرؓ نے دیکھا کہ خلاف توقع آنے والے صحابہ بہت زیادہ ہیں۔ تو دوسرا دنبہ نبی کریم ﷺ کی آمد کے بعد ذبح کیا ہو۔ سوم: یہ کہ ہوسکتا ہے اسی روز نبی کریم ﷺ پہلے اتفاقاً یا کسی دوسرے کام کی غرض سے حضرت جابرؓ کے پاس آئے ہوں۔ اورواپسی کے بعد حضرت جابرؓ نے دنبہ ذبح کر کے دوبارہ کھانے پر آپ ﷺ کو بلایا ہو۔

کانّهم علموا الخ یہ محض میزبان کی دلداری اوراس عمل پر اظہار مسرت کے طور پر فرمایا۔

معجزہ تکثیر طعام: **وفی الحدیث قصة الخ** وہ قصہ یہ ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت جابرؓ نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ سخت بھوکے تھے۔ تو آپ ﷺ کو کھانا کھلانے کا ارادہ کیا۔ گھر گئے دنبہ ذبح کیا۔ اور

---

(۱)سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰة باب الصلاة علی غیرنحرالمرء، مسنداحمد۳/۳۰۳، ، السنن الکبریٰ للنسائی کتاب الیوم واللیلة، سنن دارمی۲/۲۵۲،صحیح ابن حبان رقم الحدیث ۱۵۹ مسنداحمد۳/۳۰۳(مختار)

بیوی کو کھانا بنانے کا حکم دیا۔خود چھپکے سے نبی کریمﷺ کے پاس آئے اور انہیں دعوت دی کہ میں نے طعام کا بندوبست کیا ہے۔آپﷺ تشریف لے آئیں۔نبی کریمﷺ نے تمام صحابہؓ میں اعلان فرمایا کہ حضرت جابرؓ نے دعوت کا اہتمام کیا ہے سب آؤ،اور تقریباً ایک ہزار افراد کو لے کر نبی کریمﷺ حضرت جابرؓ کے گھر گئے حضرت جابرؓ یہ دیکھ کر سخت پریشان ہوئے کہ میں نے تو ایک چھوٹی سی ہانڈی پکانے اور چند آدمیوں کا کھانا تیار کرنے کا کہا ہے۔اب یہ سینکڑوں آدمیوں کے لیے کیسے کافی ہوگا۔گھر دوڑے آئے بیوی کو ماجرا سنایا اس نے کہا کہ اگر یہ نبی کریمﷺ نے بلائے ہیں تو خود ہی وہ انتظام بھی فرمائیں گے۔وہ جانے اور اُن کا کام جانے۔اب ہوسکتا ہے کہ گھر آکر حضرت جابرؓ نے دوسرا دنبہ بھی ذبح کیا ہو۔پھر نبی کریمﷺ آئے تو حکم دیا کہ ہانڈی پر ڈھکنا رکھ دو۔کھانے پر بھی دم کیا۔حضرت جابرؓ نے تمام صحابہ کو کھلایا۔وہ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ان کی ہانڈی پہلے کی طرح بھری ہوئی تھی یعنی ان کو اس میں کسی کمی کا احساس نہیں ہوا۔

اسمیں تکثیر طعام کا معجزہ بھی ظاہر ہوا جو کئی بار نبی کریمﷺ سے صادر ہوا ہے۔

(۲۹) حدّثنا ابن ابی عمرثنا سفیان ثنا عبدالله بن محمّد بن عقیل سمع جابرا قال سفیان وانا محمّد بن المنکدر عن جابر قال خرج رسول اللّٰه وأنا معه فدخل علی امراةٍ من الانصار فذبحت له شاةً فاکل منها واتته بقناع من رطبٍ فأکل منه ثم توضّا للظهر و صلیٰ ثم انصرف فاتته بعلالةٍ من علالة الشاة فاکل ثم صلی العصر و لم یتوضّا(۱).

ترجمہ: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک بار نبی کریمﷺ گھر سے نکلے۔میں بھی ساتھ تھا۔ایک انصاری عورت کے مکان پر تشریف لے گئے۔انہوں نے نبی کریمﷺ کے لیے ایک دنبہ ذبح کیا۔نبی کریمﷺ نے اس کے گوشت میں سے کچھ کھایا۔پھر انہوں نے چنگیری میں تازہ کھجور لا کر نبی کریمﷺ کی خدمت میں پیش

(۱)جامع ترمذی ۱/۱۱۶ کتاب الطهارة باب ما جاء فی ترک الوضؤممّامست النار، السنن الکبریٰ للبیهقی ۱/۱۵۶ کتاب الطهارة،مسنداحمد ۳/۲۷۴(مختار)

کی۔تو آپ ﷺ نے اس میں سے بھی کچھ لیا۔اس کے بعد آپ ﷺ نے ظہر کی نماز کے لیے وضوء کیا اور نماز ادا کی۔پھر آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو وہ عورت دنبے کے باقی ماندہ گوشت میں سے کچھ گوشت لے آئی۔آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔

پھر آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی اور (دوبارہ) وضوء نہیں فرمایا۔

فدخل علی امرأة الخ مدینہ کے گردونواح میں باغ تھے۔اور بعض صحابہ کے گھر بھی تھے۔جہاں اس عورت کا گھر بھی تھا۔آپ ﷺ شاید اس عورت کی دعوت پر وہاں گئے ہونگے۔یا کسی دوسری غرض سے وہاں گئے تھے۔**قناع من رطب** قناع کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی اس چنگیر کو کہتے ہیں جس میں عموماً کھجور وغیرہ رکھ کر کھائے جاتے ہیں۔**فاتته بعلالة علالة** اس تھوڑے سے کھانے کو کہتے ہیں جو کہ معمول کے کھانے سے قبل محض بھوک مٹانے کی خاطر کھایا جائے۔جیسے ناشتہ یا مہمانوں کی پہلی بار آمد کے موقع پر چائے بسکٹ وغیرہ یا آج کل سوپ یا سلاد۔لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ چونکہ اس عورت نے دعوت کی ہے۔آپ ﷺ ایک دفعہ کھانا کھا چکے ہیں لیکن اظہار محبت کی خاطر اس عورت نے مزید کھلانا چاہا۔تا کہ واپس جانے سے قبل آپ ﷺ کچھ اور بھی تناول فرمالیں۔لہٰذا جو گوشت باقی تھا وہ بھی رکھ دیا۔اور آپ ﷺ نے دوبارہ کھالیا۔معلوم ہوا کہ اگر ضرورت ہو تو کسی کی دلجوئی کی خاطر مزید کھانا بھی جائز ہے(۱)۔

(۳۰) حدّثنا العباس بن محمّد الدوری ثنا یونس ابن محمّد ثنا فلیح بن سلیمان عن عثمان بن عبدالرحمٰن عن یعقوب بن أبی یعقوب عن أم المنذر قالت دخل علی رسول اللّٰہ ﷺ ومعه علیّ ولنا دوال معلقة قالت فجعل رسول اللّٰہ ﷺ یاکل وعلیّ معه یاکل فقال رسول اللّٰہ ﷺ لعلیّ مه یا علیّ فانّک ناقه قالت فجلس علیّ

---

(۱) اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت جانور کو ذبح کر سکتی ہے۔اور عورت کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال ہے۔اگر چہ وہ حالت حیض یا نفاس میں ہو۔عوام الناس میں یہ غلط مشہور ہے کہ عورت ذبح نہیں کر سکتی۔اور اس کے ہاتھ کا ذبیحہ حرام ہے۔(مختار)

والنبی ﷺ یاکل قالت فجعلت لهم سلقا وّ شعیرا فقال رسول اللّٰہ ﷺ لعلی یا علی من هذا فاصب فانّه اوفق لک(۱)۔

ترجمہ: ام المنذر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرے پاس تشریف لائے۔حضرت علیؓ بھی ساتھ تھے۔ ہمارے یہاں کھجور کے خوشے لٹکے ہوئے تھے۔ نبی کریم ﷺ (ان خوشوں میں سے چن چن کر کھجور) کھانے لگے۔اور حضرت علیؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ کھانے لگے۔

آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کوفرمایاتم مت کھاؤ۔اے علیؓ تم (بیماری گزار کر) کمزور ہو چکے ہو۔ام المنذر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں پس علیؓ بیٹھ گئے اور نبی کریم ﷺ کھاتے رہے۔ کہتی ہیں کہ پھر میں نے ان کے لئے چقندر اور جو کا کھانا تیار کیا۔تو نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا اے علیؓ اس سے کھاؤ۔ یہ تمہارے لیے مناسب ہے۔

امّ المنذرؓ: ان کا نام سلمٰی بنت قیس بن عمرو ہے۔کنیت سے مشہور ہیں۔مشہور بدری صحابی سلیط بن قیس کی بہن ہیں۔ بیعت رضوان میں بھی شرکت کر چکی ہے۔ باپ کی جانب سے نبی کریم ﷺ کی خالاؤں میں سے تھی۔انصار کے بنوالنجار قبیلہ سے تعلق تھا۔نبی کریم ﷺ سے کچھ اور روایات بھی ان کے واسطہ سے مروی ہیں۔علامہ مناویؒ نے ان کا نام سلمۃ بنت قیس لکھا ہے۔جو اسماء الرجال کی کتابوں میں نہیں ملتا۔

کھانے پینے میں حالتِ صحت ومرض کا خیال: **ولنا دوال معلقة دوال داليه** کی جمع ہے جو کھجور کے اس خوشے کو کہتے ہیں جسے نیم پختہ حالت میں درخت سے کاٹ کر لٹکایا جائے۔اور پختہ ہونے پر اس سے کھجور کھائی جائے۔خود دول کے مادے میں تعلیق کا مفہوم موجود ہے کنویں کے کنارے لٹکی ہوئی بالٹی کو بھی دالیہ کہا جاتا ہے۔اس لیے بعد میں معلقۃ کا لفظ ذکر کرنے سے دالیۃ میں تجرید ہوگی۔اور یہ صرف خوشے کے معنی میں لی جائیگی۔ مطلب یہ ہوا کہ کھجور بھرے خوشے باغ میں لٹک رہے تھے۔

---

(۱)جامع ترمذی کتاب الطب باب ماجاء فی الحمية، سنن ابی داؤد ۲/۱۸۳ کتاب الطب باب الحمية سنن ابن ماجة ص ۲۴۵ ابواب الطب باب الحمية، مصنف ابن ابی شيبة ۷/۴۳۷(مختار)

مه یاعلی مه منع کرنے کے لیے استعمال ہونے والا کلمہ ہے۔فانک ناقه یعنی تم کمزور ہو۔اس لئے کھجور مت کھاؤ۔نقاہت اس متوسط حالت کو کہتے ہیں جو بیماری سے شفایاب ہوجانے اور صحت کاملہ کے درمیان ہوتی ہے۔شاید حضرت علیؓ اس سے قبل بیمار رہ چکے ہوں۔لہٰذا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابھی تو بیماری گزار چکے ہو۔اس لئے فی الحال کھجور جیسی ثقیل اور گرم چیز سے پرہیز کرنا چاہیے۔جو نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے(۱)۔

سلقا و شعیراً سلق چقندر کو کہتے ہیں۔من هذا فاصب یعنی یہ کھانا تیرے مزاج کے موافق ہے۔اطباء نے چقندر اور جو کے فوائد بیان کی ہیں۔برودت اور نرمی کی نقاہت کے لیے یہ بہت مفید ہیں۔

(۱۳) حدثنا محمود بن غیلان ثنا بشر بن السریّ عن سفیان عن طلحة بن یحییٰ عن عائشة بنت طلحة عن عائشة أمّ المؤمنینؓ قالت کان النبیّ ﷺ یا تینی فیقول أعندک غداءٌ فاقول لا قالت فیقول إنّی صائم قالت فاتانا یوما فقلت یا رسول اللّٰہ ﷺ انّه اهدیت لنا هدیة قال وماهی قلت حیس قال اما إنّی اصبحت صائماً قالت ثم اکل(۲).

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرے ہاں آکر پوچھتے تھے۔کیا کھانے کے لیے کچھ آپ کے پاس ہے؟ پھر جب میں کہتی کہ نہیں ہے تو آپ ﷺ فرماتے کہ میں روزہ رکھتا ہوں۔ایک دن وہ میرے پاس تشریف لائے۔تو میں نے کہہ دیا کہ ہمارے پاس ایک ہدیہ بھیجا گیا ہے۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا چیز ہے۔میں نے عرض کیا کہ حیس ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تو صبح سے روزہ کا ارادہ کر رکھا تھا۔فرماتی ہیں کہ پھر حضور ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔

---

(۱)اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسباب کی رعایت توکل کے منافی نہیں،علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے ویؤخذ من هذا ان التداوی مشروع ولاینافی التوکل(المواهب اللدنیة ص۱۱۸)(مختار)

(۲)صحیح مسلم ۱/۳۶۴کتاب الصیام باب جواز صوم النافلة بنیة من النهار قبل الزوال الخ، سنن ابی داؤد ۱/۳۴۰کتاب الصوم باب فی الرخصة ذلک، سنن النسائی ۱/۳۲۰کتاب الصیام باب فی باب صیهام المتطوع(مختار)

عائشة بنت طلحة: یہ تابعیہ ہیں۔عائشہ صدیقہؓ کی شاگرد ہیں۔انتہائی حسین وجمیل عورت تھی۔ مصعب بن زبیرؓ نے دس لاکھ درہم(۱)دے کراس سے نکاح کیا۔ان کے قتل ہونے کے بعد عمر بن عبداللہ تیمی نے ایک لاکھ دینار پر آپؓ سے شادی کی۔اوران کے بعد اپنے چچازاد بھائی عمر بن عبیداللہؓ سے شادی کی۔انھوں نے بھی ایک لاکھ دینار مہر دیا۔

امّ المومنین ازواج مطہرات کوام المومنین اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دیگر مؤمنین پر ماں کی طرح حرام ہیں۔یا اس لئے کہ والدہ کی طرح قابل احترام ہیں۔نیز وہ امت پر والدہ کی طرح رحیم وشفیق بھی ہیں۔

نفلی روزہ کے افطار کا مسئلہ: **أعندک غداء** غداء صبح سے لے کر دو پہر تک کے وقت میں کھانے کا نام ہے۔لیکن کبھی کبھی مطلق کھانے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔لیکن یہاں اول الذکر متعین ہے کیونکہ روزہ کی نیت اسی وقت میں کی جاسکتی ہے۔چونکہ نبی کریم ﷺ کی حضرت عائشہؓ سے زیادہ محبت کا صحابہؓ کو علم تھا۔اس لیے وہ ہدایا بھیجنے میں حضرت عائشہؓ کی باری(قسم) کا لحاظ رکھتے تھے۔تاکہ نبی کریم ﷺ ہدایا کو ان کے ہاں سے کھائیں۔یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کو حضرت عائشہؓ کے ہاں کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جاتا۔اور یہاں پر حضرت عائشہؓ کی مراد بھی غالباً یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کھانے کی توقع رکھتے ہوئے فرمائش کر دیتے تھے۔

قلت حَيس حیس ایک قسم کا حلوا ہوتا تھا۔جو کھجور، گھی اور پنیر یا آٹے کو ملا کر بناتے تھے۔**اما إنیّ اصبحت صائما** یعنی اگر چہ صبح سے روزہ کی نیت کر لی تھی لیکن یہ روزہ عموماً بغیر کچھ کھائے رکھا جاتا تھا۔لہٰذا جب کچھ کھانے کو ملا۔تو اب روزہ افطار کر کے حیس کھالوں گا۔روزہ کی قضاء دوسرے دن ہو جائے گی۔جبکہ بعض شراح نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ روزہ تو نہیں رکھا تھا۔البتہ روزہ رکھنے کا ارادہ تھا۔لیکن اب حیس کھانا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔یہ ترجمہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ احناف کے نزدیک نفل روزہ شروع کرنے سے واجب ہو جاتا ہے۔تو پہلی تشریح کے مطابق افطار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

(۱)شذرات میں مصعب بن زبیرؓ کی طرف سے دیا جانے والا مہر بھی ایک لاکھ دینار لکھا ہے۔(اصلاح الدین)

لیکن اول الذکر تشریح پر بھی جواب ممکن ہے۔ وہ یوں کہ ضرورت کے وقت نفلی روزہ توڑنا جائز ہے اگر چہ اس کی قضاء لازم ہوجاتی ہے۔ بقیہ مباحث اور دلائل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔۔۔اس حدیث سے ایک اور مسئلہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص مفطراتِ صوم سے اجتناب کر چکا ہو تو نفلی روزہ کی نیت نصف النہار تک کر سکتا ہے۔ اس طرح یہ حدیث امام مالکؒ پر حجۃ ہوگی جو کہ تبییت یعنی رات ہی سے نیت کرنے کو شرط کہتے ہیں۔

(۳۲) حدّثنا عبداللّٰه بن عبدالرحمٰن ثنا عمر بن حفص ابن غيّاث ثنا أبي عن محمّد بن أبي يحيٰى الأسلمّي عن يزيد بن أبيّ أمية الأعور عن يوسف بن عبداللّٰه بن سلام عن عبداللّٰه بن سلام قال رأيت النبّي ﷺ أخذ كسرة من خبز الشعير فوضع عليها تمرة ثمّ قال هذه إدام هذه فأكل (١).

ترجمہ: یوسف بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ جو کی روٹی کا ٹکڑا اٹھا کر اس پر ایک کھجور رکھ دی۔ پھر فرمایا کہ یہ کھجور اس روٹی کا سالن ہے۔ اور پھر تناول فرمایا۔

یوسف بن عبداللہؓ: عام نسخوں میں یہ حدیث یوسفؓ سے مروی ہے۔ جبکہ بعض نسخوں میں ''یوسف بن عبداللہ بن سلام عن عبداللہ بن سلام'' ذکر ہے۔ اکثر شرّاح نے پہلے نسخے کی تصحیح کی ہے۔ علامہ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں اور علامہ ابن عبدالبرؒ نے استیعاب میں اس حدیث کو یوسف بن عبداللہؓ کو منسوب کی ہے۔ نیز امام ابوداؤدؒ نے اسے یوسفؓ سے روایت کیا ہے۔

یہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے بیٹے ہیں۔ صغر سنی میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا تھا اور کچھ ادائیں محفوظ کر لی تھیں۔ ولادت کے بعد حضرت عبداللہ بن سلامؓ انہیں نبی اکرم ﷺ کے پاس لے آئے۔ آپ ﷺ نے اسے اٹھایا اور اس کا نام یوسف رکھ دیا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ خلافت میں وفات پائی۔

---

(١) السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰/۶۳، المعجم الکبیر للطبرانی ۲۲/۲۸۶ (مختار)

عبداللّٰہ بن سلامؓ: مشہور صحابی ہیں۔ بنو قینقاع سے تعلق تھا۔ حضرت یوسفؑ کی اولاد میں سے تھے۔ لہٰذا نسبتاً بنی اسرائیلی تھے۔ لیکن خزرج کے حلیف ہونے کی وجہ سے کبھی خزرجی بھی کہا جاتا ہے۔ اصل نام حصین تھا۔ نبی کریم ﷺ نے تبدیل کر کے عبداللہ رکھ دیا۔ یہود کے جید علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں نبی کریم ﷺ کی آمد کے بعد حاضر ہوئے تو بے اختیار بول پڑے "ماھذا الوجه بوجهِ كذاب" پھر اسلام لے آئے۔ اور نبی کریم ﷺ سے کہا کہ میں یہود کا سردار ہوں۔ اور ان سے میں زیادہ علم رکھنے والا ہوں۔ آپ ﷺ ان سے میرے بارے میں ان کو میرے اسلام کی خبر پہنچنے سے قبل پوچھ لیں۔ تو یہود بھی اس کا اعتراف کریں گے۔ گویا یہود کی تعصب پر پہلے دن ہی سے نبی کریم ﷺ کو خبردار کیا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو جنت کی بشارت دیدی تھی۔ ۴۳ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔

تعریف ادام نہیں بلکہ قناعت مطلوب ہے: هذه ادام هذه یعنی یہ تمرۃ (کھجور) بھی سالن ہے۔ نبی کریم ﷺ لغوی یا عرفی امور کو بیان کرنے کے لیے نہ مبعوث ہوئے تھے نہ یہاں یہ مقصد ہے۔ بلکہ مقصد یہاں قناعت کی تعلیم دینا ہے۔ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر کھجور کو مجازاً ادام کہا گیا ہے۔ یعنی اگرچہ یہ لغۃً وعرفاً ادام نہیں لیکن قناعت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ادام سمجھ لینا چاہئے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس حدیث سے شوافع کا مذہب قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ کھجور ادام ہے اور قسم کے باب میں ادام سے قسم کھجور کو شامل ہوگا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر یہ کلام بے مقصد رہ جاتا۔

(۴۳) حدّثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن ثنا سعید بن سلیمان عن عبّاد بن العوام عن حمید عن أنس بن مالک انّ رسول اللّٰہ ﷺ کان یعجبه الثفل قال عبداللّٰہ یعنی ما بقی من الطعام(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کو بچا ہوا کھانا پسند ہوتا تھا۔

یعجبه الثفل ثفل کا ترجمہ خود راوی کر رہے ہیں۔ دراصل مائع چیز میں جو مادہ نیچے بیٹھ جاتا ہے اسے ثفل کہتے ہیں۔ لیکن کھانا کھانے کے بعد جو تھوڑا کھانا برتن میں رہ جاتا ہے اسے بھی ثفل کہتے ہیں۔ اور

(۱) مسند احمد ۳/۲۲۰، شرح السنۃ للبغوی ص ۳۰۲ حدیث نمبر ۲۸۵۷ (مختار)

یہاں یہ مراد ہے۔اسے پسند کرنے کی کئی وجوہ ہیں۔مثلاً عموماً یہ زیادہ پختہ اور ہضم کے قریب ہوتا ہے۔لذیذ بھی زیادہ ہوتا ہے۔نیز متکبرین ایسے باقی ماندہ کھانے کو معیوب سمجھتے ہیں۔اس لیے آپﷺ کا اسے کھانا تواضع سے زیادہ قریب ہے۔پھر گھی، تیل، چکناہٹ سالن کے اوپراوپر ہوتا ہے جس کا مضر ہونا معلوم ہے۔اور کم چکناہٹ کی وجہ سے سالن کا نچھلا حصہ زیادہ مناسب رہتا ہے۔

بعض لوگوں نے یہاں ثفل کا ترجمہ ثرید سے کیا ہے۔لیکن باجود یہ کہ ثرید نبی کریمﷺ کا محبوب تھا۔لیکن اول الذکر ترجمہ اولیٰ ہے۔

(وصلی اللہ تبارک و تعالیٰ علی حبیبہ محمد وعلی آلہ و صحبہ و اتباعہ اجمعین)

خلاصہ باب

اس باب میں ان اشیاء کا بیان ہے جن کو نبی کریم ﷺ نے بطور سالن استعمال فرمایا ہے۔ خواہ وہ عرفاً سالن ہو یا نہ ہو۔ مثلاً گوشت کا ذکر ہے جس کو آپ ﷺ نے ادام کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ پھر گوشت میں دنبے، مرغی، حباریٰ (تلور) جیسے حیوانات کا گوشت اور دنبے کے گوشت کے بعض ان حصوں کا بیان ہے جن کو نبی کریم ﷺ نے پسند کر کے تناول فرمایا۔ مثلاً ذراع (پنڈلی)، پہلو (پسلیوں) اور کمر کا اُبالا ہوا۔ اور بھنا ہوا گوشت آپ ﷺ تناول فرما چکے ہیں۔ نیز یہ بھی بیان ہے کہ ذراع کا گوشت آپ ﷺ کو پسند تھا مگر کیوں؟

اسی طرح اس باب میں ادام کے سلسلے میں آپ ﷺ کی سادگی اور قناعت کو خوب واضح کر دیا گیا ہے چنانچہ سرکہ، روغن زیتون، شہد، پنیر، ستو کے ساتھ کھجور، کدو، اس کا شوربہ اور جو کی روٹی کے ساتھ کھجور کا بطور سالن استعمال اس باب میں مذکور ہیں جو انتہائی بے تکلفی کا مظہر ہے۔ اور اسی اختیاری سادگی کو اجاگر کرنے کے لیے آپ ﷺ نے سرکہ کو بہتر سالن کہا ہے۔ اس کو بیان کرنے کیلئے غریبوں کی دعوت قبول کرنے کا ذکر ہے۔ اور اس پر تنبیہ کے لیے حضرت سلمیٰؓ اہل بیت کے صاحبزادوں کیلئے نبی کریم ﷺ کے معمول کی غذا حیس کو تیار کرنے سے کترا رہی ہیں۔

البتہ بعض چیزوں میں نبی کریم ﷺ کی طبعی رغبت کا اظہار کر کے آپ ﷺ کی فطرتِ سلیمہ کے حسنِ انتخاب کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ذراع کے گوشت، ثفل، ثرید، شہد اور دیگر میٹھی اشیاء کی پسندیدگی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بشری تقاضوں سے بالاتر اور مشتہیات سے مستغنی نہ تھے۔ بلکہ اس سلسلے میں طبع سلیم کے مالک تھے۔ صرف فقرِ اختیاری اور ذوق قناعت ہی آپ ﷺ کی سادگی کا باعث تھا۔

''اللھم فصل علیہ صلوٰۃً ترضاھالہ''

۲۷. باب ما جاء فی صفة وضوء رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے (وضوء) ہاتھ منہ دھونے کا بیان

وضوء سے مراد اس مقام پر لغوی وضوء ہے۔ اصطلاحی وضوء مراد نہیں ہے(۱)۔ اور عند الطعام کے معنی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہیں۔ دونوں کا ذکر آئے گا۔

(۱) حدثنا أحمد بن منیع ثنا إسماعیل بن ابراهیم عن أیوب عن ابن ابی ملیکة عن ابن عباسؓ انّ رسول اللہ ﷺ خرج من الخلاء فقرب إلیه الطعام فقالوا ألا ناتیک بوضوء قال انّما امرت بالوضوء إذا قمت إلی الصلٰوة(۲).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بیت الخلاء سے باہر آئے تو آپ ﷺ کو کھانا پیش کیا گیا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا ہم آپ کے لیے وضوء کا پانی نہ لائیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تو وضوء کا حکم صرف اس وقت دیا گیا ہے جب نماز کا ارادہ کروں۔

من الخلاء خلاء دراصل خالی جگہ کو کہتے ہیں۔ لیکن یہاں قضائے حاجت سے کنایہ ہے کیونکہ یہ کام تنہائی میں کیا جاتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ قضائے حاجت کے بعد جب آپ ﷺ نے استنجاء کیا تھا۔

(۱) وضوء بفتح الواو اس پانی کو کہاجاتا ہے جس سے پاکی حاصل کی جاتی ہے۔ اور بضم الواو حصول طہارۃ کے اس مخصوص طریقے کو کہاجاتا ہے جو نماز سے پہلے اپنائی جائے۔ مگر یہاں پر وضوء کے بارے میں شیخ جواد الرومیؒ نے لکھا ہے **والمراد هنا بالوضؤ اللغوی وهو غسل الیدین والفم لأنّ الوضؤ الشرعی لیس مسنوناً قبل الطعام ولا بعده(الاتحافات ۲۳۲)** علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے **والمراد بالوضؤ الوضؤ مایشتمل الشرعی واللغوی بدلیل الاخبار الآتیة فارادة الشرعی من حیث بیان عدم طلبه عند الطعام لاوجوباً ولاندباً وإرادة اللغوی من حیث بیان ندبه عند الطعام قبله وبعده(المواهب اللدنیة ۱۲۰)** مگر حضرات محدثین نے اسی کو راجح قرار دیا ہے کہ یہاں وضوٗ سے مراد وضوٗ لغوی ہے۔ (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۲/۱۷۲ کتاب الأطعمة باب فی غسل الیدین عندالطعام، سنن النسائی ۱/۱۷ کتاب الطهارة باب الوضؤ لکل صلوٰة، شرح السنة للبغوی ۱۱/۲۸۳ کتاب الأطعمة باب الوضوء عندالطعام (مختار)

واپسی پر کھانے کی کوئی چیز پیش کی گئی۔

ألا نأتیک بوضوء بعض نسخوں میں" **لا نأتیک** "بغیر ھمزہ کے ذکر ہے۔اس صورت میں ھمزہ استفہام مقدر ہوگا۔وضوءاس پانی کو کہتے ہیں جس سے وضو کیا جائے۔صحابہؓ کا یہ سوال شاید اس وہم پر مبنی ہے کہ کھانے سے قبل بھی اصطلاحی وضوء کرنا ہوتا ہے۔

<u>وضوءلغوی نہ کہ اصطلاحی</u>: **انما امرت الخ** یعنی اگر تم اصطلاحی وضوء کروانا چاہتے ہو تو اسے تو اللہ تعالیٰ نے نماز یا وہ کام جو نماز کے حکم میں ہے، کے لیے واجب کیا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے **وإذا قمتم إلى الصلٰوة فاغسلوا وجوهکم و ایدیکم (الاية)**

اور اگر وضو لغوی مراد ہے تو وہ تو ہو چکا ہے۔حاصل کلام یہ ہوا کہ وضوء اصطلاحی نہ قبل الطعام ضروری ہے اور نہ بعد الطعام اسے واجب کیا گیا ہے۔

(۲) حدّثنا سعيد بن عبدالرحمان المخزوميّ ثنا سفيان بن عيينة عن عمرو ابن دينار عن سعيد بن الحويرث عن ابن عباسؓ قال خرج رسول اللهﷺ من الغائط فاتى بطعام فقيل له الا تتوضّا فقال اصلّى فاتوضّا(۱)۔

ترجمہ: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ قضائے حاجت سے فارغ ہو کر باہر آئے تو آپﷺ کے پاس کھانا لایا گیا۔آپﷺ سے کہا گیا کہ کیا آپﷺ وضوء نہیں کریں گے۔آپﷺ نے فرمایا کیا میں نے نماز پڑھنی ہے جو وضوء کروں۔

غائط المنخفض من الارض یعنی زیریں زمین اور گہرائی کو کہتے ہیں۔عموماً قضائے حاجت کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔لہٰذا قضائے حاجت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔لیکن یہاں مکان مراد ہے تا کہ مخرج کا لفظ حقیقت پر محمول ہو۔

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۱۶۲ کتاب الحیض باب اکل المحدث الطعام الخ ،السنن الکبری للبیهقی ۱/۴۲ کتاب الطهارة(مختار)

ألاتـوضّـا اصل میں تتـوضـا تھاتخفیفاً ایک تاءکوحذف کیا گیا۔فقـال أصلـی یہاں ہمزہ استفہام محذوف ہے۔یعنی أأصلی۔معنی یہ کہ کیا میں نے نماز پڑھنی ہے جووضوء کروں۔اوراگر چہ وضـوء علی الوضوء بہتر ہے لیکن کھانے کے لیےتو وضوءلازم نہیں ہے۔

(۳) حـدّثنا یحییٰ بن موسیٰ ثنا عبداللّٰہ بن نمیر ثنا قیس بن الربیع حـدّثـنـا قتیبة ثـنـا عبـدالـکریم الجرجانیّ عن قیس بن الربیع عن أبی هـاشـم عـن زاذان عـن سـلمان قال قرأت فی التوراة إنّ برکة الطعامه الوضؤ بعده فذکرت ذلک للنبیّ ﷺ وأخبرته بما قرأت فی التوراة فقال رسول اللّٰہ ﷺ برکة الطعامه الوضوء قبله والوضوء بعده(۱).

ترجمہ: حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا کہ کھانا کھانے کے بعد وضوء کرنا برکت کا سبب ہے۔میں نے نبی کریم ﷺ سے یہ بات کہی اوراپنے تورات پڑھنے کی بات بھی کی۔تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کھانے کی برکت کا سبب کھانے سے قبل اورکھانے کے بعد وضوءیعنی (ہاتھ منہ دھونا) ہے۔

کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونے کی برکت: قـرأت فـی الـتـورات الـخ حضرت سلمان فارسیؓ کواللہ تعالیٰ نے طویل عمر دی تھی۔اور بہت سے مذاہب سے گزرے تھے۔تورات اورانجیل کے عالم تھے۔تفصیلی حالات گزر چکے ہیں۔بـرکـة الـطـعـام:یعنی کھانے سےفراغت کے بعد اگر ہاتھ دھولیے جائیں تو کھانے میں برکت ہوتی ہے۔(۲) کیونکہ دسومت اوروہ آلودگی جو کھانے سے ہاتھ کولگتی ہے دور ہوکر ہاتھ پاک ہوجاتے ہیں۔جبکہ اطباء کے بقول اگر دسومت ہاتھ پر باقی رہے۔تو وہ ایک خاص قسم کی بیماری ''لحم'' پیدا کرتی ہے۔جوکہ جنوں کی ایک قسم ہے۔

(۱)سـنـن ابـو داؤد۲/۱۷۲ کـتـاب الأطـعـمة بـاب غسـل الیـدیـن قبـل الـطـعـام، شـرح السنة لـلـبـغـوی ۱۱/۲۸۲ کتاب الأطعمة باب الوضؤ عندالطعام،السنن الکبریٰ للبهیقی۷/۲۷۵ کتاب الأطعمه،جامع الترمذی ۲/۴۴۸کتاب الأطعمة باب الوضؤ قبل الطعام وبعده.(مختار)

(۲)علامہ عینیؒ نے لکھا ہے کہ برکت کا مطلب یہ ہے کہ کھانا زیادہ محسوس ہوتا ہے۔اورامام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ منہ دھونااور بعد میں ہاتھ منہ دھونا فقر کودور کرتا ہے(مختار)

الوضوء بعده یعنی یہ درست ہے کہ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے میں برکت ہوتی ہے۔لیکن اس بات میں ایک کمی ہے۔وہ یہ کہ کھانے سے قبل بھی ہاتھ دھونا باعث برکت ہے۔اوراس طرح نبی کریمﷺ نے کھانے سے قبل وضوءلغوی کی ترغیب دے کر یا تو شریعت موسوی پر اضافہ کیا ہے۔جو کہ آپﷺ کے مناصب میں سے ہے۔اور یا اس تعریض کی طرف اشارہ ہے کہ تورات میں تحریف ہوئی ہے۔ایک قطعہ حکم کوحذف کردیا گیا ہے۔وہاں تو "قبله" کا ذکر ہے۔لیکن پہلے ہاتھ دھونے کا حکم انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ پہلے ہاتھ دھونے میں بھی برکت ہوتی ہے۔کھانا زہریلے اثرات سے پاک ہوجاتا ہے۔اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہضم ہوکر عبادات، تحصیل علم اور جہاد کی قوت پیدا کرتی ہے۔صحیح مصرف میں صرف ہوتا ہے۔اور گناہوں کا سبب نہیں بنتا۔

ہاتھ دھلواتے وقت یہ ادب بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ کھانے سے قبل بچوں اور نوعمروں کو معمر لوگوں سے پہلے ہاتھ دھلوائیں کیونکہ ان کے ہاتھ پر عموماً گندگی یقینی ہوتی ہے۔جبکہ کھانے کے بعد معمر لوگوں کو ہاتھ دھونے میں نوعمروں پر اکراماً مقدم کرنا چاہیے۔

خلاصہ باب

اس باب میں کھانا کھانے کے لیے ضروری اور غیر ضروری صفائی کا ذکر ہے۔احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانا کھانے سے قبل ہاتھ دھونا چاہیے۔اس سے کھانے میں برکت ہوتی ہے۔اسی طرح کھانے کے بعد بھی ہاتھ دھونا باعثِ برکت ہے۔البتہ کھانے سے پہلے اصطلاحی وضوء کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۲۸. باب ما جاء فی قول رسول اللّٰه ﷺ قبل الطعام و بعد ما یفرغ منه

کھانے سے پہلے اور بعد میں حضور اقدس ﷺ کی دعائیں

یعنی وہ کونسی دعائیں اور ذکر واذکار ہیں جو کھانا کھانے سے قبل اور اس کے بعد نبی کریم ﷺ سے ثابت ہیں۔اس باب میں ان کا ذکر ہے۔

کھانا کھانے سے قبل بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمد للہ پڑھنا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔لیکن یہاں طعام سے مراد صرف کھانا نہیں بلکہ مشروبات کا پینا بھی اس سے ملحق ہے۔لہٰذا کھانا اور پینا دونوں مراد ہیں۔

(۱) حدّثنا قتیبة بن سعید ثنا إبن لهیعة عن یزید بن أبی حبیب عن راشد بن جندل الیا فعی عن حبیب بن اوس عن أبی أیّوب الأنصاری قال کنّا عند رسول اللّٰه ﷺ یوما فقُرِّب الیه طعام فلم أرطعا ماً کان أعظم برکة منه اوّل ما اکلنا و لا اقلّ برکة فی اٰخره قلنا یا رسول اللّٰه کیف هذا قال انّا ذکرنا اسم اللّٰه حین اکلنا ثمّ قعد من اکل و لم یسمّ اللّٰه تعالیٰ فاکل معه الشیطان(۱).

<u>بسم اللہ نہ پڑھنے کی بے برکتی:</u>

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ ایک روز ہم نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر تھے کہ آپ ﷺ کو کھانا پیش کیا گیا۔میں نے اس روز جیسا کھانا کبھی نہیں دیکھا تھا۔جو ابتداء میں تو ہمارے کھانے کے وقت نہایت بابرکت ہو۔اور کھانا ختم ہوتے وقت انتہائی بے برکت ہو۔ہم نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ یہ کیسے ہوا۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم نے اس وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا تھا۔جب ہم کھانا کھانے لگے تھے۔اس کے بعد ایک ایسا شخص کھانا کھانے بیٹھ گیا جو اللہ کا نام لئے بغیر کھانا کھانے لگا۔تب شیطان بھی اس کے ساتھ کھانے لگا۔(جس سے برکت اٹھ گئی)

---

(۱)شرح السنة ۱۱/۲۷۵ کتاب الأطعمة باب التسمیة علی الأکل والحمد فی آخره، کنز العمال ۱۹/۱۸۶، مسند احمد ۵/۴۱۵(مختار)

ابو ایوب انصاریؓ: خالد بن زیدؓ نام ہے۔ اور کنیت سے مشہور ہیں۔ خزرجی انصاری صحابی ہیں۔ بیعت عقبہ میں شریک تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ہجرت فرمائی، تو سب سے پہلے آپ کے ہاں ٹھہرے تھے۔ اور ایک ماہ تک آپؓ کو نبی کریم ﷺ کی مہمان نوازی کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں جہاد کے لیے نکلے۔ قسطنطنیہ کے آس پاس بیمار پڑ گئے، تو ساتھیوں کو وصیت کی کہ اگر میں وفات پاؤں تو میری لاش اپنے ساتھ لے چلو۔ اور دشمن سے مقابلہ ہو تو اس وقت مجھے اپنی قدموں میں دفن کردو۔ چنانچہ ۵۱ھ کو راستہ میں وفات پائی اور قسطنطنیہ کی فصیل کے پاس ہی دفن کردیئے گئے۔ قبر مبارک آج تک مرجع خلائق ہے۔ لوگ حصول شفاء کے لیے بھی بطور تبرک زیارت کے لیے آتے ہیں۔ مدینہ میں آپ کے گھر کی جگہ ایک مدرسہ بنایا گیا تھا۔ جسے مدرسہ شہابیہ کہا جاتا تھا۔ اب یہ سارے مقامات حرم نبوی میں شامل کردیئے گئے ہیں۔ (شذرات الذہب)

اوّل ما اکلنا الخ ما مصدریہ وقتیہ ہے۔ یعنی اول زمان اکلنا۔ اسی طرح "**فی آخرہ**" کا معنٰی یہ ہوگا کہ "آخر وقت اکلنا یا آخر زمان اکلنا" مقصود یہ ہے کہ کھانا شروع کرتے وقت کھانا بہت بابرکت تھا۔ پھر ختم ہوتے وقت کھانا بہت بے برکت ہوگیا۔ **کیف ھذا** صحابہ کرامؓ کے سوال کا مقصد یہ ہے کہ ابتداء میں تو کھانا ختم ہونے کو نہیں آتا تھا۔ یہ آخر میں اسے کیا ہوگیا۔ اور کس حکمت اور کس سبب سے یہ ناکافی ہوگیا۔ **قال انا الخ** نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابتداء میں ہم جتنے بھی لوگ تھے۔ کھانے سے قبل بسم اللہ پڑھ چکے تھے۔ درمیان میں ایک شخص ہمارے ساتھ بغیر بسم اللہ پڑھے کھانے میں شریک ہوا۔ جسکی وجہ سے کھانے کی برکت جاتی رہی۔ کیونکہ بسم اللہ نہ پڑھنے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت بلکہ خلاف سنت کام کے ارتکاب کی بناء پر شیطان شریک طعام ہوا۔ جس کی عادت ہے کہ مکھی کی طرح ہمیشہ گندگی کی طرف لپکتا ہے۔ جب اتباع سنت ترک ہوا تو معنوی تکدر کی وجہ سے اسے موقع ملا اور کھانا کھانے بیٹھا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کھانے کی ابتداء میں بسم اللہ کہنا سنت ہے۔ **ذکرنا اسم اللّٰہ** بعض کا خیال ہے کہ یہاں صرف اللہ کا نام مراد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جملہ **بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم** مراد ہے۔ دونوں کا احتمال ہے۔ لیکن مؤخر الذکر افضل ہے پھر بسم اللہ کا پڑھنا بعض کے نزدیک واجب ہے اور اکثر سنت

موکدہ ہونے کے قائل ہیں جس طرح کے دائیں ہاتھ سے کھانے میں بھی اختلاف ہے۔بعض واجب اور جمہورا سے سنت کہتے ہیں۔

بسم اللہ ہر فرد پڑھے گا یا ایک کا کافی ہوگا: اس حدیث میں یہ بات قابل بحث ہے کہ کیا ہر شخص فرداً فرداً بسم اللہ پڑھے گا یا ایک شخص کا بسم اللہ کافی ہوگا۔اول الذکر جمہور کا مذہب ہے۔لیکن امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ ابتداءً جو لوگ کھانا کھانے اکٹھے بیٹھتے ہیں ان میں سے ایک شخص کی بسم اللہ سب کے لیے کافی ہو جائے گی۔ہر شخص کے لیے ضروری نہیں۔اگر چہ بہتر تو یہی ہے کہ ہر شخص الگ الگ بسم اللہ پڑھ لے(۱)۔اب امام شافعیؒ کے مذہب پر سوال یہ ہے کہ پھر اس مقام پر یہ نو وارد شخص جو آیا اس شخص کے حق میں سابقہ بسم اللہ کیوں کافی نہ ہوا۔تو جواب یہ ہوگا کہ دراصل ایک شخص کی بسم اللہ حاضرین کی طرف سے کافی ہو جاتی ہے غائبین کے لیے نہیں۔اور یہ جو نیا شخص آیا ہے وہ چونکہ غائب تھا۔اس لئے اس کے حق میں وہ بسم اللہ کافی نہ ہوئی۔کیونکہ سابقین کا تسمیہ لاحقین تک متعدی نہیں ہوتا۔بلکہ وہ سابقین کو بھی برکتوں سے محروم کر دیتا ہے۔کہتے ہیں کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔

اکل شیطان کی نوعیت: فاکل معہ الشیطان شیطان کھانا کھاتا ہے۔اور اس کی کیفیت مختلف ہو سکتی ہے۔جو کہ مجہول ہے۔ہر مخلوق کے کھانے کے انداز بھی مختلف ہوتے ہیں۔اور خوراک بھی مختلف ہوتی ہے۔بعض مخلوقات منہ سے کھاتے ہیں۔بعض سونگھ کر،کچھ آنکھوں سے کھاتے ہیں۔اسی طرح شیطان کے کھانے کے بھی اپنے طریقے ہیں۔لہٰذا بعض علماء نے جو اس جملے کی تاویلات کی ہیں۔ان کی تاویلات سے صرف نظر کرنا ہی بہتر ہے۔اور شیطان کا کھانا حقیقت پر محمول ہوگا۔اور جب نبی کریم ﷺ نے ہمیں خبر دی ہے تو کیفیت سے لاعلمی کے باوصف ہمارا اس پر ایمان ہے(۲)۔

---

(۱)بیجوری ۱۳۹،جمع الوسائل ج ۱ص ۲۸۶

(۲)ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے واکل الشیطان محمول علی حقیقتہ عند جمھور العلماء سلفاً و خلفاً لامکانہ شرعاً وعقلاً(جمع الوسائل ۲۸۶/۱) البتہ یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مسئلہ یہ ہے کہ جب مجلس میں ایک ہی آدمی بسم اللہ پڑھے۔تو وہ سب کیلئے کافی ہے۔پھر شیطان نہیں آئے گا۔تو یہاں کیسے آیا۔حالانکہ اس آدمی کے آنے سے پہلے حاضرین مجلس نے بسم اللہ پڑھی تھی؟الجواب:اس اشکال کا اہل علم حضرات نے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۲) حدّثنا یحییٰ بن موسیٰ ثنا أبو داؤد ثنا هشام الدستوائی عن بدیل العقیلی عن عبداللّٰه بن عبید بن عمیر عن أمّ کلثوم عن عائشةؓ قالت قال رسول اللّٰه ﷺ اذا أکل أحدکم فنسی ان یذکر اسم اللّٰه تبارک و تعالیٰ علی طعامه فلیقل بسم اللّٰه اوّله واٰخره(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے اور اللہ تعالیٰ کا نام لینا بھول جائے (بسم اللہ نہ پڑھے) پھر (کھانے کے دوران یاد آنے کے بعد) ''بسم اللّٰه اوله و آخره'' کہہ دے۔

فلیقل بسم اللّٰه الخ یعنی ''واذکر ربک اذا نسیت'' پر عمل کرتے ہوئے گزشتہ تقصیر کی بقدر امکان تلافی کر لے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بعید نہیں۔ کہ اس بسم اللہ کی برکت سے ابتدائے طعام بھی بابرکت ہو۔ وسط طعام اور آخر طعام بھی۔ کیونکہ یہاں پر اول وآخر کنایہ ہے سارے طعام سے۔ لہذا وسط طعام خارج نہ ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اول سے نصف اول اور آخر طعام سے نصف آخر مراد ہو۔ پھر تو واسطہ موجود بھی نہیں ہے(۲)۔

(بقیہ حاشیہ) مختلف جوابات دیئے ہیں۔(۱) بعض فرماتے ہیں ثم قعد کا مطلب یہ ہے کہ ای قعد بعد فراغنا من الطعام اور اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی۔ تو ظاہر ہے کہ بے برکتی ہوگی۔ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ مسئلہ ان افراد کیلئے ہے جو ابتداء اکٹھے کھانے میں شریک ہوں اور ان میں سے کوئی ایک بھی بسم اللہ پڑھے۔ تو سب کیلئے کافی ہے۔ لیکن جو شخص بعد میں کھانے میں شریک ہو جائے تو اس کو بسم اللہ پڑھنی ہوگی۔ اور یہاں ظاہر ہے کہ یہ شخص بعد میں شریک ہوا ہے اور اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی۔ اس لئے بے برکتی ہوئی (جمع الوسائل ۱/۲۸۶) (مختار)

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۱۷۲ کتاب الاطعمة باب تسمية علی الطعام ، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۷۸ کتاب عمل الیوم واللیة باب مایقول اذانسی تسمية، دارمی ۲/۹۴، السنن الکبریٰ للبهیقی ۷/۲۷۶. (مختار)

(۲) ابوداؤد اور مشکوٰۃ میں روایت ہے کہ کان رسول اللّٰه ﷺ جالساً ورجل یأکل فلم یسمّ حتیٰ لم یبق من طعامه إلاّ لقمة فلمّا رفعها إلیٰ فیه قال بسم اللّٰه أوّله و آخره فضحک النبی ﷺ ثمّ قال مازال الشیطان یأکل معه فلمّا ذکر اسم اللّٰه استقاء مافی بطنه سنن ابی داؤد (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بسم اللہ پڑھنا سنت ہے یا مستحب: رہی یہ بات کہ بسم اللہ ابتدائے طعام کیلئے سنت ہے یا مستحب۔ تو ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے کہ "والتسمية مستحبة فى الاكل اجماعا "یعنی کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔لیکن یہاں مستحب سے سنت مراد ہونا چاہئے۔کیونکہ اس حدیث میں "فليقل" امر کا صیغہ ہے۔اسی طرح آئندہ حدیث میں "سمّ" بھی امر کا صیغہ ہے۔جو کم از کم سنت ہونے کا فائدہ دیتا ہے۔

(۳) حدثنا عبداللّٰه بن الصبّاح الهاشمىّ البصرىّ ثنا عبدالاعلىٰ عن معمر عن هشام بن عروة عن أبيه عن عمر بن أبى سلمة أنّه دخل على رسول اللّٰه ﷺ و عنده طعام فقال اُدن يا بُنى فسمِّ اللّٰه تعالىٰ و كل بيمينک و كل مما يليک(۱).

ترجمہ: حضرت عمر بن ابی سلمہ سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔آپ ﷺ کے پاس کھانا رکھا ہوا تھا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ بیٹا قریب ہو جاؤ۔بسم اللہ پڑھو۔دائیں ہاتھ سے کھاؤ،اور اپنے سامنے سے کھانا کھاؤ۔

عمر بن ابی سلمہؓ: عمر بن أبى سلمة یہ ام المؤمنین ام سلمہؓ کے بیٹے اور نبی کریم ﷺ کے ربیب ہیں۔والد کا نام عبداللہ بن عبدالاسدؓ ہے۔جو سابقین صحابہ میں سے ہیں۔اور نبی کریم ﷺ کے رضاعی

(بقیہ حاشیہ) كتاب الأطعمة باب التسمية عند الطعام. علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے استقاء مافى بطنه کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے استقاء أى الشيطان مافى بطنه اى ممّا أكله و الاستقاء استفعال من القئ بمعنى الاستفراغ وهومحمول على الحقيقة او المراد البركة الذاهبة بترك التسمية كأنّها كانت فى جوف الشيطان أمانة فلمّا سمىٰ رجعت إلى الطعام(عون المعبود شرح ابى داؤد ۱۰/۱۷۳)(مختار)

(۱)جامع ترمذى ۲/۷ كتاب الأطعمه باب ماجاء فى تسمية على الطعام، السنن الكبرىٰ للنسائى ۶/۷۷، كتاب عمل اليوم و الليلة ما يقول لمن يأكل، مؤطاامام مالک ص ۷۱۸ كتاب صفة النبى باب ماجاء فى الطعام و الشرب(مختار)

بھائی ہونے کے علاوہ پھوپھی زاد بھائی بھی تھے۔ جنگ احد میں زخمی ہونے کے بعد مدینہ میں وفات پا چکے تھے۔ عمرؓ ان کے والدین کی ہجرت کے دوران حبشہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور نبی کریم ﷺ کی تربیت میں پلے بڑھے۔ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے رفیق رہے۔ اور انہی کی طرف سے بحرین کے والی بھی مقرر ہوئے۔

<u>دائیں ہاتھ سے کھانا وجوب کا قول:</u> فسّم اللّٰہ الخ نبی کریم ﷺ نے کھانے کے تین سنہرے آداب کی تعلیم دی ہے۔ اول بسم اللہ پڑھنا، دوم دائیں ہاتھ سے کھانا، سوم اپنے سامنے سے کھانا۔ پہلے ادب کی تفصیل گزر چکی ہے۔ جبکہ دائیں ہاتھ سے کھانا جمہور ائمہ کے ہاں سنت مؤکدہ ہے۔

بعض لوگوں نے اسے واجب بھی کہا ہے۔ کیونکہ روایات میں اس کی تاکید اور ترک پر وعید آئی ہے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔ لیکن وہ ''لا استطیع'' کہہ کر حیلے بہانے تراشتا رہا۔ آپ ﷺ کی زبان سے نکال ''لا استطعت'' جس سے اس آدمی کا ہاتھ شل ہو گیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ''فما رفعها الی فیه'' (۱) یعنی اس کے بعد اس کا ہاتھ منہ تک نہیں اٹھتا تھا۔ ایک اور حدیث میں بائیں ہاتھ سے کھانے کو شیطان (۲) کا عمل کہا گیا ہے۔ ان وعیدات کی وجہ سے بعض لوگوں نے وجوب کا قول کیا ہے۔ لیکن جمہور اسے سنت مؤکدہ ہی کہتے ہیں۔

<u>اپنے سامنے کھانے کا حکم:</u> اسی طرح اپنے سامنے سے کھانا بھی جمہور کے ہاں سنت ہے۔ اور بعض کے ہاں یہ بھی واجب ہے۔ مگر یہ حکم اس وقت ہے کہ برتن ایک ہو۔ کھانا ایک قسم کا ہو۔ اور اطراف میں فرق نہ ہو اور اگر برتن مختلف ہوں یا کھانے کی مختلف چیزیں مثلاً پھل وغیرہ پڑے ہوں تو پھر اپنی طبیعت کی پسندیدہ چیز دوسرے شخص کے سامنے سے کھانا بھی جائز ہے۔ جس طرح کہ باب الادام میں کدو کے ٹکڑوں کے بارے میں گزر چکا ہے۔

---

(۱) عن سلمة بن الاکوع أنّ رجلا اکل عند النبی ﷺ بشماله فقال کل بیمینک قال لا استطیع فقال "لا استطعت ما منعه إلاّ الکبر قال فما رفعها الی فیه" (مسلم ج۲ ص ۱۷۲)(مختار)

(۲) لاتاکلو بالشمال فانّ الشیطان یاکل بالشمال(مسلم ج۲ ص ۱۷۲) (مختار)

(۴) **حدّثنا محمود بن غيلان ثنا أبو أحمد الزبيرىّ ثنا سفيٰن الثورى عن أبى هاشم عن إسمٰعيل بن رياح عن رياح بن عبيدة عن أبى سعيد الخدرىّ قال كان رسول اللّٰه ﷺ اذا فرغ من طعامه قال الحمد للّٰه الذى أطعمنا و سقانا و جعلنا من المسلمين(۱).**

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کھانا کھانے سے فارغ ہو جاتے تو یہ دعا پڑھتے تھے "الحمد للّٰہ الذی اطعمنا و سقانا و جعلنا من المسلمین" "تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں۔ جس نے ہمیں کھانا کھلایا، پانی پلایا اور ہمیں مسلمان بنایا۔

نعمت ایمان: و جعلنا من المسلمین کھلانے پلانے کی نعمت تو بڑی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت یعنی اسلام کا ذکر بھی نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ گویا اگر اسلام کی نعمت نہ ہو تو ہر نعمت عذاب بن جائے۔ کیونکہ مرغ پلاؤ وغیرہ جتنے بھی اچھے کھانے ہوں، ان کا حساب بھی اتنا ہی سخت ہوگا اور پھر عذاب بھی سخت ملے گا جتنا جسم پھلا پھولا اور چربی دار ہوگا۔ عبد القفاء واللّھازم ہوگا۔ اتنی ہی تکلیف زیادہ پہنچے گی۔ جبکہ نعمتوں کی تکمیل ایمان سے ہوتی ہے۔ کوئی بھی نعمت اس کے بغیر نعمت نہیں۔ اسی عظیم نعمت نے مشت خاک کو کندن بنایا۔ کسی نے کیا خوب فرمایا ؎

حمد بے حد مر خدائے پاک را   آنکہ ایمان داد مشت خاک را

اور اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ اس نعمت کا بھی ذکر کرتے تھے۔ اور تمام دیگر نعمتوں کے ساتھ اس کے استحضار کا اہتمام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس حدیث میں اس بات کی تعلیم ہے کہ ہر نعمت کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ کھانا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم نعمت ہے۔ اس پر شکر لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ لئن شکرتم لا زیدنّکم و لئن کفرتم إنّ عذابی لشدید. اور چونکہ کھانا عموماً پینے سے خالی

---

(۱) سنن ابی داؤد ۱۸۲/۲ کتاب الاطعمة باب مایقول الرجل اذا طعم، السنن الکبریٰ للنسائی ۸۰/۶ کتاب عمل الیوم اللیلة باب مایقول اذا شرب اللبن، مصنف ابن ابی شیبة ۱۲۱/۸ .(مختار)

نہیں ہوتا۔اس لئے وسقانا کا اضافہ بھی کر دیا تا کہ تمام نعمتوں کا ذکر ہو جائے۔

نعمت طعام پر حمد:

(۵) حدثنا محمد بن بشّار ثنا یحییٰ بن سعید ثنا ثور بن یزید ثنا خالد بن معدان عن أبی أمامة قال کان رسول اللہ ﷺ اذا رفعت المائدة من بین یدیه یقول الحمد للّٰہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیه غیر مودّع ولا مستغنی عنه ربّنا(۱).

ترجمہ: حضرت ابو امامہ باہلیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے سے جب دستر خوان اٹھایا جاتا۔تو آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے "الحمد للّٰہ حمدا لخ"

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ایسی تمام تعریفیں جو ریاؤ نمود سے پاک اور برکت والی ہیں۔ایسی تعریفیں جو نا قابل ترک ہوں۔نہ اس سے استغنا کیا جا سکتا ہو۔تو ہی ہمارا رب ہے(حمد ودعا سننے والا)

حمد حضور ﷺ اور امت کی خاص پہچان: الحمد اللّٰہ الخ نبی کریم ﷺ حمد کے مواقع تلاش فرماتے تھے۔اور اس کو عجیب تعبیرات اور قسم قسم کے الفاظ سے ادا فرماتے تھے۔ بلکہ حمد تو آپ ﷺ کی امتیازی خصوصیت ہے۔حتیٰ کہ آپ ﷺ کی امت کا نام حمادون یعنی زیادہ حمد کرنے والے ٹھہرا۔نبی کا نام محمد اور احمد ہے۔نبی کا آخری مقام بھی مقام محمود ہے۔قرآن کی ابتداء حمد سے ہوئی۔ جنت میں داخل ہونے کے بعد یہ امت یہی کہے گی کہ الحمد للّٰہ الذی اور ثنا الارض(الآیة)اور نبی کریم ﷺ قبر سے اٹھیں گے تو روایات کے مطابق آپ ﷺ کے ہاتھ میں لواء الحمد یعنی حمد کا جھنڈا ہوگا۔

---

(۱)صحیح بخاری ۲/۸۲۰ کتاب الاطعمة باب مایقول اذافرغ من الطعام ۲/۸۲۰، سنن ابی داؤد ۲/۱۸۲ کتاب الاطعمةباب مایقول الرجل اذاطعم، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۷۹ کتاب عمل الیوم واللیلة باب مایقول اذارفعت المائدة، ابن ماجة ۲۴۴ کتاب الاطعمة باب مایقال اذافرغ من الطعام(مختار)

بہر حال یہ ایک اہم صفت ہے۔اور علماء نے مختلف اسالیب سے اس امت پر اس کا حاوی ہونا بیان کیا ہے۔اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ حمد سے سیر نہیں ہوتے تھے۔اور یہاں بھی فرماتے ہیں کہ حمداً کثیراً طیباً۔یعنی حمد ہو زیادہ ہو۔ریا و نمود کی آلائشوں سے پاک اور مبارک ہو۔یعنی پھلے پھولے اور اس کی نشو و نما ہوتی رہے۔غیر مودّع اگر دال پر فتحہ ہو تو یہ حمد سے حال ہوگا۔اور معنی یہ ہوگا کہ غیر متروک ہو۔اور اس سے فراق کبھی نہ ہو۔کبھی اس سے دل نہ بھرے۔اگرچہ کھانا کتنا بھی لذیذ کیوں نہ ہو اس سے دل بھر جاتا ہے۔بلکہ ہر خوبصورت چیز اور محبوب ذات سے ایک نہ ایک دن دل اچٹ جاتا ہے۔

مگر آپ ﷺ کے بقول حمد ایسا ہو جو چھوڑا نہ جا سکے۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ لفظِ اللہ سے حال بنے۔اور معنی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کبھی متروک نہ ہو۔یعنی ہمیشہ کے لیے وہ ہماری عبادت انابت اور دعاؤں کا مرجع رہے۔اور مودِّع کی دال پر کسرہ ہو تو پھر قائل اور حامد سے حال ہوگا۔مطلب یہ ہوگا کہ ایسی حمد کہ میں اسے کبھی ترک نہ کروں۔لیکن یہ احتمال مابعد کے جملہ ''و لا مستغنیً عنه'' سے مطابقت نہیں رکھتا۔جو صرف حمد یا لفظِ اللہ سے حال بن سکتا ہے۔

و لا مستغنیً عنه اس کا بھی یہی مقصد ہے۔یعنی اس حمد سے استغناء اور بے نیازی نہ ہو۔یا اللہ تعالیٰ سے اعراض بے توجہی نہ ہو۔کیونکہ منعم کامل ہونے کی وجہ سے اس کے احسانات سے اغماض ممکن نہیں۔تمام عالم کا نظام ہمارے اوپر ایک بڑا انعام ہے۔عرش سے فرش تک انعامات ہیں۔انسان منعم علیہ ہے۔اور ربّ العالمین منعم حقیقی ان تین چیزوں میں سب کچھ سمٹ گیا ہے۔

ابرو باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ان تمام الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ حمد دائم ہو۔بار بار ادا ہو۔اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبدیت کا احتیاج اور شکر کی ادائیگی کا رشتہ ہمیشہ استوار رہے۔

ربّنا اس لفظ کے اعراب میں تین احتمالات ہیں۔یا تو مرفوع ہے۔مبتدا مقدر کے لئے خبر ہونے کی وجہ سے یعنی ''هو ربنا'' یا ''أنت ربّنا'' یا پھر یہ خبر مقدم۔یعنی غیر مودع کے لیے مبتدا ہے۔لیکن اس

تقدیر پر غیر مرفوع پڑھا جائے گا۔تقدیر یوں ہوگی "ربنا غیر مودع" یا منادیٰ ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا۔یا نصب فعلِ مدح۔فعل اختصاص یا فعل اعنی کی تقدیر کی وجہ سے نصب ہوگا۔تیسرا احتمال جر کا ہے۔ یعنی لفظ اللہ سے بدل بن کر مجرور ہے۔

(۶) حدّثنا أبوبکر محمّد بن أبان ثنا وکیع عن هشام الدستوائی عن بدیل بن میسرة العقیلیّ عن عبداللّٰه بن عبید بن عمیر عن أم کلثوم عن عائشةؓ قالت کان النبیّ ﷺ یاکل الطعام فی ستّة من أصحابه فجاء أعرابی فأکله بلقمتین فقال رسول اللّٰه ﷺ لو سمّی لکفا کم(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ چھ آدمیوں کی معیت میں کھانا کھا رہے تھے کہ ایک بدوی آیا۔اور سارا کھانا دو لقموں میں ختم کردیا۔تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔اگر یہ بدوی بسم اللہ پڑھتا تو یہ کھانا سب کے کے لئے کافی ہوجاتا۔

جاء اعرابیّ صحرا میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کو اعرابی کہتے ہیں۔جو پانی اور چارے کی تلاش میں کوچ در کوچ کرتے رہتے ہیں۔

لو سمّی لکفاکم یعنی اس نو وارد کے بسم اللہ نہ پڑھنے کی وجہ سے کھانے کی برکت جاتی رہی۔ اگر یہ شخص بسم اللہ پڑھتا تو کھانے میں برکت ہوتی۔اور بظاہر یہ تھوڑا سا کھانا تم سب کے لیے کافی ہوجاتا۔ جیسے کئی مواقع پر معجزہ کے طور پر اس قسم کی تکثیر کا مشاہدہ کیا جاچکا ہے۔لیکن جب اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت اور ترک سنت کا ارتکاب ہوا۔تو شیطان کو موقع ملا اور کھانا ختم کردیا۔

(۷) حدّثنا هنّاد و محمود بن غیلان قالا حدثناأبو أسامة عن زکریا بن أبی زائدة عن سعید بن أبی بردة عن أنس بن مالک قال قال رسول اللّٰه ﷺ إنّ اللّٰه لیرضٰی عن العبد أن یاکل الاکلة ویشرب

---

(۱)کذافی جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۹۳

الشربة فیحمده علیها(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اس بات پر بہت راضی ہوتے ہیں۔ کہ وہ ایک بار کھانا کھائے، یا پانی پیے اور پھر (شکر ادا کرتے ہوئے) رب ذوالجلال کا حمد بیان کرے۔

ان یاکل الاکلة: أکلة فتح ھمزہ کے ساتھ ہے۔ **الفعلة للمرّة** یعنی بسبب **الا کلة** یعنی ہر بار جب وہ کچھ کھاتا ہے۔ **اویشرب شربة** یعنی ہر بار جب وہ کچھ پیتا ہے۔ صبح ہو، شام ہو، دوپہر ہو یا رات کوئی بھی وقت ہو۔ اور کوئی بھی کھانا ہو۔ ہر نوالے اور ہر گھونٹ کے ساتھ حمد ادا کرے۔ بعض لوگوں نے اُکلة کو بضم ھمزہ پڑھا ہے۔ جو نوالہ کے معنی میں ہے۔ لیکن شربة کے قرینہ سے فتحہ کا احتمال قوی ہے(۱)۔

فیحمده علیها تو وہ اس کھانے پینے پر رب تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ اس کی حمد بیان کرے۔ تو ضمیر **اکلة یاشربة** کو بطریق تردید راجح ہے۔

اس حدیث میں بھی دوسری احادیث کی طرح کھانے کے بعد الحمد للہ کہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۳۵۲ کتاب الذکر والدعا وباب استحباب حمداللّٰہ تعالیٰ بعدالأکل والشرب، جامع ترمذی ۲/۳ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی الحمدعلی الطعام اذافرغ منه، مسنداحمد ۳/۱۰۰ .(مختار)

خلاصہ باب

اس باب میں ان اذکار کا بیان ہے جو کھانا کھانے سے پہلے یا بعد میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں۔کھانا کھانے سے قبل بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔جو کھانے میں برکت کا سبب بنتا ہے۔اور شیطان کے تصرف کے لئے مانع ہے۔اور اگر بھولے سے ابتداء میں پڑھنا رہ جائے۔تو جب بھی درمیان میں یاد آئے تو بھی بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔اسی طرح کھانے سے فراغت کے بعد حمد اور شکر کے الفاظ کہنا مسنون ہے۔

جس کے آسان الفاظ یہ ہیں کہ **الحمد للّٰہ الذی اطعمنا و سقانا و جعلنا مسلمین.**

اس کے ساتھ ساتھ ضمناً دائیں ہاتھ سے کھانے،اور اپنے سامنے سے کھانے کی مسنونیت کا بیان بھی ہوا ہے۔

۲۹۔ باب ما جاء فی قدح رسول الله ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے پیالہ کا بیان

جس طرح کھانوں میں نبی کریم ﷺ کی سادگی اور اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کے شکر کا بیان تھا۔

<u>رسول اللہ ﷺ کے گھر کے برتن تکلفات سے پاک تھے:</u> اسی طرح نبی کریم ﷺ کے کھانوں کے برتنوں میں بھی تنوع اور تکلفات نہیں تھے۔آج کل تو صبح کے کھانے کیلئے برتنوں کے الگ سیٹ مہیا کئے جاتے ہیں تو شام کے کھانوں کیلئے الگ سیٹ کا تقاضا ہوتا ہے۔کہیں چائے کا سیٹ ہے تو کہیں شربتوں کا سیٹ ہے۔اس باب میں نبی کریم ﷺ کے کھانے پینے کے برتن کا ذکر ہے۔اور اس پر تنبیہ ہے کہ برتنوں کا اہتمام اصل مقصود نہیں ہوتا۔مقصود تو کھانا ہوتا ہے جس برتن کے ذریعے بھی ہو۔گزشتہ زمانے میں ہمارے طلبہ کا بھی یہی حال تھا کہ جو برتن کھانے کا ہوتا تھا وہی پینے کیلئے بھی استعمال۔جیسا کہ اس باب میں بیان ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کے کھانے اور پینے کیلئے ایک ہی پیالہ تھا۔پانی،شربت،لسی اور دودھ وغیرہ سب اسی میں تناول فرماتے۔ہر چیز کیلئے الگ سیٹ موجود نہیں تھے۔

تعیش کے اس دور میں تو مختلف ڈیزائن اور رنگوں کے برتنوں سے الماریاں بھری ہوتی ہیں۔لیکن بیویوں کا پھر بھی مطالبہ ہوتا ہے کہ ڈیزائن اور فیشن بدل چکا ہے۔زمانہ کے ساتھ چلنا ہے۔اس لیے دوسرا سیٹ لینا ضروری ہے۔

(۱) حدّثنا الحسين بن الأسود البغداديّ ثنا عمرو بن محمّد ثنا عيسىٰ بن طهمان عن ثابت قال أخرج إلينا أنس بن مالك قدح خشبٍ غليظاً مضبباً بحديد فقال يا ثابت هذا قدح رسول الله ﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت ثابت کہتے ہیں کہ حضرت انس ؓ نے ہم کو لکڑی کا موٹا پیالہ جس میں لوہے کے پترے لگے تھے نکال کر دکھلایا۔اور فرمایا کہ اے ثابت یہ حضور ﷺ کا پیالہ ہے۔

---

(۱)شرح السنة ۱۱/۳۷۰کتاب الأشربة باب تحريم الشرب من آنية الفضة(مختار)

<u>رسول اللہ ﷺ کا پیالہ</u>: قدح خشب (۱) چونکہ حضرت انسؓ آپ ﷺ کے خادم تھے اس لئے نبی کریم ﷺ کی متعدد چیزیں آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت انسؓ کے پاس رہ گئی تھیں۔ خاص خادم اور خاص شاگرد کے ساتھ بعض اوقات کچھ خاص چیزیں بطور نشانی رہ جاتی ہیں۔ ان اشیاء سے مذکورہ پیالہ آپؓ نے بطور تبرک لیا تھا۔ یہ لکڑی کا بنا ہوا پیالہ تھا (۲)۔ جو آپؓ لوگوں کو دکھایا کرتے تھے۔

<u>رسول اللہ ﷺ کے پیالہ پر پٹیاں</u>: مضبّبا بحدید یعنی جس پر لوہے کے ضِباب یعنی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ضباب ضبۃ کی جمع ہے جو کسی برتن کی مضبوطی کے لیے اس کے گرد لگائی جانے والی دھات کی پٹی کو کہتے ہیں گویا اس پیالہ کے کناروں پر مضبوطی کی غرض سے یا کہیں سے ٹوٹنے کی وجہ سے لوہے کی پٹی لگی ہوئی تھی (۳)۔

---

(۱) علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے قدح خشب ای قدحاً من خشبٍ فالاضافة بمعنی من قوله غليظاً مضبّبا بالنصب على انه صفة قدح ورواه في جامع الاصول غليظ مضبب بالجر وهو كذلك في بعض النسخ وهو من قبيل هذا حجر ضب خرب وقوله بحديد متعلق بمضبّباً (المواهب اللدنية ص ۱۲۵) (مختار)

(۲) رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ عام طور پر لکڑی کے پیالہ میں پانی پیا کرتے تھے۔ کما جاء في رواية عن انس انه قال لقد سقيت رسول اللّٰه ﷺ من هذا القدح اكثر من كذا وكذا (جمع الوسائل ۱/۲۹۴) (مختار)

(۳) سوال یہ ہے کہ یہ تضبیب رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی یا حضرت انسؓ نے کی تھی۔ تو علامہ بیجوریؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں دونوں کا امکان موجود ہے۔ اور علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے وفي الصحيح ايضاً انّه قد اتعدع فسلسل بعضه بعض بفضة فيحتمل أنّ الواصل هو النبي ﷺ أو أنس وكلام العسقلاني يميل إلى الأول حيث قال هو الظاهر ويؤيّده ما ورد في الصحيح أنّ قدح النبيّ ﷺ قد انصدع فاتخذ مكان الشعب سلسلة من فضة ثمّ قال ويحتمل ان يكون الواصل أنساً ويؤيّده ما رواه البهيقي عن أنس ولفظه فجعلت مكان الشعب سلسلةً انتهى والظاهر ان يحمل قوله فاتخذ على انّه امر بالاتخاذ على الاسناد المجازي ويحمل قوله فجعلت على الاسناد الحقيقي فاتفق الروايتان (جمع الوسائل ۱/۲۹۴) (مختار)

یہ پیالہ حضرت انسؓ کی وفات کے بعد حضرت نضر بن انسؓ کے پاس تھا۔اس کے بعد اسے آٹھ لاکھ درہم میں بیچا گیا۔اور آخر کار اس پیالہ کی قیمت تقریباً دس لاکھ درہم کو پہنچ گئی تھی۔جبکہ بعض لوگ ایک لاکھ بیان کرتے ہیں۔امام بخاریؒ نے عاصم احول سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے وہ پیالہ دیکھا تھا۔

بعض تابعین نے اس میں بطور تبرک پانی بھی پیا تھا۔لیکن ان کے بقول اس پر چاندی کا ضبہ یعنی چاندی کی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔خود امام بخاریؒ نے بصرہ میں اس میں پانی پیا تھا۔اس بظاہر تدافع کی توجیہ یوں کی جاتی ہے کہ ممکن ہے کہ پہلے لوہے کی پٹی ہو اور بعد میں کسی نے مزید مضبوطی کے لیے چاندی کی پٹی لگائی ہو(۱)۔

(۲) حدّثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن ثنا عمرو بن عاصم ثنا حمّاد ابن سلمة ثنا حمید و ثابت عن أنس قال لقد سقیت رسول اللّٰہ ﷺ بھذا القدح الشراب کله الماء والنبیذ و العسل واللبن(۲).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس ﷺ کو اس پیالہ سے پینے کی سب انواع، پانی، نبیذ، شہد اور دودھ پلائی ہیں۔

حدّثنا: الشراب کله شراب یہاں مشروب کے معنی میں ہے یعنی میں نے نبی کریم ﷺ کو ہر قسم کی مشروبات پلائے ہیں۔پانی، نبیذ، شہد اور دودھ سب کچھ اسی میں دیا تھا۔گویا نہایت سادگی کا نمونہ پیش کرتے ہوئے آپ ﷺ نے پینے کیلئے تمام مشروبات کیلئے ایک ہی پیالہ کو کافی سمجھا۔

---

(۱)عن عاصم الاحول قال رأیت قدح النبی ﷺ عند انس بن مالکؓ. و کان قد انصدع فسلسله بفضّة... وقال ابن سیرین انّه کان فیه حلقة من حدید فارا د أنس ان یجعل مکانها حلقة من ذھب او فضّة فقال له ابو طلحةؓ لا تغیرنّ ما صنعه رسول اللّٰہ ﷺ فترکه(بخاری باب الشرح من قدح النبی ﷺ ج ۲ ص ۸۴۲)(اصلاح الدین)

(۲)صحیح مسلم ۲/۱۶۷ کتاب الاشربة باب اباحة النبیذ الذی لم یشتدولم یصر مسکراً، السنن الکبریٰ للبھیقی ۸/۲۹۹ کتاب الاشربة، المستدرک للحاکم ۴/۱۰۵، ابو داد الطیاسی(مختار)

خلاصہ باب

نبی کریم ﷺ کے استعمال میں آنے والے پینے کے برتنوں کے متعلق اس باب میں امام ترمذیؒ نے دوحدیثیں بیان فرمائی ہیں۔ دیگر کتب حدیث میں بھی اس سلسلے میں کچھ روایات موجود ہیں۔

امام بخاریؒ نے ''بـاب الشـرب مـن قـدح النبی ﷺ'' کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ کے پاس آپ ﷺ کا ایک پیالہ تھا جسے حضرت انسؓ بڑی حفاظت سے رکھا کرتے تھے۔ ایک بار یہ ارادہ بھی فرمایا کہ اس پر لگی ہوئی لوہے کی پٹی کی بجائے سونے یا چاندی کی پٹی لگادے۔ لیکن ام انسؓ کے خاوند حضرت ابوطلحہؓ کے منع کرنے پر یہ فیصلہ بدل دیا۔ بعد میں جب وہ ٹوٹ گیا تو حضرت انسؓ نے اس پر چاندی کا حلقہ لگادیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت نضر بن انسؓ کی میراث میں سے یہ پیالہ آٹھ لاکھ درہم میں فروخت ہوا۔ اسی طرح کا ایک پیالہ حضرت سہل بن سعدؓ کے پاس تھا جس میں نبی کریم ﷺ پی چکے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جس زمانہ میں مدینہ کے گورنر تھے۔ اس زمانہ میں یہ پیالہ حضرت سہل سے مانگا اور حضرت سہل نے یہ پیالہ ان کو ہبہ کردیا(۱)۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے پاس بھی ایک ایسا پیالہ تھا جو نبی کریم ﷺ کے استعمال میں آچکا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے ہاں جو پیالے تھے ان میں سے لکڑی کے پیالوں کے علاوہ ایک شیشے کا پیالہ بھی بتایا جاتا ہے(۲)۔ اور بعض کیلئے خصوصی نام بھی رکھے گئے تھے۔ مثلاً ایک کو ریّـــان (۳) اور ایک کو مـغـیــث کہاجاتا تھا۔ نیز ایک قدح مضّبب بھی تھا۔

---

(۱) بخاری شریف ج ۲ ص ۸۴۲

(۲) عـن ابـن عبـاسؓ قـال كـانـت لـرسـول الـلّٰـهﷺ قدح قوار یر یشرب فیه(ابن ماجة آخر ابواب الاشربة ص ۲۵۳) (مختار)

(۳) قـال ابـن الـقیـم وكـان للمصطفیٰ اقداح واحد منها الريّان وآخر الخ. هكذا و جدت فی شرح الشمائل للمناوی علی هامش جمع الوسائل فذكره بالباء واللام اقوال و لعل ذالک من سبق الـقـلـم و الـصـحـیـح مـا ذكـرنا انه الريان كما ذكره البیجوریؒ فی شرحه فی هذا المقام وزاد كان لـلـنـبـیﷺ قدح من عید ان بفتح العین المهملة والعید انه النخلة السحوق و هوالذی كان یوضع تحت سریره لیبول فیه باللیل (اصلاح الدین عفی عنه)

۳۰. باب ما جاء فی صفة فاکهة رسول اللّٰه ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے پھل تناول فرمانے کا بیان

اس باب میں ان پھلوں کا بیان ہے جو نبی کریم ﷺ نے تناول فرمائے ہیں۔ "فاکھة" ما یتفکه به الانسان کا نام ہے۔یعنی وہ چیز جو تلذذ کی غرض سے کھائی جائے۔اس کا اطلاق گندم اور چاول جیسی بطور تغذی کھائی جانے والی اشیاء پر نہیں ہوتا۔اس طرح سبزیوں نیز ان چیزوں کو بھی فاکہہ نہیں کہتے جو کہ بطور دوا استعمال ہوتی ہیں بلکہ عموماً کھانے کے بعد تلذذ کی خاطر جو چیز کھائی جاتی ہے فاکہہ کہلاتی ہے۔

فاکہہ کے مفہوم میں اختلاف: ائمہ کے درمیان یہ اختلاف فقہ اور اصول فقہ کی کتب میں تفصیل سے مذکور ہے۔کہ فاکہہ کا مفہوم کن چیزوں کو شامل ہے اور کونسی اشیاء اس سے خارج ہیں۔مثلاً اگر کسی شخص نے فاکہہ یعنی پھل نہ کھانے کی قسم کھائی تو امام ابوحنیفہؒ کے ہاں کھجور اور انار سے حانث نہیں ہوگا۔کیونکہ اول الذکر تغذی اور دوسرا تداوی کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے۔جبکہ فاکہہ وہ ہے جو تغذی یا تداوی کے لیے نہ ہو۔ان کی دلیل اس سلسلے میں یہ ہے کہ قرآن مجید "فیھا فاکھة وّ نخلٌ وّ رُمّان" کہہ کر نخل اور رُمان یعنی کھجور اور انار کو فاکہہ پر عطف کر دیا گیا ہے۔اور عطف مغایرت کا مقتضی ہے۔اگر کھجور اور انار بھی پھل ہوں تو اس کا عطف فاکہہ پر صحیح نہیں ہوگا۔اس کے برعکس صاحبینؒ کے نزدیک دونوں چیزیں فاکہہ میں شمار کی جاتی ہیں۔اور فاکھہ سے قسم کھانے والا شخص کسی ایک کے کھانے سے حانث ہوگا۔گویا ان کے نزدیک فاکہہ میں تغذّی یا تداوی کا نہ ہونا شرط نہیں۔لیکن درست بات یہی ہے کہ اس قسم کا اختلاف زمانہ اور مختلف علاقوں کے عرف پر مبنی ہے۔ویسے بھی ایمان اور قسموں کا دارومدار عرف پر ہے۔

تو گویا جس ملک میں جو چیز بطور تفکّہ کھائی جائے۔وہ فاکھہ ہے۔مثلاً ہمارے ہاں کھجور اور انار میں سے کوئی بھی اتنی مقدار میں نہیں پایا جاتا کہ لوگ اسے بطور تغذی استعمال کریں۔بلکہ تفکہ اور تلذذ کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ فاکہہ میں آئیں گے۔اور جہاں پر کھجور وغیرہ اتنا زیادہ ہو کہ اسے غذا کے طور پر کھایا جائے تو یہ فاکہہ میں شمار نہ ہوگا اور نہ قسم کھانے والا اس کے کھانے سے حانث ہوگا۔

صاحبینؒ کا فتویٰ بھی اس پر مبنی ہے۔رہی یہ بات کہ قرآن مجید میں مذکورہ دونوں پھلوں کو فاکھۃ پر عطف کیا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا عطف اہتمام شان کی غرض سے کیا گیا ہوگا۔مثلاً انار کی افادیت اور لذت کو مدنظر رکھ کر اہتمام شان کی وجہ سے اس کی تخصیص کی گئی ہوگی۔جس طرح کہ دوسری جگہ آتا ہے وفاکھۃً وابّاً یہاں ابّاً کی تشریح میں عام مفسرین ان اشیاء کا نام لیتے ہیں جو کچی کھائی جاتی ہیں۔اور پھلوں میں سے نہیں۔مثلاً گاجر، مولی اور ککڑی وغیرہ۔لیکن بعض مفسرین نے جن میں ہمارے علامہ مناظر احسن گیلانیؒ بھی ہیں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ ابّا سے آم بھی مراد ہوسکتا ہے جسے آج بھی عربی میں انبہ کہتے ہیں۔اور اس کا ذکر فاکہہ کے بعد زیادہ اہتمام کی وجہ سے کیا گیا ہے ورنہ آم بھی تو پھل ہے۔

(۱) حدّثنا إسمٰعیل بن موسٰی الفزاریّ ثنا إبراهیم بن سعد عن أبیه عن عبداللّٰه بن جعفر قال کان النّبیّ ﷺ یاکل القثّاء بالرطب(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن جعفر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ککڑی کو کھجور کے ساتھ کھایا کرتے تھے۔

عبداللّٰه بن جعفرؓ کا شمار کم عمر صحابہ میں ہوتا ہے۔باب نمبر ۱۳ میں انکے احوال مذکور ہیں۔

یاکل القثاء بالرطب قثّاء کی متعدد قسمیں ہیں۔یہ کھیرے کی طرح کچا کھایا جاتا ہے۔اردو میں اسے ککڑی کہتے ہیں۔نبی کریم ﷺ کے اس عمل سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ مصلحت کے تحت بیک وقت دو چیزیں کھانا ناجائز نہیں۔

مسرفین کی طرح ہر وقت طرح طرح کے کھانے منہ میں ٹھونسنا اور بسیار خوری کی عادت نبی کریم ﷺ کو پسند نہ تھی لیکن نبی کریم ﷺ کا مذکورہ عمل اس کے جواز کے لئے کافی ہے۔گویا کراہت صرف اس صورت میں ہوگی جب اسے عادت بنادیا جائے۔

---

(۱)صحیح بخاری ۲/۸۱۸ کتاب الأطعمة باب القثاء بالرطب، صحیح مسلم ۲/۱۸۰ کتاب الأشربة باب أکل القثاء بالرطب، ابوداؤد کتاب الأطعمة باب فی الجمع بین الکونین عندالاکل ۲/۱۸۰، ابن ماجة ص ۲۳۸ کتاب الأطعمة باب القثاء والرطب یجمعان(مختار)

طبی مرکبات سے علاج کا نبوی ﷺ اصول: علاوہ ازیں قوانین طب کی رو سے کسی چیز کی مضر خصوصیت دوسری چیز کے ملانے سے بدل سکتی ہے۔زیادہ تر دوائیں بھی مرکبات کی صورت میں بنتی ہیں۔ تو مفردات کے ساتھ ساتھ علم طب کے مرکبات کا ایک عظیم الشان دروازہ حضور اقدس ﷺ کے اس عمل نے کھولا اور اس کا اصل یہی باب ہے کہ مختلف اشیاء کے ملانے سے اعتدال پیدا ہوجاتا ہے۔مثلاً اگر ایک چیز میں حرارت زیادہ ہے تو دوسرا جو کہ بارد ہے اس کی حرارت کو کم کردیتا ہے تو نبی کریم ﷺ نے اس عمل سے اس بات کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اعتدال مقصود ہو تو ترکیب کرنا چاہیے۔

یہاں بھی کھجور گرم اور ککڑی بارد ہے جبکہ زیادہ گرم یا زیادہ سرد چیز کا کھانا نقصان دہ ہوتا ہے۔اس لیے طبائع اطعمہ اور ان کی خصوصیات کا لحاظ رکھنا اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

ابوداؤد کی روایت (۱) میں تو نبی کریم ﷺ نے اس کی تصریح بھی کی ہے کہ یکسر حرّ ھذا ببردھذا و برد ھذا بحرِ ھذا یعنی اس ایک کی گرمی کو دوسرے کی سردی سے اور دوسرے کی سردی کو اس کی گرمی سے توڑا جاتا ہے (۲)۔

(۲) حدّثنا عبدۃ بن عبداللّٰہ الخزاعیّ البصریّ ثنا معاویۃ بن ھشام عن سفیان عن ھشام بن عروۃ عن ابیۃ عن عائشۃؓ أنّ النّبیّ ﷺ یأکل البطیخ بالرطب (۳).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ تربوز کو تازہ کھجور کے ساتھ کھایا کرتے تھے۔

---

(۱)ابو داؤد ۱۸۰/۲ کتاب الأطعمة باب الجمع بین اللونین عند الأکل ج ۲ صف ۱۸۰ (مختار)

(۲)قال النوویؒ فیہ جواز أکل الطعامین معاً والتوسع فی الأطعمة ولاخلاف بین العلماء فی جوازہ (جمع الوسائل ۲۹۶/۱)(مختار)

(۳)السنن الکبریٰ للنسائی ۱۶۶/۴ کتاب الولیمة ابواب الأطعمة باب الرطب، سنن ابی داؤد ۱۸۰/۲ کتاب الأطعمة، جامع ترمذی ۶/۲ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی اکل البطیخ بالرطب، السنن الکبریٰ للبیھقی ۲۸۱/۷ (مختار)

کان یاکل البطیخ (۱) **بالرطب** یہاں بھی وہی حکمت ملحوظ ہے کہ کھجور کی گرمی کو کم کرنے کے لیے تربوز کو بھی ساتھ ساتھ تناول فرمایا۔

(۳) حدثنا ابراهیم بن یعقوب ثنا وهب بن جریر ثنا ابی قال سمعت حمیداً یقول او قال حدّثنی حمید قال وهب و کان صدیقا له عن أنس بن مالکؓ قال رأیت النبیﷺ یجمع بین الخربز والرطب(۲)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریمﷺ کو خربوزہ اور کھجورا کھٹے کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

لطیف سندی نکتہ: **او قال حدّثنی حمید الخ** اس مقام پر راوی وہبؒ کو شک ہے کہ میرے والد جریرؒ نے سمعت حمید کہا یا حدثنی حمید کہا۔ بہر حال یہ اور اس قسم کی توضیحات سے رواۃ حدیث کا روایت میں

(۱) بطیخ کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے اس کا معنی خربوزہ لکھا ہے۔ اور بعض نے تربوز فرمایا ہے۔ اگر بطیخ کا معنی تربوز لیا جائے۔ جیسا کہ مشہور ہے۔ تو پھر کوئی اشکال نہیں رہتا۔ لیکن اگر خربوزہ مراد لیا جائے تو پھر اشکال ہوگا کہ اس میں **یکسر حر هذا ببرد هذا** کیسے ہوگا۔ جیسا کہ ابوداؤد کی روایت میں وضاحت کے ساتھ مذکورہ ہے۔ کہ **کان یاکل البطیخ بالرطب فیقول یکسر حر هذا ببرد هذا او برد هذا بحرّ هذا**؟ تو علماء کرام نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں برودت سے مراد برودت حسی ہے یعنی ہاتھ لگانے میں ٹھنڈک اگر خربوزہ کو کاٹنے کے بعد تھوڑی دیر کھلا رکھ دیا جائے تو وہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ توجیہ کی ہے کہ اس سے مراد کچا خربوزہ ہے۔ اس لئے کہ خربوزہ جب کچا ہو تو سرد (ٹھنڈا) ہوتا ہے اور جب پک جائے تو اس کی خاصیت بدل جاتی ہے۔ جیسا کہ آم کے بارے میں مشہور ہے کہ آم جب کچا ہو تو بارد ہوتا ہے اور جب پک جائے تو حار (گرم ہو جاتا ہے) اور بعض کا کہنا ہے یہ برودت امور اضافیہ میں سے ہے کہ بطیخ کی برودت رطب کے اعتبار سے ہیں کیونکہ رطب شدید الحرارۃ ہے۔ یہ توجیہات اس معروف اور مشہور قول کے اعتبار سے ہیں ورنہ شیخ بوعلی سینا سے منقول ہے کہ خربوزہ بھی بارد ہوتا ہے۔ لہٰذا بطیخ سے دونوں معنی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ اس لئے مدینہ منورہ میں دونوں (خربوزہ اصفر، تربوز اخضر) پیدا ہوتے تھے۔ اور آئندہ روایت میں **رأیت رسول اللّٰہﷺ یجمع بین الخربز والرطب** کی تصریح موجود ہے۔ (مختار)

(۲) **السنن الکبریٰ للنسائی ۴/۱۶۷ کتاب الولیمة ابواب الأطعمة باب الجمع بین الخربز والرطب، صحیح ابن حبان رقم حدیث ۱۳۵۶ (مختار)**

انتہائی درجہ کا حزم واحتیاط معلوم ہوتا ہے۔منکرینِ حدیث جب ان باریکیوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں تو انکارحدیث کے مرض میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔اوراگرچہ بظاہران دونوں میں کوئی بڑافرق دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن درحقیقت ان میں باریک اوراہم فرق موجود ہے۔

وکان صدیقا له الخ اس جملہ میں حمید سے جریرؒ کا سماع ثابت کرنا مقصود ہے۔کیونکہ جب دونوں دوست تھے تو سماع بھی ضرور ثابت ہوگا۔اور ساتھ ساتھ اس سے جریرؒ کا مرتبہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ معمولی آدمی نہ تھے بلکہ حمیدؒ جیسے امام کے دوست تھے۔چنانچہ اس جملے سے جریرؒ کا تزکیہ اوراس کی توثیق بھی ہوگئی۔اس لحاظ سے"**وکان صدیقا له**" کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جریرؒ حمیدؒ کا دوست تھا۔اور یہ معنی بھی محتمل ہے کہ حمید جریر کا دوست تھا۔اس سے بھی جریرؒ کی توثیق ہوتی ہے۔لیکن اس طرح کان ضمیر حمیدؒ کوراجع ہوگا۔یہ دونوں ترجمے اس وقت ہیں جب صدیق فتح صاد کے ساتھ ہو۔لیکن ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے کہ ایک نسخہ **صِدّیقا** یعنی صاد کے کسرہ اوردال مشدد مکسور کے ساتھ ہو۔پھر معنٰی یہ ہوگا کہ حمیدؒ جریرؒ کی زیادہ تصدیق کرنے والے تھے۔

<u>خربوزہ یاتربوزہ:</u> **الخربز والرطب** اس مقام پر خربز کے معنی میں اختلاف ہے بعض شارحین کے ہاں اس سے زرد رنگ کا پھل یعنی خربوزہ اور بعض کے ہاں سبز رنگ کا پھل یعنی تربوزہ مراد ہے۔مؤخرالذکر قول اکثر علماء کا ہے۔ان کے خیال میں چونکہ تربوزہ طبعی برودت کا حامل ہے جبکہ خربوزہ خود بھی گرم ہے۔اس لئے کھجور کی گرمی کوتوڑنے والا خربوزہ نہیں بلکہ تربوزہ ہوسکتا ہے۔دوسری دلیل وہ گزشتہ روایت کو بناتے ہیں کہ وہاں بطیخ کا ذکر ہے۔تو گویا حضرت انسؓ بھی وہی حضرت عائشہؓ کی حدیث میں مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہیں لیکن بطیخ سے تعبیر خربز سے کیا گیا ہے۔اوراگر خربوزہ ہی مراد ہوتو پھر کچا خربوزہ مراد ہوگا جو کھیرے کی طرح طبعی طور پر سرد اور مٹھاس سے خالی ہوتا ہے۔لیکن بعض شراح کے خیال میں خود خربوزہ کا مراد ہونا بھی محتمل ہے کیونکہ وہ اگرچہ گرم ہے لیکن کھجور کی نسبت بارد ہے۔اس لیے ترکیب کے بعد کم ازکم کھجور کی حرارت کوختم کرسکتا ہے۔علامہ مناویؒ نے اس احتمال کوترجیح دی ہے۔اورحافظ زین عراقیؒ کا قول بھی نقل کیا ہے کہ"**الخربز اسم للاصفر بارض العراق**"۔

(۴) حدّثنا محمّد بن یحییٰ ثنا محمّد بن عبدالعزیز الرملی ثنا عبداللّٰہ بن یزیدبن الصلت عن محمّد بن اسحاق عن یزید بن رومان عن عروة عن عائشةؓ أنّ النبیّ ﷺ اکل البطیخ بالرطب(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ تربوزہ کو تر کھجور کے ساتھ تناول فرماتے تھے۔

اکل البطیخ بالرطب اس حدیث کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔ پہلے دوسری سند سے مصنف اسے لاچکے ہیں۔

(۵) حدّثنا قتیبة بن سعید عن مالک بن أنس وحدثنا اسحاق بن موسٰی ثنا معن ثنا مالک عن سهیل بن أبی صالح عن أبیه عن أبی هریرة قال کان الناس اذا رأوا اوّل التمرجاء وابه إلی النبیّ ﷺ فاذا أخذه رسول اللّٰہ ﷺ قال اللّٰهمّ بارک لنا فی ثمارنا و بارک لنا فی مدینتنا و بارک لنا فی صاعنا و فی مدّنا اللّٰهم إنّ إبراهیم عبدک و خلیلک و نبیک وإنّی عبدک و نبیک وانّه دعاک لمکّة وانّی ادعوک للمدینة بمثل مادعاک به لمکّة و مثله معه قال ثمّ یدعو اصغر و لید یراه فیعطیه ذلک الثمر(۲).

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب لوگ کسی فصل آنے پر نئے پھل کو دیکھتے تو اس کو حضور ﷺ کی خدمت میں لاکر پیش کرتے۔ پس جب نبی کریم ﷺ اس کو لیتے تو فرماتے اے اللہ ہمارے لیے ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما اور ہمارے لیے

---

(۱)تفردالامام الترمذی بهذاالحدیث،جامع ترمذی ۲/۶ ابواب الاطعمة(مختار)

(۲)صحیح مسلم ۲/۴۴۲ کتاب الحج باب فضل المدینة، جامع ترمذی ۲/۱۸۳ کتاب الدعوات باب مایقول اذارأی با کورة من الثمر، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۸۳ کتاب عمل الیوم اللیلة باب مایقول اذاادعی باول اثمر(مختار)

ہمارے شہر میں برکت عطا فرما۔اور ہمارے لیے (ہمارے پیمانوں یعنی) صاع اور مد میں برکت عطا فرما۔اے اللہ بیشک ابراہیمؑ تیرے بندے دوست اور نبی تھے۔اور بیشک میں تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔اور بیشک انہوں نے شہر مکہ کے لیے تجھ سے دعا فرمائی تھی اور میں تجھ سے مدینہ کے لیے اس جتنا مانگتا ہوں جتنا انہوں نے مکہ کے لیے مانگا تھا۔اور اس جتنا مزید بھی مانگتا ہوں۔فرمایا پھر نبی کریم ﷺ کی نظر جس چھوٹے سے چھوٹے بچے پر پڑتی اس کو بلا کر وہ پھل اس کو دے دیتے تھے۔

پہلا پھل حضور اقدس ﷺ کی نذر: جاء وا به إلیٰ النّبیّ ﷺ اہل مدینہ کا رواج تھا کہ جب پہلی بار درخت کا پھل یا کھیت میں سبزی لگ جاتی تو اظہار محبت وعقیدت کے لیے اس کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرتے تھے۔اس میں نبی کریم ﷺ کو اپنے اوپر ترجیح، محبت کا اظہار، تعظیم اور ثمرات میں طلب برکات کے علاوہ اس بات پر تنبیہ بھی مقصود ہے کہ رزق الٰہی کا اولین اور سب سے زیادہ مستحق اشرف خلائق نبی کریم ﷺ ہیں(۱)۔

بلکہ ہمارے ہاں بھی یہی رواج بعض علاقوں میں چلتا ہے کہ لوگ عقیدت اور تعظیم کے طور پر علماء ومشائخ کو ایسے مواقع میں خود پر بھی مقدم کر لیتے ہیں۔بزرگوں کی خدمت میں اس قسم کا پھل پیش کیا جاتا ہے۔دوسری طرف اس عمل سے آپ ﷺ اس لئے خوش ہوتے تھے کہ ملک کی معاشی حالت کی بہتری پر ملک کا سربراہ خوش ہوتا ہے۔آپ ﷺ بھی مدینہ کی ظاہری خوش حالی اور فلاح کے لیے فکر مند رہتے۔اور دعا فرمایا کرتے تھے کہ

اللّٰھمّ بارک لنا فی ثمارنا و بارک لنا فی مدینتنا و بارک لنا فی صاعنا و فی مدّنا.

ترجمہ: اے اللہ ہمارے لیے ہمارے پھلوں میں برکت ڈال اور ہمارے شہر میں برکت ڈال اور ہمارے لئے صاع اور مد (یعنی فصل کے پیمانوں) میں برکت ڈال۔

---

(۱)علامہ بیجوریؒ ویؤخذ منه أنّه یندب الاتیان بالباکورہ لأکبر الصوم علمّاً وعملاً (مختار)

جو کہ دراصل معاشی آسودگی کی دعا تھی۔اس لیے کہ باہر کے لوگوں کو کچھ فروخت کرنا ہو تو پیمانوں اور باٹوں سے کیا جاتا ہے چنانچہ ان میں بھی برکت کی دعا کی۔اور ساتھ ساتھ مدینہ میں برکت وہاں پر شعائر اسلامیہ کی بقاء کی دعا بھی تھی تا کہ عبادات اور بالخصوص زکوٰۃ اور صدقات جیسے مالی شعائر زندہ رہیں۔ انہی دعاؤں کا اثر آج بھی حرمین میں دکھائی دیتا ہے۔جہاں ہر چیز وافر ہوتی ہے۔پھل کی کمی نہ سبزی کی۔ حالانکہ لاکھوں افراد حج کے موسم میں جا کر یہ چیزیں کھاتے ہیں مگر دکانیں پھر بھی بھری ہوتی ہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔**یجبیٰ الیہ من کل الثمرات (الآیة)** اور **وارزقهم من الثمرات (الآیة)** کا ظہور ہے۔

خلّة ابراهیم: **اللّٰهمّ إنّ إبراهیم علیه السلام** حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خلیل تھے بعض کا خیال ہے کہ خلیل خلة سے ہے جس کے معنی حاجت کے ہوتے ہیں۔اور چونکہ دوست سے حاجت پوری ہوتی ہے اس لیے دوست کو بھی خلیل کہتے ہیں۔اور بعض کے نزدیک یہ خُلّة بضم خاء ہے۔جس کے معنی ایسی محبت کے ہوتے ہیں جو خلال قلب، یعنی قلب کے وسط میں داخل ہو۔اسی طرح خلیل محبوب کے معنی میں ہوگا۔اللہ تعالیٰ بھی خلیل ہے کیونکہ وہی حقیقی حاجت روا اور محتاج الیہ ہے۔اور بندہ خلیل ہے لیکن وہ محتاج ہے۔بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہ تمغہ اور خصوصیت حضرت ابراہیمؑ کو دی ہے۔

وإنّی عبدک الخ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابراہیمؑ کے لیے نبوت، خلّة اور عبدیت تینوں صفات ذکر فرمائیں لیکن خود اپنے لیے خلیل ہونے کا اعزازی لفظ ذکر نہیں کیا۔اپنے بارے میں آپ ﷺ انتہائی تواضع اور عجز وانکساری کی صفات برتتے تھے اور خصوصاً یہ موقع تو دعا کا ہے جس میں عاجزی ہی زیادہ کام آتی ہے۔بایں ہمہ آپ ﷺ رویا کرتے تھے کہ اے اللہ میں نے عبدیت کا حق بھی ادا نہیں کیا۔تو اگر چہ تمام بندوں میں نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہیں اور آپ ﷺ نے سب سے بڑھ کر اس صفة خلّہ سے بھی متصف ہیں لیکن تواضعاً آپ ﷺ نے اسے اپنے لیے استعمال نہیں کیا۔

وانّه دعاک لمکّة یعنی پہاڑوں کے درمیان اور ریت کے ٹیلوں نیز لق ودق صحرا میں انہوں نے مکہ کے لیے دعائیں کی تھیں۔ایک بہت ہی غیر آباد مقام کو اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے لیے منتخب فرمایا

تھا۔سوئیز رلینڈ،فرانس،سوات،کشمیر یا مری کی بجائے مکہ میں بیت اللہ بنایا۔اس میں بڑی حکمت ہے کہ اس طرح عشق وعبدیت کی شان باقی رہتی ہے۔خوبصورت مقامات کوتو لوگ سیر کرنے جاتے ہیں۔عشاق کی جگہیں جنگل،صحرا اور بیابان ہوتی ہیں۔پھول باغات اور دلکش مناظر ان کو راس نہیں آتے۔جبکہ بیت اللہ کی زیارت تو ابتداء سے آخر تک سفر عشق اور محبت کے منازل ہیں۔مکہ بھی ایسے ہی ایک بہت غیر آباد علاقے میں واقع ہے۔اور خصوصاً ابراہیمؑ کی آمد کے وقت تو اور بھی ہو کا منظر تھا۔پانی تھا نہ چارہ۔گھر نہیں تھے،پرانے آثار بھی مٹ چکے تھے۔وہ آئے تو دعا کی جو یہ تھی:

ربّنا إنّی اسکنتُ من ذریّتی بوادغیر ذی زرع عندبیتک المحرّم. ربنا لیقیموا الصّلوٰة فا جعل افئدةً من الناس تهوی الیهم وارزقهم من الثمرات لعلهم یشکرون.(الایة)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا **ربّ اجعل هذابلداً آمناً وارزق اهله من الثمرات.(الآیة)**

ترجمہ: اے ہمارے رب میں اپنی اولاد کو تیرے معظم گھر (کعبہ) کے قریب ایک میدان میں جو زراعت کے قابل بھی نہیں آباد کرتا ہوں تا کہ وہ لوگ نماز کا اہتمام رکھیں۔پس آپ کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دیجئے اور ان کو پھل کھانے کو دیجئے تا کہ یہ لوگ شکر کریں۔

اے میرے پروردگار اس جگہ کو امن والا شہر بنا دے اور اس شہر والوں کو پھلوں سے رزق دے دے۔

ثمرات کل شیئ کا مطلب: یہ دعائیں تھیں جو سب قبول ہو گئیں۔اور کچھ نہ اگانے والے میدان کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ "**و یجبیٰ الیه ثمرات کل شی**" یہاں **کل شئی** کے معنی یہ نہیں کہ ہر قسم کا پھل ہر ملک سے آتا ہے بلکہ **کل ثمر** کی بجائے **کل شئی** کا ذکر اس لیے کیا کہ تمام دنیا کے متاعِ زیست کا خلاصہ وہاں لایا جاتا ہے۔مثلاً ریڈیو،ٹیپ ریکارڈ،گھڑیاں اور کپڑا وغیرہ بھی

سب ثمرات الاشیاء ہیں۔

تو ثمرة شئی سے مراداس چیز کا حاصل اور پیداوار ہے۔وہ چیز بے جان ہو یا جاندار، پھل ہو یا غلہ، زمین کی فصلیں اور سبزیاں ہوں یا کارخانوں کی مصنوعات ہوں۔ بہر حال دنیا کے تمام ممالک جو بھی کام کی چیز بناتے ہیں وہ بنا کر مکہ مکرمہ پہنچاتے ہیں۔وانی ادعوک الخ یعنی اگر حضرت ابراھیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے مانگا تھا تو میں مدینہ کے لیے اس سے دو چند مانگتا ہوں۔اور اس دعا کا اثر آج بھی حجاج کو محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ مدینہ میں راحت مل جاتی ہے۔آسائش سکون اور ارزانی وہاں مکہ کی نسبت زیادہ ہے۔ جہاں گلی گلی، ذرّہ ذرّہ جمال نبوی ﷺ سے منور اور وجود اطہر سے معطر ہے۔

ثمّ یدعو اصغر ولیدا الخ ایسے موقع پر نبی کریم ﷺ مجلس میں موجود سب سے چھوٹے بچے کو بلا کر بطور ھدیہ لایا جانے والا پھل دے دیتے۔ایک تو نوعمر بچوں کو نئے نئے پھل وغیرہ زیادہ پسند ہوتے ہیں۔اس لیے اس عمل سے ان کی دلجوئی بھی ہو جاتی ہے۔اور بچوں کی دلجوئی ایک نیکی ہے جو دعا کو درگاہ ربوبیت میں قبولیت کے قریب تر کر دیتی ہے(۱)۔

نیز ولید اور اس قسم کی چیز کے درمیان ایک مصنوعی مناسبت بھی ہے۔وہ یہ کہ ولید بھی نوعمر اور نوخیز پھل جیسا ابھی ابھی پیدا ہوا ہوتا ہے۔اور یہ لائی ہوئی چیز باکورہ بھی نوخیز اور تازہ پیدا ہوتی ہے۔اس لیے ولید کو دیتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے استحقاق اور ایک لطیف مناسبت کا لحاظ رکھا ہے۔خود اس نئے پھل کو اس لئے نہیں کھاتے تھے کہ اس طرح کھانے میں حرص اور خواہشِ نفس پورا کرنے کا شبہ ہوتا ہے۔نیز اس بات پر تنبیہ کے لیے بھی خود کھانے سے پرہیز کرتے تھے کہ پاکیزہ نفوس اور کامل الاخلاق لوگوں کے لیے نئے پھلوں کا تناول تب کرنا چاہئے جب عوام الناس میں سے تمام یا اکثر کی رسائی ایسے پھل تک ہو جائے۔

---

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے وفیہ بیان حسن عشرته وکمال شفقته ومرحمته وملاطفته مع الکبیر والصغیر وتنزیل کل احدفی مقامه ومرتبته الائقة به(جمع الوسائل ۱/ ۲۰۰) اور یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ اس وقت تک پھل تناول نہ فرماتے تھے جب تک فراوانی نہیں ہوتی تھی۔ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے والنفوس الذکیة لاتر کن إلیٰ تناول شئ من الباکورة إلاّبعد ان یعمّ وجوده ویقدر کل احدعلی اکله(جمع الوسائل ۱/ ۳۰۰)(مختار)

(٦) حدّثنا محمّد بن حمید الرازیّ ثنا إبراھیم بن المختار عن محمّد بن إسحاق عن ابی عبیدة بن محمّد بن عمّار بن یاسر عن الرُبیع بنت معوّذ بن عفراء قالت بعثنی معاذ بن عفراء بقناع من رطب وعلیه اجرو من قثاء زغبٌ و کان النبیّ ﷺ یحبّ القثاء فاتیته به و عنده حلیةٌ قد قدمت علیه من البحرین فملأیده منها فاعطانیه(١).

ترجمہ: ربیعؓ فرماتی ہیں کہ مجھے میرے چچا معاذ بن عفراءؓ نے ایک تھال جن پر روئیں دار چھوٹی ککڑیاں بھی تھیں دیکر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ نبی کریم ﷺ ککڑی پسند کیا کرتے تھے۔ جس وقت میں یہ طبق لائی حضور ﷺ کے پاس کچھ زیورات تھے۔ جو بحرین سے آئے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ان میں سے ہاتھ بھر کر مجھے مرحمت فرمائے۔

ربیع: **عن الربیع الخ** رائے مضموم یا مفتوح اور یائے مشدد مکسور کے ساتھ یہ راویہ کا نام ہے۔ والد کا نام معوذؓ ہے۔ جو میم مضموم اور واو مشدد مکسور کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ معوذ بن حارث مشہور بدری صحابی ہیں جو ابن عفراء کے نام سے مشہور ہیں۔ والدہ عفراء بنت عبیدؓ(٢) مشہور صحابیہ ہیں۔ خود ربیع بنت معوذؓ بن حارث بن رفاعہ مشہور صحابیہ ہیں۔ بیعتِ رضوان میں بھی شرکت کی۔ نبی کریم ﷺ آپ کی شادی کے دوران آپ کے گھر تشریف لائے تھے۔ جس میں دف بج رہا تھا۔ اور بدر کے شہداء کو بھی یاد کیا جا رہا تھا۔ آپ ﷺ بیٹھے سنتے رہے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت رُبیع نے آپ ﷺ کو پانی انڈیل کر وضوء بھی کرایا تھا۔ کئی غزوات میں شرکت کی۔ زخمیوں اور شہدا کی خدمت کرتی رہی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ایام تک زندہ رہیں۔

معاذ ومعوّذ: **بعثنی معاذ**: معاذؓ بھی معوذؓ کے بھائی ہیں۔ جلیل القدر بدری صحابی ہیں۔ یہی وہ دو نامور ہستیاں تھیں جنہوں نے نوعمری کے باوجود جنگ بدر میں ابوجہل پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔

---

(١)تفرد بھذاالحدیث الامام الترمذی البغوی فی شرح السنة ١١/٣٣ کتاب الاطعمة (مختار)

(٢) حضرت عفراءؓ وہ واحد صحابیہ ہیں جن کے سات بیٹے جنگ بدر میں شریک تھے۔ **کمافی الاصابة** (مرتب)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ان دونوں کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بدر میں صفیں کھڑی ہوگئیں تو میں نے دیکھا کہ میرے دونوں طرف دونوجوان کھڑے ہیں۔ جنگ کی شدت اور طرفین میں ناتجربہ کار نوجوانوں کی وجہ سے عدم تحفظ کا تصور کر کے میں پریشان ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد ان دونوں نے باری باری ابوجہل کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ تم اس کا کیوں پوچھ رہے ہو۔ ابوجہل تو بہت مضبوط شخصیت کا مالک ہے۔ ہم سب مل کر اس کا علاج نہیں کر سکے۔ تم بچے ہو کر کیا کر سکو گے۔ لیکن انہوں نے پھر منت کی۔ میں نے اچانک ابوجہل کو صفیں درست کرتے ہوئے دیکھا تو ان دونوں کو اشارہ سے بتا دیا کہ وہ ہے۔ دونوں نوجوان شاہینوں کی طرح جھپٹے اور ابوجہل کو شدید زخمی کر دیا۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آ کر اس کی گردن کاٹ دی۔

حضرت معوذؓ تو غزوۂ بدر میں شہید ہوگئے تھے اور حضرت معاذؓ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اپنے بھائی کی طرح بدر میں شہادت پائی۔ جبکہ دوسرے قول کے مطابق آپؓ بدر میں زخمی ہو گئے تھے۔ اور پھر مدینہ منورہ آ کر وفات پائی۔ لیکن علامہ ابن عبدالبرؒ اور علامہ ابن حجرؒ نے دونوں روایتوں کو مرجوح قرار دیا ہے۔ صحیح قول کے مطابق آپؓ نے حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں وفات پائی تھی۔ البتہ بدر میں آپؓ کا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا۔

بقناع من رطب تازہ کھجور کا بھرا ہوا ایک تھال دے دیا۔ **وعليه اجرِ واجرِو جِرو** کی جمع ہے جِروٌ دراصل بلی، کتے، درندوں اور مرغی وغیرہ کے چھوٹے بچے کو کہا جاتا ہے لیکن یہاں جرو قثاءٍ سے چھوٹی چھوٹی ککڑیاں(۱) مراد ہیں۔ جن پر عموماً چھوٹے چھوٹے تیز کانٹوں جیسے بال ہوتے ہیں۔ اور پکڑتے وقت انگلیوں میں چبھ جاتے ہیں۔ بہرحال تازہ تازہ ککڑیاں کھجور کے ساتھ رکھی تھیں۔

زُغبٌ یہ لفظ مرفوع ہے۔ اور جرو کی صفت ہے۔ جس طرح کہ آنے والی روایت میں ہے جبکہ بعض

---

(۱) اہل حجاز کے ہاں جرو کا اطلاق ہر چھوٹی چیز پر ہوتی ہے۔ چنانچہ زمخشریؒ ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں ایک گلی سے گزر رہا تھا۔ کہ اچانک ایک آدمی کو دیکھا جو سر پر بانس کی گٹھڑی اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ بولا ''**أعطني ذالک الجرو** '' میں نے دیکھا نیچے کتا ہے نہ کتے کا بچہ میں نے کہا ''**ماهنا جرو** '' وہ بولا ''**انت عراقي اعطني تلک القثاء** '' تم عراقی معلوم ہوتے ہو میں یہ ککڑی مانگ رہا ہوں۔ (مختار)

کے ہاں مجرور ہے۔اور قثاء کی صفت ہے۔ازغب کی جمع ہے جو کہ چھوٹے روؤں والے اور تیز کانٹوں والے کو کہتے ہیں۔

وعنده حِلیةٌ لحیۃ کے وزن پر حُلِیٌّ کی جمع ہے قرآن مجید میں بھی ''وتستخرجون منه حلیةً تلبسونها'' میں مذکور ہے۔زیور کو کہتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے پاس بحرین کے خراج کے مال سے کچھ سونے چاندی کے زیور لائے گئے تھے۔

فملأیده الخ چونکہ ہدیہ لانے والی ایک لڑکی تھی۔جن کو فطری طور پر زیورات سے محبت ہوتی ہے۔اس لیے آپ ﷺ نے احسان کا بدلہ مناسب اور ایسے احسان سے دیا جس سے وہ زیادہ خوش ہوتی ہے۔اور زیورات سے تزیّن عورت ہی کیلئے مناسب ہے۔قرآن مجید کہتا ہے کہ

أو من یُنشأ فی الحلیة و هو فی الخصام غیر مبین(زخرف ۱۸)

کیا(خدا کی اولاد ہے)وہ جو کہ عادۃً آرائش میں نشو ونما پائے۔اور مباحثہ میں قوت بیانیہ بھی نہ رکھے۔

(۷) حدّثنا علیّ بن حجر أنا شریک عن عبداللّٰہ بن محمّد ابن عقیل عن الربیع بنت معوّذ بن عفراء قالت اتیت النّبیّ ﷺ بقناع من رطب و اجرو زغبٍ فاعطانی ملأکفه حلّیًا او قالت ذهباً(۱).

ترجمہ: ربیعؓ سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کھجور اور چھوٹی روئیں دار ککڑیوں کی چنگیری لے کر حاضر ہوئی۔تو نبی کریم ﷺ نے مجھ کو ایک ہاتھ بھر کر زیور عطا فرمایا۔یا یہ کہا کہ سونا عطا فرمایا۔

اس حدیث کی تشریح بھی پچھلی حدیث جیسی ہے۔صرف ایک مقام پر راوی کے شک کا ذکر ہے کہ حضرت ربیعؓ نے حلیا کہا تھا یا ذھبا۔دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ بہت زیادہ سخی تھے۔اور احسان کے بدلہ میں محسن(۲) سے بڑھ جاتے تھے۔

---

(۱)تفرد بهذاالحدیث الامام الترمذی(مختار)

(۲)بخاری شریف کی روایت میں ہے **کان النبی ﷺ یقبل الهدیة ویثیب علیها بخاری ۱/۳۵۲ کتاب الهبة اعکافأة فی المعیة (اصلاح الدین)**

خلاصہ باب

نبی کریم ﷺ کو پھل پسند تھے۔اور ہر قسم کے پھلوں کے ساتھ ذوق سلیم کے مطابق معاملہ فرماتے تھے۔اس باب میں چند اشیاء مثلاً ککڑی، خربوزہ، تربوز اور کھجور کا ذکر ہے۔آپ ﷺ نے ان میں سے کھجور کو دوسرے مذکورہ اشیاء کے ساتھ تناول فرمایا۔کیونکہ اس طرح ان دونوں چیزوں میں طبعی اعتدال پیدا ہو جاتا تھا۔نیز طبی لحاظ سے اس کا فائدہ بھی بڑھ جاتا تھا۔کیونکہ کھجور کے ساتھ سرد چیزوں کا استعمال ہو تو یہ بدن کی نشو ونما میں بہت مؤثر اور مقوی ہو جاتا ہے۔حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میری والدہ کی خواہش تھی کہ شادی سے قبل میں فربہ ہو جاؤں۔ان کی یہ خواہش صرف اس وقت پوری ہوئی جب مجھے کھجور کے ساتھ ککڑی کھلائی گئی۔تو میں خوب فربہ ہوگئی(۱)۔

اس کے ساتھ ساتھ ذائقہ میں بھی بہت اعتدال آجاتا ہے۔کیونکہ ککڑی کھجور کی تیز مٹھاس کو کم کر دیتی ہے۔اور کھجور کی وجہ سے ککڑی کا پھیکا پن ختم ہو جاتا ہے اور معتدل ذائقہ بن جاتا ہے۔علاوہ ازیں دیگر روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ انگور بھی تناول کر چکے ہیں۔

---

(۱)ابوداؤد ۲/ ۱۸۹ کتاب الطب باب فی السمنة وابن ماجه ص ۲۴۶ ابواب الاطعمةباب القثاء و الرطب یجمعان (مختار)

۱۳۱. باب ما جاء فی صفة شراب رسول اللهﷺ

حضور اقدسﷺ کے مشروبات کا بیان

اس باب میں نبی کریمﷺ کے مشروبات کا بیان ہے کہ آپﷺ نے کیا کیا پیا ہے اور کس صفت کے ساتھ مشروبات آپﷺ کو مرغوب ہوتے تھے۔ گویا ''کلّ شراب شربه رسول اللهﷺ'' کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

(۱) حدّثنا إبن أبی عمر ثنا سفیان عن معمر عن الزهری عن عروة عن عائشةؓ قالت کان احب الشراب الی رسول اللهﷺ الحلو البارد(۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریمﷺ ٹھنڈے اور میٹھے مشروب کو تمام مشروبات میں سب سے زیادہ پسند فرماتے تھے۔

کان أحبّ الشراب إلیٰ رسول اللهﷺ آپﷺ کا مرغوب ترین مشروب وہ تھا جس میں دو صفتیں ہوں۔ اول یہ کہ وہ میٹھا ہو۔ دوم یہ کہ ٹھنڈا ہو۔

<u>پانی کی دو مرغوب صفتیں:</u> نعمتوں میں رغبت صحیح وسالم انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ پانی میں پینے کے لحاظ سے مرغوب صفتیں دو ہی ہیں۔ یعنی میٹھا ہونا اور ٹھنڈا ہونا۔ اس لیے آپﷺ ان دو صفتوں والے پانی کو پسند فرماتے تھے۔ آپﷺ کے لیے میٹھا پانی دور کے کنوؤں سے مدینہ منورہ لایا جاتا تھا(۲)۔

---

(۱) جامع ترمذی ۲/۱۱ کتاب الاشربة باب ماجاء ای شراب کان أحبّ إلیٰ رسول اللهﷺ، مصنف ابن ابی شیبة ۸/۳۶۱، شرح السنة ۱۱/۳۶۴ کتاب الاشربة (مختار)

(۲) اور ایک روایت کے مطابق یہ کنواں مدینہ منورہ سے دو دن (یعنی ۳۶ میل) کی مسافت پر تھا۔ اور آپﷺ میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا اہتمام فرماتے تھے۔ اس لئے علامہ ابن بطالؒ نے فرمایا ہے کہ ٹھنڈے پانی کا اہتمام کرنا زہد کے خلاف نہیں۔ اور نہ کھارا پانی پینا باعث فضیلت ہے۔ امام دار الھجرۃ امام مالکؒ اپنے تلامذہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ٹھنڈا پانی پیا کرو۔ اس لئے کہ ٹھنڈے پانی کی وجہ سے دل کی گہرائی سے شکر ادا ہوتا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے فرمایا ہے کہ پانی میں جب دو اوصاف (حلاوت اور برودت) پائے جائیں تو ایسا پانی حفظان صحت کا ضامن ہے۔ اور تبخیر کو دفع کرتا ہے۔ (مختار)

سات مخصوص کنوؤں کا پانی آپ ﷺ پسند فرماتے تھے۔جن کا پانی پینے کے لیے آپ ﷺ کو مہیا بھی کیا جاتا تھا۔ان میں بیر سقیا زیادہ مشہور تھا جو مدینہ منورہ سے ایک یا دوسرے قول کے مطابق دو دن کے سفر کے فاصلہ پر تھا۔

یہاں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ میٹھے مشروب سے وہ پانی مراد ہو جس میں شہد، شربت، یا نبیذ ملا دیا گیا ہو جو کہ ایک مستقل نعمت ہے۔اور نعمت جتنی اعلیٰ ہو، اتنا ہی خلوص حمد وتشکر میں ہوتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے الحمد للہ کی صدا اُٹھتی ہے۔

ایسے ہی جب خوب پیاس لگی ہوئی ہو اور ٹھنڈا اور میٹھا پانی ملے تو بے اختیار آدمی کی زبان سے اللہ کا شکر ادا ہوتا ہے۔اور انہی اسباب کی بنا پر آپ ﷺ کو اس قسم کا پانی زیادہ پسند ہوتا تھا۔

(۲) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا إسماعیل بن إبراھیم أنا علّی بن زید عن عمر ھو إبن أبی حرملة عن إبن عباس ؓ قال دخلت مع رسول اللّٰہ ﷺ انا و خالد بن الولید علی میمونة فجاء تنا باناء من لبن فشرب رسول اللّٰہ ﷺ وانا علی یمینه و خالد علی شماله فقال لی الشربة لک فان شئت آثرت بھا خالدا فقلت ما کنت لأ وثر علی سورک احداًثمّ قال رسول اللّٰہ ﷺ من اطعمه اللّٰہ طعاماً فلیقل اللّٰھم بارک لنافیه و اطعمنا خیراً منه و من سقاہ اللّٰہ لبناً فلیقل اللّٰھم بارک لنا فیه و زدنا منه ثمّ قال رسول اللّٰہ ﷺ لیس شئی یجزئ مکان الطعام و الشراب غیر اللبن.

قال أبو عیسیٰ ھکذا روی سفیان ابن عیینة ھذا الحدیث عن معمر عن الزھری عن عروة عن عائشة ؓ ورواہ عبداللّٰہ بن المبارک و عبدالرزاق و غیر واحد عن معمر عن الزھری عن النبیّ ﷺ مرسلا ولم یذکر و ا فیه عن عروة عن عائشة وھکذاروی یونس وغیر واحد عن الزھری عن النبیّ ﷺ مرسلا قال ابو عیسیٰ و انّما اسندہ ابن

عيينة من بين الناس.

وميمونة بنت الحارث زوج النبیﷺ هی خالة خالد بن الوليد و خالة ابن عباسؓ وخالة يزيدبن الاصم واختلف الناس فی رواية هذا الحديث عن علیّ بن زيد بن جدعان فروىٰ بعضهم عن علیّ بن زيد عن عمر ابن أبی حرملة وروى شعبة عن علیّ بن زيد فقال عن عمرو بن حرملة والصحيح عمر بن حرملة(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اور خالد بن ولیدؓ دونوں نبی کریمﷺ کے ہمراہ حضرت میمونہؓ کے پاس آئے۔ام المؤمنین ہمارے لیے دودھ کا ایک برتن لائیں۔نبی کریمﷺ نے (اس دودھ میں سے) پیا۔میں نبی کریمﷺ کے دائیں جانب اور خالد بن ولیدؓ بائیں جانب بیٹھے تھے۔آپﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ پینے کی باری تیری ہے۔اگر تو چاہے تو خالد کو ترجیح دیدے۔میں نے کہا کہ میں آپﷺ کے جھوٹے میں اپنے پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔پھر نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کوئی چیز کھلائے۔تو وہ یہ دعا پڑھے کہ اے اللہ تو اس (کھائی ہوئی چیز) میں ہمارے لیے برکت عطا فرما۔اور اس سے بہتر چیز عطا فرما۔اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ دودھ عطا فرمائے۔تو وہ یہ دعا پڑھے،اے اللہ تو اس دودھ میں ہمارے لیے برکت عطا فرما۔اور ہمارے لیے اس میں زیادتی فرما۔پھر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ نبی کریمﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دودھ کے سوا کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو کھانے اور پانی دونوں کی کفایت کرے۔(اس کے بعد امام ترمذیؒ نے دونوں حدیثوں کی سندوں کے بارے میں کچھ توضیحات کی ہیں۔جس کی تفصیل آگے آئے گی)

---

(۱)سنن ابی داؤد ۱۶۸/۲ کتاب الاشربة باب مايقول اذاشرب اللبن، جامع ترمذی ۱۸۳/۲ کتاب الدعوات باب ما يقول اذاكل طعاماً السنن الكبرىٰ للنسائی ۷۹/۶ کتاب عمل اليوم والليلة باب مايقول اذاشرب اللبن(مختار)

دخلت الخ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت خالد بن ولیدؓ نبی کریمﷺ کے گھر گئے۔اور ام المؤمنین حضرت میمونہ بنت الحارثؓ کے حجرے میں داخل ہوئے۔حضرت ابن عباسؓ حضرت میمونہؓ کے بھانجے لگتے ہیں۔کیونکہ وہ حضرت میمونہؓ کی بہن لبابۃ الکبریٰ کے بیٹے ہیں۔اور ام المؤمنینؓ کی دوسری بہن لبابۃ الصغریٰ چونکہ حضرت خالدؓ کی والدہ ہیں اس لیے وہ حضرت خالدؓ کی بھی خالہ لگتی ہیں۔اس طرح حضرت یزید بن الاصمؓ کی والدہ بھی حضرت میمونہؓ کی بہن ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ یہاں حجاب کی رکاوٹیں نہیں ہیں۔

فشرب رسول اللهﷺ نبی کریمﷺ نے خود اپنے آپ کو اس لئے مقدم فرمایا کہ اس طرح دودھ میں برکت پیدا ہوگی۔اور ساتھ ساتھ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت خالدؓ کی بھی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ نبی کریمﷺ کا جھوٹا پی لیں۔

الشِربة لک شین پر تینوں حرکات آتے ہیں۔اور اس سے معانی بھی بدل جاتے ہیں لیکن پینے کی باری جس کی ہو اس کیلئے کہتے ہیں۔ **له شِربٌ ،یا لَه' شربةٌ** یعنی شین کو مکسور پڑھا جاتا ہے۔اسی معنیٰ پر قرآن میں بھی آتا ہے۔"**ولها شِرب ولکم شِربُ یوم معلوم**"یعنی اس اونٹنی کے لیے پینے کا معین نمبر اور تمہاری باری کا بھی مقرر دن ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی شین مکسورہ کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

<u>معاشرتی آداب کی حکیمانہ تعلیم</u>: لہٰذا معنیٰ یہاں یہ ہوگا کہ باری تو تمہاری ہے۔کیونکہ تم داہنی جانب ہو۔اور ایمن زیادہ مستحق ہوتا ہے۔لیکن دوسری طرف حضرت خالد بن ولیدؓ ہیں جو عمر میں بزرگ ہیں اور **اکبر سناً** بھی ایک لحاظ سے زیادہ قابل قدر رہوتا ہے۔اس لئے اگر دونوں سامنے ہوتے پھر تو عمر کا لحاظ کیا جاتا۔اور اکبر سنا سے ابتداء ہوتی کیونکہ یہی شرعی آداب ہیں۔لیکن چونکہ ابن عباسؓ دائیں اور حضرت خالدؓ بائیں جانب تھے۔اس لیے اس حیثیت سے حضرت ابن عباسؓ کو ترجیح ملتی تھی۔نبی کریمﷺ کے اس بیان سے ایک معاشرتی ادب کی تعلیم بھی ملتی ہے۔کہ دائیں جانب کو بائیں جانب پر ترجیح حاصل ہے۔

فان شئت آثرت بها خالداً اس مشورہ اور ارشاد میں نبی کریمﷺ نے ایک اور ادب کی

طرف اشارہ فرمادیا کہ عمر میں بزرگ کی بھی رعایت کرنی چاہیے۔آپ ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ کو ایثار کرنے کا مشورہ دیا۔

ناقابل ایثار نعمت: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں تو آپ ﷺ کا حکم ماننے اور تعمیل ارشاد کے لیے بسروچشم تیار ہوں۔لیکن ہر چیز میں تو ایثار بھی نہیں ہوتا۔لہذا ما کنت لا وثر علی سورک احداً یعنی خالد کا احترام مجھ پر واجب ہے۔لیکن آپ ﷺ کے جھوٹے میں ایثار کر کے کسی کو نہیں دے سکتا۔خواہ وہ کوئی بھی ہو۔کیونکہ یہ تو ہر وقت نہیں ملتا(۱)۔

اسی طرح کے ایک اور واقعہ میں ایک صحابی اور اس کے بیٹے میں یہ نزاع پیدا ہوگی کہ ان میں سے کون جہاد میں شامل ہو جائے۔اور کون گھر میں رہے۔دونوں میں قرعہ اندازی کی گئی۔تو قرعہ بیٹے کا نکل آیا۔باپ نے منت کی کہ ''آثِرنی'' یعنی قربانی کر کے یہ باری مجھے دے دو۔لیکن بیٹے نے فرمایا لا یؤثر بالجنة احدٌ احداً ابدا یعنی جنت میں ایثار نہیں کیا جا سکتا۔اور اگر جنت جہاد کے راستے میں ملے۔تو وہ کسی کو نہیں دے سکتا خواہ باپ (۲) کیوں نہ ہو۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ حضرت خالدؓ کو مقدم کر دیتے۔تو اس میں ایک اور فائدہ بھی تھا کیونکہ اگر وہ پی لیتے تو حدیث کی رو سے اس کا جھوٹا بھی تو شفا تھا کیونکہ ارشاد ہے کہ فی سور المؤمن شفاء پھر ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ کا جھوٹا بھی تھا۔دونوں سور جمع ہو کر فضیلت اور بڑھ جاتی۔اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی کوشش یہ تھی کہ عین اس جگہ پر ہونٹ رکھ دے جہاں نبی کریم ﷺ نے لب مبارک رکھے تھے اس دوسری غرض کی وجہ سے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے پیالہ حضرت خالدؓ کو نہیں دیا۔ثم قال الخ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ طعام دے دے جو بھی پھل وغیرہ نصیب ہو۔تو وہ تناول کرتے ہوئے یوں کہے۔

---

(۱) یہاں پر یہ مسئلہ بھی قابل توجہ ہے کہ قربات میں ایثار جائز ہے یا نہیں؟ تو شوافع کے ہاں قربات میں ایثار جائز نہیں۔ لیکن حنفیہ کثر اللہ سوادہم کے ہاں جائز ہے۔بشرطیکہ قربات نافلہ ہوں۔اور استدلال میں یہی روایت پیش کرتے ہیں کہ اگر ایثار جائز نہ ہوتا تو آنحضرت ﷺ عبداللہ بن عباسؓ کو ایثار کا مشورہ کیوں دیتے۔(مختار)

(۲) المواہب اللدنیہ ص ۱۴۸

دودھ اعلیٰ ترین نعمت ہے: اللّھم بارک لنا فیه واطعمنا خیراً منه. یعنی اللہ ہمارے لیے اس چیز میں برکت ڈال دے۔ اور اس سے بہتر چیز ہمیں عطا فرما۔

اور جس نے دودھ پیا وہ یہ کہے کہ اے اللہ ہمارے لیے اس میں برکت ڈال دے۔ اور اسے زیادہ فرما۔ کیونکہ دودھ تمام نعمتوں میں اعلیٰ ترین نعمت ہے۔ اور دنیا کے تمام ڈاکٹر، سائنس دان اور علم حیوانات ونباتات کے ماہرین اس پر متفق ہیں کہ ہر نعمت سے بڑھ کر ایک اور نعمت بھی ہے سوائے دودھ کے۔ لیبارٹریوں کی تحقیقات سے سائنس دودھ کی مکمل غذائیت کا وہی فیصلہ دہرا رہی ہے جو کہ چودہ سو سال قبل نبی کریم ﷺ نے کیا تھا۔ اور آج بھی محققین کی رائے یہ ہے کہ بچے کیلئے ڈبوں میں بند دودھ یا دوسری دوائیں اتنی مفید نہیں جتنا ماں کا دودھ مفید ہے۔ پھر دودھ میں جو حیاتین، پروٹین اور نباتی اجزاء شامل ہیں۔ وہ دوسرے اغذیہ میں کب ملتے ہیں۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے اعلان فرمایا کہ لیس شیئا یجزی مکان الطعام والشراب غیر اللبن کہ کھانے پینے کی تمام اشیاء کا نعم البدل دودھ کے سوا کوئی اور طعام نہیں ہو سکتا۔

اغذیہ اور کھانوں کا کوئی بھی ماہر چودہ سو سال قبل یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے یہ آپ ﷺ کی نبوت کا بیّن ثبوت ہے۔

مسند اور مرسل کی سندی بحث: قال ابو عیسیٰ الخ امام ترمذیؒ یہاں باب کی دونوں حدیثوں کی سندوں کے بارے میں کچھ تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی حدیث کی سند پر تبصرے کا حاصل یہ ہے کہ سفیان بن عیینہؒ نے اس حدیث کو مسند روایت کیا ہے۔ حضرت عروۃؓ کے واسطے سے حضرت عائشہؓ سے اس روایت کو مسند ذکر کرنے میں وہ متفرد بھی ہیں۔ لیکن اس حدیث کی یہ غرابت اس کی صحت کی منافی نہیں ہے۔ دوسری طرف امام زہریؒ جو خود بھی تابعی ہیں۔ اس حدیث کو نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں اور صحابی یا کسی دوسرے واسطہ کا ذکر بھی نہیں کیا ہے تو صحابی کے ذکر نہ کرنے کی وجہ سے یہ مرسل ہوئی۔ لیکن یہ مرسل بھی اجماعاً حجت ہے۔ ہمارے ہاں تو مرسل حجت ہے۔ لیکن شوافعؒ کے ہاں اس لیے حجت ہے کہ یہ مسند سے مؤید ہے۔ امام ترمذیؒ نے جامع میں مرسل کی سند کو مسند کی سند کی نسبت راجح قرار دیا ہے۔ علامہ مناویؒ

نے زہریؒ کی سند میں عروۃؒ کے ترک کرنے کی وجہ سے حدیث کو منقطع کہا ہے۔لیکن چونکہ زہریؒ خود تابعی ہیں۔لہٰذا یہاں صرف صحابی کا ترک لازم آتا ہے۔

قال ابو عیسٰی الخ دوسری حدیث کے بارے میں تبصرہ کررہے ہیں۔جس میں ایک تو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور خالد بن ولیدؓ دونوں کا حضرت ام المؤمنین میمونہؓ کے ساتھ رشتہ کا بیان کررہے ہیں کہ دونوں کی خالہ لگتی ہیں۔لہٰذا ان کا حرم نبویؐ کے ہاں داخلہ قابل اعتراض نہیں ہے۔دوسری یہ کہ اس سند میں علی بن زیدؒ کے استاد کے نام میں اختلاف ہے کہ وہ عمر ہے یا واو کے ساتھ عمرو ہے۔اوران کے والد کی کنیت ابوحرملہ ہے یا نام حرملہ ہے۔تو روایات میں اختلاف ذکر کرنے کے بعد فیصلہ سناتے ہیں کہ یہ نام عمر بن ابی حرملۃ ہے اس کا نام عمرو نہیں ہے۔نہ والد کا نام حرملہ ہے۔

ام المؤمنین میمونہؓ: **وميمونة بنت الحارث الخ** ام المؤمنین میمونہ کا پہلا نام برّہ تھا۔نبی کریم ﷺ نے نام تبدیل کر کے میمونہ رکھا۔جاہلیت کے زمانہ میں معوذ بن عمرو ثقفی کے نکاح میں تھیں۔ اس سے جدائی کے بعد ابورہم نامی شخص سے نکاح کیا۔اس کی وفات کے بعد ذی القعدہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے سفر کے دوران مکہ سے دس میل کے فاصلہ پر واقع سرف کے مقام پر نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں۔اس وقت آپ ﷺ احرام میں تھے۔عمرہ سے واپسی پر اسی جگہ شادی کی تقریب کا اہتمام ہوا۔اور عجیب اتفاق یہ پیش آیا کہ ۵۱ھ یا ایک قول کے مطابق ۶۱ھ کو اسی مقام پر آپؓ کا انتقال بھی ہوا۔اور یہیں دفن ہوئیں۔آپؓ نبی کریم ﷺ کی نکاح میں آنے والی سب سے آخری بیوی تھیں۔عبداللہ بن عباسؓ کی والدہ لبابہ کبریٰ اور خالد بن ولیدؓ کی والدہ لبابۃ الصغریٰ آپؓ کی حقیقی بہنیں تھیں۔علاوہ ازیں نو یا دس اخیافی بہنیں بھی تھیں۔جن میں حضرت اسماء بنت عمیسؓ کا نام بھی ہے جو حضرت علیؓ کی بیوی تھی۔اور حضرت علیؓ سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور اس سے پہلے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی طرف سے بیوہ ہو چکی تھی۔ان تینوں حضرات سے اسماءؓ کی اولاد بھی ہوئی تھی۔

خلاصہ باب

اس باب میں یہ بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ٹھنڈا اور میٹھا پانی بہت مرغوب ہوتا تھا۔ نیز دودھ بھی آپ شوق سے پیتے تھے۔ اور اس کو بڑی نعمت کہتے۔ حتیٰ کہ اس سے بڑی نعمت کا گویا تصور بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس کی دعا کی جائے۔

میٹھے اور ٹھنڈے پانی کی طلب بلکہ اس سلسلے میں تکلف بھی تعیش اور ترّفہ کے زمرے میں نہیں آتی۔ نہ یہ زہد کے منافی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی میٹھے اور کڑوے پانی میں فرق کو اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں کہ **هذا عذب فرات سائغ شرابه وهذا ملح اجاج**

شیخ ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں کہ جب میں میٹھا پانی پیتا ہوں ۔تو دل کے وسط سے رب ذوالجلال کے لیے حمد نکل جاتی ہے۔

(فالحمدللّٰہ علی نعمائه الكاملة)

۳۲. باب ما جاء فی صفۃشرب رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے پینے کے طریقے کا بیان

مشروبات کی کیفیت کے بیان کے بعد اس باب میں نبی کریم ﷺ کے پینے کا طریقہ بیان کیا جاتا ہے۔اور بالخصوص اس بات کی تفصیل ہے کہ کھڑے ہو کر پینا جائز ہے یا نہیں۔عام روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عذر اور مجبوری نہ ہو تو حتی الوسع کھڑے ہو کر پانی پینے سے اجتناب کیا جائے اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر پینا چاہیے۔لیکن بعض مواقع میں خود نبی کریم ﷺ سے کھڑے ہو کر پانی پینا ثابت ہے۔ جیسے زمزم کا پانی نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر پیا ہے۔یہاں پر امام ترمذیؒ پہلے وہ احادیث لاتے ہیں جن میں کھڑے کھڑے پانی پینا ثابت ہے۔

(۱) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا هشیم انا عاصم الأحول و مغیرۃ عن الشعبی عن ابن عباس أنّ النبیّ ﷺ شرب من زمزم وهو قائم(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پیا۔

<u>زمزم کیا ہے؟</u> زمزم حرم پاک میں موجود پانی کا نام ہے جو کہ زمانہ قدیم سے کنویں کی صورت میں موجود تھا۔اس کے لغوی معنی ''بہت زیادہ'' کے ہوتے ہیں۔اور یہ پانی بھی اتنا زیادہ ہے کہ کئی ہزار سال استعمال ہونے کے باوجود یہ ختم ہونے کو نہیں آتا۔حالانکہ یہ اس وادی غیر ذی ذرع میں واقع ہے جہاں میلوں تک گھاس اور پانی نہیں ہے اب تو زمزم کے پانی کو مدینہ تک باقاعدہ پہنچانے کی کوشش جاری ہے۔ مسجد نبوی ﷺ میں تو اب بھی یہ عام ملتا ہے بعض اہل خیر حضرات ٹینکروں سے وہاں یہ پانی پہنچاتے ہیں۔

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۲۲۱ کتاب الحج باب ماجاء فی زمزم، صحیح مسلم ۲/۱۷۳ کتاب الأشربۃ باب فی الشرب من زمزم قائماً جامع ترمذی ۲/۱۰ کتاب الأشربۃ باب ماجاء فی الرخصۃ فی الشرب قائماً، سنن النسائی ۲/۳۹ کتاب مناسک الحج باب الشرب من زمزم(مختار)

بعض لوگوں نے وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ حضرت ہاجرہؓ نے جب پہلے پہلے اس پانی کو زمین سے ابلتے ہوئے دیکھا تو جلدی جلدی ادھر ادھر سے مٹی اور پتھر لا کر بند باندھنے لگی۔ اور ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی "زم زم" جسکا معنی ہے ٹھہر جا ٹھہر جا۔ اسی وجہ سے اس پانی کا نام زمزم پڑ گیا۔

<u>زمزم کی برکات:</u> یہ بہت مبارک پانی ہے۔ پینے والوں کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ نیز اس کے پیتے ہوئے جو دعا کی جاتی ہے وہ بھی قبول ہوتی ہے۔ مستجاب وغیرہ ہونے کے سبب صدقِ دل سے کی جانے والی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ علماء کرام اور بزرگان عظام سے اس موقع پر کچھ مخصوص دعائیں منقول ہیں۔ جن کی قبولیت کی شہادت تاریخ دے رہی ہے۔

مثلاً علامہ ابن حجرؒ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے اس مقام پر یہ دعا کی تھی کہ اے اللہ میرا حافظہ علامہ ذہبیؒ کے حافظے جیسا بنا دے۔ ایک اور محدث کے بارے میں آیا ہے کہ انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ میری تمام زندگی اتباع سنت میں گزرے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ سب سے بہتر دعا یہ ہے کہ اے اللہ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے۔ بہر حال جہاں دعا قبول ہوتی ہے شرب زمزم انہی مواقع میں سے ایک ہے(۱)۔ البتہ بہتر دعا کا انتخاب اس کا ملکہ اور اس کا الہامی القاء کسی کسی کو ہوتا ہے۔ ایک ضروری بات یہ ہے کہ دعا اخلاص اور سوز و گداز کے ساتھ ہونی چاہیے۔ سرسری زبان سے اور قلب غافل کے ساتھ دعائیہ کلمات کی ادائیگی مقصود نہ ہو۔ یہ عبادت کی مغز ہے عشق و محبت کے ساتھ ہو۔ جیسے نبی کریمﷺ کی دعائیں ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے "**الحزب الاعظم**" کے نام سے آپﷺ کی مسنون دعاؤں کو جمع کیا ہے۔ جن الفاظ، تعبیرات اور درد کے ساتھ آپﷺ نے دعائیں مانگی ہیں کتاب پڑھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ بالخصوص سفر حج وعمرہ اور حرمین میں اس کی کیفیات اور لطف دوبالا ہو جاتے ہیں جس کا پچھلے تیس چالیس سال سے مجھے تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ والحمدللہ

معنوی برکت کے ساتھ ساتھ زمزم میں کچھ ظاہری خصوصیات بھی ہیں۔ یہ کھانے کی بھی کفایت کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں غذائیت موجود ہے۔ بہت سے بزرگوں نے طویل عرصہ تک صرف زمزم پی کر گزارہ کیا

---

(۱)عن جابر بن عبداللہ یقول سمعت رسول اللہﷺ ماء زمزم لما شُرب له ۱۲ ابن ماجة ۲۲۰ ابواب المناسک (مختار)

ہے۔جیسا کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے بارے میں روایت ہے کہ ایک طویل مدت تک آپ نے زمزم پینے کے سوا کچھ نہیں کھایا(۱)۔

پانی پینے کا طریقہ: یہاں پر نبی کریم ﷺ سے قیام کی حالت میں پانی پینا ثابت ہو رہا ہے۔یہ حجۃ الوداع کا موقعہ تھا۔نبی کریم ﷺ اس روز سواری پر سوار طواف کر رہے تھے۔طواف کے بعد دوگانہ پڑھنے کیلئے آپ ﷺ سواری سے اترے ہونگے۔اور اسی دوران آپ ﷺ نے زمزم کا پانی مانگا ہوگا۔اور حضرت ابن عباسؓ نے پیش کیا ہوگا۔اس تشریح کے مطابق اس باب کی تیسری حدیث اور زیر نظر حدیث میں تطبیق ہو جاتی ہے کہ یہاں تو حضور ﷺ کا خود پینا ذکر ہے۔اور وہاں پر ابن عباسؓ کی طرف سے پیش ہونے کا ذکر ہے۔لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ یہ دونوں الگ الگ واقعے ہوں۔ایک بار آپ ﷺ نے خود پیا ہو۔دوسری بار ابن عباسؓ نے پیش کر دیا ہو۔

کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت واباحت کا بحث: بہر حال آپ ﷺ نے عملاً کھڑے کھڑے پانی پیا۔جس سے اس عمل کا جواز ثابت ہوتا ہے۔لیکن مسلم شریف کی ایک روایت میں آیا ہے کہ

لایشربنّ احد منکم قائما فمن نسی فلیستقئی(۲).

تم میں سے کوئی کھڑے ہو کر پانی نہ پئے۔جس نے بھولے سے پیا۔وہ اسے قے کر دے۔

جس سے کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔اس بظاہر تدافع کو دیکھ کر بعض لوگوں نے احادیث نہی کو ناسخ کہہ کر کہا کہ کھڑے ہو کر پینا جائز نہیں۔اور جہاں نبی کریم ﷺ سے کھڑے ہو کر پینا مروی ہے۔وہ یا تو منسوخ ہے۔یا پھر عذر پر محمول ہے۔مثلاً زمزم کا پانی کھڑے کھڑے اس لیے پیا تھا کہ چونکہ اس کنویں کے کنارے بہت ازدحام ہوتا ہے۔پھر اس زمانے میں منڈھیر پر کیچڑ اور پانی بھی ہوتا تھا۔لہٰذا یہاں بیٹھنا مشکل ہوتا تھا۔پرانے زمانے میں زمزم کھلا کنواں تھا۔اور اس پر چرخی لگی ہوئی تھی۔ڈول

(۱) حضرت ابوذرؓ جب پہلے پہلے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ملاقات کی خاطر مکہ تشریف لائے تو ایک موقعہ پر اپنی روپوشی کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔"فاختبات بین الکعبۃ و بین استارھا ولبثت فیھا بین خمس عشرۃ من یوم ولیلۃ ومالی طعام و لاشراب الا ماء زمزم. کذافی الاصابۃ ج ۲ ص ۶۳ (اصلاح الدین)

(۲) مسلم ج ۲ ص ۱۷۳ (مختار)

سے پانی نکالا جاتا تھا۔ مشینیں تھیں نہ نلکے۔ بلکہ چرخی اور ڈول تو مشین کے دور تک لگی ہوئی تھی۔ میرے مشاہدے کی ۱۳۸۳ھ کی بات ہے کہ لوگ خود ڈول کے ذریعے پانی نکال بھی سکتے تھے۔ کنویں کے اندر جھانکنا بھی ممکن تھا اور لوگ جھانک بھی لیتے تھے۔ کیونکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص کنویں میں جھانک کر دیکھے تو تمام گناہ اس میں جھڑ جاتے ہیں(۱)۔

آج کل تو وسیع انتظامات مثلاً جنگلوں، نلکوں، اور مشینوں کے باوجود ازدحام اتنا زیادہ ہوتا کہ نلکوں پر نمبر ملنا مشکل ہوتا ہے۔ ملے بھی تو کھڑے ہوکر پینے کی سہولت ہے۔ اور قیام کی حالت ہی میں پینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا نبی کریمﷺ نے بھی ضرورت کی بنا پر کھڑے ہوکر زمزم پیا ہوگا۔ ویسے عام حالات میں ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔ پانی زمزم کا ہو یا کوئی دوسرا پانی ہو۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ کھڑے ہوکر پانی پینے سے نہی کی حدیث سے زمزم اور وضوء کے پانی کی تخصیص ہو چکی ہے۔ گویا احادیث نہی کی تعمیم منسوخ ہو چکی ہے۔ اور نبی کریمﷺ کا عمل اس کے لئے ناسخ ہے اور صرف ان دو موقعوں میں بیانِ جواز کے لیے آپﷺ نے ایسا کیا ہے۔ تو گویا عمومی طور پر تو کھڑے کھڑے پینا مکروہ ہوگا۔ البتہ دو جگہ جائز ہوگا۔ کیونکہ زمزم اور وضوء کا پانی عام پانیوں کی طرح نہیں ہے۔ اس کی خصوصیات اور فضائل کی وجہ سے اس کا زیادہ پینا مطلوب ہے۔ اور اس کا مشروع طریقہ بھی یہی ہے کہ قبلہ رو کھڑے ہوکر بتکلف زیادہ پیا جائے(۲)۔

تیسری رائے یہ ہے کہ کھڑے ہوکر پانی پینے سے منع کرنے کا حکم ارشاد پر مبنی ہے۔ اور نہی تنزیہی ہے۔ کیونکہ کھڑے کھڑے پانی پینے میں دنیوی مفاسد اور طبی نقصانات ہیں۔ لہٰذا شرعی نقطۂ نگاہ سے بیٹھ کر پینا ضروری ہے۔ نہ کھڑے ہو کر پینا مکروہ بلکہ بدن انسانی کے لیے مصالح کی بنیاد پر آپﷺ نے

---

(۱) لم افز بحدیث یثبت ذالک الا ما رأیت فی انجاح الحاجة علی ابن ماجة حیث قال "والنظر الیها والطهور منها یحط الخطایا" (ابن ماجة باب الشرب من زمزم)(اصلاح الدین)

(۲) عن ابن عباسؓ قال اذا شربت منها فاستقبل القبلة واذکر اسم اللّٰه و تنفس ثلاثا وتضلّع منها فاذا فرغت منها فاحمد اللّٰه عزو جل فان رسول اللّٰهﷺ قال انّ آیة ما بیننا و بین المنافقین انّهم لا یتضلعون من زمزم(ابن ماجة ص ۲۲۶)ابواب المناسک باب الشرب زمزم(اصلاح الدین)

کھڑے ہو کر پینا منع کر دیا ہے۔ مثلاً علامہ ابن قیمؒ نے کھڑے ہو کر پینے کی بہت سی آفات لکھی ہیں۔ جن میں پیاس کا نہ بجھنا بلا استفادہ کے معدے سے پانی کا گزر جانا(۱) وغیرہ ایک واضح ضرر یہ بھی ہے کہ آدمی بہت زیادہ سیر ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ بوجھل اور سست ہو جاتا ہے۔ بدن میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا علماء کہتے ہیں کہ عموماً تو ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن زمزم کا پانی اپنی برکتوں اور خصوصیات کی وجہ سے جتنا زیادہ پیا جائے بہتر ہے۔ لہٰذا اسے کھڑے ہو کر پینا اس لیے افضل ہو گا کہ وہاں تکثیر مضر نہیں مطلوب ہے چنانچہ احادیث میں وارد نہی ارشاد اور تنزیہ پر مبنی ہو گی۔ اور عمل بیان جواز کے لیے ہو گا۔

(۲) حدّثنا قتیبة بن سعیدثنا محمّد بن جعفر عن حسین المعلّم عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال رایت رسول اللّٰهﷺ یشرب قائماًو قاعداً(۲).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو کھڑے اور بیٹھے دونوں طرح پانی پیتے دیکھا۔

سند عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی تحقیق: واضح رہے کہ عمرو کے والد کا نام شعیب ان کے والد محمد اور ان کے والد عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں۔ اب یہاں پر عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ میں ابیہ کی ضمیر تو بالاتفاق عمرو کو راجح ہے۔ لیکن جدہ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ اگر عمرو کو راجح ہو تو جدہ سے مراد محمد بن عبداللہ بن عمرو ہیں۔ جو تابعی ہیں اور اگر ضمیر ''اب'' یا شعیب کو راجح ہو۔ تو اس سے شعیب کے دادا عبداللہ بن عمرو مراد ہونگے۔ اول الذکر صورت میں حدیث مرسل ہو گی۔ یعنی صحابی متروک الذکر ہو گا۔ علاوہ ازیں شعیب کی روایت اپنے والد محمد سے بھی محل نظر ہے۔ کیونکہ اس کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اگر جد کو جد اعلیٰ پر محمول کر کے عبداللہ بن عمرو بن العاص مراد لئے جائیں تو شعیب کی روایت ان سے ثابت ہے۔ مؤخر الذکر

(۱) شاید مسند احمد کی ایک روایت میں بھی انہی مضرات کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہے **لو یعلم الذی یشرب وھو قائم ما فی بطنه لاستقاء(مسند احمد ج ۲ ص ۲۸۳)(اصلاح الدین)**

(۲) جامع ترمذی ۲/۱۰ ا کتاب الاشربة باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب قائماً، صحیح مسلم ۲/۱۷۳ کتاب الاشربة(مختار)

صورت میں حدیث مسند ہوگی۔لیکن کچھ لوگوں کے ہاں شعیب کی ملاقات عبداللہؓ سے خفی ہے۔اس لیے یحیٰی بن معینؒ سے مروی ہے کہ یہ سند کمزور ہے۔البتہ اکثر علماء جن میں امام بخاریؒ، امام احمدؒ، اور علی بن المدینیؒ بھی ہیں کے نزدیک مؤخر الذکر صورت میں سند کو متصل قرار دیتے ہیں۔اور شعیب کی ملاقات اپنے دادا سے ثابت کر کے اس سند کو قابل احتجاج مانتے ہیں۔امام بخاریؒ نے کتاب القدر میں اسی سند سے ایک حدیث کی تخریج کی ہے۔اور یہی صورت اقویٰ بھی معلوم ہوتی ہے۔

<u>عبداللہ بن عمرو بن العاص</u>: **عبداللہ بن عمروؓ** عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا اصل نام عاص تھا۔ ایک جنازہ کے دوران نبی کریم ﷺ نے آپؓ کا نام تبدیل کر کے عبداللہ رکھ لیا۔ابو محمد اور ابو عبدالرحمٰن کنیت تھی۔مکثرین فی الحدیث صحابہ میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت آپؓ سے روایت کرتی ہے۔نبی کریم ﷺ نے آپ کو حدیث لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔اور اسی وجہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کے بقول آپؓ کے پاس تمام صحابہ سے زیادہ احادیث موجود تھیں۔البتہ عمر کا اکثر حصہ مصر اور شام میں گزارنے کے سبب آپؓ کی روایات بعض دیگر صحابہ کی نسبت کم نقل کی گئیں۔آپؓ اپنے والد عمرو بن العاصؓ سے بھی پہلے اسلام لائے تھے۔ایک روایت کے مطابق آپؓ اپنے والد سے صرف بارہ برس یا گیارہ برس چھوٹے تھے۔

طویل قد اور سرخ رنگت تھی عمر کے آخری حصے میں نظر سے بھی محروم ہو چکے تھے۔تورات کے بھی عالم تھے۔کثرت علم کے علاوہ عبادت کے ایسے شوقین تھے کہ کثرتِ صوم اور تلاوت کی وجہ سے والد صاحب نے نبی کریم ﷺ سے شکایت کی۔چنانچہ آپ ﷺ نے پابندیاں لگا دیں۔جنگ صفین میں باپ کے حکم سے شریک تو ہوئے مگر قسم کھاتے ہیں کہ تیر، تلوار یا نیزہ کو بھی استعمال نہیں کیا۔اور مسلمانوں کے درمیان لڑی جانے والی اس جنگ میں صرف شرکت کی وجہ سے بھی بہت نادم تھے۔اور ہمیشہ استغفار کیا کرتے تھے۔نیز فرماتے ''کاش میں اس واقعے سے دس برس قبل ہی مرجاتا'' بہتر سال کی عمر میں ۶۵ھ کو شام میں اور ایک قول کے مطابق ۶۷ھ کو مکہ میں وفات پائی۔

قائماً و قاعداً یعنی کبھی آپ ﷺ کھڑے ہو کر پیتے تھے اور کبھی بیٹھ کر۔بلکہ اکثر بیٹھ کر پیتے

تھے۔ان دوطریقوں کے علاوہ دوسرے اوضاع میں پانی پینا نامناسب ہے۔مثلاً چلتے چلتے، ٹیک لگا کر، لیٹے لیٹے، یارکوع اور سجدہ کی حالت میں پانی نہیں پینا چاہیے۔

(۳) حدّثنا علیّ بن حجرثنا إبن المبارک عن عاصم الأحول عن الشعبی عن إبن عباس قال سقیت النّبیّ ﷺ من زمزم فشرب و ھو قائم(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو زمزم کا پانی پلایا تو آپ ﷺ نے کھڑے ہوکر اسے پیا۔

فشرب و ھو قائم باب کی پہلی حدیث کی طرح یہاں بھی کھڑے کھڑے پانی پینا ثابت ہورہا ہے۔جس کی تفصیل گزرچکی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ زمزم کی فضیلت اور نبی کریم ﷺ کا اہتمام کے ساتھ پینا بھی یہاں ثابت ہورہا ہے۔

(۴) حدّثنا أبو کریب محمّد بن العلاء و محمّد بن طریف الکوفیّ انبانا إبن الفضیل عن الأعمش عن عبدالملک بن میسرة عن النزال عن سبرة قال اتی علیّ بکوز من ماء و ھو فی الرّحبة فاخذ منه کفاً فغسل یدیه و مضمض و استنشق و مسح وجهه و ذراعیه و راسه ثمّ شرب منه و ھو قائم ثمّ قال ھذا و ضوء من لم یحدث ھکذا رأیت رسول اللّٰہ ﷺ فعل (۲).

ترجمہ: نزال بن سبرہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے پاس پانی کا بھرا کوزہ لایا گیا۔جبکہ آپؓ اس وقت رحبہ میں تھے۔آپ ﷺ نے اس سے ایک چلو پانی لیا۔جس سے

---

(۱)صحیح بخاری ۱/۲۲۱ کتاب الحج باب ماجاء فی زمزم، صحیح مسلم ۲/۱۷۳ کتاب الأشربة باب فی الشرب من زمزم قائماً،جامع ترمذی کتاب الأشربة باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب ۲/۱۰ قائماً (مختار)

(۲)صحیح بخاری ۲/۱۶۷ کتاب الأشربة باب الشرب قائماً، سنن ابی داؤد کتاب الأشربة باب فی الشرب قائماً سنن النسائی کتاب الطھارة باب صفة الوضؤ من غیر حدث، السنن الکبریٰ للبھیقی ۱/۷۵ کتاب الطھارة(مختار)

دونوں ہاتھ دھوئے۔ پھر کلی کی، ناک میں پانی ڈالا، پھر منہ، بازوں اور سر پر ہاتھ
پھیرا۔ پھر کھڑے ہوکر کوزے کا پانی پیا اور فرمایا یہ اس شخص کا وضوء ہے جس کا وضوء نہ
ٹوٹا ہو۔ ایسا ہی میں نے نبی کریمﷺ کو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

بکوز من ماء کوزہ میں یہ پانی وضوء کی غرض سے لایا گیا تھا۔ **وھو فی الرحبه** امیر المؤمنین حضرت علیؓ کھلے میدان میں تھے۔ رحبہ راء مفتوحہ اور حاء کے فتحہ اور سکون دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ دراصل صحن اور کھلے میدان کو کہتے ہیں۔ اوراس سے مراد مسجد کوفہ کے ساتھ وہ کشادہ جگہ ہے جہاں حضرت علیؓ بیٹھ کر فیصلے بھی سنایا کرتے تھے۔ اور وعظ وتذکیر بھی فرماتے تھے۔ جبکہ بعض شراح کے نزدیک یہاں وہ چبوترہ مراد ہے جو مسجد کوفہ کے اندر حضرت علیؓ کے وعظ اور قضاء کے لیے بالخصوص بنایا گیا تھا۔

فمضمض الخ یہ اخذ پر عطف ہے۔ غسل پر عطف اس لیے درست نہیں ہوتا کہ ایک بار پانی لینے سے ان تمام کاموں کا کرنا عقلاً مستبعد ہے۔ ایک چلو پانی سے ہاتھ بھی دھوئے جائیں اور پھر اسی سے مضمضہ واستنشاق وغیرہ کے سارے کام بھی سرانجام ہوں۔ لہٰذا معنی یہ ہوگا کہ ایک چلو پانی لے کر آپﷺ نے ہاتھ دھوئے، پھر منہ، ناک دھویا اور مسح کیا۔

مسح وجهه و ذراعیه آپؐ نے پانی لے کر منہ، سر اور ہاتھوں کا مسح کیا۔ تو گویا یہ حقیقی وضوء نہیں تھا۔ ورنہ منہ اور ہاتھوں کا مسح تو بالاتفاق وضوء میں کافی نہیں ہوتا۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ تبرید کے لیے یا گردوغبار صاف کرنے کے لیے آپﷺ نے یہ عمل کیا تھا۔ وضوء پہلے سے تھا۔ اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہاں پاؤں دھونے کا سرے سے ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ پاؤں دھوئے بغیر وضوء نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بھی محتمل ہے کہ آپﷺ نے غسلِ خفیف کیا ہو جس کو راوی نے مسح کہا۔ اور چونکہ مسئلہ تجدید الوضوء علی الوضوء کا تھا۔ اسی لیے بعض اعضاء کے دھونے کا ذکر ہے پاؤں کا ذکر نہیں کیا۔ اور اعضاء کا دھونا بھی خفیف طریقہ سے ہوا۔ مؤخر الذکر احتمال کو شرّاح نے ترجیح دی ہے۔

ھکذا رأیت الخ نبی کریمﷺ کو یہ دونوں عمل کرتے ہوئے دیکھا تھا کہ تجدید وضوء میں ہلکا سا وضوء کیا اور وضوء کے بعد جو پانی بچا تھا وہ کھڑے ہوکر پیا تھا۔ اس طرح بچے ہوئے پانی پینے کی اباحت

بلکہ استحباب بھی ثابت ہوا۔علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ وضوء کے بعد بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پینا بعض امراض کا علاج ہے(۱)۔ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ یہ مستحب ہے۔کیونکہ یہ بھی زمزم کی طرح متبرک پانی ہے۔اور اگر نبی کریمﷺ کا عمل صرف بیان جواز کیلئے ہوتا تو حضرت علیؓ اس کا اعادہ نہ فرماتے۔

(۵) حدّثنا قتیبة بن سعیدویوسف بن حماد قالا حدّثنا عبدالوارث ابـن سـعیـد عـن أبـی عـصـام عن أنـس بن مالک أنّ النبّی ﷺ کان یتنفّس فی الاناء ثلاثا اذا شرب ویقول هو امرء واروی(۱) .

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ برتن میں (پانی پیتے ہوئے) تین مرتبہ سانس لیا کرتے تھے۔اور فرماتے تھے کہ اس طریقہ سے پینا زیادہ خوشگوار اور خوب پیاس بجھانے والا ہے۔

<u>پانی کتنے سانسوں میں پینا چاہئے</u>: کـان یتـنـفّـس الخ اس حدیث میں پانی پینے کا ایک اور ادب بیان کرنا مقصود ہے کہ ایک سانس میں پانی نہیں پینا چاہیے۔بلکہ آرام سے پینا چاہیے۔درمیان میں سانس لینا چاہیے۔فـی الإنـاء کا مقصد یہ نہیں کہ برتن کے اندر سانس لینا ہے بلکہ برتن کو دور کردینا چاہیے۔کیونکہ برتن میں سانس لینا مکروہ ہے۔اس سے دوسری احادیث میں ممانعت آئی ہے(۲)۔نبی کریمﷺ سانس

---

(۱)وفیـه حـدیث إنّ فیه شفاء من سبعین داء ادنا ها البهر (دمه) قال الحافظ انه واه وفی شرح هدایة ابـن العماد لسیدی عبدالغنی النابلسی و ممّا جربته أنّی اذا اصابنی مرض اقصد الا ستشفاء یشرب فـضـل الوضوء فیحصل لی الشفاء و هذا دابی اعتماد علی اوّل الصادق ﷺ فی هذا الطب النبوی الصحیح(ردالمحتار ج ۱ ص ۹۶)مطلب فی مباحث الشرب قائما (اصلاح الدین)

(۲)صـحـیـح مسـلـم ۱۷۴/۲ کتـاب الأشـربة بـاب الکراهیة التنفس فی نفس الإناء الخ، سنن ابی داؤد ۱۶۸/۲ کتـاب الأشـربة بـاب فـی السـاقی منی یشرب، جامع ترمذی ۱۰/۲ کتاب الأشربة باب ماجاء فی التنفس فی الإناء(مختار)

(۳)عن ابی سعید الخدریؓ أنّ النّبیّ ﷺ نهی من النفخ فی الشراب فقال رجل القذاة اراها فی الاناء فقال اهر قها فقال فانّی لاارویٰ من نفس واحدة قال فا بن القدح اذاً عن فیک. وروی عن ابی قتادةؓ انّ رسول اللّٰه ﷺ قال اذا شرب احدکم فلا یتنفّس فی الاناء. کلا الحدیثین رواهما الترمذی ج ۲ ص ۱۱ ورویٰ الاخیر البخاری ۸۴۱/۲(اصلاح الدین)

لیتے تو برتن کو منہ سے ہٹا دیتے تھے۔ رہی یہ بات کہ اس مقام پر تین مرتبہ سانس لینے کا ذکر ہے۔ آگے حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں مرتین کا ذکر ہے یعنی دو سانسوں کا ذکر ہے۔ اس ظاہری تدافع کا جواب یہ ہے کہ یا تو یہ تعدد واقعات پر محمول ہے کہ بعض اوقات میں دو مرتبہ سانس لیا تھا۔ جبکہ اکثر اوقات میں تین مرتبہ لیا ہے۔ اور یا یہ کہ دو مرتبہ سانس لینا ادنی درجہ کے بیان کے لیے تھا۔ کہ کم از کم دو مرتبہ تو سانس لے لو۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ پینے کے دوران درمیان میں دو مرتبہ سانس لیا ہے۔ اور آخر میں جو سانس لیا جاتا ہے وہ شمار ہو تو تین سانس بنتے ہیں۔

چنانچہ بعض لوگوں نے پینے کے بعد کا سانس بھی شمار کیا ہے۔ اور بعض اسے شمار نہیں کرتے۔ صرف دوران شرب سانس شمار کرتے ہیں جو کہ دو بنتے ہیں۔ **ویقول هوأ مرأ واروىٰ** فرماتے ہیں کہ اس طرح پینا بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ ہضم ہونے، سیر ہونے اور ذائقہ کے لحاظ سے یہ طریقہ اچھا ہے۔ **امــــرأ** خوب ہضم ہونے والی چیز کو کہتے ہیں۔ جو لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ معدہ پر بوجھ نہ بنے۔ اور **اروىٰ** خوب سیر کرنے والی مشروب کو۔ درمیان میں سانس لینے سے پیاس خوب بجھتی ہے۔ نیز ڈاکٹروں نے اس بات پر بھی تحقیق کی ہے کہ ایک سانس میں پانی پینا نظام تنفس کو نقصان پہنچاتا ہے۔ معدہ اور اعصابی نظام میں بھی خلل کا سبب بنتا ہے(۱)۔

(۲) حدّثنا عليّ بن خشرم أنا عيسىٰ بن يونس عن رشدين بن كريب عن أبيه عن ابن عبّاس أنّ النّبيّ ﷺ اذا شرب تنفّس مرتين(۲).

ترجمہ: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب پانی پیتے تھے۔ تو (درمیان میں) دو دفعہ سانس لیتے تھے۔

اس حدیث میں دو مرتبہ سانس لینے کا ذکر ہے۔ گزشتہ حدیث سے توافق گزر چکا ہے۔

---

(۱) بلکہ اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی موجود ہے **وقد روى البيهقي وغيره اذا شرب احدكم فليمص الماء مصّا ولا يعبه عبا فانه يورث الكباد** (کباد جگر کی بیماری کو کہتے ہیں) ۱۳ بیجوری ص ۱۰۴ (مختار)

(۲) جامع ترمذی ۲/ ۴۵۱ كتاب الأشربة باب ماذكر في الشرب بنفسين، ابن ماجة ۲۴۴ كتاب الأشربة باب الشرب بثلاثة أنفاس (مختار)

(۷) حدّثنا إبن أبی عمر ثنا سفیٰن عن یزید بن یزید بن جابر عن عبدالرحمٰن بن أبی عمرة عن جدته کبشة قالت دخل علیّ رسول اللّٰہﷺ فشرب من فی قربة معلقة قائما فقمت إلیٰ فیها فقطعته(۱).

ترجمہ: حضرت کبشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریمﷺ میرے ہاں تشریف لائے تو آپ نے ایک لٹکے ہوئے مشکیزے کے منہ سے کھڑے ہوکر پانی پیا۔ میں اٹھی اور مشکیزے کے منہ کو کاٹ لیا۔ (تاکہ محفوظ رہے)

کبشة علامہ مناویؒ کہتے ہیں کہ یہ حضرت ابوقتادہؓ کی بہو کبشۃ بنت کعب بن مالک ہیں۔ جن سے بلی کے جھوٹے کی طہارت والی حدیث مروی ہے۔ لیکن اکثر شراح نے یہاں مذکور کبشہ کو کبشہ بنت ثابت بن المنذرؓ پر محمول کیا ہے۔ جو صحابیہ ہیں اور شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابتؓ کی ہمشیرہ ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ نے اس کا ایک لقب برصاء بھی ذکر کیا ہے۔ نیز اسے کبیشۃ (تصغیر کے ساتھ) بھی کہا جاتا ہے۔

من قربة معلقة پانی سے بھرے مشک کو عام طور پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک تو اس پر ہوا لگتی ہے جس سے اس کا پانی ٹھنڈا رہتا ہے۔

دوسری یہ کہ چیونٹیوں اور دیگر حشرات سے بھی ایک حد تک محفوظ ہوجاتا ہے بہرحال آپﷺ نے اوپر لٹکے ہوئے مشک سے کھڑے ہوکر پانی پیا۔ چونکہ یہ مجبوری کی حالت تھی یعنی مشکیزہ اتارنا مشکل تھا۔ اس لیے آپﷺ نے کھڑے ہوکر پانی پیا۔ اور ضرورت کے وقت اس طرح کھڑے ہوکر پینے کی اجازت ہے۔ جبکہ یہ احتمال بھی ہے کہ آپﷺ نے بیان جواز کے لیے ایسا کیا ہو۔ کما سبق

فقطعته یعنی مشکیزہ کے منہ کا وہ حصہ جہاں آپﷺ کا مبارک منہ لگا تھا۔ تبرک اور استشفاء کی خاطر کاٹ لیا تاکہ ضائع ہونے سے محفوظ رہے۔ یا پھر ادباً کاٹ لیا ہوگا۔ یعنی چونکہ دوسروں کے منہ لگنے کا

(۱) جامع ترمذی ۲/ ۴۵۱ کتاب الأشربة باب ماجاء فی الرخصه سنن ابن ماجة ص ۲۴۴ کتاب الأشربة باب الشرب قائماً شرح السنة للبغوی ۱۱/ ۴۷۸ کتاب الأشربة(مختار)

احتمال تھا جس سے سوءادب کا شائبہ(۱) تھا۔لہٰذا کاٹ لیا اوروں کے منہ اس قابل کہاں ؎

ہزار بار بشویم دہن بمشک وگلاب — ہنوز نام تو گفتن کمال بےادبی ست

(۸) حدثنا محمّد بن بشار ثنا عبدالرحمٰن بن مهدی ثنا عزرة بن ثابت الأنصاری عن ثمامة بن عبداللّٰه قال كان أنس بن مالک يتنفس فی الاناء ثلاثا وزعم انس أنّ النبیّ ﷺ كان يتنفس فی الا ناء ثلثا(۲).

ترجمہ: ثمامہ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ برتن سے پانی پیتے ہوئے تین مرتبہ سانس لیتے تھے۔اور کہتے تھے کہ نبی کریمﷺ برتن سے پانی پیتے ہوئے تین مرتبہ سانس لیتے تھے۔

وزعم انس یہاں زعم قال کے معنی میں ہے جو احادیث میں کئی جگہ مستعمل ہے۔حدیث کے بقیہ حصوں کی تشریح گزشتہ احادیث کی تشریح کی ضمن میں ہو چکی ہے۔

(۹) حدثنا عبداللّٰه بن عبدالرحمٰن انا أبو عاصم عن ابن جريج عن عبدالكريم عن البراء إبن زيد ابن ابنة أنس بن مالک عن أنس بن مالک أنّ النبیّ ﷺ دخل على امّ سليم و قربة معلقة فشرب من فم القربة وهو قائم فقامت امّ سليم إلى رأس القربة فقطعتها(۳).

(۱) دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپؓ نے تبرک کیلئے اس حصہ کو کاٹ لیا جہاں آنحضرتﷺ کا دھن مبارک لگا تھا قال البيجوریؒ قوله فقطعته أی لصيانة عن الابتذال بشرب كل احدمنه وللتبرک وللاستشفاء به فقطعها فم الربة للوجهين المذكورين كماقال النووی فی شرح مسلم(المواهب اللدنية ص۱۳۵)

(۲)صحيح بخاری ۸۲۰/۲ كتاب الأشربة باب الشرب بنفسين اوثلاثة، صحيح مسلم ۱۷۴/۲ كتاب الأشربة باب كراهية التنفس فی نفس الاناء الخ، جامع ترمذی ۱۰/۲ كتاب الأشربة باب ماجاء التنفس فی الإناء، ابن ماجة كتابا الشربة(مختار)

(۳)شرح السنة للبغوی ۳۷۹/۱۱كتاب الأشربة، ابوداؤد طياسی، رقم حديث ۱۶۵۰،سنن دارمی ۱۲۰/۲ (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ (میری والدہ) ام سلیمؓ کے ہاں تشریف لائے۔ وہاں ایک مشکیزہ لٹکا ہوا تھا۔ آپﷺ نے کھڑے کھڑے اس مشکیزے کے منہ سے پانی کونوش فرمایا۔ ام سلیمؓ مشکیزے کے منہ کو کاٹنے کیلئے اٹھیں اوراسے کتر کر (محفوظ) رکھ لیا۔

ام سلیمؓ: ام سلیم بنت ملحان بن خالد انصاریہ حضرت انسؓ کی والدہ ہیں۔ ان کا نام سہلہ، رمیلہ، رمیثہ یا کچھ اور تھا۔ مالک بن نضر سے جاہلیت میں نکاح کی۔ اور حضرت انسؓ کی ولادت ہوئی۔ پھر خاوند کی اجازت کے بغیر ایمان لائیں۔ جس کی وجہ سے مالک ناراض ہوکر شام چلا گیا۔ اور وہیں اس کی موت واقع ہوگئی۔ اس کے بعد جب ابوطلحہؓ نے آپؓ سے نکاح کی خواہش ظاہر کی تو آپؓ نے کہا کہ میں تم سے مہر بھی نہیں لوں گی۔ لیکن تجھے نکاح سے پہلے مسلمان ہونا پڑے گا۔ وہ راضی ہو گئے تو ان کے اسلام کے بعد ان سے نکاح کرلیا۔ وہ ایک باحوصلہ اور نیک خاتون تھی۔ نبی کریمﷺ آپؓ پر بہت مہربان تھے بکثرت ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ اور آپؓ بھی کچھ نہ کچھ تیار کرکے ان کا اکرام کرتی تھیں۔ کئی غزوات میں شرکت کی۔ عموماً غزوات میں آپؓ اپنے ایک خنجر سے مسلح رہتی تھی۔

ابن ابنة انس یہ براء کی دوسری صفت ہے یعنی براء زید کے بیٹے اور حضرت انسؓ کے نواسے تھے۔

مـن فم القربة اس حدیث اور گزشتہ ایک حدیث میں مشکیزے کے منہ سے پانی پینے کا ذکر ہے۔ اس پر یہ اشکال ہے کہ احادیث میں مشکیزے کے منہ سے منہ لگا کر پینے کی ممانعت آئی ہے(۱)۔ تو آپﷺ نے عملاً مخالفت کیوں کی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عمل فی نفسہٖ خلاف اولیٰ ہے۔ مطلقاً ممنوع بھی نہیں ہے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ آپﷺ نے بیان جواز کے لیے ایسا کیا ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں پر مجبوری کی وجہ سے آپﷺ نے یہ عمل کیا ہو۔ کیونکہ مشک کو اتارنا مشکل ہوتا ہے۔ اور چھوٹا برتن اس وقت موجود نہ ہوگا۔

نیز یہ احتمال ہے کہ نہی دوسروں کے لیے ہو خود نبی کریمﷺ اس سے مستثنیٰ ہوں۔ اور اس کی ایک معقول وجہ بھی ہے وہ یہ کہ دوسرے لوگوں کے جھوٹے سے لوگ نفرت کرتے ہیں۔ بالخصوص مشک کے منہ پر

(۱)نھیٰ النبیﷺ ان یشرب من فی السقاء(بخاری ج۲ ص ۸۴۱) (مختار)

منہ لگانے سے کبھی تعفن سا پیدا ہو جاتا ہے۔لیکن آپ ﷺ کی بات اور ہے آپ ﷺ کے جھوٹے پر تو لوگ مرتے تھے۔طبعی کراہت،اور تقذر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔لوگ آپ ﷺ کے جھوٹے کو سعادت سمجھتے تھے،محبت سے پیتے تھے،آپ ﷺ کے خون کو چاٹا گیا ہے،وضوء کا پانی پیا جاچکا ہے، بلکہ آپ ﷺ کے بول کو بھی پیا گیا ہے(۱)۔تو دوسروں کے جھوٹے کو نبی کریم ﷺ کے جھوٹے پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ نیز اس مقام پر نہی کے دوسرے وجوہ سے بھی کوئی وجہ موجود نہیں تھی۔لہٰذا آپ ﷺ نے مشک سے پانی پیا۔

(۱۰) حدّثنا أحمد بن النصر النیسابوری ثناإسحاق بن محمّد الفروی حدثتنا عبیدة بنت نائل عن عائشة بنت سعد بن أبی وقّاص عن أبیھا أنّ النبیّ ﷺ کان یشرب قائما و قال ابو عیسٰی وقال بعضھم عبیدة بنت نابل(۲).

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (کبھی کبھی) کھڑے ہو کر پانی پی لیا کرتے تھے۔

<u>سعد بن ابی وقاص ؓ</u>: ان کا نام سعد بن مالک ؓ بن اصیب یا وھیب الزہری تھا۔ابو اسحٰق کنیت تھی۔قدیم الاسلامی صحابی اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔اور ان میں وفات پانے والے آخری صحابی تھے۔عرب کے چوٹی کے شہسواروں اور تیر اندازوں میں آپ ؓ کا شمار ہوتا تھا۔اس لیے آپ کو''فارس الاسلام'' بھی کہا جاتا ہے۔عراق کی فتح میں سب سے آگے تھے۔عمر ؓ کے زمانہ میں کوفہ کے امیر بھی رہے بلکہ آپ ؓ ہی دراصل کوفہ کے بانی تھے۔پھر حضرت عثمان ؓ کے زمانے میں دوبارہ کوفہ کے امیر مقرر ہوئے۔نبی کریم ﷺ نے آپ ؓ کے مستجاب الدعوات ہونے کے لیے دعا کی تھی۔اس لیے آپ ؓ کی کوئی دعا رد نہیں ہوتی تھی۔عمر ستر (۷۰) سے تجاوز کر گئی تھی۔اور مشہور قول کے مطابق <u>۵۶ھ</u> میں وفات پائی۔اگرچہ تاریخ وفات میں دیگر اقوال بھی ہیں۔

---

(۱)اقول شربته برکة الحبشیة خادمة ام المؤمنین امّ حبیبة بنت أبی سفیان کما ذکره ابن حجرؒ فی الاصابة ج۴ ص ۲۴۹ (اصلاح الدین)

(۲)شرح المعانی الاثار ۲/۳۲۲باب الشرب قائماً،المعجم الکبیر للطبرانی ۱/۱۴۷ (مختار)

اسلام میں سب سے پہلا تیر آپؓ کے کمان سے نکلا۔ایسے ہی موقع پر آپؓ کو نبی اکرم ﷺ نے ''فداک ابی و امّی'' کے امتیازی خطاب سے نوازا تھا۔زہری قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ آپؓ کو ماموں کہا کرتے تھے۔بلکہ آپ کے ماموں ہونے پر فخر کرتے تھے۔دین کے معاملہ میں متصلب اور سخت گیر صحابہؓ میں شمار ہوتے تھے۔صحابہ کے درمیان مشاجرات میں مکمل طور پر غیر جانبدار رہے۔آپؓ کے مناقب کیلئے مکمل کتاب ہی کافی ہوسکتی ہے۔

کان یشرب قائما یعنی کبھی کبھی ضرورت کی بنا پر یہ بیان جواز کیلئے کھڑے کھڑے پی لیتے تھے۔ عموماً بیٹھ کر پانی پیا کرتے تھے۔لہٰذا ابوداؤد کی روایت ''**نهی عن الشرب قائما**''(۱) نیز مسلم شریف کی روایت ''**وزجر عن الشرب قائما**''(۲) اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ''**لا یشربّن احد منکم قائما فمن نسی فلیستقی**''(۳) اور ترمذی کی روایت کہ ''**انّ النبی ﷺ نهی عن الشرب قائما**''(۴) ہی اصل حکم ہے۔اور گویا کھڑے ہوکر پینا صرف اباحت کے درجہ میں بوقت ضرورت ثابت ہے(۵)۔

قال ابو عیسیٰ الخ امام ترمذیؒ عائشہ بنت سعدؓ کی شاگرد عبیدۃ کے والد میں محدثین کا اختلاف بیان کرتے ہیں کہ مشہور تو نائل ہمزہ کے ساتھ ہے۔لیکن بعض محدثین نے اسے نابل باء کے ساتھ بھی بتایا ہے۔

---

(۱)ابوو داؤد کتاب الاشربه باب فی الشرب قائما. و مسلم ج ۲ ص ۱۷۳ کتاب الاشربة

(۲)مسلم ج۲ ص ۱۷۳ باب فی الشرب قائما

(۳)ایضاً

(۴)جامع ترمذی ۲/ ۱۰ باب فی النهی عن الشرب قائماً

(۵)ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے ای نادراً لبیان الجواز او حمل النهی عنه علی التنزیة اولضرورة او مخصوصیة (جمع الوسائل ۱/ ۳۰۸) اور کھڑے ہوکر پانی پینے کے مضرات علامہ مناویؒ نے حافظ ابن قیمؒ کے حوالہ سے لکھا ہے وللشرب قائماً آفات منها انّه لایحصل به الری التام فی المعدة حتی یقسمه الکبد علی الاعضاء ویلاقی المعدة فربّما یردحرارتها ویسرع النفوذ الی اسافل البدن بغیر تدریج فیضرّضرراً بیناً (المناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/ ۳۰۷)(مختار)

خلاصۂ باب

اس باب میں پانی پینے کے کچھ آداب کا بیان ہے۔ مثلاً اول یہ کہ عموماً بیٹھ کر پانی پیا جائے۔ البتہ کچھ شرعی یا طبی مصلحتوں یا مجبوریوں کی بناء پر بعض اوقات کھڑے کھڑے پینے میں کوئی حرج نہیں۔ دوم یہ کہ پانی تین سانسوں سے پینا مستحب ہے۔ یا کم از کم دو سانسوں سے پینا چاہیے۔ ایک سانس میں پانی پینا شرعی اور طبی مصالح کے منافی ہے۔ سوم یہ کہ بڑے مشکیزے اور اس جیسے برتنوں کے منہ سے کبھی کبھی مجبوری کے تحت تو پانی پیا جا سکتا ہے۔ لیکن حتی الوسع اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

علاوہ ازیں پینے سے قبل بسم اللہ پڑھنا اور آخر میں الحمد للہ پڑھنا وہ آداب ہیں جو گزشتہ ابواب سے ثابت ہیں۔ بلکہ بعض روایات میں ہر سانس سے قبل بسم اللہ اور اس کے بعد حمد کا ذکر آیا ہے۔

۳۳. باب ما جاء فی تعطّر رسول اللّٰہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کی خوشبو استعمال کرنے کا بیان

تعطّر(۱) عطر سے ہے۔ **تعطّر الرجل** کے معنی ہیں اس آدمی نے خوشبو استعمال کی۔ نبی کریم ﷺ کا بدن مبارک خود بھی معطّر تھا۔ پھر بھی آپ ﷺ خوشبو لگانا بہت پسند کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ **حبّب الیّ من الدنیا النساء والطیب وجعلت قرۃ عینی فی الصلوۃ**(۲)

ترجمہ: مجھے دنیا میں عورتوں اور خوشبو سے محبت ہے۔ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

مذکورہ تین چیزوں میں خوشبو کا بھی بطور خاص ذکر ہے۔ نبی کریم ﷺ کو خوشبو، صفائی، پاکیزگی، نظافت اور نفاست سے شغف تھا۔ یہی امور فطرت سلیمہ کی ترجمان ہیں۔ اسی لیے اسلام میں مطلوب ہیں۔ اور کئی مواقع پر ان کا حکم دیا گیا ہے۔

<u>حضور اقدس ﷺ کی ذاتی جسمانی خوشبو:</u> خود نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا معطّر جسم بخشا تھا کہ جس راستے پر سے آپ ﷺ گزرتے صحابہؓ سمجھ لیتے تھے کہ آپ ﷺ یہاں سے گزرے ہیں۔ سارے راستے میں ایک مہک اور خوشبو پھیلی ہوتی تھی جو دیگر خوشبوؤں سے ممتاز ہوتی تھی۔ کئی روایات میں نبی کریم ﷺ کے پسینے کی خوشبو کا بھی ذکر ہے۔ شمائل ہی میں حضرت انسؓ کی حدیث گزری ہیں۔ فرماتے ہیں کہ **ولا شممت مسکا و لا عطراً اطیب من عرق رسول اللّٰہ ﷺ**(۳)۔

ترجمہ: میں نے نبی کریم ﷺ کے پسینے سے زیادہ خوشبودار مشک سونگھی ہے نہ عطر۔

---

(۱)**التعطر استعمال العطر کما أنّ التطیب استعمال الطیب(جمع الوسائل ۲/۲)** عطر بکسر العین خوشبو کو کہا جاتا ہے۔ عرب زیادہ خوشبو لگانے والے شخص کو رجل معطر کہا کرتے ہیں (جمع الوسائل ۲/۲) تو گویا باب کا مطلب ہے **باب بیان الاحادیث الواردہ فی تعطر رسول اللّٰہ ﷺ(المواھب اللدنیہ ص۳۷)(مختار)**

(۲)نسائی ج۲ ص ۹۴ باب حب النساء (مختار)

(۳) ملا علی قاریؒ نے حضرت انسؓ کی روایت کے الفاظ یوں نقل کئے ہیں **ماشممت ریحاً قط و لامسکاً و لاعنبراً اطیب من ریح رسول اللّٰہ ﷺ(جمع الوسائل ۲/۲)(مختار)**

ان کی والدہ ام سلیمؓ آپ ﷺ کے پسینہ سوتے میں جمع کرتی تھیں اوراسے دوسرے تیلوں سے ملاتی تھیں۔اس جیسا خوشبودار تیل کبھی نہیں ملتا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے استفسار پر آپؓ کہتی تھیں۔

هذا عرقک نجعله فی طیبنا و هو من اطیب الطیب(۱)

بایں ہمہ آپ ﷺ خوشبو کا التزام بھی فرماتے تھے تاکہ مہک دوبالا ہوجائے۔ نیز امت کو یہ تعلیم بھی دیتے رہے کہ خوشبو کا استعمال سنت ہے۔

(۱) حدّثنا محمّد بن رافع وغیر واحد قالوا انا ابو احمد الزبیری ثنا شیبان عن عبداللّٰہ بن المختار عن موسیٰ بن انس بن مالک عن أبیه قال کان لرسول اللّٰہ ﷺ سکة یتطیب منها(۲).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک سکّہ تھا جس میں سے آپ ﷺ خوشبو لگاتے تھے۔

سکّة یتطیبّ منها(۳) سکّہ ایک خاص قسم کی سیاہ خوشبو ہے یہ ایک ٹھوس مرکب عطر ہے جس میں مشک ملائی جاتی ہے۔ پھر اس کی گولیاں بنا کر دھاگے میں پرولیا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خوشبو میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جبکہ بعض شارحین علماء کا خیال ہے کہ سکّہ دراصل عطردان کو کہتے ہیں یعنی آپ ﷺ کے پاس عطر کی ایسی شیشی یا ڈبیا جیسی چیز تھی جس میں آپ ﷺ عطر رکھتے تھے۔ اور مختلف مواقع پر اسے استعمال فرماتے تھے۔ ان شرّاح نے ''مِنْ'' کے کلمہ سے استدلال کر کے یہ کہا ہے کہ مِنْ ابتدائیہ ہے۔ اگر سکّہ کوئی خوشبو ہوتی تو پھر یتطیب بها کہنا چاہیے تھا۔ لیکن اول الذکر شارحین کہتے ہیں کہ مِنْ تبعیضیّه ہے۔ یعنی ''یتطیّب ببعضها''

---

(۱) صحیح مسلم ج۲ ص ۲۵۷ باب طیب عرقه صلی الله علیه وسلم والتبرک به (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۲/۲۲۰ کتاب الترجل باب ماجاء فی استحباب الطیب، شرح السنة للبغوی ۱۲/۸۵ کتاب اللباس باب التطیب (مختار)

(۳) یہ جملہ ترکیب کے اعتبار سے یا تو حال ہے اور یا استیناف بیان کیلئے ہے۔ (مختار)

(۲) حدّثنا محمّد بن بشار ثنا عبدالرحمان بن مهدی ثنا عزرة بن ثابت عن ثمامة بن عبداللّٰه قال کان انس بن مالک لایرُدّ الطیب وقال انس أنّ النبیّ ﷺ کان لا یردّ الطیب(۱).

خوشبورد نہ کریں:

ترجمہ: ثمامہؒ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ خوشبو کورد نہیں کرتے تھے اور حضرت انسؓ نے یہ بھی فرمایا کہ نبی کریم ﷺ بھی خوشبو کو رد نہیں فرماتے تھے۔

لا یردّ الطیب الخ حضرت انسؓ خوشبو واپس نہیں فرماتے تھے (۲) محبت سے قبول فرماتے تھے کیونکہ حضرت انسؓ کے بقول نبی کریم ﷺ خوشبو کو رد نہیں فرماتے تھے۔ ابوداؤد شریف کی ایک حدیث میں ہے ”**من عرض علیه طیب فلا یرده فانه طیب الریح خفیف المحمل**

(۳) حدثنا قتیبة بن سعید ثنا ابن ابی فدیک عن عبداللّٰه بن مسلم بن جندب عن ابیه عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰه ﷺ ثلث لا تردّ الوسائد والدهن والطیب واللبن.

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تین ہدایا لوٹانے کی نہیں۔ تکیہ، تیل اور خوشبو۔

الوسائد والدهن والطیب جن تین چیزوں کا اس مقام پر ذکر ہے ان کو واپس نہیں کرنا چاہیے۔ ان میں سے ایک وسادہ یعنی تکیہ ہے جب کوئی شخص محبت کے طور پر اسے پیش کر دے تو لیکر اس

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۳۵۳ کتاب الهبة باب لایرد من الهدیة، جامع ترمذی ۲/۵۶۷ کتاب الادب باب ماجاء فی کراهیة ردالطیب، سنن النسائی ۲/۲۹۳ کتاب الزینة باب الطیب (مختار)

(۲) شمائل کے بعض نسخوں میں الوسائد والدهن والطیب کا ذکر ہے۔ اللبن کا نہیں اور بعض نسخوں میں اللبن کا ذکر ہے الطیب کا نہیں۔ اس روایت میں اگرچہ بظاہر چار چیزیں ذکر ہیں تو ہوسکتا دھن اور طیب ایک ہو۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے ولعل المراد بالدهن هو الذی له طیب فعبّر تارة بالطیب واخری بالدهن (جمع الوسائل ۲/۴) علماء نے ان تین اشیاء کے رد نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کا ایک قاعدہ نکالا ہے۔ چونکہ یہ چیزیں هدیة دینے والے پر بار نہیں ہوتی اور بسا اوقات واپسی رنج والم کا سبب بنتا ہے۔ اس لئے اس کے حکم میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جو دینے والے پر بار نہ ہوتی ہوں تو گویا حقیر سے حقیر ہدیۃ کو بھی قبول کرنا چاہئے (مختار)

پر ٹیک لگا دو۔ دوسری چیز تیل اور تیسری خوشبو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عطر، پھول وغیرہ کوئی پیش کردے تو اسے قبول کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان چیزوں میں ہدیہ دینے والے پر بوجھ اور مشقت بھی کم ہے۔ مفرح اور آرام دہ ہیں۔ اور قبول کرنے میں مہدی کی خاطر داری بھی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہدیہ دینے والے کی تطییب قلب کی غرض سے ان کو قبول کرنا چاہیے۔ واپس کرنا مناسب نہیں ہے۔

یہ حدیث میں نے بچپن میں سنی تھی حضرت شیخ الحدیث والد محترمؒ کے ساتھ میں لاہور گیا تھا۔ جامعہ اشرفیہ کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ کے پاس ہم گئے جو حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ ان کا ایک پاؤں کٹ چکا تھا۔ بڑے ولی اللہ اور بزرگ شخصیت تھی۔ ان کو بھی حضرت شیخ الحدیثؒ سے محبت تھی۔ کبھی کبھی سالانہ جلسوں میں بلایا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم ان کی خدمت میں نیلا گنبد میں اوپر کی منزل میں گئے۔ وہاں بڑے بزرگ لوگ اور صاحبِ حیثیت حضرات ملاقات کو آتے جاتے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے حضرت الشیخ کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھایا۔ اور محبت کے ساتھ کئی بار تکیہ ان کو پیش فرمایا۔ حضرت الشیخ ادباً اور تواضعاً واپس ان کی طرف رکھ لیتے تھے۔ بالآخر مفتی صاحبؒ نے جلال کے انداز میں فرمایا ''مولوی صاحب وہ حدیث یاد نہیں **ثلٰث لا تردّ الخ**'' اس کے بعد حضرۃ الشیخ نے اسے قبول کرلیا۔ اس حدیث میں تکیہ، تیل اور خوشبو کا ذکر ہے۔ تیل بھی خوشبو کے ضمن میں آجاتا ہے۔ اسی لیے تو احرام میں تیل لگانا جائز نہیں ہے۔ جبکہ بعض نسخوں میں **لبن** ''دودھ'' کا ذکر ہے کہ اسے بھی واپس کرنا جائز نہیں ہے(۱)۔

(۴) حدّثنا محمود بن غیلان ثنا ابوداؤد الحفریّ عن سفیان عن الجریری عن ابی نضرۃ عن رجل عن ابی ھریرۃ قال قال

(۱) چنانچہ مصنفؒ نے اس حدیث کو جامع ترمذی میں لایا ہے۔ وہاں الفاظ یہ ہیں **ثلاث لاترد الوسائد والدھن واللبن(ترمذی ج۲ ص ۱۰۲ باب ماجاء فی کراھیۃ ردالطیب)** اور ظاہر ہے کہ وہاں دہن سے مراد تمام خوشبوئیں ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے ایسی سات چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کا پیش ہونے کے بعد رد کرنا مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے دو شعروں میں ان اشیاء کو جمع کیا ہے اور اسے قبول کرنا سنت کہا ہے۔

عن المصطفی سبع یسن قبولھا — اذامابھاقد أتحف المرء خلان

فحلوٌ والبانٌ ودھنٌ وِسادۃٌ — ورزقٌ لمحتاجٍ وطیبٌ وریحانٌ(مختار)

رسول اللّٰہ ﷺ طیب الرجال ما ظهر ریحه و خفی لونه وطیب النساء ما ظهر لونه وخفی ریحه.

حدّثنا علیّ بن حجر ثنا اسماعیل بن ابراهیم عن الجریری عن ابی نضرة عن الطفاویّ عن أبی هریرة عن النبیّ ﷺ مثله بمعناه(۱).

مردانہ اورزنانہ خوشبو میں فرق:

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مردانہ خوشبووہ ہے جس میں خوشبو غالب ہواور رنگ پھیکا ہو۔اورزنانہ خوشبووہ ہے جس میں رنگ غالب اور خوشبو کم ہو۔

عن رجل اس راوی کی تحقیق آگے آرہی ہے۔**طیب الرجال** اس حدیث میں اس ارشاد کا ذکر ہے کہ مردوں کے استعمال میں آنے والی خوشبو ایسی ہو جس کی خوشبو تیز ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی بو سے مستفید ہوسکیں۔وجہ یہ ہے کہ مرد کے لیے جمعوں،عیدوں اور دیگر مجامع میں حاضر ہونا پڑتا ہے ۔لہٰذا اس کے لیے مہکدار خوشبو استعمال کرنی چاہیے۔جیسے مشک،عنبر،کافوراورعرق گلاب وغیرہ لیکن چونکہ اس کیلئے رنگ دار خوشبو اور خوش رنگ اشیاء سے تزین ممنوع ہے۔اس لیے خوشبو کا رنگ مدھم ہونا چاہیے۔

اس کے برعکس عورتوں کی طیب مدھم خوشبو والی ہو۔جس کا رنگ تیز ہو کیونکہ وہ تزیّن کے طور پر طیب (خوشبو) کا استعمال صرف اپنے خاوند کے لیے کرتی ہے۔لہٰذا ایسی خوشبو استعمال کرے جو خاوند کی نظر کو بھائے اور اسی تک منحصر رہے۔تیز بو والی خوشبو اس لیے استعمال نہ کرے تاکہ باہر نکلتے وقت راستے پر سے گزرنے والے غیر مردوں کو متوجہ کر کے فتنے اور شہوانی وساوس کا سبب نہ بنے۔

البتہ رنگ تیز اور بھڑ کیلا ہو مثلاً زعفران اور صندل یا مہندی تو ایسی کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔کیونکہ باہر نکلے گی تو وہ پردے میں نکلے گی۔اور گھر کے اندر اس کا فائدہ خاوند کو پہنچے گا۔البتہ اگر عورت گھر کے اندر

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۳۰۲کتاب النکاح باب ماجاء یکره من ذکر الرجل الخ، جامع ترمذی۲/۵۶۷ کتاب الأدب باب ماجاء فی طیب الرجال والنساء، سنن النسائی ۲/۲۸۱ کتاب الزینة باب الفصل بین طیب الرجال وطیب النساء (مختار)

ہی رہے اور صرف اپنے خاوند کی خاطر تیز خوشبودار چیز استعمال کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

حدثنا علی بن حجر الخ یہاں سے اوپر کی حدیث کے لیے ایک اور سند ذکر کر رہے ہیں۔ اوپر کی سند میں ابو ہریرہؓ سے روایت کرنے والے شخص کو رجل کہا تھا۔ یہاں پر ''طفاوی'' سے تعبیر کر رہے ہیں لیکن پھر بھی یہ رجل مجہول ہی ہے۔ نام وغیرہ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

بایں ہمہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے جس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ یہ آدمی تابعی ہے اور تابعین میں اتنی سی مجہولیت قابل برداشت ہے۔ حدیث کے لیے مضر نہیں ہے۔

(۵) حدّثنا محمّد بن خلیفة و عمر وبن علیّ قال ثنا یزید بن زریع ثنا حجّاج الصوّاف عن حنّان عن أبی عثمان النھدی قال قال رسول اللّٰہ ﷺ اذا اعطی احدکم الریحان فلا یردّہ فانّہ خرج من الجنة (۱).

ترجمہ: حضرت ابوعثمانؓ النہدیؒ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو گل ریحان دیا جائے۔ تو اسے واپس نہ کرے کیونکہ یہ جنت سے نکلا ہے۔

<u>ابو عثمان النھدی:</u> ان کا نام عبدالرحمٰن بن مل ہے۔ کنیت سے مشہور ہیں۔ بنو قضاء کی ایک شاخ نہد کی طرف منسوب ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی حیات ہی میں مسلمان ہو چکے تھے لیکن شرف ملاقات حاصل نہ ہو سکی۔ ۹۵ھ میں وفات پائی۔ ایک سوتیس برس یا اس سے بھی زیادہ عمر پائی تھی۔ لہٰذا یہ حدیث مرسل ہے کیونکہ صحابی محذوف ہیں۔ **اذا اوتی احدکم الریحان الخ** ریحان پودوں کے اس گروپ کا نام ہے جس کے پھول، پتے، ٹہنیاں اور تخم سب خوشبودار ہوں۔ یہاں پر ذکر ریحان کے پھول کا ہے۔ لیکن ہر قسم کا خوشبودار پھول مراد ہوسکتا ہے۔ گلاب، چمبیلی وغیرہ جو بھی پھول کوئی پیش کرے۔ **فلا یردہ** پس اسے نہیں ٹھکرانا چاہیے۔ یہ نہی کا صیغہ ہے کیونکہ ایسی چیز کے ٹھکرانے سے آدمی کا لالچی ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ گویا اپنے عمل سے وہ ہدیہ دینے والے پر یہ واضح کرنا چاہتا ہے۔ کہ یہ بھی کوئی ہدیہ ہے جو تم پیش کر رہے ہو۔ کوئی اہم چیز ہو تو قبول کروں۔ صرف پھول پیش کر کے نہ بہلاؤ۔ اس طرح ہدیہ دینے

---

(۱)سنن ابی داؤد کتاب المراسیل باب ماجاء فی الریحان، جامع ترمذی ۲/۵۶۷ کتاب الأدب باب ماجاء فی کراھیة ردّ الطیب ، شرح السنة للبغوی ۱۲/۸۷باب التطیب کتاب اللباس(مختار)

والے کا بھی دل ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ پتہ نہیں اس نے کتنی چاہت کے ساتھ پھول لائے ہونگے۔اور یہاں پر اس کا تحفہ ٹھکرادیا گیا ہے۔

نعمتوں اور خوشبوؤں کا سرچشمہ جنت: فانه خرج من الجنة یہ دوسری اور اصل وجہ ہے ٹھکرانے کی عدم مناسبت کی۔یعنی یہ پھول جنت سے نکلا ہے۔منزل مقصود کی نشانی اور دار حبیب کی علامت ہے۔ لہٰذا سر آنکھوں پر رکھ کر قبول کرنا چاہیے۔صرف پھول نہیں بلکہ رنگ و بو، طعام ولباس اور مناکحۃ وغیرہ کی دنیا میں جتنی بھی خوبصورت نعمتیں پائی جاتی ہیں۔سب کا سرچشمہ جنت ہی ہے۔یہ نعمتیں جنت میں اضافوں کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہونگیں (۱)۔

باقی رہی یہ بات کہ یہ جنت سے کیسی نکلی ہے تو اس کی صحیح کیفیت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ہمارے لیے اس پر ایمان لانا ہی کافی ہے۔

قال ابوعیسی الخ علامہ عبدالرحمان بن ابی حاتم کی مشہور کتاب جس کا نام ''الجرح والتعدیل '' ہے میں لکھا ہے کہ حنان اسدیؒ مسددؒ کے باپ کے چچا ہیں۔جو کہ ابوعثمان النہدیؒ کے شاگرد ہیں۔سمعت ابی یقول ذالک۔یعنی علامہ عبدالرحمٰنؒ کہتے ہیں کہ حنان اسدی کا مذکورہ تعارف میں نے اپنے والد ابوحاتمؒ سے زبانی سنا تھا۔

(۲) حدّثنا عمر بن اسماعیل بن مجالد بن سعید الهمدانّی ثنا ابی عن بیان عن قیس بن أبی حازم عن جریر بن عبداللّٰه قال عرضت بین یدی عمر بن الخطاب فالقیٰ جریر رداءه و مشیٰ فی ازار فقال له خذردائک فقال عمر للقوم ما رأیت رجلا احسن صورة من جریر الاما بلغنا من صورة یوسف علیه السلام(۲).

---

(۱)قال البیجوریؒ وانما خلق اللّٰه الطیب فی الدنیا لیذکر به العباد طیب الجنة و یرغبون فیها بزیادہ الاعمال الصالحة والحاصل ان طیب الدنیا نموذج من طیب الجنة والا فطیبهایوجدریحه من مسیرة خمس مأة عام کما فی الحدیث ۲ ۱ المواهب اللّدنیة ص ۵۸ ۱ (اصلاح الدین)

(۲)تفردالامام الترمذی بهذاالحدیث

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں (معائنہ) کے لیے پیش ہوا۔ جریرؓ نے (اس موقع پر) اپنی چادر اتاردی اور (صرف) لنگوٹھی میں چلنے لگے (معائنہ کے بعد) حضرت عمرؓ نے اسے حکم دیا کہ اپنی چادر (پہننے کے لیے) لے لو۔ پھر حضرت عمرؓ نے حاضرین سے فرمایا کہ میں نے جریرؓ سے زیادہ خوبصورت آدمی نہیں دیکھا ہے سوائے حضرت یوسفؑ کی صورت کے۔ جیسا کہ ہم تک (ان کے حسن کی بات) پہنچی ہے۔

<u>جریر بن عبداللہ</u>: جریر بن عبداللہ بن جابرؓ بجیلہ قبیلہ کے مشہور صحابی ہیں۔ بجیلہ ایک عورت کا نام تھا جس کے نام سے یہ قبیلہ منسوب ہے۔ علامہ ابن عبدالبرؒ نے حضرت جریرؓ کی روایت کے مطابق بیان کیا ہے کہ آپؓ نے نبی کریم ﷺ کی وفات سے صرف چالیس دن قبل اسلام قبول کیا تھا لیکن ابن حجرؒ اسے تسلیم کرنے سے کتراتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ صحیحین میں آپؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر مجھے حکم دیا ''استنصیت الناس'' یعنی لوگوں کو خاموش کردو۔ واقدیؒ کہتے ہیں کہ آپؓ رمضان ۱۰ھ میں اسلام لانے کی غرض سے مدینہ منورہ تشریف لائے تھے۔ بلکہ علامہ ابن حجرؒ نے بعض شواہد کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ آپؓ ۱۰ھ سے بھی پہلے اسلام لائے تھے۔ علامہ ابن عبدالبرؒ کے قول کی توجیہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ آپؓ نے وفات نبوی ﷺ سے چالیس دن قبل اسلام کی تجدید کی ہو۔ آپؓ کے حاضر ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ نے آپؓ کی بہت تکریم کی تھی بلکہ فرمایا ''اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ''

آپؓ انتہائی حسین اور لمبے قد کے آدمی تھے۔ کہتے ہیں کہ آپؓ کا قد چھ ذراع یعنی تین گز تھا۔ اونٹ کے کوہان کو کھڑے ہو کر چھو لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ انتہائی حسن کی وجہ سے آپؓ کو ''یوسف ھذہ الامۃ'' کہتے تھے۔ جس کا کچھ بیان زیر نظر حدیث میں بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے آپؓ کے قدوم سے قبل ہی فرمایا تھا کہ تمہارے پاس ایک ایسا شخص آرہا ہے کہ ''کان علی وجھہ مسحۃ ملکٍ'' گویا فرشتے نے اس کے چہرے پر تحسین کا ہاتھ پھیرا ہے۔ امام ترمذیؒ نے باب ضحک النبی ﷺ میں آپؓ سے روایت کی ہے کہ ''ما حجبنی رسول اللّٰہ ﷺ منذ اسلمت و لا رأنی الا تبسّم''۔

حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں ان کی طرف سے امیر معاویہؓ کے ہاں سفارت کاری کا فریضہ بھی انجام دیا۔لیکن بعد میں دونوں سے علیحدگی اختیار کر کے غیر جانبدار رہے۔ پہلے کوفہ اور پھر قرقیساء میں مقیم رہے۔اور ۵۱ھ میں وفات پائی۔

حضرت عمرؓ کا فوجی معائنہ، پریڈ: عرضت بین یدی اس باب میں خوشبو کا بیان ہو رہا تھا۔اسی ضمن میں امام ترمذیؒ حضرت جریرؓ کے بارے میں ان ہی کی روایت سے یہ حدیث لائے ہیں۔اس مقام پر عرض کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح آج کل بھی انتظامیہ کے افسران یا فوجی جرنیل اپنے فوجی پلٹنوں کا معائنہ کرتے ہیں۔اور گارڈ آف آنر اور معائنہ کا رواج ہے۔کبھی بھرتی ہوتے وقت فوجیوں کا طبی ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔صحت، سینہ، بازو، ٹانگیں اور وزن وغیرہ دیکھے جاتے ہیں۔اسی طرح گزشتہ زمانوں میں بھی فوجیوں کو پرکھا جاتا تھا۔

ایسے اکثر امور کی باقاعدہ ابتداء حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ پولیس،فوج اور انتظامیہ کی باقاعدہ تجیل اور انتظام بھی آپؓ ہی کے زمانہ میں ہوئی۔جس طرح محاصل مالیہ اور زمین کی پیمائش بھی آپؓ ہی کے زمانہ سے رائج ہوئی تھی۔بہر حال فوجی انتخاب کے لیے آپؓ کے زمانہ میں باقاعدہ معائنہ ہونے لگا تھا۔اور اسی غرض سے سپاہیوں کے ضروری ستر سے زائد کپڑے اتروا دیئے جاتے تھے۔اور انہیں ٹہلنے کا حکم دے کر دیکھا جاتا کہ چاک وچوبند ہے یا نہیں۔نیز اس کی صحت کیسی ہے۔پھر اس کے بعد کس بڑی مہم کے لیے فوجیوں کا انتخاب ہوتا تھا۔

تو حضرت جریرؓ اس موقع پر اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب میں حضرت عمرؓ کے سامنے معائنہ کے لیے پیش ہوا تو میں نے اپنی چادر اتار دی اور صرف لنگوٹھی کے ساتھ میدان میں گزرنے لگا۔ معائنہ ختم ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ''خذ رداءک ''یعنی اپنی چادر لے کر پہن لو۔

فقال عمر للقوم الخ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے قوم سے تحسین کے انداز میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جریرؓ کو بہترین صحت وصورت سے نوازا ہے۔میں نے ایسا خوبصورت آدمی نہیں دیکھا تھا۔ہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ہمیں جو معلومات پہنچی ہیں ان کے اعتبار سے شاید یوسفؑ کا حسن اس سے زائد ہو۔

حضرت عمرؓ نے اس مقام پر اپنے مشاہدہ کی بات کی ہے کہ انہوں نے جتنے بھی مرد دیکھے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے شنیدہ حسن کے علاوہ تمام لوگوں کی نسبت حضرت جریرؓ کا حسن زیادہ ہے۔ لیکن اس کلام سے نبی کریم ﷺ کا استثناء خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ وہ تو بالاتفاق اجمل الخلق ہیں۔ اگرچہ بعض خاص صفات مثلاً صباحت میں حضرت یوسفؑ آپ ﷺ سے زیادہ ہوئے تو حضور اقدس ﷺ ملاحت میں بے مثال تھے۔ لیکن یہ جزوی فضیلت ہے۔ ویسے نبی کریم ﷺ کا حسن مُسلّمات میں سے ہے۔

__باب سے مناسبت:__ بظاہر اس حدیث کی باب سے مناسبت معلوم نہیں ہوتی کیونکہ باب تعطر کے بارے میں ہے اور اس مقام پر معائنہ اور حسن صورت کا ذکر ہے۔ حضرت جریرؓ کی صحت کی نمائش اور حسن کا بیان ہے۔ اس لیے شراح مناسبت کی تلاش میں تکلف سے کام لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس حدیث میں حسن صورت کا ذکر ہے جس کا خوشبو سے قریبی تعلق ہے۔ دونوں حسن و پاکیزگی کے باب سے ہیں۔ پھر ظاہری حسن، خوشبو اور تعطر پر بھی دال ہیں۔ کیونکہ بدصورت آدمی عموماً طیب و خوشبو کا بھی لحاظ نہیں رکھتا۔ اور خوبصورت آدمی نظافت اور خوشبو سے بھی محبت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے مناسبت غالباً یہی ہے کہ طیب صورت کے ساتھ غالباً طیب ریح بھی ہوتا ہے۔ اور اس حدیث میں طیب صورت کا ذکر ہے۔

لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ یہاں باب کے الفاظ میں کچھ تغیر ہونا چاہیے۔ اور باب کے الفاظ یہ ہوں "**باب ما جاء فی تعطر رسول اللہ ﷺ و حسن صورۃ الاصحاب و عرضھم علی ابن الخطابؓ**" اور یوں مطابقت حاصل ہو جائے گی۔ **واللہ اعلم الصواب**

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کی خوشبو سے محبت اور اس کے استعمال کا ذکر ہے باوجود یہ کہ آپ ﷺ کو خوشبو کے استعمال کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ؎ حاجتِ مشاطہ نیست روئے دل آرام

لیکن پھر بھی امت کی تعلیم اور طبیعتِ سلیمہ کے تقاضے کو اجاگر کرنے کے لیے آپ ﷺ خوشبو کو استعمال بھی کرتے تھے اور کوئی پیش کرتا تو محبت کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ نیز قبول کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ البتہ عورتوں کی فتنہ پردازیوں کی پیش بندی کے لیے زنانہ اور مردانہ خوشبوؤں میں فرق کو بھی واضح فرمایا۔